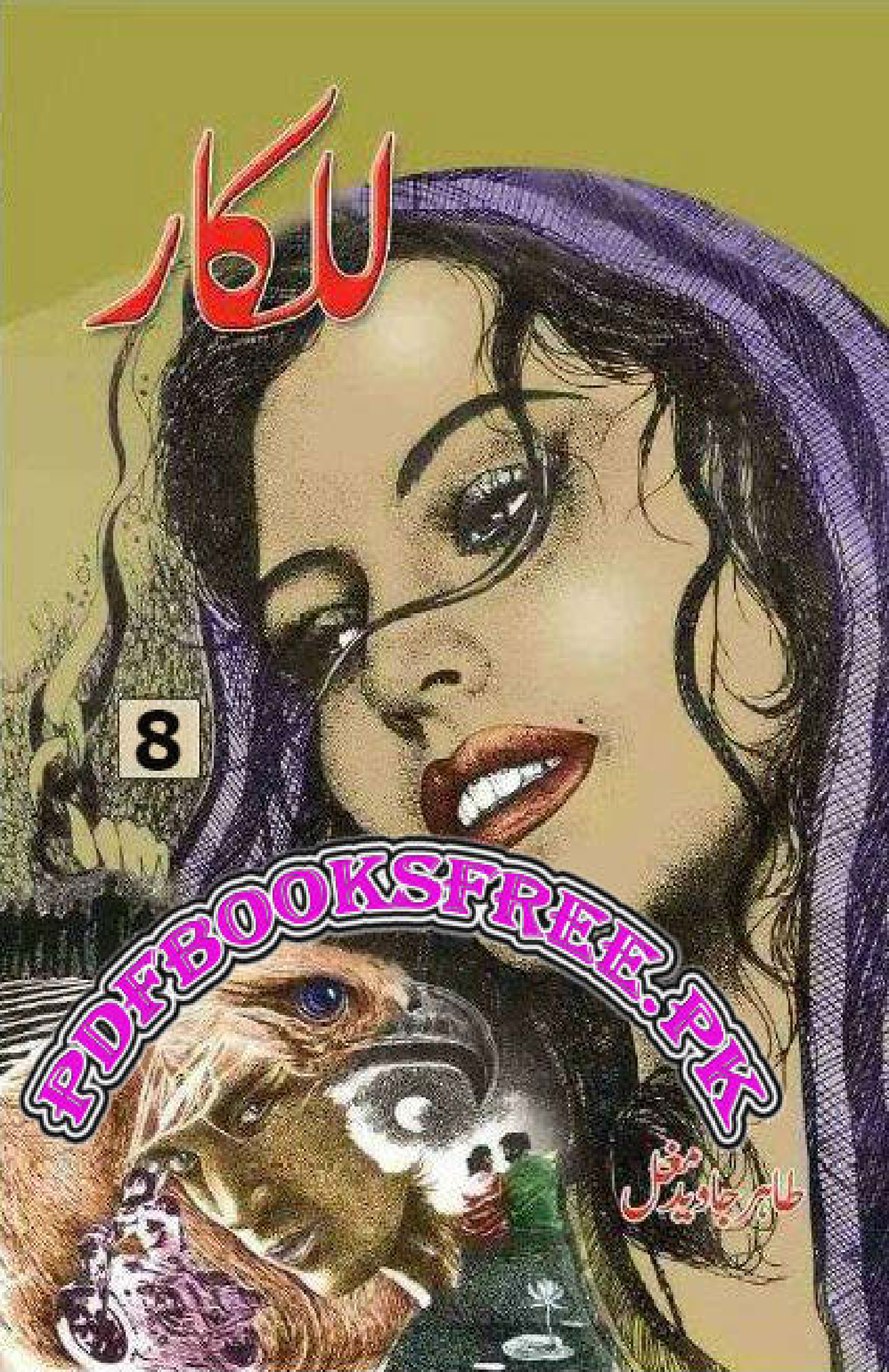


للکار
8
PDFBOOKSFREE.PK
ساحر جاوید مغل

اسی دوران میں شاربہ بائی پھر ہمارے کمرے کی طرف آتی دکھائی دی۔ غالباً اس نے کھانا کھایا تھا اور اپنے پان سے رنگے ہوئے دانتوں میں خلال کر رہی تھی۔ وہ مستی میں آئی ہوئی نیل گائے کی طرح سلاخ دار کھڑکی کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اب وہ مجھ پر اتنا غور نہیں کر رہی تھی جتنا ثروت پر۔ اسے اوپر سے نیچے تک تاکتے ہوئے بولی۔

''تو یہ ہے وہ شریف زادی جو اپنے عیاش خصم کے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ واہ بھئی واہ...... گھر گرہستن ہو تو ایسی۔ اپنی جوانی اور عزت ہتھیلی پر رکھ کر نکل پڑی ہے، اللہ کی بندی۔''

''کیا کیا ہے اس کے خصم نے؟'' پریم چوپڑا نے دریافت کیا۔

''یہ پوچھو، کیا نہیں کیا۔ اس جیسی نیک پروین زنانیاں گھروں میں بیٹھ کر آلو گوشت پکاتی رہتی ہیں اور ان کے خصم روسٹ، بٹیر اور مچھلی کباب کھاتے ہیں طوائف زادیوں کے ساتھ بیٹھ کر۔ اس کا شوہر بھی یہی کرتا رہا ہے۔''

''تم اپنی زبان بند رکھو تو بہتر ہے۔'' میں نے کڑے لہجے میں شاربہ بائی کو مخاطب کیا۔

''اوئے...... میں نے تو سنا ہے کہ تُو یار ہے اس شریف زادی کا۔ میں تو تیرے فائدے کی بات کر رہی ہوں۔ اس کے خصم کا کچا چٹھا بتا رہی ہوں اور کوئی جھوٹ تو نہیں بول رہی ہوں نا۔ یہ کہے گی تو ثبوت بھی دے دوں گی۔''

پریم چوپڑا مسکرایا اور اس کی ناک کچھ اور بھی چوڑی ہو گئی۔ وہ بولا۔ ''بائی جی! کس بات کی دشمنی لے رہی ہو بے چاری سے؟ دیکھو رنگ کیسے پیلا پڑ گیا ہے اس کا۔''

''دشمنی تو مجھے ''ہے'' ایسی شریف زادیوں سے۔'' وہ شرابیوں کی طرح ہاتھ لہرا کر بولی۔

"کس بات کی دشمنی؟" پریم چوپڑا نے پوچھا۔

"بس ہمارے پیٹ پر لات مارتی ہیں اس طرح کی خاوند پرست زنانیاں۔ چمٹی رہتی ہیں۔ گالیاں سنتی ہیں۔ اپنے گھر والوں سے جوتے کھاتی ہیں۔ سب کچھ پتا ہوتا ہے ان کو پھر بھی ذلیل ہو کر پڑی رہتی ہیں گھر میں۔ میں نے ایک ایسی عورت کو بھی دیکھا ہے جو فجر کی اذانوں تک اپنے خصم کے انتظار میں بیٹھی رہتی تھی۔ وہ مجرا دیکھ کر آتا تھا اور آتے ہی گالی گلوچ شروع کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی اسے جوتا بھی دے مارتا تھا اور پھر اسی سے کہتا تھا کہ جوتا پکڑ کر لاؤ تا کہ مزید پٹائی کر سکوں۔ اور یہ کوئی ایک مثال نہیں ہے۔ گھروں کے گھر بھرے پڑے ہیں ایسی چمڑ لیس زنانیوں سے۔"

پریم چوپڑا اپنا زخمی کندھا دباتے ہوئے بولا۔ "تو بائی جی! تم چاہتی ہو کہ خصم اگر کہیں مجرا وغیرہ دیکھنے چلا جائے تو عورت طلاق لے لے اس سے۔"

"نہیں...... میں یہ کہہ رہی ہوں کہ جو خصم پکے تماش بین اور طوائف باز بن جائیں، ان کی عورتوں کو لات مار دینی چاہیے ان کی تشریف پر۔ کہیں اور گھر بسا لینا چاہیے۔ وہ بھی سکھی ہو جائیں گی۔ ہمارا کاروبار بھی چمکے گا۔ اب دیکھو اس ستی ساوتری کو۔ کیسا نچوڑے لیموں کی طرح منہ ہو گیا ہے اس کا۔ پر بھاگی پھر رہی ہے پتی دیو کے پیچھے اور ایک وہ ہے کہ طوائف کے ساتھ گھر بسانے کے لیے بھی تیار ہے۔ چھ مہینے کے لیے تو طوائف زادی کا گھر والا بن ہی گیا تھا وہ۔"

"وہ کس طرح؟" پریم چوپڑا نے پوچھا۔

شاربہ بائی نے نشیلے انداز میں وہ سب کچھ پریم چوپڑا کے اور ہمارے گوش گزار کر دیا۔ ڈمی ہیروئن کے ساتھ یوسف کا ایک رنگین رات گزارنا، پھر مزید راتوں کی خواہش ظاہر کرنا۔ پھر چھ مہینے کے لیے ایک پیکیج ڈیل کرنا...... اور آئندہ کے لیے بھی نیت و ارادہ رکھنا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے ثروت کو تکلیف پہنچا کر اسے راحت مل رہی ہے۔ میں سناٹے میں تھا۔ جو کچھ بھی تھا، میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یوسف کا کچا چٹھا اس طرح ثروت کے سامنے کھلے اور وہ بھی ایسے تضحیک آمیز انداز میں۔

پریم چوپڑا کے ایک سانولے ساتھی نے پوے میں سے انڈین وہسکی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "بائی جی! سچی بات پوچھو تو اپن کو تو وہ لمبی ناک والا چھوکرا ایسا نہیں لگتا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے جب ہم نے گوبند رسنگھ کو ٹیکایا تو وہ سالا چھوکریوں کی طرح تھر تھر کانپنے لگ گیا تھا۔"

ایک دم جیسے شاربہ بائی کو کچھ یاد آیا۔ وہ مخمور لہجے میں بولی۔ "ٹھہرو، میں تم کو اس کا پکا ثبوت بھی دیتی ہوں۔ ایک منٹ ٹھہرو۔"

وہ گھوم کر اندرونی کمرے کی طرف گئی۔ اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ بتاتی تھی کہ وہ واقعی نشے میں ہے۔ اس کا چربیلا جسم اس کے چست لباس میں سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اپنا شولڈر بیگ تھامے واپس آئی۔ اس بیگ میں سے اس نے ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل کیمرا نکالا۔ ایک دو منٹ تک کیمرے سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہی۔ اس میں موجود تصویروں میں سے کوئی تصویر چھانٹ رہی تھی۔ آخر اس کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ کیمرے کی اسکرین کا رُخ ہماری طرف کرتے ہوئے بولی۔ "لو یہ دیکھو۔ یہ تصویر تو جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

میں نے دیکھا۔ یہ یوسف ہی کی تصویر تھی۔ یہ کوئی ایسی ویسی تصویر نہیں تھی۔ پھر بھی یہ بات ثابت کرتی تھی کہ یوسف رنگ رلیوں کی غرض سے شاربہ بائی کے پاس جاتا رہا ہے۔ اس تصویر میں یوسف کا ہمراز دوست فلم ایڈیٹر وسیم احمد بھی نظر آ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں نشہ تھا اور ان کے سامنے میز پر جن کی بوتل بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ پس منظر میں دو نیم عریاں لڑکیوں کے دھندلے سے پوز تھے۔ یوسف بڑے نوٹوں کی ایک گڈی شاربہ کے "دست مبارک" میں تھما رہا تھا۔

ثروت نے بھی تصویر دیکھی۔ پھر ایک اور تصویر اسکرین پر آئی۔ یوسف صوفے پر تھا اور رقاصہ اس سے چھیڑ خانی کر رہی تھی۔ یوسف نے شاربہ کو نیلے نوٹوں کی جو گڈی دی تھی، وہ شیشے کی تپائی پر پڑی تھی۔

شاربہ گھاگ نائیکا کے انداز میں بولی۔ "یہ نوٹ اس عیاش نے مجھے یتیم مسکین لڑکیوں کی شادی کے لیے نہیں دیئے تھے۔ خود دولہا بننے کے لیے دیئے تھے۔ ایک رات کا دولہا......"

ہمیں دکھانے کے بعد شاربہ بائی نے یہ تصویر پریم چوپڑا اور اس کے ساتھی کو بھی دکھائی۔ وہ شاید ابھی کچھ دیر تک مزید ثروت کو کچوکے لگاتی لیکن اسی دوران میں ایک رائفل بردار تیزی سے اندر آیا اور شاربہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بائی جی! لونڈیا ہوش میں آ گئی ہے۔ بھیا صاحب کہہ رہے ہیں کہ آ کر دیکھ لو۔"

شاربہ نے ایک نگاہِ غلط انداز ثروت پر ڈالی اور ایک بار پھر اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔

کارندے کی بات چونکا دینے والی تھی۔ غالباً اس نے نوخیز رجنی کا ذکر کیا تھا۔ اور اب

یہ گھاگ نائیکا نہ جانے کس مقصد سے رجنی کو تاکنے کے لیے گئی تھی۔ شاید وہ یہاں اس گاؤں میں آئی ہی اس کام کے لیے تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آج کل یہ بدقماش عورت جاوا کے ساتھ نتھی ہو کر یہاں پہنچی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ گھوم رہی ہے۔

ثروت نے اپنی پیشانی اپنے اُٹھے ہوئے گھٹنوں پر ٹکا دی تھی اور چہرہ چھپا لیا تھا، یقیناً اس کا چہرہ رنج والم کی تصویر تھا۔ چوپڑا اور اس کے دونوں ساتھی بھی کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔ میں نے نرمی سے ثروت کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''ثروت! ان لوگوں کی باتوں پر نہ جاؤ۔ یہ بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یوسف کہیں ایک آدھ بار اس فاحشہ عورت سے ملا ہو۔ ملنے کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ اس عورت کی نیت کی خرابی اس بات سے ظاہر ہے کہ اس نے یوسف کی تصویریں اُتاری ہوئی ہیں۔''

ثروت خاموش آنسو بہاتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس کی گمبھیر آواز اُبھری اور میرے کانوں تک پہنچی۔ ''تابش! مجھے آپ کے دوست جگت سنگھ نے بھی کچھ باتیں بتائی تھیں لیکن اس وقت میں نے یقین نہیں کیا تھا۔''

جگت سنگھ کی صورت میری نظروں میں گھومی اور میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اسے سختی سے منع بھی کیا تھا کہ وہ ثروت سے ایسی کوئی بات نہیں کہے گا لیکن اس نے اپنی مرضی کی تھی۔

''کیا کہا تھا جگت نے؟''

''وہی سب کچھ جو ابھی اس عورت نے بتایا ہے اور جو شاید...... آپ بھی جانتے ہیں۔ مجھ سے چھپاتے رہے ہیں۔ یوسف اب کسی بہت خوبصورت بازاری عورت کے چکر میں ہے۔ اور اسی چکر کی وجہ سے ہی یہاں تک پہنچے، اس مصیبت میں بھی پھنسے ہیں۔'' وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کا پورا جسم دہل رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں؟ اسے کس طرح دلاسا دوں؟

وہ عجیب رات تھی۔ دُکھ درد اور ناخوشگوار واقعات سے بھری ہوئی۔ کسی کمرے سے جاوا کے گونج دار قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ کسی وقت ان قہقہوں میں چودھری انور اور شاربہ بائی کی مدھم ہنسی بھی شامل ہو جاتی تھی۔ پھر میں نے ایک بہاری لڑکی کو دیکھا۔ عام بہاری لڑکیوں کی نسبت وہ خاصی خوش شکل تھی۔ اس کے پاؤں میں گھنگرو چھن چھن کر رہے تھے۔ شاربہ بائی اس لڑکی کو لے کر جاوا اور چودھری انور والے کمرے میں چلی گئی۔

''کہاں کا مال ہے بائی؟'' جاوا کی بہکی آواز آئی۔

''مال تو یہیں کا ہے جی۔'' شاربہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پاکستان، ہندوستان بنا تو

یہ مشرقی پاکستان چلا گیا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا تو یہ پاکستان آ گیا۔ پاکستان سے یہ پھر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ آپ کی خدمت کے لیے۔''

جاوا نے بلند آواز میں کہا۔ ''مجھے کوئی خدمت شدمت نہیں کرانی لیکن یہ اپنا چودھری انور شہری کڑیوں کا شوقین ہے۔ اس کی رات ضائع نہیں ہونی چاہیے۔'' کچھ دیر بعد ٹیپ ریکارڈر پر گانا گونجنے لگا۔ ہائے ہائے ہائے مجبوری...... یہ موسم اور یہ دوری...... بہاری لڑکی اس گانے پر رقص کر رہی تھی اور گھنگروؤں کی چھن چھن دور تک پھیل رہی تھی۔ یقیناً اڑوس پڑوس کے لوگ بھی سب کچھ سن رہے ہوں گے اور جان رہے ہوں گے مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ جاوا کی سفاکیت حیران کن تھی۔ اس چار دیواری میں کم از کم تین لاشیں موجود تھیں۔ تین جیتے جاگتے انسانوں کو قتل کیا گیا تھا اور جاوا رقص و سرور کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ یہ ایک طرح سے طمانچہ بھی تھا گاؤں والوں کے چہروں پر۔ ان میں کئی پھنے خان زمیندار، چودھری اور چودھری زادے موجود تھے۔ انہوں نے اپنے کان اور آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

مجھے رہ رہ کر جگت سنگھ کا خیال بھی آ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ گاؤں میں موجود نہیں تھا۔ اگر وہ ہوتا تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا تھا۔ کم از کم شدید قسم کی مزاحمت تو ضرور ہوتی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کب واپس آنا ہے اور آنے کے بعد اس کا ردِعمل کیا ہونا ہے۔ اس کے لیے یہاں دو بہت بڑے صدمے موجود تھے۔ اس کی محبوبہ آشا کو قتل ہو چکی تھی اور اس کا لاڈلا بھائی گوبندر بھی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

O......❖......O

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ ہمیں کمرے میں ہی ناشتہ دیا گیا۔ غالباً نمبردار کے گھر سے پراٹھے، حلوہ اور انڈے وغیرہ آئے تھے۔ ثروت نے ناشتے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میری نگاہوں میں بھی آشا اور گوبندر کی خونچکاں لاشیں گھوم رہی تھیں۔ اس ناشتے میں دودھ پتی دیکھ کر آشا کی ناگہانی موت کا دُکھ اور بڑھ گیا۔ میں نے بھی ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

دس بجے کے لگ بھگ میری اور جاوا کی ایک ملاقات اور ہوئی۔ یہ ملاقات جاوا کے کمرے میں ہوئی۔ ثروت کو مجبوراً وہیں سلاخ دار کھڑکی والے کمرے میں رہنا پڑا۔ یوسف اسی چار دیواری میں تھا لیکن مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مجھے لگا کہ جاوا دوٹوک بات کرنے کے موڈ میں ہے۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے

پوچھا۔ ”تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟“

”میں عمران سے بات کر کے ہی کچھ بتا سکوں گا۔“

”اور عمران سے بات تم کر سکتے ہو۔ لیکن یہ بات تمہیں ابھی کرنا پڑے گی۔“

”مجھے منظور ہے۔“

جاوا نے اپنے ایک کارندے کو آواز دی کہ وہ میرا موبائل فون لے کر آئے۔ یہ موبائل فون کچھ دیگر چیزوں سمیت میری تلاشی کے بعد قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ یہ دراصل شکاری اجو والا فون ہی تھا۔ میں نے تین چار بار عمران سے رابطے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ پہلے کسی طرح عمران خود مجھ سے رابطہ کرے۔

میں نے کہا۔ ”جاوا صاحب! میں تمہیں حتمی بات تو عمران سے ڈسکس کرنے کے بعد ہی بتا سکوں گا لیکن اس سلسلے میں ایک دو شرطیں میری بھی ہیں۔“

”شرطوں کی اتنی زیادہ گنجائش تو نہیں ہے لیکن چلو تم بتاؤ۔“

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اگر یہ ڈیل آگے بڑھتی ہے تو اس کے لیے میری سب سے پہلی اور اہم شرط یوسف کے حوالے سے ہوگی۔ آپ کو یوسف کو چھوڑنا پڑے گا اور اسے اس کی بیوی سمیت حفاظت سے پاکستان واپس پہنچانا ہوگا۔“

وہ دھیان سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہندی کی پرانی فلموں جیسے عاشق لگتے ہو تم۔ اچھا بھلا موقع مل رہا ہے تمہیں۔ محبوبہ کا پتی سورگ باشی ہونے جا رہا ہے اور تم اسے بچانے اور یہاں سے نکالنے کی باتیں کر رہے ہو؟“

”میں مذاق نہیں کر رہا جاوا صاحب! میری پہلی شرط ہی یہ ہے کہ یوسف کو چھوڑنا ہوگا اور میاں بیوی کو اپنی گارنٹی کے ساتھ پاکستانی علاقے میں واپس پہنچانا ہوگا۔“

”میرے بچے! یہ تو کافی مشکل کام بتا رہے ہو تم۔ سردار اوتار سنگھ تو اُچھل اُچھل کر چھت کو لگے گا۔ اس کو بڑی مشکل سے ایسا گولڈن چانس ملا ہے اور اس کے لیے کافی روکڑا بھی خرچ کیا ہے اس نے۔ وہ نہیں مانے گا اس کے لیے۔ نہیں چھوڑے گا چھوکرے کو۔“

”تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکے گا جاوا صاحب! سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ آپ ہماری جان تو شاید لے لیں لیکن کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔“

”دوسری شرط کیا ہے میرے بالکے؟“

”رجنی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر پہلے ہی بڑا ظلم ہو گیا ہے۔ اس کے منگیتر کو مار دیا ہے آپ لوگوں نے۔“

”چلو یہ رجنی والی شرط تو ہو جائے گی۔ حالانکہ شارہ بائی کو لڑکی پسند آ گئی ہے۔ وہ اپنے ایک خاص گاہک کے لیے انڈیا کے مختلف حصوں سے پانچ چھ بڑے تیکھے قسم کے ”پیس“ پسند کر رہی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ اسے کوئی اور پنجابن مٹیار پسند کرا دیں گے۔ یہ سندر ناری کو ”مٹیار“ ہی کہتے ہیں نا پنجابی بھاشا میں؟“

میں نے سرد مہری سے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور بولو؟“

”میرے اور عمران کے بارے میں آپ کہہ ہی چکے ہو کہ اس کھیل میں حصہ لینے کے بعد ہم حفاظت سے پاکستان پہنچ سکیں گے۔“

”بالکل ایسا ہی ہوگا۔“ جاوا نے کہا اور اپنی انگلیوں سے اپنی زبان کو چھوا۔ ”یہ ممبئی کا سب سے مہنگا اور بھروسے والا اسٹامپ پیپر ہے بچے۔“

”یہ کھیل کب اور کہاں ہونا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ممبئی میں۔ اس کی فائنل ڈیٹ تو نہیں آئی لیکن اندازہ ہے کہ چند دن کے اندر ہی ہو گا۔“

”آپ اپنے پرانے حریف ریان ولیم کی بات بھی کر رہے ہو۔ کیا وہ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے؟“

”وہ خبیث اس معاملے میں دلچسپی کیوں نہیں لے گا جس میں قریباً 100 ملین ڈالرز کا سرکل چلنا ہے۔ مجھے وشواس ہے وہ تمہارے ہیرو عمران کو اس کھیل پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اپنی کوشش میں سپل (کامیاب) بھی ہو چکا ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے، تمہیں عمران کو یہاں لانا ہے اور اس کو اس کھیل کے لیے تیار کرنا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ کوئی بھی ہوشمند بندہ ایسے تماشے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ عمران بھی نہیں ہوگا۔ ہاں...... اگر تم کہو تو میں خود کو اس بازی کے لیے پیش کر سکتا ہوں؟“

قریباً وہی وقت تھا جب اس سیل فون کی بیل ہونے لگی جس پر عمران کی کال آتی تھی۔ میں نے اسکرین پر نظر دوڑائی۔ یہ عمران ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ”جاوا صاحب! عمران کی کال ہے۔ میں اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور...... تم شانتی سے بات کرو۔ ہر اونچ نیچ اسے سمجھا دو۔ خاص طور پر اپنی شادی شدہ محبوبہ کے بارے میں۔“

وہ باہر چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے عمران کی توانا آواز ابھری۔ وہ سنجیدہ موڈ میں تھا۔ ''کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''حال بالکل ٹھیک نہیں ہے......''

وہ جلدی سے بولا۔ ''گھبراؤ نہ...... اب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری مدد کے لیے ڈاکٹر رتن اور شہباز احمد کل کسی وقت ایمبولینس لے کر گاؤں میں پہنچ جائیں گے۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔''

''نہیں عمران۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ''اب ان کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر انہیں کہہ دیا ہے تو فوراً منع کر دو۔ یہاں معاملہ بہت خراب ہو چکا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' وہ چونک گیا۔

''وہی جس کا اندیشہ تم نے ظاہر کیا تھا۔ جاوا اور اس کے ساتھی اسی علاقے میں موجود تھے اور ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں ڈھونڈ لیا ہے عمران۔ ہمارے میزبانوں میں آشا کور اور گوبندر مارے جا چکے ہیں۔ ہم جاوا کے پاس ہیں۔ پورے گھر میں جاوا کے رائفل بردار دندنا رہے ہیں۔''

''او مائی گاڈ!''

میں نے کہا۔ ''جگت سنگھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ وہ گاؤں میں نہیں ہے اور بہتر ہے کہ نہ ہی آئے ورنہ یہ لوگ اسے بھی دھر لیں گے۔ گاؤں میں جاوا کی اتنی دہشت ہے کہ کوئی اونچی آواز میں بولتا بھی نہیں۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ یہ بدبخت اپنی من مرضی کر رہے ہیں۔''

''ثروت تو خیریت سے ہے۔''

''ہاں...... لیکن آئندہ کیا ہوگا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اسے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں اور اس کی جان بخشی کے لیے کچھ کڑی شرطیں رکھ رہے ہیں۔''

''دیکھو تابی! میں اس کتے جاوا کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بڑا بے رحم گینگ ہے۔ تم نے کسی طرح کی مزاحمت نہیں کرنی۔ کوئی رسک نہیں لینا۔ مجھے پوری تفصیل بتاؤ۔ یہاں کیا ہوا؟''

اگلے پانچ دس منٹ میں، مَیں نے تقریباً سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح یوسف کی شکل سے دھوکا کھا کر ایک مقامی مخبر نے پولیس کو بتایا

کہ گاؤں میں مفرور اشوکا سنگھ موجود ہے اور کس طرح پولیس والے کی اطلاع پر جاوا ہم تک آ پہنچا۔ پوری رُوداد سننے کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ آشا کو بہیمانہ طریقے سے قتل کیا گیا، عمران کا لب و لہجہ کچھ اور گمبھیر تھا۔ وہ ثروت کے حوالے سے بہت فکرمندی محسوس کر رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''تم نے ابھی کچھ شرطوں کی بات کی ہے۔ کیا کہہ رہا ہے جاوا؟''

''وہ جوئے کی ایک بڑی بازی کی بات کر رہا ہے عمران! اس کے ساتھ یہ بازی ممبئی کے ایک بڑے جوا خانے میں کھیلی جائے گی۔ جہاں دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے کھلاڑی بھی حصہ لیں گے۔''

''اوہ میں سمجھ گیا تم ''سیلف شوٹنگ'' کی بات کر رہے ہو۔ اس کا ایک مقابلہ ممبئی میں کسی جگہ ہونے والا ہے۔ بہت بڑی رقمیں داؤ پر لگائی جانے والی ہیں لیکن یہ کھیل نہیں ہے۔ یہ تو سیدھی سیدھی قتل و غارت ہے یار! کھیل تو وہ ہوتا ہے جس میں کھلاڑی اپنی مرضی سے حصہ لیتے ہیں۔ کھیل میں خطرہ اور تھرل ہوتا ہے لیکن سیدھی سیدھی موت تو نہیں ہوتی۔ یہ تو دیوانہ پن ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں لوگ اپنی مرضی سے حصہ لیں گے۔ اس میں ان کی مجبوریوں کو خریدا جائے گا۔''

''تمہیں کیسے پتا ہے اس مقابلے کے بارے میں؟''

''ریان ولیم نے دو تین دن پہلے بات کی ہے۔ وہ بھی اس کو خودکشی پروگرام بتا رہا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی چاہ رہا تھا کہ کوئی اس کی طرف سے اس ایونٹ میں حصہ لے۔ وہ باتوں باتوں میں مجھے ٹٹول رہا تھا کہ کیا میں یا میرا کوئی ساتھی اس کھیل میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کام میں تو وہی دلچسپی لے گا جس کی ٹانگ سے بم باندھ کر اسے کھیلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو یا وہ ویسے ہی خودکشی کا ارادہ کر چکا ہو۔ جاوا نے یہ بات کس حوالے سے کی ہے؟ کہیں وہ......''

''ہاں عمران! اس نے ثروت کی زندگی کی قیمت یہی بتائی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس کی طرف سے چار چھ یا پانچ چھ والا کھیل کھیلو۔''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ وہ تمہاری جگہ مجھے قبول کر لے لیکن وہ نہیں مانتا۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے عمران! کچھ بھی نہیں۔ میں نے تمہیں پورے حالات بھی بتا دیئے ہیں۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ کیا کرنا ہے۔ میں لڑنے مرنے کے لیے بھی پوری طرح تیار ہوں اور تمہیں سچ بتاتا

ہوں عمران! اگر ثروت کی زندگی کا خیال نہ ہوتا تو اب تک میں جو بھی کر سکتا تھا، کر چکا ہوتا۔"

"یعنی وہ تمہیں اور ثروت کو چھوڑنے کے بدلے میں یہ چاہتا ہے کہ میں اس کی طرف سے یہ بازی لگاؤں؟"

"ہاں عمران! بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی تمہاری "لک" پر بہت بھروسہ کر رہا ہے۔ لیکن میں تمہاری بات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ یہ قسمت آزمائی نہیں، خودکشی ہے۔ چیمبر میں چار گولیاں رکھ کر دو دفعہ فائر کرنا یا پانچ گولیاں رکھ کر ایک دفعہ۔ اس مسئلے کا کوئی اور حل نکالنا چاہیے عمران۔"

دوسری طرف کئی سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ پھر عمران کی آواز آئی۔ "حل اتنی دور بیٹھ کر نہیں نکل سکتا تابی! میں آرہا ہوں تمہارے پاس۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر۔"

"لیکن عمران......"

"باقی باتیں وہاں پہنچ کر ہوں گی۔ میں پہلے تم سے فون پر ہی رابطہ کروں گا۔ تمہیں یہ فون آن رکھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تم اس وقت ہو کہاں؟"

"لنگڑی پورہ گاؤں میں ہی ہیں۔ گوبندر کے سسرالی گھر میں۔ یہ کافی بڑا گھر ہے۔ سامنے کی طرف برآمدہ ہے......"

میری بات کو بریک لگ گئے۔ باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور پریم چوپڑا کی گرج دار آواز آئی۔ "ہاں بھئی...... تمہاری بات ختم ہوئی یا نہیں؟"

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ لوگ اندر ہونے والی گفتگو سنیں گے تاکہ میں کوئی فالتو بات نہ کر سکوں۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے عمران! ہم پھر بات کریں گے۔ میرا فون کھلا ہے، اوکے...... خدا حافظ۔"

دس پندرہ منٹ بعد جاوا اپنے پورے کروفر کے ساتھ پھر آدھمکا۔ وہ واقعی ایک ہیبت ناک شخص تھا۔ اس کی موجودگی جیسے اردگرد کی ہر جاندار شے کو سہا دیتی تھی۔ اس کے جسم سے ایک حیوانی سی بُو پھوٹتی رہتی تھی۔

میں نے جاوا کو یہی بتایا کہ عمران نیم رضامند ہے۔ وہ ایک ڈیڑھ روز میں یہاں پہنچ رہا ہے۔ وہ فون پر بات کرے گا۔ براہِ راست ملاقات سے پہلے اسے ایک دو یقین دہانیاں

چاہیے ہوں گی۔

جاوا بولا۔ "بچے! ایک بار کہہ دیا ہے نا کہ اس زبان سے بڑی یقین دہانی پورے مہاراشٹر اور پورے انڈیا میں کوئی نہیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جاوا صاحب! ثروت اور یوسف کو کب چھوڑو گے؟"

"نہیں بچہ جی! ابھی تو اس چھوکری کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ وہ تو کھیل پورا ہونے کے بعد ہی چھوٹے گی۔ اس لونڈے یوسف کی بات پر غور کیا جا سکتا تھا لیکن اس میں بھی زبردست قسم کا لفڑا ہے۔ سردار اوتار کی دُم پر بڑے زور کا پاؤں آئے گا۔ وہ کبھی نہیں مانے گا۔ اس کے ساتھ اپنا دس سال کا یارانہ بھاڑ میں چلا جائے گا۔"

"جاوا صاحب! آپ یہ کہہ رہے ہو کہ یوسف کو خدانخواستہ اشوکا سنگھ کی جگہ مرنا پڑے گا۔"

"خدانخواستہ کہہ لو یا بھگوان نہ کرے کہہ لو لیکن بات تو کچھ ایسی ہی ہے بچے۔"

"تو پھر یہ ڈیل نہیں ہو سکے گی۔ تم ہماری جان چاہتے ہو تو لے لو۔ بلکہ ابھی مار دو ہم سب کو۔" میں نے دوٹوک حتمی لہجے میں کہا۔

میرے لہجے نے جاوا کو ذرا چونکایا۔ اس نے جگر پاش نظروں سے مجھے گھورا۔ "جاوا کی دی ہوئی موت اتنی آسان نہیں ہوتی بچہ جی! اس کی تمنا نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ بہرحال میں اس بارے میں سردار اوتار سے بات کر کے دیکھوں گا۔ وچن کوئی نہیں دیتا اور نہ ہی دے سکتا ہوں۔ ہاں اگر تم چاہو تو تمہیں ابھی رہا کرنے کو تیار ہوں۔ کہو تو تمہیں پاکستان بھی پارسل کیا جا سکتا ہے تاکہ تم ہیرو کو جلد از جلد یہاں بھیج سکو۔ تمہارے علاوہ اس چھوکری رجنی کو بھی ابھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ بتاؤ پروگرام ہے رہا ہونے کا؟"

"نہیں...... میں ثروت اور یوسف کو یہاں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

"اوئے بلونگڑے! یوسف کا تو تُو بس یونہی نام لے رہا ہے۔ تیرا اصل مسئلہ تو وہ چھوکری ثروت ہے۔ مجھے پتا ہے، ہندی فلموں والا کلاسیکل عاشق ہے تُو۔ وہ مکیش کا گانا کیا تھا، جس کی دھن اپنے چاچا جے کشن نے بنائی تھی۔ جینا یہاں، مرنا یہاں اس کے سوا جانا کہاں۔ میرے چندا! تُو بھی اس چھوکری کے سوا کہیں نہیں جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مرے گا اور اس کے ساتھ ہی قبر میں لیٹنا پسند فرمائے گا۔ میں تاڑ گیا ہوں تیری آنکھوں میں دیکھ کر۔ چھوٹا موٹا ڈپلوما نہیں ہے تیرے پاس، پوری پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے تُو نے عاشق

میں۔"

"جو بھی آپ سمجھ لو۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ تم چھوڑ سکتے ہو تو ان دونوں کو چھوڑ دو۔"

"یہ تو ہو نہیں سکتا۔ ہاں رجنی کے بارے میں میری آفر اب بھی برقرار ہے۔"

میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "کب چھوڑو گے اسے؟"

"کہو تو ابھی چھوڑ دیتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جہاں من چاہے، چلی جائے گی اور ہمارے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دے گی۔ وہ اس گاؤں کے جس گھر میں چاہے، جا سکتی ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے ضمانت دینا ہوگی کہ وہ گاؤں سے باہر نہیں جائے گی اور نہ اپنی زبان کھولے گی۔"

اس روز سہ پہر کے بعد جاوا نے وعدے کے مطابق رجنی کو چھوڑ دیا۔ وہ اس خطرناک چار دیواری سے نکل کر گاؤں میں ہی اپنے ایک ماموں کے گھر چلی گئی۔ میں نے بڑے پُرزور طریقے سے اسے اور اس کے ماموں کو زبان بندی کی ہدایت کر دی۔ آشا کور کی ہلاکت کا تو رجنی کو علم ہو چکا تھا، میں نے گوبندر کی ہلاکت کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔ اسی رات جاوا گروپ کے افراد نے آشا کور، گوبندر اور مخبر روہیل سنگھ کی لاشیں ایک بند گاڑی میں ڈالیں اور کسی نامعلوم جگہ غتربود کر دیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کام میں مقامی تھانے دار نے بھی جاوا کے کارندوں کی مدد کی۔ میرا یہ اندازہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔ تین جیتے جاگتے انسانوں کو مار کر ان کا مدعا غائب کر دینا جاوا کے لیے ایسا ہی تھا جیسے تین مکھیوں کو مار دینا۔ اس رات جاوا نے مجھے فون کی ایک نئی سم بھی دی تاکہ میں عمران سے رابطہ بحال رکھ سکوں۔

شام کو ایک اور اہم شخص کی آمد اس چار دیواری میں ہوئی۔ یہ اونچے زرتار شملے والا سردار اوتار سنگھ تھا لیکن آج اس کے شملے میں پہلے جیسا تناؤ اور لہراؤ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وجہ یقیناً سردار اوتار کی بیٹی ہی تھی۔ سردار اوتار سنگھ ترشولا کے علاقے کا سب سے باعزت شخص تھا اور وہ اپنی ہی بیٹی کے ہاتھوں بری طرح رسوا ہوا تھا۔ اس کی چودھریانہ اکڑ اور اس کے بے جا گھمنڈ نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ جاوا اور سردار اوتار سنگھ کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی، اس کا کوئی کوئی فقرہ میرے کانوں تک بھی پہنچ رہا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ نہال برادری کے لوگوں نے ایک بار پھر سردار اوتار کی بیٹی کو پاکستان پہنچا دیا ہے اور اب وہ ننکانہ صاحب میں ہے۔ سردار اوتار سنگھ جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا تھا۔ اس کی بے قراریاں عروج پر تھیں لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اپنی بیٹی کے ہاتھوں ہار چکا ہے۔

مجھے وہ خوب صورت لیکن بیمار باپو یاد آیا جس نے بستر مرگ پر ہوتے ہوئے بھی اپنی پوتی کی مدد کی تھی۔ اس نے اپنی پوتی کا یہ حق مانا تھا کہ وہ اپنی زندگی اپنی پسند کے مطابق گزارنے کے لیے آزاد ہے۔ وہ چلا گیا تھا لیکن جاتے جاتے اپنی پوتی کے راستے سیدھے کر گیا۔

جاوا نے شاید سردار اوتار سنگھ کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا، دھپ کی آواز آئی پھر جاوا بولا۔ "اب چھوڑ دے اوتارے! جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب یہ بڑے والا پیگ پی اور دوسری باتوں کے بارے میں سوچ۔"

اس کے ساتھ ہی بوتل اور گلاس وغیرہ کی کھنک سنائی دی۔ جاوا، سردار اوتار کا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سردار اوتار کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔ "جاوا صاحب! اب تو من کرتا ہے کہ شراب کا تالاب ہو اور اس میں چھال مار دوں۔ اس میں ڈبکی لگا کر نیچے چلا جاؤں۔ نہ کسی کی شکل دیکھوں نہ کوئی آواز سنوں۔"

"اوئے تُو چل میرے ساتھ ممبئی، وہاں یہ انتظام بھی کر دیں گے۔ ساتھ تین چار فلمی پریاں بھی تیرے ساتھ تالاب میں اُتار دیں گے اور شراب بھی اصلی فرانسیسی ہوگی۔ سیدھی سورگ میں پہنچا دے گی تجھے۔"

"جاوا صاحب! سورگ نہ ہو لیکن یہ نرگ تو نہ ہو۔ لگتا ہے کہ پورا شریر آگ میں جل رہا ہے۔"

"تو آگ پر یہ پانی ڈال نا یار! کہتا ہے تو تیرے لیے کچھ چھن چھن کا انتظام بھی کر دیتے ہیں۔" جاوا کا اشارہ یقیناً اسی بہاری رقاصہ کی طرف تھا جو کل شاربہ بائی کے ساتھ یہاں آئی تھی اور رات کو چودھری انور کے پاس رہی تھی۔

میں اسی کمرے میں تھا جہاں آج صبح بھی جاوا سے میری بات ہوئی تھی۔ ثروت اسی سلاخ دار کھڑکی والے کمرے۔۔۔ میں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جاوا اپنی گارنٹی پر پورا عمل کرے گا اور ثروت بالکل خیریت سے رہے گی۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہم جاوا کی ہدایت پر چلتے رہیں گے۔ جب سے شاربہ بائی نے ثروت کے سامنے یوسف کے پول کھولے تھے، وہ عجیب کیفیت میں تھی۔ بالکل گم صم تھی۔ آنکھوں کے کنارے گہرے سرخ تھے لیکن آنسو جیسے روٹھے ہوئے تھے۔

ثروت سے زیادہ فکر مجھے یوسف کی طرف سے تھی۔ یوسف بھی اسی چار دیواری میں

موجود تھا، تاہم کل رات سے میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اب سردار اوتار سنگھ بھی یہاں آن موجود ہوا تھا۔ سردار اوتار سنگھ یقیناً یوسف کے لیے یہاں آیا تھا۔ یوسف سرداروں کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ اس کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔ یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی تھی کہ وہ اپنے مفرور بیٹے کی زندگی آسان کرنے کے لیے یوسف کی جان لینا چاہ رہے ہیں۔ ان کا ایک طریقہ ناکام ہو گیا تھا لیکن وہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر سکتے تھے۔

یہ بڑے تناؤ والی صورتِ حال تھی۔ میں نے جاوا کو صاف بتا دیا تھا کہ وہ جو بھی ڈیل کرنا چاہتا ہے، اس میں یوسف کی جان بخشی پہلی شرط ہوگی۔ جو آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں، ان سے پتا چلتا تھا کہ سردار اوتار بلانوشی کر رہا ہے۔ جب وہ بالکل ٹن ہو گیا تو اس نے نہال برادری کے لوگوں کے لیے گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ وہ ان کی ماؤں بہنوں سے ناجائز و شرمناک رشتے جوڑ رہا تھا۔ پھر یہ رشتے جوڑتے جوڑتے ہی وہ شاید سو گیا۔ میں نے ایک کارندے کے ہاتھ جاوا کو پیغام بھیجا کہ میں ثروت کے لیے فکر مند ہوں۔ وہ اسے میرے پاس بھیج دے۔

چند منٹ بعد پریم چوپڑا اس کا جواب لے کر آیا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ چھوکری اپنے اصلی پتی کے پاس بالکل خیریت سے ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس۔ وڑی، تم اپنا مغز پلپلا مت کرو۔''

پریم چوپڑا نے جھوٹ بولا تھا۔ ثروت بالکل خیریت سے تھی لیکن یوسف کے کمرے میں نہیں تھی۔ اس کا ثبوت ہمیں بعد میں ملا اور یہ خاصا حیران کرنے والا ثبوت تھا۔ ابھی صبح کا اُجالا پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا کہ شور سے میں جاگ اُٹھا۔ ''بھاگو، دوڑو'' کی صدائیں آ رہی تھیں۔ پھر ایک فائر ہوا۔ پریم چوپڑا نے کسی کو للکارا۔ تب ایک دوسرے کارندے سورج کی آواز سنائی دی۔ ''ادھر سے نکلا ہے۔ دور نہیں گیا ہوگا۔''

تب اوپر تلے دو فائر مزید ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی۔ یہ جیپ بڑی تیزی سے کسی کے پیچھے گئی۔ پورے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ گئے تھے۔ ان میں جاوا اور سردار اوتار سنگھ بھی تھے۔ پھر جاوا کے گرجنے برسنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے کسی کارندے کو زوردار تھپڑ رسید کیا اور گندی گالیاں دیں۔ کارندے نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''بھیا صاحب! میں بس ایک منٹ کے لیے اندر آیا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ چودھری انور صاحب آوازیں دے رہے تھے۔ بس اتنی دیر میں وہ نکل گیا۔''

جاوا نے کارندے کو ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ ''ایک منٹ کم ہوتا ہے کتے کے بچے۔'' وہ دھاڑا۔ ''ایک منٹ میں انڈیا کے اندر تین درجن لوگوں کی ہتھیا ہوتی ہے۔ چار پانچ سو عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔ تیرے جیسے بہت سے حرام خور ملازموں کو ان کے مالک زندہ جلا دیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آج تیرے پر بھی پیٹرول چھینکنا پڑے گا۔''

کارندہ دہشت زدہ آواز میں فریادیں کرنے لگا۔ دو تین منٹ بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ یوسف کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ حیرت ناک انکشاف تھا۔ گوبندر کی موت کے بعد سے یوسف کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بالکل سکتہ زدہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح کی کوشش کرے گا۔ اب تک دو افراد اس جگہ سے بھاگے تھے اور دونوں پکڑے گئے تھے۔ یعنی ثروت اور رجنی۔ اب یوسف کا پتا نہیں کیا انجام ہونا تھا۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ بچ نکلے گا۔ یہاں کوئی بھی جاوا کے مطلوب شخص کو پناہ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پولیس بھی نہیں۔

سردار اوتار سنگھ سب سے زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ جاوا کے کارندوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے تین چار بندے بھی یوسف کے پیچھے لگا دیئے تھے۔ یوسف کے بھاگنے کی تفصیل مجھے کچھ دیر بعد پریم چوپڑا سے ہی معلوم ہوئی۔ اب کے ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ پریم چوپڑا ابھی ابھی جیپ پر کہیں سے واپس آیا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا۔ اس کی چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔

میرے پوچھنے پر پہلے تو اس نے ناک بھوں چڑھائی پھر بتایا کہ وہ لیٹرین کی طرف سے نکلا ہے۔ سویرے سویرے دہائی دے رہا تھا کہ اسے زور کی لگی ہے۔ نریندر اسے لیٹرین کی طرف لے کر گیا تھا۔

''نریندر تو باہر کھڑا رہا ہوگا۔'' میں نے تفصیل چاہی۔

''وہ بس ذرا دیر کے لیے اندر گیا تھا۔ چودھری آوازیں دے رہا تھا۔ اسی دوران میں اس کتے نے دیوار پھاندی اور باہر گلی میں کود گیا۔ لیکن جائے گا کہاں، چوہے کے مافق پکڑیں گے اور دُم کی طرف سے کھینچتے ہوئے واپس لائیں گے۔''

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یوسف ایسی جرأت کر چکا ہے۔ کبھی کبھی موت کا حد سے بڑھا ہوا خوف بھی انسان کو کچھ کر گزرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آگ کے ڈر سے لوگ بلند عمارتوں سے کود جاتے ہیں۔ اونچی سپاٹ دیواروں پر چڑھ جاتے ہیں۔ یوسف بھی شاید اسی طرح نریندر کی عقابی نظروں سے بچ نکلا تھا۔ یہ نریندر کوئی عام کارندہ نہیں تھا۔ پریم چوپڑا کے بعد جو

دو تین کارندے زیادہ اہم تھے، یہ ان میں سے ایک تھا۔ سلاخ دار کھڑکی والے کمرے میں گوبندر سنگھ کو اسی نے گولی سے اُڑایا تھا۔ اس سے پہلے پرسوں رات مخبر روہیل کو قتل کرنے کے لیے بھی جاوا نے اسی نریندر کے حوالے کیا تھا۔

میں دل ہی دل میں دعا گو ہو گیا کہ یوسف اس خونی گھیرے سے کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

سارا دن عجیب سی کشمکش میں گزرا۔ موبائل فون میری مٹھی میں تھا اور میں مسلسل عمران کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن کال ابھی نہیں آئی تھی۔ شام کے کچھ ہی دیر بعد پریم چوپڑا جھلایا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کے عقب میں دو خونخوار صورتوں والے رائفل بردار موجود تھے۔ ان لوگوں کی صورتیں ہی یہ بتا دیتی تھیں کہ درجنوں کے حساب سے قتل کر چکے ہیں۔ وہ جب دروازہ کھولتے تھے تو ان کی انگلیاں ٹریگر پر ہوتی تھیں اور وہ بڑی مہارت سے میرے اور اپنے درمیان ایک خاص فاصلہ برقرار رکھتے تھے۔ پریم چوپڑا بھی یقیناً اس طرح کی نقل و حرکت کا ماہر تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی میرے اور رائفل برداروں کے درمیان نہیں آیا تھا۔

پریم چوپڑا نے دروازہ کھلوایا اور چڑھی ہوئی تیوریوں سے بولا۔ ''چلو...... وہ تمہاری سہیلی یاد کر رہی ہے تمہیں۔ بیچاری کی بھوک مری ہوئی ہے تمہارے بغیر۔''

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ ثروت کی طرف ہے۔ یقیناً وہ یوسف کے جانے کے بعد اکیلی خوف کھا رہی تھی۔

وہ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر اسی کمرے میں لے آئے جہاں سلاخ دار کھڑکی کا منظر حوالات کی سی جھلک دکھاتا تھا۔

اسی ''حوالات'' میں گوبندر کا سفاکانہ قتل ہوا تھا۔ میں نے دیکھا، ثروت سکڑی سمٹی ایک گوشے میں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی چادر مضبوطی سے اپنے اردگرد لپیٹ رکھی تھی جیسے یہ اس کا آخری سہارا ہوا۔ ان شرابیوں، سفاک بدمعاشوں کے نرغے میں وہ اس نازک آبگینے کی طرح تھی جو پتھروں کی بارش میں رکھا ہو۔ آشا کور کی جان تو مر کر یہاں سے چھوٹ گئی تھی۔ رجنی کو انہوں نے ویسے ہی آزاد کر دیا تھا۔ اب صرف ثروت یہاں موجود تھی۔

میں کمرے میں گیا تو چوپڑا نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں سرگوشی کی۔ ''بتی نہیں بجھے گی۔ ہاں پہرے دار کی نظر بچا کر چوما چاٹی کر سکتے ہو۔''

میں نے بمشکل ضبط کیا۔ ثروت چوبیس گھنٹے میں ہی کئی دنوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔

اس کے رُخساروں پر زردی کھنڈی تھی۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں جیسے مرجھا کر اپنا رنگ تبدیل کر چکی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب کیوں ہے۔ شاربہ بائی نے اس کے سامنے جو کچھ یوسف کے بارے میں بولا تھا، اس نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا۔ وہ یوسف کی پچھلی غلطیاں معاف کر کے اس کے ساتھ نئے سرے سے زندگی کے سفر کا آغاز کرنا چاہ رہی تھی مگر یہاں اس کو پتا چلا تھا کہ وہ ''وفا کا پتلا'' تو نئی غلطیوں کا آغاز کر چکا ہے۔

میں ثروت سے دل جوئی کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے دھیمی آواز میں اس سے پوچھا۔ ''ابھی تک یوسف ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آیا۔ یہ اچھا شگون ہے۔'' وہ خاموش رہی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''کیا اس نے تمہیں تھوڑا بہت اشارہ دیا تھا کہ یہاں سے نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''مجھے کیا پتا؟'' وہ بالکل سپاٹ لہجے میں بولی۔

''وہ تمہارے ساتھ اسی کمرے میں تھا۔ تمہیں کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا؟''

''وہ میرے ساتھ نہیں تھا۔'' ثروت نے مدھم آواز میں انکشاف کیا۔

''کیا مطلب؟ پریم چوپڑا وغیرہ تو بتا رہے ہیں کہ وہ رات کو تمہارے ساتھ یہاں تھا۔''

''جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہیں ساتھ والے کمرے میں رکھا گیا تھا۔ میں رات کو یہاں اکیلی رہی ہوں۔''

''پھر انہوں نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''انہوں نے اور بھی کئی جھوٹ بولے ہیں تابش! پتا نہیں کیا چاہتے ہیں یہ؟''

''میں سمجھا نہیں ثروت؟''

ثروت نے ایک نظر کھڑکی سے باہر کھڑے پہرے داروں پر ڈالی پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''یوسف خود یہاں سے نہیں نکلے تابش! ان لوگوں نے انہیں نکالا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟''

''وہ کل رات ساتھ والے کمرے میں تھے۔ گیارہ بارہ بجے کے قریب وہ چوڑی ناک والا کمرے میں آیا تھا جسے چوپڑا کہتے ہیں۔ اس نے یوسف سے کچھ باتیں کی تھیں۔ دو چار باتیں میرے کانوں میں بھی پڑیں۔ چوپڑا، یوسف کو یہاں سے نکلنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے یوسف سے کہا کہ وہ تیار رہے۔ تین چار گھنٹے میں اسے یہاں سے نکال لیا جائے گا۔''

''یوسف نے جواب میں کیا کہا؟''

''وہ تیار ہو گئے تھے۔'' وہ پژمردگی سے بولی۔

"تو پھر یہ ڈراما کیوں رچایا گیا؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اچانک میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹی۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی۔ جاوا اور سردار اوتار سنگھ میں یارانہ تھا۔ سردار اوتار کو ہر صورت میں یوسف درکار تھا جبکہ میں نے جاوا کو صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر یوسف کو نہیں چھوڑا جائے گا تو پھر کوئی ڈیل بھی نہیں ہو سکے گی۔ یوں لگتا تھا کہ عیار جاوا نے اس مسئلے کا ایک درمیانی راستہ نکالا ہے۔ اس نے ظاہر کیا ہے کہ یوسف بھاگ نکلا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" ثروت نے پوچھا۔

میں نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو سوچ رہا تھا۔ یوسف کے حوالے سے یہ ایک اچھی صورتِ حال تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ ثروت کو اس کی کوئی خاص خوشی نہیں ہے۔ شاید اسے اس بات کا بھی دُکھ ہوا تھا کہ یوسف نے اپنی رہائی کے موقع پر اس کے بارے میں نہیں سوچا۔

ہم رائفلوں کی چھاؤں میں تھے۔ درجنوں نگاہیں ہمیں ہمہ وقت گھور رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ سردار اوتار سنگھ کے ساتھ جو ڈراما ہوا ہے، اس کا علم جاوا اور بس اس کے ایک دو قریبی ساتھیوں ہی کو ہے۔ سردار اوتار کا "غم" اور بڑھ گیا تھا لہٰذا "غم غلط کرنے کی رفتار" بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ سارا دن پیتا رہا اور کبھی کبھی بھڑکیں بھی لگاتا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ بیچاری بہاری رقاصہ بھی اس کے "غم" کی زد میں آئی ہو۔ بیٹی کے فرار کے بعد یہ دوسری آفت تھی جو اوتار پر آئی تھی۔

رات کا کھانا ہمیں کمرے میں ہی پہنچایا گیا۔ میرے اصرار پر ثروت نے آج چند نوالے لیے۔ اس نے میرے لیے بھی پلیٹ میں کھانا نکالا اور میرے سر پر آنے والی چوٹ کا حال بھی دریافت کیا۔ وہ یوسف کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ نہ ہی اس نے یوسف کے متعلق شاربہ بائی کے انکشاف پر کوئی تبصرہ کیا تھا۔

رات تاریک اور نیم سرد تھی۔ نہ جانے کیوں ابھی تک عمران نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید اسے انڈیا پہنچنے میں ذرا تاخیر ہوئی تھی۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ جاوا اپنی لگژری جیپ پر اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ کہیں گیا ہوا تھا۔ سردار اوتار سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ تاہم چودھری انور اور چوپڑا وغیرہ یہیں تھے۔ ہمارے اردگرد رائفلوں کی گردش بھی اسی طرح تھی۔ کمرے میں رنگین پایوں والی بس ایک چارپائی تھی۔ میں نے ثروت سے کہا کہ وہ

چارپائی پر لیٹ جائے لیکن وہ کسی صورت آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "بھئی...... میں تکلف کے طور پر نہیں کہہ رہا۔ میں تو سوتا ہی نیچے ہوں۔"

"تو پھر میں بھی نیچے ہی لیٹ جاؤں گی۔" اس نے ایک طرف پڑی چٹائی کھول لی۔ اسے ایک کپڑے سے اچھی طرح صاف کیا۔ چٹائی لمبائی میں دس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ ثروت نے اس کے ایک سرے پر اپنا اور دوسرے پر میرا تکیہ رکھ دیا۔ رنگین پایوں والی چارپائی خالی پڑی رہی۔

چوپڑا کہہ رہا تھا کہ کمرے کی بتی حسبِ معمول جلتی رہے گی لیکن پھر لائٹ چلی گئی۔ گھر میں تین چار لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ ایک لالٹین کی مدھم روشنی سلاخ دار کھڑکی کے راستے ہمارے کمرے میں بھی آتی رہی۔ ہم اپنی اپنی جگہ خاموش لیٹے رہے۔ مختصر سے فاصلے بھی کبھی کتنے طویل ہوتے ہیں۔ ہم سیدھے لیٹے تھے۔ پتھریلے مجسموں کی طرح ساکت۔ بے روح اور بے تعلق۔ کچھ دیر بعد سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ثروت نے کروٹ بدلی ہے۔ اپنا رُخ میری طرف کیا ہے۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "آپ نے مجھے ابھی تک اس کام کے بارے میں نہیں بتایا جو یہ لوگ آپ سے اور آپ کے دوست سے لینا چاہ رہے ہیں۔"

"ثروت! تم پہلے ہی بہت پریشان ہو۔ ان سوالوں میں خود کو نہ اُلجھاؤ۔ یہ ہمارا کام ہے، ہم کر لیں گے۔"

"لیکن یہ جاننا تو میرا حق ہے نا کہ آپ ہمارے لیے کتنی بڑی قربانی دینا چاہ رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوا تو میں، فرح اور عاطف کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا ثروت! ہم اس معاملے کو اچھی طرح ہینڈل کر لیں گے۔ ہمیں اس کا تجربہ ہے۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "تابش! آپ پہلے ہی بہت قانون شکنی کر چکے ہیں۔ کیا اب اور کریں گے؟ خود کو اور سزا کی دلدل میں دھنسائیں گے؟"

"یہ تو مقدر ہے ثروت اور مقدر سے کوئی نہیں بھاگ سکتا۔"

"لیکن یہ بھی تو کہتے ہیں کہ مقدر ہم خود بناتے ہیں۔"

"اب تو جو بننا تھا بن چکا ہے ثروت! اب اس کا اور کیا بگڑے گا۔"

"میرا بھی جو بننا تھا، بن چکا ہے تابش! اب میں وہ پہلے والی ثروت نہیں بن سکتی۔ آپ میرے لیے خود کو کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔"

"ایسی بات کیوں کرتی ہو۔ تمہارے سامنے ایک زندگی پڑی ہے۔ ایک صاف ستھری

خوبصورت گھریلو زندگی۔"

"نہیں تابش! پلیز آپ میرے لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالیں۔ میں نے کل آپ کی باتیں بھی سنی ہیں۔ آپ پلیز مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں کہ میں دب کر مر جاؤں۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"میں نے سب سنا ہے۔ یہ بدمعاش جس کو آپ جاوا کہتے ہیں، آپ کو چھوڑ رہا تھا۔ یہاں سے جانے کی اجازت دے رہا تھا لیکن آپ نے میرا نام لیا اور کہا کہ آپ مجھے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اگر آپ کو آزادی مل رہی تھی تو آپ نے کیوں نہ لی؟ کیا پتا کہ باہر نکل کر آپ ہمارے لیے کچھ بہتر کر سکتے۔"

"بہتر کام کسی سے کسی بھی وقت ہو سکتا ہے ثروت! کیا پتا یوسف کے باہر جانے سے کوئی فائدہ ہو جائے۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا لیکن بولی کچھ نہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یوسف کے یوں خاموشی کے ساتھ چلے جانے سے اسے رنج ہوا ہے۔ وہ یوسف کے جانے کا موازنہ میرے نہ جانے سے کر رہی تھی۔ اس موازنے سے اسے یوسف کا رویہ زیادہ بُری طرح کھٹک رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے ثروت کہ یوسف نے یہ پیشکش کچھ سوچ کر ہی قبول کی ہو۔ وہ سمجھ گیا ہو کہ یہ لوگ ابھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ وہ یہاں رہ کر کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس نے باہر جا کر کوشش کرنے کا سوچا ہو۔"

"میں جانتی ہوں تابش! آپ مجھ سے باتیں چھپاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ یوسف کی باتوں پر بھی پردہ ڈالتے ہیں۔ جب لاہور میں یوسف ہسپتال پہنچے تو آپ بھی وہاں کیسے پہنچ گئے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ سب کچھ اتفاقیہ نہیں تھا۔ آپ شاید پہلے سے یوسف کے آس پاس تھے۔ اگر ایسا تھا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یوسف کی مصروفیات کیا ہیں۔ یوسف کے چیریٹی شو والے جھوٹ کا بھی آپ کو پتا چل گیا ہوگا پھر بھی آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"ثروت! میں نے کہا ہے نا، تم خود کو ان سوالوں میں جتنا اُلجھاؤ گی، اتنا ہی پریشان ہو گی۔ تم پہلے ہی کچھ کم پریشان نہیں ہو۔ یہاں آئینہ نہیں ہے ورنہ میں تمہیں صورت دیکھنے کا مشورہ دیتا۔ چہرہ ہلدی ہو گیا ہے۔ تم تو مجھے توانائی دیتی ہو ثروت! تم سے مجھے آگے بڑھنے کی ہمت ملتی ہے۔ اگر تمہارا یہ حال ہوگا تو میں کیا کر سکوں گا۔"

آخری دو تین جملے میں نے بےساختہ ہی کہہ ڈالے تھے۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ تمہیں کیا پتا تم میرے لیے کیا ہو ثروت! ہاں...... میں سچ کہتا

ہوں، میں تم سے توانائی پکڑتا ہوں۔ زندگی کی مصیبتیں جھیلنے کا حوصلہ پاتا ہوں۔ تم ہر ہر قدم پر میرے لیے ہمت اور ترنگ کا سرچشمہ ہو ثروت۔ اگر سرچشمے سوکھ جائیں تو بڑے بڑے دریا ریت کے ڈھیر بن جاتے ہیں، زندگیاں بنجر ہو جاتی ہیں۔" میری آواز بھرا گئی۔

میں اس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جذبات کے ریلے میں کچھ مزید بہہ جانا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ بھانڈیل اسٹیٹ میں، مَیں نے کیسے کیسے اسے یاد کیا ہے۔ کیسے کیسے تڑپا ہوں اس کے لیے۔ لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ عشق کی آبرو خاموشی میں تھی۔ برداشت میں اور تسلیم و رضا میں تھی۔ عشق، ازل سے "خوددار" رہا ہے۔ ہاتھ پھیلا کر صلہ نہیں مانگتا، چپ رہ کر دل میں اُترتا ہے، سب کچھ پا جاتا ہے یا سب کچھ کھو دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں کامران ٹھہرتا ہے۔ میں نے پانچ برس پہلے ثروت کو بہت قریب آنے کے بعد کھویا تھا۔ آج وہ پھر میرے آس پاس تھی۔ شادی شدہ ہو کر بھی شادی شدہ نہیں تھی۔ اس کی اور میری زندگی کے راستے پھر سے ایک ہو سکتے تھے لیکن میں اس یکجائی کے لیے اپنی محبت کو لفظوں اور خواہشوں کے داغ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت نے مجھے اندر سے بڑا سیر چشم کر دیا تھا۔ میں اپنے دل کو ٹٹولتا تھا تو لگتا تھا کہ میرے اندر ثروت کو پھر سے کھونے کا حوصلہ بھی موجود ہے۔

وہ خاموش لیٹی تھی۔ مجھے لگا کہ پھر یوسف کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ میں نے کہا۔ "ثروت! پریشان نہیں ہونا۔ یوسف جہاں بھی ہوگا، جاوا کی حفاظت میں ہوگا۔ میں صبح جاوا سے اس کے متعلق ساری تفصیل معلوم کروں گا۔"

"وہ مجھ سے ملے بغیر کیوں چلے گئے؟ میں ان کی بیوی ہوں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ایسا ہوا ہے۔"

"ثروت! کئی سوالوں کا جواب ہمارے پاس نہیں، وقت کے پاس ہوتا ہے۔ ہم خود کو خوامخواہ ہی سوچ سوچ کر ہلکان کرتے ہیں۔ بہرحال اتنا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، وہ ہم سے کہیں زیادہ محفوظ ہے اور ہو سکتا ہے کہ اسے پاکستان ہی پہنچا دیا گیا ہو۔"

"مجھے نصرت کی بھی بہت فکر ہے تابش! وہ پہلے ہی تنی بیمار ہے کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ اس سے میری بات ہو سکے۔"

"میں اس بارے میں بھی کوئی کوشش کروں گا ثروت! مجھے امید ہے کہ جاوا ہماری بہت سی باتیں مانے گا۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔"

"جی......" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کی اس "جی" نے مجھے گئے وقتوں کی

یاد دلا دی۔ جب ہر چیز پر بہار تھی۔ ساری خوبصورتیاں جوان تھیں۔ میں جب اسے ''ثروت'' کہہ کر بلاتا تھا، وہ اتنے پیار سے ''جی'' کہتی تھی کہ میں آگے کی ساری بات ہی بھول جاتا تھا۔ میں اس سے کہا کرتا تھا۔ تم جان بوجھ کر ایسا کرتی ہو۔ عام باتوں کے جواب میں ''ہاں'' کہتی ہو لیکن جب تم تاڑ جاتی ہو کہ میں کوئی فرمائش کروں گا تو ''جی'' کہہ دیتی ہو۔ میری یادداشت کا فیوز اُڑ جاتا ہے۔ وہ ہنس ہنس کر سرخ ہو جاتی تھی۔

میں یادوں کی کھڑکی میں جھانکتا رہا۔ وہ اسی طرح میری طرف کروٹ بدلے بدلے سو گئی۔ دلنشین آنکھوں پر پلکوں کی چلمن تھی۔ اغیار کے نرغے میں، رائفلوں کی چھاؤں میں اگر وہ یوں سو رہی تھی تو یہ میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہ مجھ پر اس کے بے پناہ بھروسے کا خاموش اظہار تھا۔ اس نے خود اصرار کر کے مجھے یہاں اس کمرے میں بلوایا تھا اور جب میں آ گیا تھا تو وہ اپنے اردگرد کے سارے حالات سے لاتعلق ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں، مَیں اس کا ملیح چہرہ دیکھتا رہا۔ دل چاہا اس کو سینے میں چھپا لوں۔ دنیا جہان کی رکاوٹوں اور آفتوں کو چیر کر نکلوں اور کسی ایسے بے آباد جزیرے میں جا بسوں جہاں میرے اور اس کے سوا اور کوئی نہ ہو۔

صبح نو بجے کے قریب جاوا سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ جب بھی مجھے جاوا سے ملاقات کے لیے لے جایا جاتا تھا، میرے ہاتھ عقب میں ''ہینڈ کف'' سے جکڑ دیئے جاتے تھے۔ یہ ملاقات اسی کمرے میں ہوئی جہاں اس سے پہلے ہوئی تھی۔ یہاں بڑے پلنگ پر جاوا پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ الکحل کی بُو، سگریٹ کا دھواں اور خود جاوا کی حیوانی بُو باس، سب کچھ یہاں موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ سردار اوتار سنگھ آج صبح سویرے یہاں سے واپس جا چکا ہے۔ چودھری انور گنجا بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ جاوا نے مجھ سے تنہائی میں بات چیت کی۔ اس بات چیت سے پہلے اس نے اپنے دونوں سیل فون بند کر دیئے۔ کھڑکی کو بھی بند کرا دیا۔

''ہاں بچے! بات ہوئی تمہاری ہیرو سے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں...... ابھی نہیں لیکن امید ہے کہ آج ضرور ہو جائے گی۔''

''دیر نہ کرو۔ یہاں بہت کچھ بہت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ سردار اوتار سنگھ بہت بے قرار ہے۔ وہ اس لونڈے یوسف کو ہر صورت یہاں سے لے کر جانا چاہتا تھا۔''

''اور یوسف کہاں ہے؟''

جاوا نے ایک گہری سانس لی اور قدرے دھیمی آواز میں بولا۔ ''اس کے لیے ہمیں ناٹک رچانا پڑا ہے۔ اس کے فرار کا ناٹک۔ بہرحال وہ ہمارے پاس ہے اور بالکل محفوظ

ہے۔ اس وقت فرید کوٹ کے ایک گھر میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہوگا۔ کوئی ڈراما وراما ''ساس بھی تو خانہ خراب کبھی بہو تھی۔ لیکن بچہ جی! یہ بات تمہارے گلے کے نیچے رہنی چاہیے۔ گلے سے اوپر آئی تو گلا بھی نہیں رہے گا۔'' اس نے ہاتھ سے گردن کاٹنے کا اشارہ دیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

رات کو میں نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ جاوا نے اپنے مطلب کے لیے سردار اوتار سنگھ کو یادگار دھوکا دیا تھا۔ یقیناً جاوا ان لوگوں میں سے تھا جو آگے بڑھنے اور اوپر جانے کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لاشوں کے زینے بنا سکتے ہیں۔

وہ بولا۔ ''میرے بارے میں کسی وہم کا شکار نہ ہونا۔ جو کچھ بھی ہوں، زبان کا پکا ہوں۔ میں جو جو وچن تمہیں دے رہا ہوں پورے کروں گا۔ تمہارا ہیرو کھیل پر آمادہ ہو جائے گا تو وہ چھوکری رجنی اور یوسف کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہوں گے۔ اور کھیل کے بعد تم تینوں بھی آزاد ہو جاؤ گے۔''

''یہ کیسی آزادی ہے جاوا صاحب! تم جسے کھیل کہہ رہے ہو، وہ موت ہے۔ تم میرے دوست کو مارنے کی بات کر رہے ہو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ہماری آزادی کا کوئی مطلب نہیں ہوگا۔''

''کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے میرے بچے، اپنی جانِ من کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے دوست کے لیے تو کچھ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔''

''اس کو آپ ''کچھ خطرہ'' کہہ رہے ہو۔ یہ تو سراسر خودکشی ہے۔''

وہ سفاک انداز میں مسکرایا۔ ''خودکشیاں ناکام بھی تو ہو جاتی ہیں لیکن جس کو ہم قتل کرتے ہیں، اسے واقعی قتل ہونا پڑتا ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتا رہا۔ پھر گمبھیر انداز میں بولا۔ ''سنا ہے تمہیں درد نہیں ہوتا۔ سلطان چٹا کہہ رہا تھا، تم درد سے بچتے نہیں بلکہ درد کے پیچھے بھاگتے ہو۔ ایسے کام ڈھونڈتے ہو جن میں تمہیں شریر کا دُکھ سہنا پڑے؟''

میں خاموش رہا۔ وہ بولا۔ ''جواب دو...... کیا میں درست کہہ رہا ہوں۔''

''میں خود سے کچھ نہیں کرتا۔ بس میرا مزاج ہی ایسا ہو چکا ہے۔''

''تمہارے جیسے مزاج والے کی ہمارے پاس بڑی ڈیمانڈ ہے۔ یہ کھیل والا معاملہ نمٹ جائے پھر میں تمہارے لیے ایک بڑا اچھا سا کام ڈھونڈوں گا ممبئی میں۔''

''کیا یہ بھی کوئی دھمکی ہے؟''

"نہیں میرے سونو! میرے چندے، یہ تو تمہاری اپنی اکھشا کی بات ہوگی۔ اگر چاہو تو مان لینا۔ ورنہ تمہارا اپنا راستہ ہماری اپنی پگڈنڈی۔ ویسے واقعی کیا تمہیں درد جھیلنے میں شانتی ملتی ہے؟"

"میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں۔"

اچانک اس نے جلتا ہوا سگریٹ میرے سینے پر عین بائیں چھاتی کے اوپر تھوپ دیا۔ قمیص اور بنیان فوراً جل گئی۔ پھر گوشت جلا، سگریٹ بجھ گیا۔ درد کی ایک ناقابلِ بیان لہر میرے پورے جسم میں پھیل گئی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ میں بس خود کو تھوڑا سا پیچھے ہی ہٹا سکا۔

اس نے میرا چہرہ دیکھا۔ "ہاں بھئی میری جانکاری غلط نہیں ہے۔ کچھ بات ہے تمہارے اندر۔"

میری پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا لیکن میں نے کوشش کر کے چہرے کے تاثرات کو نارمل ہی رکھا۔ وہ سفاک درندہ تھا اور میں کراہ کر اس کی سفاکی کو حظ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے دوبارہ ثروت کے پاس پہنچا دیا گیا۔ میرا اسٹیل کا ہینڈ کف کھول دیا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر ثروت کے چہرے پر اطمینان کی ایک نمایاں لہر نظر آتی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں کوئی بات کرتے، میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ عجیب سا نمبر تھا۔ صرف تین ہندسوں کا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے عمران کی زندگی بخش آواز اُبھری۔ "ہیلو...... عمران بول رہا ہوں۔" میرے پورے جسم میں جوش کی لہر دوڑ گئی۔

"کہاں ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"آئی ایم ہیئر ان انڈیا...... تمہارے پاس...... تگڑے ہو جاؤ۔"

"یار! یہ کس نمبر سے بات کر رہے ہو، تین ہندسوں کا نمبر ہے؟"

"یہ "پہیلی نمبر" ہے اور اس کو سمجھنے میں تمہیں کافی وقت لگے گا۔ فی الحال کام کی بات کرتے ہیں۔ میں اس وقت فرید کوٹ پہنچ چکا ہوں۔ تم کہاں ہو؟"

"میں یہیں لنگڑی پورہ گاؤں میں۔ گوبندر کے سسرالی گھر میں۔" میں نے عمران کو اس نئی سم کے بارے میں بھی بتایا جواب میں اپنے فون سیٹ میں ڈالنے والا تھا۔ عمران نے میرا نیا نمبر نوٹ کر لیا۔

"جاوا سے بات ہوئی ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"اس نے رجنی اور یوسف کو چھوڑ دیا ہے لیکن دونوں ابھی تک اس کی نگرانی میں ہیں۔ وہ کہتا ہے، جب ہماری ڈیل فائنل ہو جائے گی، وہ انہیں کہیں بھی جانے کی اجازت دے دے گا۔"

وہ بولا۔ "تابی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں یہ گیم کھیلوں گا۔ میں نے اس ایونٹ کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ تم جاوا سے میری براہِ راست بات کراؤ۔"

"لیکن عمران......"

"نہیں تابی! کوئی سوال جواب نہ کرنا، یہ میری درخواست ہے تم سے۔ بس جو کہتا ہوں، وہ کرتے جاؤ۔ ہمیں جاوا کی شرط قبول ہے۔ کیا تم ابھی اس سے میری بات کرا سکتے ہو؟"

"ابھی تو وہ باہر نکلا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے جیسے ہی وہ یہاں واپس آئے، تم اس سے رابطہ کراؤ۔"

"مگر عمران! یہ بھی تو دیکھو......"

"میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں جگر۔" اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ "جیسا کہتا ہوں، ویسا کرو۔ میں ابھی ایک گھنٹے بعد دوبارہ کال کروں گا۔" اس نے فون بند کر دیا۔

جاوا کہیں نہیں گیا تھا، وہ یہیں تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عمران کیا چاہ رہا ہے۔ وہ ایک ایسی شرط قبول کر رہا تھا جس میں اسّی سے پچاسی فیصد تک جان چلے جانے کا امکان تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ گلے میں جیسے کچھ اٹک کر رہ گیا تھا۔

ثروت میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا تھا کہ ہمارے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ اچانک ثروت کی نظر میرے سینے پر پڑی۔ قمیص اور بنیان جلی ہوئی تھی۔ سینے پر داغے جانے کا تازہ نشان نظر آ رہا تھا۔ "ہائے اللہ! یہ کیا ہوا؟" اس نے کہا۔

پھر میرے بتائے بغیر ہی وہ جان گئی کہ مجھے سگریٹ سے داغا گیا ہے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آئے۔ وہ اینٹی بایوٹک مرہم جو جاوا کے کارندے نے مجھے سر پر لگانے کے لیے دیا تھا، کمرے میں ہی پڑا تھا۔ رُوئی بھی تھی۔ ثروت جلدی سے گئی اور مرہم لے آئی۔

مجھے زخموں کو لا دوا رکھنا آ گیا تھا۔ زخم خود ہی لگتے تھے، خود ہی خراب ہو کر ٹھیک ہو جاتے تھے لیکن آج ثروت مجھے اپنے ہاتھ سے دوا لگا رہی تھی۔ ایسے علاج کے لیے تو میں اپنے پورے جسم کو زخم زخم کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی حنائی انگلی پر مرہم لگایا اور میری جلی ہوئی جلد پر رکھا۔ تاثیر زخم سے روح تک چلی گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔

"درد ہو رہا ہے؟" اس نے مجھے پوچھا۔

"ہاں ثروت! بہت درد ہے۔ سر سے پاؤں تک درد میں ڈوبا ہوا ہوں لیکن مجھے پتا ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں۔ یہ درد...... مجھے اپنے ساتھ قبر میں لے کر جانا ہوگا۔"

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ "آپ میرے دُکھ میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ میں آپ کو منع نہیں کروں گی۔ جو کہنا ہے کہہ لیں۔ میں سب کچھ سہنے کو تیار ہوں۔ میں نے آپ کو بہت دُکھ دیئے ہیں تابش۔ میں اس کا اعتراف کرتی ہوں۔ آپ جو بھی سزا دیں، میرے لیے کم ہے۔"

"دونوں ہی قصوروار ہیں ثروت اور دونوں ہی بے گناہ بھی۔ یہ جرم و سزا کی بات نہیں ہے ثروت! یہ تو وفا اور فنا کی کہانی ہے۔"

"تو پھر دعا کریں، میں فنا ہو جاؤں۔ آپ کے سامنے آپ کے ہاتھوں میں ختم ہو جاؤں۔ جینے میں تو کوئی خوشی نہیں مل سکی، شاید مرنے میں مل جائے۔"

"تم بس مرنے کی بات ہی کیوں کرتی ہو ثروت؟"

"مجھے جینے میں کچھ نظر نہیں آتا تابش! کچھ بھی نہیں۔ میری زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی۔ میری نہ پوری ہونے والی خواہشوں کا وبال میرے آس پاس والوں پر پڑا ہے۔ امی ابو چلے گئے۔ ناصر بھائی چلے گئے اور اب نصر...... نصرت میری زد میں ہے۔"

"نصرت تمہاری زد میں نہیں ہے ثروت! نہیں ہے۔ وہ اپنی بیماری کی زد میں ہے اور یہ بیماری بھی کوئی لاعلاج نہیں ہے۔ نصرت نے ٹھیک ہونا ہے پھر سے ہنسنا بولنا ہے لیکن تم شاید پھر بھی جینا نہ سیکھ سکو۔ پھر کوئی اور واہمہ تمہیں جکڑ لے گا۔ زندگی کی کسی اور دشواری کو تم اپنی طرف منسوب کر لو گی۔ اس گھیرے سے نکلو ثروت! اس جال کو توڑ دو۔ میاں بیوی کا رشتہ بہت مقدس رشتہ ہے۔ اس کا ٹوٹنا بڑی بدقسمتی ہے لیکن جب یہ رشتہ ایک ناقابلِ علاج ناسور بن جائے تو پھر اس کو کاٹ دینا بھی جائز ہے۔ مذہب، معاشرہ، اخلاقیات، سب میں اس کی اجازت موجود ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تابش!"

"نہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ سب کچھ تمہارے سامنے واضح ہے۔ مجھے آج کہنے دو ثروت کہ یوسف نے کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ وہ جرمن بیوی کے عشق میں گرفتار رہا اور اس کی وجہ سے اس نے تم سے قطع تعلق رکھا۔ تمہیں کبھی بیوی سمجھا ہی نہیں۔

جب جرمن لڑکی والا بھوت سر سے اُترا تو اسے ہوش آیا لیکن تب بھی اس نے تم سے محبت نہیں کی، صرف تمہاری قربت کی خواہش کی۔ اسے احساس ہوا کہ ایک خاوند کی حیثیت سے اسے تم سے مستفید ہونا چاہیے۔ مگر اس کے لیے بھی اس نے تادیر انتظار کرنا گوارا نہیں کیا۔ جب تمہاری طرف سے سرد مہری دیکھی تو وہ فوراً دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔"

وہ کراہی۔ "بے شک ان میں غلطیاں ہیں تابش! لیکن...... اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اتنا بڑا فیصلہ کر لیں۔ وہ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ جب خدا انسان سے مایوس نہیں تو ہم اتنی جلدی مایوس کیوں ہو جائیں۔ میں اپنی پوری کوشش کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے......" اس کی آواز بھرا گئی۔

"تم اپنی زندگی کو کانٹوں میں گھسیٹنے کی کوشش کر رہی ہو ثروت! اور ساتھ یہ امید بھی رکھتی ہو کہ کانٹے تمہیں زخمی نہیں کریں گے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ابھی وقت ہے ثروت! کوئی اچھا فیصلہ کر لو۔"

ثروت نے اپنا سر گھٹنوں میں کر لیا اور نفی میں ہلانے لگی۔ وہ جیسے مجھے چپ رہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں چپ ہو گیا۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح گٹھری بنی بیٹھی رہی پھر بولی۔ "میں نے آپ سے کہا تھا، آپ نصرت سے میری بات کروا دیں۔"

میں نے طویل سانس لی۔ "میں جاوا سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن پھر نہیں کی۔ ابھی ہمیں نصرت کو اس معاملے سے الگ رکھنا چاہیے۔ یہ بدترین لوگ ہیں ثروت! ہم نصرت کو ان کی نگاہوں میں کیوں لائیں۔"

وہ میری بات سمجھ گئی اور سر جھکا لیا۔

○......❖......○

نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ عمران کوئی نہ کوئی درمیانی راستہ نکال لے گا۔ وہ کتنا بھی دلیر اور جوشیلا سہی، قسمت اس پر کتنی بھی مہربان سہی لیکن سامنے اندھا کنواں دیکھ کر آنکھیں بند کرنے والا وہ بھی نہیں تھا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی خاص پلاننگ تھی۔ پھر بیٹھے بٹھائے مجھے اچانک راجا یاد آ گیا۔ دل افسردہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ گزرنے والے آخری وقت کے مناظر فلم کی طرح ذہن کے پردے پر چلنے لگے۔ اس کی تیزی طراری، اس کا شاطر انداز اور ہر لمحے زندگی کے چھتے میں سے شہد نچوڑنے کی کوشش کرنا۔ مگر وہ بھول گیا تھا کہ زیادہ شہد کے ساتھ زیادہ زہر بھی ہوتا ہے۔ اسی دوران میں پھر عمران کا فون آ گیا۔ اور اس

نے تمہید میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور بولا۔ ''تابی! میں جاوا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''عمران! میں ایک بار پھر کہوں گا کہ......''

''تم جو کہنا چاہتے ہو، میں سمجھ رہا ہوں۔ تم اس سے میری بات کرواؤ۔''

میں نے جاوا کے کارندے کو آواز دی اور اسے سیل فون تھماتے ہوئے کہا۔ ''بھیا صاحب کے لیے کال ہے، ان کو دو۔''

کارندہ فون لے کر چلا گیا۔ اس کی واپسی ایک گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ فون سیٹ گرم ہو رہا تھا۔ لمبی چوڑی بات ہوئی تھی جاوا کی۔ مجھے اس گفتگو کا کوئی لفظ سنائی نہیں دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی کسی قریبی کمرے سے جاوا کی گونج دار آواز کانوں میں پڑ جاتی تھی۔

اگلے دو تین گھنٹے میں صورتِ حال تیزی سے تبدیل ہوئی۔ پریم چوپڑا نے ہمیں بتایا کہ ہم جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہمیں فرید کوٹ لے جایا جا رہا ہے۔

میں نے اس سے کہا۔ ''جاوا صاحب سے میری بات کرواؤ۔''

وہ مجھے گھور کر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بات نہ کرائے لیکن قریباً پندرہ منٹ بعد جاوا ہماری کھڑکی کے سامنے آیا اور بولا۔ ''ہاں میرے چندا! کیا بات ہے۔ بڑی جلدی اُداس ہو جاتے ہو میرے بغیر۔''

''رجنی اور یوسف کا کیا بنا ہے؟''

''وہ دونوں خوشی کے ڈھول بجا رہے ہیں۔ اپنی مرضی سے کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہیں۔ رجنی اپنے ماموں کے ساتھ کسی دوسرے گاؤں نکل گئی ہے۔ اس لونڈے یوسف کے بارے میں جانکاری ملی ہے کہ وہ دہلی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ وہاں اس کا کوئی مجسٹریٹ دوست رہتا ہے۔''

''ہمیں کیسے یقین آئے گا۔''

''تمہارا وہ لنگوٹیا عمران، ایک دم گرو ہے بلکہ گرو گھنٹال ہے۔ وہ سب جان لے گا اور شاید اب تک جان بھی چکا ہو۔ اس کے ہرکارے بڑے تیز ہیں۔ ایک دم بوگیر کتوں کے مافق۔ تم چنتا نہ کرو۔ وہ تمہیں فون پر ساری رام کہانی سنا دے گا۔ تم بس چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ زبردست قسم کا موج میلا کرائیں گے تمہیں۔''

○......✥......○

ہم اس مکان سے نکل کر ہائی روف گاڑی میں آ بیٹھے۔ یہ گاڑی باہر سے جتنی خوبصورت تھی، اندر سے بھی اتنی ہی آرام دہ تھی۔ مجھے ایک بار پھر اُلٹی ہتھکڑی لگا دی گئی تھی۔

اوپر سے چادر کی بکل ماردی گئی تا کہ ہتھکڑی نظر نہ آئے۔ ثروت بھی سرتاپا ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ فقط اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں گاڑی کی درمیانی نشستوں پر بٹھایا گیا۔ عقب میں دو مسلح افراد بالکل چوکس حالت میں موجود تھے۔ ہمارے سامنے فرنٹ سیٹ پر پریم چوپڑا خود موجود تھا اور وہ بھی مسلح تھا۔ مزاحمت کی گنجائش زیرو فیصد تھی۔ ہمارے آگے ایک کار تھی جس میں جاوا کے مسلح ڈشکرے بھرے ہوئے تھے۔ عقب میں لگژری جیپ تھی۔ اس جیپ میں جاوا کے علاوہ چودھری انور گنجا اور شاربہ بائی بھی موجود تھے۔

گاؤں میں ہُو کا عالم تھا۔ حالانکہ یہ سہ پہر تین چار بجے کا وقت تھا مگر کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ گھروں کی کھڑکیاں دروازے بند تھے، گلیاں سنسان نظر آ رہی تھیں۔ گاڑیاں روانہ ہوئیں تو میں نے مڑ کر اس چار دیواری کو دیکھا جہاں ہم نے چند نہایت بُرے دن گزارے تھے۔ اسی چار دیواری میں آشا کور ہنستی کھیلتی داخل ہوئی اور لاش بن گئی۔ جواں سال کھلاڑی گوبندر بھی یہیں پر موت کے گھاٹ اُترا۔ ہم ابھی زندہ تھے لیکن یہ زندگی کب تک ساتھ دے گی، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جاوا اور اس کے کارندے میری توقع سے بڑھ کر خطرناک تھے۔ بندے کو چیونٹی کی طرح مسل دینے کا محاورہ میں نے کئی بار سنا تھا مگر اس محاورے کی عملی شکل پہلی بار یہاں دیکھی تھی۔

نہ جانے کیوں بار بار اس نوجوان سائیں کی شکل میری نگاہوں میں گھوم جاتی تھی جو ہمیں ہارون آباد کے ہوٹل میں ملا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ماورائی چمک ذہن میں آتی تھی اور اس کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔ اس نے ثروت کو خاص طور پر نشانہ بنایا تھا اور کہا تھا کہ ساری مصیبت کی شروعات اسی سے ہوئی ہے، اس نے موت کا اور قبروں کا ذکر کیا تھا۔

ہمارا قافلہ دھول اُڑاتا، لنگڑی پورہ سے ''انڈین پنجاب'' کے معروف شہر فرید کوٹ کی طرف روانہ ہوا۔ ہم کچے اور نیم پختہ راستوں سے گزر رہے تھے۔ ہمارے اطراف میں کماد اور چاول کے کھیت تھے۔ باغ تھے اور پگڈنڈیاں تھیں۔ کہیں کہیں کاشت کار مرد و زن بھی دکھائی دیتے تھے۔ پس منظر میں مویشیوں کے ریوڑ تھے اور مغرب کی طرف جھکتا سورج تھا۔ دیہی زندگی اپنی مخصوص آہستہ روی کے ساتھ متحرک تھی۔ مگر اس ہائی روف گاڑی کے اندر کی دنیا بالکل مختلف تھی۔ یہاں خوف کے سائے تھے اور تناؤ کی حکمرانی تھی۔ ہم انڈیا کے کچھ خطرناک ترین لوگوں کے نرغے میں تھے۔ سفر بالکل خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔

اچانک میری آنکھوں کے سامنے برق سی کوندی گئی۔ ہمارے سامنے ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ میں نے بہت سی مٹی فضا میں اُچھلتے دیکھی۔ دوسرا دھماکا سامنے جانے والی کار کے

عین سامنے ہوا۔ کار بُری طرح اُچھلی۔ میں نے اس کے بونٹ کو فضا میں اُڑتے اور انجن کو آگ پکڑتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی آٹو میٹک رائفل کا طویل برسٹ چلا۔ کار کی بائیں جانب کے شیشے چکنا چور ہوگئے۔

ثروت چلا اُٹھی اور اس نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دونوں مسلح افراد ہمارے عقب میں چوکس بیٹھے رہے تاہم پریم چوپڑا اپنا مشین پسٹل نکالتا ہوا گاڑی سے اُتر آیا۔ اُترتے ساتھ ہی چوپڑا کو مچھلی کی طرح پٹ سے کچی زمین پر گرنا پڑا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے سر پر سے گزر گئی تھیں۔

اور یہی وقت تھا جب میں نے اپنے میزبان جگت سنگھ کو دیکھا۔ وہ ایک درخت کی اوٹ سے نکلا۔ اس کا چوڑا سینہ دیوار نظر آ رہا تھا۔ اس کی نیلی پگڑی کے نیچے اس کا چہرہ غیظ و غضب کی تصویر تھا۔ اس نے بالکل سامنے آ کر ایک پورا برسٹ کار پر چلایا اور کم از کم دو کار سواروں کو چھلنی کر دیا۔ اس کی للکار گونجی۔ ''ماردوں گا......فنا کردوں گا۔''

گاڑی میں بچ جانے والے افراد چھلانگیں لگا کر باہر نکلے اور مختلف درختوں کی آڑ لی۔

جگت کے ساتھیوں نے فلک شگاف نعرہ لگایا۔ ست سری اکال...... جو بولے سو نہال۔

تب میں نے جگت سنگھ کو اپنا بازو فضا میں لہراتے دیکھا۔ ایک سیکنڈ بعد کار سے چند میٹر دور ایک اور زبردست دھماکا ہوا۔ گرد و غبار کے ساتھ ہی جاوا کا ایک اور کارندہ ہوا میں اُچھلا اور چاول کے ہرے کھیت میں گرا۔ میں سمجھ گیا کہ جگت سنگھ اور اس کے ساتھی وہی ''کالے انار'' چلا رہے ہیں جن کا ذکر جگت نے فون پر کیا تھا۔ جگت کی رکھیل محبوبہ آشا کور ماری جا چکی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی گوبندر بھی موت کے گھاٹ اُتر گیا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ جگت سنگھ ان اندوہناک خبروں سے آگاہ ہو چکا ہے اور اب سرتاپا قہر ہے۔

ان لوگوں نے ہماری گاڑی کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس گاڑی میں ہماری موجودگی کے بارے میں جانتے ہیں۔ میرے ہاتھ عقب میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اگر ثروت میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ضرور مزاحمت کرتا۔ موجودہ صورتِ حال میں یہ خودکشی کے زمرے میں آرہا تھا کم از کم ابھی تو یہ خودکشی ہی تھی۔ پھر میں نے اس پُرانی فوجی جیپ کو دیکھا جو لہراتی ہوئی ہماری گاڑی کے قریب آئی۔ اس میں اُبھرے رُخساروں اور گھنی مونچھوں والا ایک جواں سال شخص موجود تھا۔ یہی جگت سنگھ کا ساتھی پرتاب سنگھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے۔ اس کے تاثرات سے عیاں تھا کہ وہ لوگ ہمیں یہاں سے چھڑا کر لے جانے کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں۔ اب ضروری تھا کہ موقع محل دیکھ

کر ہم بھی ہاتھ پیر ہلائیں۔

ایک گولی ہائی روف کی پچھلی اسکرین توڑتی ہوئی آئی اور ہمارے ایک نگران کے کندھے میں لگی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ گالی نکلی اور وہ تکلیف کی شدت سے نیچے جھک گیا۔ ہم دونوں بھی جھک گئے تاکہ دوطرفہ فائرنگ کی زد سے محفوظ رہیں۔ نیچے جھکے جھکے میں نے دستی بم کے ایک اور دھماکے کا منظر دیکھا۔ کار کے اگلے حصے کے پرخچے اُڑ گئے اور وہ پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔

تیسری گاڑی یعنی جاوا والی لگژری جیپ ہمارے پیچھے کچھ فاصلے پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ آگے کا حال دیکھ کر یہ جیپ دور ہی رُک جائے گی۔ اس میں جاوا، چودھری انور اور شاربہ بائی تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ جیپ سیدھی آگے بڑھتی آئی۔ پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ مجھے حیرت کا دوسرا دھچکا لگا۔ جیپ کی کھڑکیاں محفوظ رہیں۔ یہ بلٹ پروف جیپ تھی۔ بکتر بند کی طرح اس کی باڈی کو شاک پروف بھی بنایا گیا تھا۔ اس کا ثبوت ''کالے انار'' کے ایک اور دھماکے سے ہوا۔ یہ دھماکا جیپ کے بالکل نزدیک ہونے کے باوجود اسے آگ لگانے یا کوئی نقصان پہنچانے میں ناکام ہوا۔

جیپ دندناتی ہوئی ان دو افراد پر چڑھ دوڑی جو کاندھے سے کندھا ملائے فائرنگ کر رہے تھے۔ جیپ انہیں روندتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی چھت کا چوکور خلا یعنی سلائیڈنگ سن روف اوپن ہوا۔ اس میں سے ایک شخص کا بالائی دھڑ نمودار ہوا۔ میں نے گرد و غبار میں دیکھا۔ یہ جاوا کا سب سے خطرناک رائفل بردار نریندر کمار ہی تھا۔ اس نے جگت کے ساتھیوں پر آٹو میٹک رائفل سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ نریندر بہترین پوزیشن میں تھا۔ پلک جھپکتے میں جگت کے دو ساتھی شدید زخمی ہو کر گر گئے۔ تیسرا زخمی ہو کر بھاگا لیکن کسی اور طرف سے آنے والی گولیوں نے اسے بھی اوندھے منہ گرا دیا۔

ایک دم ہی پانسا پلٹا ہوا نظر آیا۔ جاوا کی بلٹ پروف گاڑی کی آڑ لے کر اس کے ساتھیوں نے اندھا دھند فائرنگ کی۔ جگت کے ساتھی بے حد پُرجوش ہونے کے باوجود اس ہلّے کو جھیل نہیں سکے۔ میں نے جگت کے ایک اور ساتھی کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ جگت سنگھ نے خود بھی پسپائی اختیار کی۔ وہ ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر بھاگا۔ جاوا کی جیپ نے اس کا پیچھا کیا۔ شاید وہ لوگ اسے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ غالباً ان کی یہی خواہش جگت سنگھ کی زندگی کا بہانہ بن گئی۔ وہ اکا دُکا فائر کرتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اس کی سفید دھوتی ہوا میں پھڑپھڑاتی نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ برق رفتاری سے درختوں اور جھاڑیوں کے ایک گھنے جھنڈ

میں داخل ہو گیا۔ جاوا کی جیپ رُک گئی۔ پیچھا کرنے والے پیادے بھی رُک گئے۔ وہ جھنڈ میں داخل نہیں ہو رہے تھے۔ بس فاصلے سے فائرنگ کر رہے تھے۔ جھنڈ ایک ڈیک نالے کے عین کنارے پر تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ جگت جھنڈ میں نہیں ہے۔ وہ شام کی نیم تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر نالے میں کود چکا ہے۔ میرے دل کی گواہی بعد میں بالکل درست ثابت ہوئی۔ جگت رواں دواں نالے میں کودا تھا۔ زخمی حالت میں۔

اس زور دار اور خونی جھڑپ نے اردگرد کے کاشت کاروں اور راہ گیروں کو موقع پر جمع کر دیا تھا مگر وہ دور دور کھڑے رہے۔ قریب آنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ یقیناً یہ مقامی لوگ آج کل جاوا گروپ کی گاڑیوں کو اچھی طرح جان پہچان رہے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ گاڑیاں آج کل یہاں کیا گل کھلا رہی ہیں۔

جتنے زور دار دھماکے یہاں ہوئے اور جتنی شدید فائرنگ ہوئی تھی، پولیس کو بھی یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن پولیس تو اسی وقت آ سکتی تھی جب جاوا کی اجازت ہوتی...... عین ممکن تھا کہ جاوا نے فون پر ہی انہیں ''دخل در معقولات'' سے منع کر دیا ہو۔

ثروت دم بخود بیٹھی تھی۔ آج کل وہ موت کو بہت قریب سے دیکھ رہی تھی اور وہ بھی ایسے انداز میں جس کا اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ اس خون ریز لڑائی میں جاوا گروپ کے دو بندے جان سے چلے گئے تھے۔ دو تین کو زخم آئے تھے۔ جگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا زیادہ نقصان ہوا تھا۔ دو افراد کی لاشیں ہم سے چند میٹر کے فاصلے پر پڑی تھیں۔ تین چار افراد شدید زخمی حالت میں فرار ہوئے۔ جیپ کے نیچے کچلے جانے والے ایک نیم مردہ شخص کو اس کے ساتھی اُٹھا کر درختوں میں غائب ہوئے تھے۔

بالکل آخر میں زخمی ہونے والے شخص کو پکڑ لیا گیا۔ اس کی ٹانگ میں شاٹ گن کے موٹے چھرے لگے تھے۔ یہ چوڑے چہرے والا جگت کا قریبی ساتھی پرتاب تھا۔ ایک اور نوجوان لڑکے کو بھی پکڑا گیا، اس کی عمر بمشکل انیس بیس سال رہی ہو گی۔ اس کی باریک مونچھیں اوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے بسنتی رنگ کا چولا پہن رکھا تھا۔ ''جو بولے سونہال'' کا نعرہ لگانے والوں میں وہ پیش پیش تھا۔

اپنے ساتھیوں کی لاش دیکھنے کے بعد جاوا غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا پستول نکال کر نوجوان لڑکے کے سر پر رکھ دیا اور دو تین منٹ کے اندر اس سے پوچھ لیا کہ حملہ کرنے والے کون تھے اور ان کا مقصد کیا تھا۔ نوجوان کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس نے جگت سنگھ کا نام بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ جگت کے چھوٹے بھائی گوبند سنگھ اور اس کی

بیوی آشا کی ہتھیا کا بدلہ لینے کے لیے حملہ آور ہوئے تھے۔ نوجوان کا نام دیپک سنگھ تھا۔ جاوا کی قہرناک صورت دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر دیپک کا مورال ڈاؤن سے ڈاؤن ہوتا چلا جا رہا تھا۔ غالباً اس نے اس مشہور ڈان کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اب وہ اس کے رُوبرو تھا اور اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ جاوا کے حکم پر زخمی پرتاب کو ہمارے والی گاڑی میں بٹھا دیا گیا جبکہ نوجوان دیپک کے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف رسّی سے باندھ دیئے گئے۔ سرخ نائلون کی یہ رسّی پندرہ بیس فٹ لمبی تھی۔ اس کا دوسرا سرا جاوا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ زہرخند انداز میں بولا۔ ''میرے چندا! گاڑیوں کے اندر جگہ کم ہے۔ تمہیں ذرا کٹھنائی (دشواری) تو ہو گی لیکن تمہیں ہمارے ساتھ بھاگ کر جانا پڑے گا۔''

اس نے رسّی کا دوسرا سرا اپنی جیپ کے عقب میں موجود آہنی حلقے میں بندھوا دیا۔

نوجوان نے منت کے انداز میں کہا۔ ''میرا دوش نہیں ہے۔ میں جگت سنگھ کے دوست کا دوست ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے کھل کر کچھ نہیں بتایا جی۔ بس اتنا کہا کہ ایک پُن کا کام ہے۔''

''تو ہم کون سا پاپ کا کام کر رہے ہیں بچے! یہ بھی پن کا کام ہی ہے۔ فرید کوٹ پہنچ کر تمہاری خاطر داری کریں گے۔ بڑا موج میلا ہونا ہے وہاں۔ پر شرط یہی ہے کہ تم فرید کوٹ پہنچ جاؤ۔'' جاوا کا لہجہ سفاک تھا۔

اسی دوران میں پریم چوپڑا جو موبائل فون سن رہا تھا، جاوا کے قریب آ کر بولا۔ ''بھیا جی! انسپکٹر چاؤلہ کا فون آیا ہے۔ پولیس موقع پر آ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم یہیں رہو۔ دو تین لڑکے بھی ساتھ ہی رکھو۔ ہم جا رہے ہیں۔''

نوجوان نے ایک بار پھر منت سماجت کی مگر جاوا اپنے کان بند کر چکا تھا۔ وہ جیپ میں بیٹھ گیا۔ چودھری انور اور شاربہ بائی بھی بیٹھ گئے۔ جیپ روانہ ہو گئی۔ نوجوان دیپک جیپ کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ ہماری ہائی روف، جیپ کے عقب میں تھی۔ جاوا کے خونخوار کارندوں نے زخمی پرتاب کے ہاتھ عقب میں باندھ دیئے تھے اور اسے ہائی روف کی پچھلی سیٹوں کے درمیانی خلا میں کسی بھیڑ بکری کی طرح ٹھونس دیا تھا۔ وہ گاہے بگاہے اسے گالیاں دے رہے تھے اور اس کی پیٹھ پر تھپڑ بھی رسید کر رہے تھے۔ وہ پوری طرح اس پر حاوی ہو چکے تھے۔

دونوں گاڑیاں گہری تاریکی میں اونچے نیچے راستوں پر چلتی رہیں۔ رفتار زیادہ نہیں تھی۔ دیپک اب ہانپنا شروع ہو گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ شاید اسے اچھی طرح تھکانے کے

بعد اس کی سزا موقوف کر دی جائے گی اور اسے ہمارے والی گاڑی میں بٹھا لیا جائے گا لیکن اگلے آدھ گھنٹے کے اندر جاوا کی سفاکی بالکل کھل کر سامنے آ گئی۔ جیپ نہیں روکی گئی۔ دیپک اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔ اس کے بھاگنے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ بُری طرح ہانپ چکا ہے اور اس کی ٹانگیں شل ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ بھاگتے بھاگتے کچھ بول بھی رہا تھا۔ شاید خود کو باندھنے والوں سے رحم کی درخواست کر رہا تھا۔ یا اس قسم کی کوئی اور بات کر رہا تھا۔ مگر اس کی آواز جیپ سواروں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے کھڑکیاں چڑھا رکھی تھیں۔ مظلوموں کی آہ و بکا کے لیے یہ کھڑکیاں ہمیشہ سے چڑھی رہتی ہیں۔ زندگی کے لیے بھاگنے والے، ہانپتے ہوئے اور زخموں سے چُور لوگ پکارتے رہتے ہیں، چلا چلا کر بتاتے رہتے ہیں کہ وہ موت کی دہلیز پر ہیں، وہ مر جائیں گے مگر یہ کھڑکیاں نہیں کھلتیں۔ اندر بیٹھے ہوئے فرعون اپنے ماحول میں مست رہتے ہیں۔ اندر اور باہر کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق اس دنیا کو بدصورت بنا رہا ہے۔ اُجاڑ رہا ہے۔

دیپک بھی بھاگتا رہا، لڑکھڑاتا رہا۔ شاید اب وہ بولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ ایک ہلکی سی...... معمولی سی ٹھوکر بھی اسے گرا سکتی تھی۔ نائیلون کی سرخ رسی کو لگنے والا ایک ذرا سا جھٹکا بھی اسے زمین بوس کر سکتا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس کے ہاتھوں کی رسی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ گر گیا۔ طاقتور جیپ نے اسے کھینچنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی۔ وہ اسے کھینچتی گئی، گھسیٹتی گئی۔ ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں دیپک کا المناک انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دھول اور خون میں لتھڑتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کس وقت مرا؟ اس کا اندازہ نہیں ہوا لیکن یقیناً اس کی موت المناک تھی۔ کچھ دیر بعد جیپ کی ایک عقبی کھڑکی کھلی، کسی نے ہاتھ باہر نکالا۔ ہاتھ میں کوئی تیز دھار چیز تھی۔ چلتی گاڑی میں سے ہی نائیلون کی رسی کاٹ کر دیپک کو ''آزاد'' کر دیا گیا۔

ان لوگوں کی دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ انہوں نے ایک جیتے جاگتے شخص کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا تھا اور اس کی لاش کو سرِ راہ پھینک کر جا رہے تھے۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

O....❖....O

فرید کوٹ انڈین پنجاب کا ایک درمیانے سائز کا قصبہ ہے۔ اس کی آبادی لگ بھگ چھ لاکھ ہو گی۔ اس کا نام بابا فرید گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ مجھے جگت سنگھ سے معلوم ہوا تھا کہ سکھوں کی مذہبی کتابوں میں بابا فرید کے صوفیانہ اشعار موجود ہیں۔ فرید

کوٹ کی سڑکیں زیادہ کشادہ نہیں تھیں۔ ہمیں سفر کے دوران میں بلند و بالا عمارتیں بھی دکھائی نہیں دیں۔ ہمیں شہر کے مضافات میں ایک ایسی کوٹھی میں لایا گیا جس کی چار دیواری دس فٹ سے زیادہ اونچی تھی اور اس کے اوپر خاردار تار کے چھلے تھے۔ کوٹھی کا رقبہ دو کنال کے لگ بھگ تھا۔ دوسری منزل کی چھت پر ایک بہت بڑی سرچ لائٹ دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگا جیسے ہم کسی رہائشی عمارت کے بجائے کسی سفارت خانے کی بلڈنگ میں گھس رہے ہیں۔ دو باوردی مسلح افراد نے آہنی گیٹ کھولا اور ہم ڈرائیو وے سے گزر کر وسیع پورچ میں رُک گئے۔
یہ عمارت باہر سے تو عام ہی لگ رہی تھی لیکن اندر سے اسے جدید انداز میں سجایا گیا تھا اور خوب سجایا گیا تھا۔ کئی کمروں کی دیواریں اور فرش بھی شیشے کے تھے۔ ایک راہداری کے بلوری فرش کے نیچے ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ اس میں نارنجی اور زرد رنگ کی مچھلیاں شفاف پانی میں تیرتی نظر آ رہی تھیں۔

ایک نہایت فربہ اندام شخص نے جاوا کا استقبال کیا۔ اس شخص نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر تلک اور کانوں میں طلائی بالیاں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس درمیانی عمر کے شخص کی کمر کا گھیرا کسی صورت بھی سات آٹھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے سفید گوشت کا پہاڑ ریان ولیم یاد آ گیا۔ تاہم ریان ولیم اتنا ہی موٹا ہونے کے باوجود قدرے چست اور تندرست نظر آتا تھا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں۔ چوبیس پچیس سال کی ایک دبلی پتلی اسمارٹ لڑکی اس دیو کے پہلو میں تھی۔ جیسے کے بعد میں معلوم ہوا یہ اس کی دھرم پتنی امریتا سنگھ تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ دولت سے بہت کچھ خریدا جا سکتا ہے۔

فربہ اندام شخص نے ہاتھ جوڑ کر جاوا کو نمستے کیا پھر ہاتھ ملایا۔ وہ بڑے غور سے مجھے اور ثروت کو گھور رہا تھا۔ ''تو یہ ہیں ہمارے مہمان۔'' اس نے قدرے باریک آواز میں کہا۔
''ہاں لیکن اتنا مت گھورو۔ یہ تین چار ہفتے یہاں رہیں گے۔ شانتی سے دیکھتے رہنا۔'' جاوا نے کہا۔

ہمیں ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چوکور کمرا اسی طرح لوگوں کو بند کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کا اسٹیل کا دروازہ بڑا مضبوط تھا اور سلائیڈ کر کے کھلتا تھا۔ دروازے کے علاوہ کمرے میں فقط ایک راستہ اور تھا۔ یہ ایک فٹ ضرب دو ڈھائی فٹ کی ایک مختصر سی کھڑکی تھی۔ یہ بھی سلائیڈنگ تھی۔ اس میں سے ''بند افراد'' کو کھانا وغیرہ پہنچایا جاتا تھا۔ کمرے میں ایک ہی بڑا بیڈ موجود تھا۔ فرش پر قالین اور ایک الماری بھی تھی۔ اٹیچ باتھ

روم کا دروازہ الماری کے بالکل ساتھ تھا۔ دروازے کے اوپر ایک مائیک کی جالی نظر آتی تھی۔

ہمیں کمرے میں پہنچا کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ چند سیکنڈ بعد مختصر کھڑکی کھلی۔ نریندر نے چابی اندر پھینکی اور ثروت سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔ ''اس کی کڑی کھول دو۔''

ثروت نے تھوڑی سی کوشش کے بعد میری ہتھکڑی کھول دی۔ مختصر کھڑکی نما خلا بلند ہو گیا۔

ثروت نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کر دیا۔ اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ یہاں مائیکروفون بلکہ کیمرا وغیرہ بھی موجود ہو۔ میں نے بڑی احتیاط سے کمرے کا جائزہ لیا۔ تاہم مائیک کی جالی کے علاوہ کوئی شے نظر نہیں آئی۔ فقط دو انچ قطر کا ایک سوراخ دکھائی دیا جس میں شیشہ لگا تھا۔ غالباً اس شیشے کا مقصد وقتاً فوقتاً کمرے میں جھانکتے رہنا تھا۔

اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ راستے میں دیکھے جانے والے خونی مناظر کی وجہ سے ثروت بالکل گم صم نظر آتی تھی۔ ابھی اس نے نوجوان دیپک کے جیپ کے پیچھے گھسٹنے اور مرنے کا منظر نہیں دیکھا تھا ورنہ اس کے اعصاب پر مزید بُرا اثر پڑتا۔ اچانک موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ وہی تین فگرز والا نمبر تھا۔

عمران کی توانا آواز اُبھری۔ ''ہیلو جگر! کیا رومانی سین چل رہا ہے؟''

''بکواس بند کرو۔ راستے میں بڑی مارا ماری ہوئی ہے۔ ابھی تک آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ثروت کے ساتھ مارا ماری ہوئی ہے لیکن وہ تو ایسی نہیں لگتی۔ تم نے ضرور کوئی بے ہودگی کی ہو گی۔''

''عمران! میں تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔ تمہیں بالکل بے وقت کی شوخیاں سوجھ رہی ہیں۔ راستے میں بڑی سخت لڑائی ہوئی ہے۔ دستی بم پھینکے گئے ہیں۔ آٹو میٹک رائفلوں سے دس پندرہ منٹ فائرنگ ہوئی ہے۔ کم از کم پانچ بندے جان سے گئے ہیں۔''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''یار! پتا ہے مجھے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جہاں یہ جاوا صاحب تشریف فرما ہوتے ہیں، وہاں اس طرح کے کرنتو شالے یعنی لفڑے ہوتے رہوت ہیں۔ آگے آگے دیکھنا ہووت ہے کیا؟''

''یار! میں جگت کی طرف سے پریشان ہوں۔ یہ لوگ اس کو مار ڈالیں گے۔ تم کچھ کر سکتے ہو؟''

''فی الحال تو دعا ہی کر سکت ہوں بھیا! میرا سارا گیان دھیان تمہاری اور ثروت کی طرف ہے۔ پہلے تمہیں اس جالو بھر شاٹ سے نکال لوں۔ جالو بھر شاٹ سمجھت ہو نا تم؟ پرانی ہندی کا شبد (لفظ) ہے۔''

اس پر پھر خود ساختہ ہندی کا بھوت سوار تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! میری ایک بات دھیان سے سنو۔ تم نے کہا تھا کہ ہم اس کا کوئی حل نکالیں گے۔ میرا مطلب ہے اس ریوالور والے منحوس کھیل کا۔ لیکن اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم یہ کھیل کھیلنے کے لیے تیار ہو۔ یہ دیوانے پن کے سوا کچھ نہیں عمران۔ میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔''

''اور میں تمہیں اس بارے میں کوئی بحث نہیں کرنے دوں گا۔ میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ اس بارے میں تم ایک لفظ بھی نہیں بولو گے۔ ورنہ میں تمہیں فون نہیں کروں گا اور میں تمہاری ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ رہا ہوں۔''

عمران کا لہجہ بے حد سنجیدہ اور حتمی تھا۔ شاید اس کے پیچھے کوئی راز تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے کہا۔ ''عمران! ثروت کئی دن سے نصرت کے لیے بہت پریشان ہے۔ کیا کسی طرح نصرت سے اس کی بات نہیں ہو سکتی؟''

''ہاں...... اس طرح کی فرمائش کرو جو میں پوری بھی کر سکوں۔ اپنا شیخ لاہور میں ہی ہے۔ میں اس سے رابطہ کرتا ہوں۔ وہ کچھ نہ کچھ کر لے گا۔''

''کیا تم یہاں نہیں آؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں لیکن گھبراؤ مت، تمہارے آس پاس ہی رہوں گا اور وقتاً فوقتاً تم سے فون پر رابطہ بھی رکھوں گا۔''

''ہمیں کتنے دن یہاں اور رہنا پڑے گا؟''

''ایک نمبر کے چغد ہو تم۔'' وہ آواز دبا کر بولا۔ ''دیکھو قدرت نے کتنا نرالا موقع فراہم کیا ہے تمہارے لیے۔ ثروت اور تم ایک جگہ ہو بلکہ ایک ہی کمرے میں۔ یہ سچویشن شریف ترین ہیرو شاہ رخ کو بھی جوہی چاولہ یا کاجل وغیرہ کے ساتھ ملی ہوتی تو انڈیا کی فلمی تاریخ کیا سے کیا ہو گئی ہوتی۔ تم پتا نہیں کس مٹی کے بنے ہوئے ہو۔''

موبائل کے اسپیکر سے ہلکی سی آواز نکل کر کمرے میں پھیل رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ آواز ثروت کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ میں نے کہا۔ ''اول نمبر کے خبیث ہو تم۔'' اور فون بند کر دیا۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ نصرت سے رابطہ کرانے والا وعدہ عمران دو تین دن سے پہلے

پورا کر سکے گا۔ وہ خود بھی انڈیا میں تھا مگر اس کے ہاتھ واقعی لمبے تھے۔ اپنے ذرائع سے وہ بہت جلد اپنے مقررہ ہدف تک پہنچ جاتا تھا۔ شاید سلطان، چٹا وغیرہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ عمران کا قریبی دوست ہونے کے باوجود میں کئی پہلوؤں سے اسے نہیں جانتا تھا۔ اس کی زندگی کے کئی تاریک گوشے بھی موجود تھے۔

اگلے ہی روز دوپہر سے پہلے ایک کال موصول ہوئی۔ یہ پاکستان کا نمبر تھا۔ پہلے جیلانی (شیخ) کی آواز اُبھری۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا اور رسمی کلمات ادا کیے پھر بولا۔

''لو تابش صاحب! نصرت بہن سے بات کرو۔''

''ہیلو تابش بھائی!'' نصرت بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہیلو نصرت! تم ٹھیک ہونا؟''

''میں تو ٹھیک ہوں لیکن یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں آپ لوگ؟ اور باجی کہاں ہیں؟ میں دن رات ان کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا میرے ساتھ۔''

''ہم بالکل خیریت سے ہیں نصرت اور ثروت بھی بالکل خیریت سے ہے۔ بس ایک معاملے میں پھنس گئے تھے ہم۔ لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ بہت جلد تم ہمیں اپنے پاس دیکھو گی۔ ہوسکتا ہے کہ یوسف ہم سے پہلے ہی تم تک پہنچ جائے۔''

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''وہ پہنچ چکا ہے تابش بھائی! وہ پرسوں شام ہی آ گیا تھا۔'' نصرت کے لہجے میں یوسف کے لیے بیگانگی اور تلخی تھی۔

''وہ خیریت سے ہے نا؟''

''وہ تو خیریت سے ہے لیکن...... وہ دوسروں کی خیریت کو برباد کر رہا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے ذرا چونک کر پوچھا۔

''بس کچھ نہیں۔ آپ پہلے ہی پریشان ہیں۔''

''نہیں نصرت! مجھے بتاؤ۔ میں نے اسی لیے تو تم سے فون کرایا ہے۔ ہم تمہارے بارے میں جاننا چاہ رہے ہیں؟''

ذرا توقف کے بعد نصرت بولی۔ ''تابش بھائی! یہاں وہی کچھ ہو رہا ہے جو میں بار بار باجی سے کہہ چکی ہوں۔ آپ باجی کو نہ بتایئے گا لیکن یہاں یوسف نے وہی کیا ہے جس کی اس سے توقع تھی۔''

''کھل کر بتاؤ نصرت۔''

وہ سسکنے لگی۔ ''تابش بھائی! چندروز سے گھر کے نمبر پر پھر اسی خبیث جرمن، گریس کے فون آ رہے ہیں۔ کل رات پھر فون آیا ہوا تھا۔ یوسف اس سے بڑی دیر باتیں کرتا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں میں پھر صلح ہو رہی ہے۔ میں نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ان دونوں کی کچھ باتیں سنی ہیں۔ یوسف کو شک ہوا۔ اس نے کھڑکی کھول کر مجھے دیکھ لیا۔ سخت بُرا بھلا کہا۔ اسی وقت گھر سے نکل جانے کو کہا۔ میں قدرت اللہ صاحب کے آستانے پر آ گئی ہوں۔ اس وقت وہیں سے بول رہی ہوں۔ میں نے چھوڑ دیا ہے اس کا گھر۔''

میں حیران رہ گیا۔ یوسف کے حوالے سے ایسی خبر کی توقع مجھے نہیں تھی۔ جرمن بیوی کے پھر سے رابطے والی بات بھی غیر متوقع ہی تھی لیکن نصرت جو بتا رہی تھی، وہ یقیناً سچ تھا۔

نصرت سسکتے ہوئے بولی۔ ''تابش بھائی! آپ لوگ جلدی آ جائیں۔ آپ جسے ڈھونڈنے نکلے تھے، وہ تو یہاں دندنا رہا ہے اور آپ ابھی تک نہ جانے کہاں ہیں۔ یہ ٹھیک بندہ نہیں ہے تابش بھائی! اب کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اس نے کل رات بڑی بدتمیزی کی ہے۔ باجی کے لیے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ وہ سن لیں تو رو رو کر بُرا حال کر لیں۔ اسے باجی پر بالکل بھروسہ نہیں۔ وہ آپ کے لیے بھی بہت غلط سوچ رکھتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اگر اب بھی باجی کی آنکھیں نہیں کھلیں گی تو کب کھلیں گی۔ آپ انہیں سمجھائیں تابش بھائی! اب تو ہوش میں آ جائیں۔''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا نصرت۔''

''آپ باجی کو فون دیں۔ کہاں ہیں وہ؟''

''لیکن تم کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرو گی۔''

میں نے فون ثروت کو تھما دیا۔ ان کی گفتگو شروع ہوئی تو طویل ہوتی چلی گئی۔ نصرت نے گو مجھ سے کہا تھا کہ وہ ثروت کو مزید پریشان نہیں کرے گی لیکن جب دونوں بہنوں نے دُکھ سکھ شروع کیا تو وہ کچھ بھی چھپا نہیں سکی۔ میں نے ثروت کی آنکھوں سے آنسو رِستے دیکھے اور اس کے چہرے کو رنج والم کے رنگ اوڑھتے دیکھا۔ یہ اطلاع ثروت کے لیے یقیناً تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی کہ یوسف اسے نہ صرف یہاں چھوڑ کر پاکستان واپس جا چکا ہے بلکہ نصرت سے سخت جھگڑا بھی کر چکا ہے۔

کچھ دیر بعد نامعلوم وجہ سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ثروت کچھ دیر ہیلو ہیلو کرتی رہی پھر فون مجھے تھما کر بستر پر دراز ہو گئی۔ اس نے بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

○......❖......○

ہم اسی کمرے میں بند تھے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ فرید کوٹ کی اس رہائشی عمارت کے اندر اور عمارت سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ فقط اس چھوٹے سے خلا کے ذریعے تھے۔ اسی میں سے کھانے کی ٹرے اندر آتی تھی اور دیگر ضروریات بشمول لباس وغیرہ ہمیں مہیا ہوتی تھیں۔ جاوا سمیت کسی نے بھی ہم سے رابطہ نہیں کیا۔ پچھلے قریباً اڑتالیس گھنٹے پہلے عمران کا فون آیا تھا اور نہ نصرت کی طرف سے کال ہوئی تھی۔ میں جگت کے لیے پریشان تھا مگر اس کی طرف سے کوئی اطلاع مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس نے ایک سچے خالصے کی طرح بڑی بے جگری سے جاوا کے قافلے پر حملہ کیا تھا۔ اس کی دلیری اور ہمت پر کوئی شک نہیں تھا لیکن جاوا جیسے بدنام زمانہ بدمعاش کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چل سکی تھی۔

یہ دوسری تیسری رات کا واقعہ ہے۔ ثروت نے میرے سینے کے زخم کی مرہم پٹی کی اور اصرار کر کے اینٹی بائیوٹک دوا بھی کھلائی۔ پھر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میں نے اسے بہت کہا تھا کہ وہ بستر پر سو جایا کرے لیکن گاؤں کی طرح وہ یہاں بھی نہیں مانی تھی۔ وہ قالین پر ہی سوتی تھی۔ ہاں ہم دونوں کے درمیان چھ سات فٹ کا فاصلہ رہتا تھا۔ چھ سات فٹ کا فاصلہ جو درحقیقت چھ سات صدیوں کا فاصلہ بن چکا تھا۔ دل کے تار نہ مل رہے ہوں تو جسموں کا قرب کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رات کی تاریکی، سناٹا، مکمل تنہائی اور غنودگی مل جل کر انسان پر جادو سا کر دیتے ہیں۔ وہ کہیں سپنوں اور بیداری کے درمیان بھٹک رہا ہوتا ہے اور اس کی ساری کیمسٹری بدل جاتی ہے۔ اس رات بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں نے کروٹ بدلی تو مجھے لگا کہ میرا چہرہ ایک خوشبو میں دھنسا ہوا ہے۔ اپنی ناک کے قریب مجھے ریشمی سرسراہٹ محسوس ہوئی، یہ ثروت کی چوٹی تھی۔ میں نہ جانے کب کروٹ بدلتا ہوا ثروت کے قریب چلا آیا تھا۔ کچھ شرارت اس کی چوٹی نے کی تھی اور میری طرف بڑھ آئی تھی۔ اب اس کے ریشمی بال عین میری ناک اور ہونٹوں سے چھو رہے تھے۔ ایک بے نام سی کیفیت پیدا ہوئی۔ ان بالوں کے لمس اور ان کی مہک نے بہت سی حسین یادوں کے در کھول دیئے۔ کئی دل گداز ملاقاتوں کا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے کھلتا چلا گیا۔

میں نے دیکھا، زیادہ قصور میرا ہی تھا۔ میں نیند کی حالت میں اپنے تکیے سے کافی دور چلا آیا تھا۔ میں نے پلٹنا چاہا لیکن جیسے کسی جادوئی گرفت نے مجھے جکڑ لیا۔ ہاں یہ تاریکی اور تنہائی کا جادو تھا۔ میں ثروت کے کچھ اور قریب چلا گیا۔ عجیب والہانہ پن سے اس کے چہرے کے نشیب و فراز کو اپنی انگلیوں سے سہلانے لگا۔ اس کی پیشانی، ناک اور رُخسار جو کبھی میرے بہت قریب تھے، میرے اپنے تھے۔ اپنی گردن آگے بڑھا کر جب میں نے اس کے

رُخسار کو چوما تو وہ ایک دم بیدار ہو گئی۔

"تابش!" گہری تاریکی میں اس کی ٹھٹکی ہوئی آواز اُبھری۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی انگلیوں کے ساتھ تیزی سے میرے چہرے کو چھوا۔ جیسے اپنی انگلیوں سے مجھے دیکھنا چاہ رہی ہو پھر وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں بس اس کا مدھم ہیولا ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے میری طرف سے رُخ ذرا سا پھیرا ہوا تھا۔ وہ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ کیا ہوا ہے۔

ایک عجب سی دلیری میرے سینے میں آتشیں لہر کی طرح دوڑ گئی۔ میں نے عقب سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی صراحی دار گردن کا عقبی حصہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اس کی گردن کے ریشم پر اپنے جلتے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے کو اس کے کان کی لو کو اس کی گردن کو بوسے دینے لگا۔

اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ "پلیز تابش! پلیز تابش!" وہ کراہ رہی تھی۔

پھر وہ جلدی سے اُٹھی اور میرے ہاتھ پیچھے ہٹاتی ہوئی بستر پر جا بیٹھی۔ "آپ ایسا نہ کریں تابش!" وہ کراہی۔ "آپ مجھے کمزور کر رہے ہیں۔ مجھے توڑ رہے ہیں۔ پلیز ایسا نہ کریں۔"

"سس...... سوری ثروت! میں بھی تو اتنا مضبوط نہیں ہوں اور تمہارے حوالے سے تو بالکل نہیں۔ میں...... معافی مانگتا ہوں ثروت۔" میں نے تہ دل سے کہا۔ میں واقعی بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

وہ خاموش رہی۔ جیسے میری کیفیت کو سمجھ رہی ہو اور کسی حد تک میرے ساتھ ہمدردی بھی محسوس کر رہی۔ کتنی ہی دیر تک ہمارے درمیان گمبھیر خاموشی طاری رہی۔

آخر میں نے کہا۔ "ثروت! اگر تم چاہو تو میں جاوا سے بات کرتا ہوں۔"

"کس بارے میں؟"

"ثروت! جاوا تمہاری سلامتی اور حفاظت کی ضمانت دے چکا ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ اپنی زبان سے پھرے گا نہیں۔ اگر...... تم چاہو...... تو میں اپنے لیے کسی دوسرے کمرے کا انتظام کرا لیتا ہوں۔"

"نہیں تابش! میں ایسا نہیں چاہتی لیکن......" اس کی آواز بھرا گئی۔

"لیکن کیا؟"

"میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"ہاں...... کہو ثروت! میں سن رہا ہوں۔"

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر عجیب لہجے میں بولی۔ "تابش! میں نے خود سے عہد کر رکھا ہے کہ میں کبھی آپ کے بارے میں نہیں سوچوں گی۔ کبھی آپ کے...... قریب نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں ثروت! کیوں؟"

"بس تابش! میرے دل میں کچھ خوف جم گئے ہیں۔ میں جتنی بھی کوشش کرلوں لیکن اپنے خیالات کو اپنے ذہن سے علیحدہ نہیں کرسکتی۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں نے اپنا عہد توڑا تو نصرت کی زندگی اذیت اور دُکھ کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی۔ اس نے سو سال بھی عمر پائی تو اپنی بیماری سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے گی۔ یہ بیماری اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے اس سلسلے میں سمجھانے کی کوشش کریں۔ اسے میرا واہمہ اور کمزور عقیدہ قرار دیں لیکن میں کیا کروں تابش! آپ کی قربت کو اور اس وہم کو ایک دوسرے سے جدا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ خدا کے لیے تابش! مجھ پر رحم کریں۔ مجھے آزمائش میں نہ ڈالیں۔ میں اس آزمائش پر پوری نہ اُتر سکی۔ کمزور پڑ گئی تو ساری زندگی خود کو معاف نہ کرسکوں گی۔"

میں اس کا ہیولا دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے اور اپنی پیشانی ان ہاتھوں پر رکھ کر سسکتی چلی گئی۔

کتنی ہی دیر تک ایک گمبھیر سناٹا بیڈروم پر طاری رہا۔ اس سناٹے میں بس وال کلاک کی ٹک ٹک تھی یا میرے زخمی دل کی مایوس دھڑکن۔ آخر میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "ثروت! میں نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ کبھی تمہیں کسی کام پر مجبور نہیں کروں گا۔ آج کے بعد میری طرف سے ہر طرح کا اطمینان رکھو۔ میں کوئی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔"

میں نے اپنا تکیہ اُٹھایا اور کچھ مزید پیچھے ہٹا کر دیوار کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ چادر بھی دور کھینچ لی اور لیٹ گیا۔ ثروت نے اپنا تکیہ اُٹھا کر بستر پر رکھ لیا اور لیٹ گئی۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ کمرا اگر مکمل نہیں تو کافی حد تک ساؤنڈ پروف تھا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے ہلکی سی نمی محسوس کی۔ محبت میں انسان کیوں اتنا بے بس ہو جاتا ہے؟ وہ اپنے سامنے بند گلی دیکھتا ہے پھر بھی رُکتا نہیں، مڑتا نہیں، آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن بند گلیوں سے راستے کہاں پھوٹتے ہیں۔

اب ثروت بستر پر تھی اور میں نیچے تھا۔ مجھے لگا کہ آج اس نے وہ "احترام" واپس لے لیا ہے جو وہ مجھے دے رہی تھی۔ آج اس نے بستر پر سونا مناسب سمجھا ہے۔ اس صورتِ حال کا ذمے دار خود میں ہی تھا۔

میں لیٹا رہا۔ خود کو ملامت کرتا رہا۔ زخمی دل کچھ اور زخمی ہوتا رہا۔ سینے کے زخم کچھ اور لَو دیتے رہے۔ توہین کا احساس رگوں کو کاٹتا رہا۔ میں نے خود سے کہا۔ تم نے بند گلی کو دیکھ لیا ہے۔ پھر کیوں رُک نہیں جاتے؟ کیوں پتھروں سے ٹکرا کر خود کو لہولہان کرنا چاہتے ہو؟ ان لوگوں میں خود کو شامل کرنا چاہتے ہو جو عشق کے دُکھ جھیلتے جھیلتے بے نیل و مرام دنیا سے چلے گئے۔ یہ گلی کسی کو رستہ نہیں دیتی۔ تمہیں کیسے دے گی؟ رُک سکتے ہو تو رُک جاؤ۔ پلٹ سکتے ہو تو پلٹ جاؤ۔ دل نے کہا، رُکنا ہوتا تو بہت پہلے رُک جاتا، پلٹنا ہوتا تو بہت پہلے پلٹ جاتا۔ میں عشق ہوں۔ میں دلیل کو نہیں مانتا۔ میں کچے گھڑے پر تیرتا ہوں۔ آنکھوں سے دیکھ کر زہر پیتا ہوں۔ میں نے مرتے دم تک آس کا دامن چھوڑنا نہیں سیکھا۔ اپنے یقین کے بل بوتے پر میں نے پتھر موم کیے ہیں، گہرے پانیوں میں دیے جلا کر دکھائے ہیں۔ موت ملے یا زندگی، میں ہر حال میں سرخرو ہوتا ہوں۔

میں لیٹا رہا، سوچتا رہا۔ سینے میں درد کی ایک لہر سی چلتی رہی۔ چار پانچ منٹ بعد میں نے گہری تاریکی میں محسوس کیا کہ کوئی میرے پاؤں کی طرف موجود ہے۔ یہ ثروت کا ہیولا تھا۔ اچانک اس نے میرے پاؤں پکڑے اور اپنی پیشانی ان پر رکھ دی۔

"ثروت! کیا کرتی ہو؟" میں نے پاؤں چھڑانا چاہے اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے پاؤں نہیں چھوڑے۔ ان پر اپنا چہرہ جھکائے رکھا۔

اس کے گرم بھیگے چہرے کا سارا گداز میرے پاؤں میں منتقل ہو رہا تھا۔ اس کے ریشمی بالوں کی لٹیں میرے تلوؤں سے چھو رہی تھیں۔

میں نے اسے پیچھے ہٹانا چاہا۔ وہ نہیں ہٹی۔ میرے پاؤں سے چمٹی رہی، سسکتی رہی۔ مجھے پاؤں کی انگلیوں پر گرم سیال کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ ثروت کے آنسو تھے۔ میں تڑپ اُٹھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کا کندھا تھام کر نرمی سے اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ بہت مشکل سے اس نے اپنی گرفت ختم کی اور پھر تیزی سے اُٹھ کر بیڈ پر چلی گئی۔

اگلے روز دوپہر کے بعد جب ثروت واش روم میں باتھ لے رہی تھی۔ اسپیکر پر جاوا کی بھاری بھرکم منحوس آواز سنائی دی۔ "ہیلو! بچہ، بچی! کیا کر رہے ہو تم دونوں؟"

''کچھ خاص نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر کچھ خاص کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آج شام تم ایک زبردست پارٹی میں شریک ہو رہے ہو۔ خوب موج میلا ہو گا۔''

''کس قسم کی پارٹی ہے؟''

''بچے! جس قسم کی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ شراب، کباب، ڈانس، گانا بجانا۔ ڈانس آتا ہے تمہیں؟''

''نہیں۔''

''چلو دیکھنا تو آتا ہو گا نا۔ بڑی اچھی فلمی ڈانسر ہے۔ ممبئی سے خاص ہم لوگوں کی تفریح کے لیے یہاں پدھاری ہے۔ مزہ نہ آیا تو پیسے واپس۔ تم دونوں میاں بیوی کو دعوت ہے اور شرکت لازمی ہے۔'' وہ ثروت کو بڑے یقین کے ساتھ میری بیوی قرار دے رہا تھا۔ شکر تھا کہ وہ کمرے میں نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ''جاوا صاحب! ہم نہیں آسکیں گے۔''

''نہیں...... یہ تو نہیں ہو سکتا۔ اگر دونوں نہیں تو ایک کو تو ضرور آنا ہو گا۔''

میں نے کوشش کی کہ اس پارٹی سے پیچھا چھڑا سکوں لیکن جاوا بضد تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ اپنی رعایت واپس نہ لے لے۔ یعنی دونوں کی شرکت ضروری قرار نہ دے دے۔ ہماری حیثیت اس کے قیدیوں کی تھی۔ وہ کوئی بھی حکم لاگو کر سکتا تھا۔

شام کے وقت میں ثروت کو بمشکل سمجھانے میں کامیاب ہو سکا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ میں اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر جاؤں۔ وہ ٹھیک ٹھیک جاننا چاہتی تھی کہ میں کتنے بجے واپس آؤں گا۔ مجھے خود پتا نہیں تھا، اسے کیا بتاتا۔

میں جانے لگا تو اس نے میرا بازو تھام لیا۔ ''پلیز تابش! اپنا خیال رکھیے گا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ حسبِ دستور پہلے ایک ضرب ڈھائی فٹ کی مختصر کھڑکی کھلی۔ اس میں سے پریم چوپڑا نے جھانکا اور ثروت سے مخاطب ہو کر تحکمانہ انداز میں بولا۔

''کڑی لگاؤ اسے۔ اُلٹی کڑی۔''

اسٹیل کے ہینڈ کف الماری کے اوپر رکھے تھے۔ میں نے ثروت کو اشارہ کیا۔ اس نے ہینڈ کف اُتارے۔ میں نے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑے۔ ثروت نے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑ دیئے۔ چابی ثروت کے پاس ہی رہی۔ دروازہ کھول کر مجھے باہر نکال لیا گیا۔ ثروت کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید ''پارٹی'' کے

حوالے سے جھوٹ بولا جا رہا ہے اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے مجھے باہر نکالا گیا ہے۔

ثروت کا اندیشہ غلط ثابت ہوا اور میرا یقین درست نکلا۔ ایک طویل راہداری سے گزار کر مجھے ایک خم دار راہداری میں لایا گیا۔ یہ وہی خوبصورت راہداری تھی جس کے شیشے کے فرش کے نیچے پانی تھا اور رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی تھیں۔ راہداری کا اختتام ایک محرابی دروازے پر ہوا۔ دروازے کی دوسری جانب سے بہت سے مرد و زن کی طربیہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہلکے پھلکے قہقہے بھی گونج رہے تھے۔ میں ایک کیبن نما جگہ پر پہنچا۔ یہاں دو نیم عریاں لڑکیاں میرے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ وہ خوشبو میں بسی ہوئی تھیں اور سر ''مہربانی'' پر مائل نظر آتی تھیں۔ کیبن کا مخملی پردہ ہٹایا گیا تو میں دنگ رہ گیا۔ میرے سامنے گول دائرے کی شکل کا ایک خوبصورت ہال تھا۔ یہ ہال سارے کا سارا شیشے کا بنا ہوا تھا۔ یہاں موجود بیشتر فرنیچر بھی شیشے ہی کا تھا۔ مضبوط اور چمک دار شیشہ۔ فرش راہداری جیسا تھا۔ نیچے پانی تھا اور رنگین مچھلیاں، چھوٹے کچھوے اور اس طرح کی دیگر آبی مخلوقات۔ پورے ہال میں خوشبوؤں، رنگوں اور روشنیوں کی بہار تھی۔ بہت بڑے ڈانسنگ فلور پر کوئی دو تین درجن مرد و زن رقص کے لیے تیار تھے۔ پھر آرکسٹرا دھن بکھیرنے لگا اور رقاص جوڑے متحرک ہو گئے۔

ایک لڑکی نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''کوئی خدمت جناب؟''

''میرے ہاتھ کھول دو۔''

وہ دلنشیں انداز میں مسکرائی۔ ''کوئی ایسی خدمت جو آپ کی یہ خادمائیں انجام دے سکیں۔ کوئی ڈرنک، کھانا، سگریٹس یا جو بھی آپ چاہیں۔''

میں نے دیکھا۔ ایک طرف میز پر شراب خانہ خراب سمیت بہت سے ڈرنکس رکھے تھے۔ مہنگے ترین امپورٹڈ سگریٹ اور سگار وغیرہ بھی موجود تھے۔ میں نے کہا۔ ''نہیں ابھی ضرورت نہیں۔''

وہ دونوں میرے دائیں بائیں اسٹائل سے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا کہا۔ وہ پہلے تو جھجکتی رہیں پھر مسکراتی ہوئی ایک ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ موسیقی کی لے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہال میں موجود مہمان کھانے سے پہلے ہلکے پھلکے ڈرنکس لے رہے تھے اور سموکنگ کر رہے تھے۔ میں نے دھیان سے دیکھا اور حیران ہوا۔ مہمانوں میں انڈین فلم سکرین کے دو چار جانے پہچانے چہرے بھی نظر آئے۔ ایک معروف ہیرو کی دید نے تو مجھے واقعی حیران کیا۔ اس کے گرد چلبلی لڑکیوں کا گھیرا تھا اور آٹوگراف وغیرہ لیے جا رہے تھے۔ صورتِ حال سے

اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ نقلی نہیں۔ واقعی اصلی ہیرو ہے۔ جاوا کے قریب چودھری انور کی جھلک بھی دکھائی دی۔

میں نے سوچا کتنا اچھا ہو کہ یہاں کہیں عمران بھی موجود ہو۔ میں اس کی صورت دیکھنے کو ترسا ہوا تھا۔ میں اردگرد نگاہ دوڑانے لگا لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔

اسی دوران میں موسیقی تھم گئی۔ رقص ختم ہو گیا۔ جوڑے میزوں پر واپس آ گئے۔ ایک طرف بنے ہوئے بلوری اسٹیج پر ورائٹی شو پیش کیا جانے لگا۔ انڈیا کے چند ٹی وی اسٹارز اپنی اُلٹی سیدھی حرکتوں کے ذریعے حاضرین کو ہنسانے کی کوشش کرتے رہے اور کہیں کہیں واقعی کامیاب بھی ہوتے رہے۔

اسی دوران میں کھانے کا دور شروع ہو گیا۔ میرے سامنے بھی شیشے کی دیدہ زیب تپائی پر شاندار کھانا چن دیا گیا۔ بائیں جانب بیٹھی حسینہ نے پوچھا۔ ''کیا کھایئے گا اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں پتا ہے آپ مسلمان ہیں۔ یہ سارا حلال کھانا ہے۔''

''کھانے کے علاوہ تو سب کچھ حرام ہے نا۔'' میں نے اس کے سراپا پر اچٹتی نظر ڈالی۔

''آپ معزز مہمان ہیں۔ جو چاہے کہہ سکتے ہیں مگر حرام حرام میں فرق تو ہوتا ہے نا'' بائیں طرف والی لڑکی ادا سے مسکرائی۔

وہ مجھے اپنے ہاتھ سے لقمے کھلانا چاہتی تھی لیکن میں کھانے سمیت کسی چیز میں رغبت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد بلوری ہال کی تیز روشنیاں بجھا دی گئیں۔ بس ہلکی نیلگوں اور سرخ روشنیاں رہ گئیں۔ ڈانسنگ فلور پر ایک قتالہ نمودار ہوئی۔ اس کی شکل بھی کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ اسے فلموں میں رقص کرتے دیکھا تھا لیکن اس کے نام سے آگاہی نہیں تھی۔ کوئی دوسرے درجے کی ایکٹریس تھی لیکن ''جسم'' پہلے درجے کا تھا۔ کچھ روشنیوں کے زاویے ایسے تھے کہ وہ قیامت اُٹھا رہی تھی۔ تہ در تہ لباس میں بھی اس کا شباب اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ ہال کے شاندار آڈیو سسٹم پر گانا گونجنے لگا۔ کچھ اس طرح کے بول تھے۔ رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا...... جب نشہ چھائے گا، تب مزہ آئے گا......

اور واقعی رقاصہ کے رقص کا نشہ پوری محفل پر چھانے لگا۔ پیمانوں کی گردش تیز ہو گئی۔ دھوئیں کے مرغولے کثیف ہوتے گئے۔ وہ ایک ایک کر کے اپنے جسم سے کپڑوں کا بوجھ کم کرتی گئی۔ اس کے انداز میں فنکارانہ چابک دستی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں رُکے گی۔ لیکن وہ کہیں نہیں رُکی۔ وہ مادر پدر آزاد ہو گئی۔ روشنیوں نے اس کے جسم کو دہکا دیا۔

سرتاپا شعلہ بنا دیا۔ موسیقی کی لے بھی تیز تر ہوتی چلی گئی۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ بہت سے معروف لوگ یہاں موجود تھے جن میں ایک بہت بڑا انڈین فلم اسٹار بھی تھا۔ ان کی موجودگی میں یہ برہنہ تماشا جاری تھا۔

پہلے گانے کے بعد ایک دوسرا ہیجان خیز گانا چلنے لگا اور وہ اس گانے سے بھی پورا انصاف کرنے لگی۔ چند منٹ بعد کئی اور باڈی بلڈر نوجوان بھی اس شرمناک تماشے میں شامل ہو گئے۔ یہ وحشی جنگلیوں کے روپ میں تھے۔ یہ بھی عریاں تھے۔ بس اتنا فرق تھا کہ ان کے زیریں جسموں کو چند سبز پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ حسین ترشے جسم والی رقاصہ کے گرد ہیجان خیز انداز میں منڈلانے لگے اور ''ٹیبلو'' کے انداز میں اپنی جنسی پیاس کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے سنا تھا کہ انڈیا میں فار ایسٹ اور یورپ کی طرح نائٹ کلبوں میں لائیو سیکس شوز ہوتے ہیں۔ آج ان کی دید بھی ہو رہی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس محفل میں بہت سی خواتین بھی موجود تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر اپنی نسوانی جھجک کو الکحل میں ڈبو چکی تھیں اور ساتھی مردوں کے ساتھ قہقہے بکھیر رہی تھیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ اچانک ایک شرابی کے دھکے سے شراب کی ایک ٹرالی اُلٹ گئی۔ کسی کا سگریٹ بھی گرا اور ایک دم آگ بھڑک اُٹھی۔ یہ آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ چلانے کی آوازیں آئیں۔ مرد و زن ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھاگے۔ کوئی آگ کی لپیٹ میں تو نہیں آیا لیکن خوف و ہراس بہت شدید تھا۔ میں نے نائیکا شاربہ بائی کو دیکھا۔ وہ نیچے گری دو عورتوں کو پاؤں تلے روندتی ہوئی سیڑھیوں تک پہنچی اور دھوئیں کے مرغولوں میں گم ہو گئی۔ میرے اردگرد بیٹھی دونوں لڑکیاں بھی باہر لپکیں۔ دھواں تیزی سے کیبن کی طرف بڑھ رہا تھا۔

مجھے وہ افراتفری یاد آ گئی جو سردار اوتار سنگھ کی حویلی میں پھیلی تھی اور جس سے فائدہ اُٹھا کر میں اور ثروت سردار کی حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کیا آج بھی کچھ ایسا ہو سکے گا؟ میرے ذہن سے سوال اُبھرا۔

میں اُٹھا اور کیبن سے باہر نکل آیا۔ شیشے کے فرش والی راہداری میں بھی دھواں بھر رہا تھا اور کوئی محافظ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک ٹن شرابی خوف زدہ انداز میں اپنی ساتھی کو پکار رہا تھا۔

''کامنی...... کہاں ہو...... کامنی۔''

میں اس کے پہلو سے گزرتا ہوا بڑی راہداری میں آ گیا۔ یہ بالکل سیدھی تھی اور عمارت کے اسی حصے میں جاتی تھی جہاں ثروت موجود تھی۔ میں اس کمرے کی طرف لپکا لیکن ابھی دس پندرہ قدم آگے ہی گیا تھا کہ پریم چوپڑا نظر آیا۔ اس کے عقب میں دو رائفل بردار تھے۔ ان

کی نظر سے بچنے کے لیے میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر نیچے جانا چاہا، لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر مسلح محافظ موجود تھے۔

اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ بھگدڑ میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ نچلی منزل پر شعلے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاں گاڑھا دھواں پھیل رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ جدید Fire Extinguishers کے ذریعے ہال کمرے کی آگ پر کنٹرول حاصل کرلیا گیا ہے اور اب اسے بالکل ختم کیا جا رہا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی ہلکی سی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ میرے عقب کی کسی راہداری میں بھاری قدموں کی ٹھک ٹھک اُبھری۔ میں ایک قریبی دروازہ کھول کر جلدی سے اس میں داخل ہوگیا۔ چند قدم آگے ایک اور دروازہ تھا۔ اس کے بیضوی تالے میں چابی لگی ہوئی تھی۔ شاید یہ چابی افراتفری میں یہاں لگی رہ گئی تھی۔ دروازے پر OX کے نامکمل الفاظ لکھے تھے۔

میں نے یونہی تجسس کے تحت چابی گھمائی اور اندر چلا گیا۔ اس مستطیل کمرے کی دیواریں سفید تھیں۔ ایک طرف دو بڑے فریزر نظر آ رہے تھے۔ پوری ایک دیوار ان فریزرز نے گھیری ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جس طرح ہاتھ موڑ کر میں نے قفل میں چابی گھمائی تھی، اسی طرح ایک فریزر کا ڈھکنا اُٹھایا اور اندر جھانکا۔ اندرونی لائٹ کی روشنی میں مجھے جو کچھ نظر آیا، وہ مجھے سکتہ زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسہ ہی نہیں ہوا۔ فریزر میں گوشت محفوظ کیا گیا تھا لیکن یہ کسی جانور کا گوشت نہیں تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آشا کور کو دیکھا اور گوبندر سنگھ کو دیکھا۔ ہاں میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ نیم برہنہ منجمد لاشیں ان دونوں ہی کی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے لکڑی کی طرح سخت نظر آتے تھے۔ پھر میری نگاہ ایک اور لاش پر پڑی۔ یہ آشا کور اور گوبندر کی لاش کے نیچے اُلٹی پڑی تھی۔ چہرے کی صرف ایک سائیڈ نظر آ رہی تھی۔ پھر بھی میں نے پہچان لیا۔ یہ پولیس کے مخبر روہیل سنگھ کی لاش تھی، جسے جاوا قتل سے پہلے میاں مٹھو کہہ کر پکارتا رہا تھا۔ چہروں کے نقوش دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے یہ تینوں افراد ابھی ابھی مرے ہیں۔

تب میری نگاہ ایک اور منظر پر پڑی اور اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ جواں سال کھلاڑی گوبندر کی لاش کا ایک بازو کندھے سمیت غائب تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تیز دھار چھری سے بڑی صفائی کے ساتھ بازو کو جسم سے علیحدہ کیا گیا ہو۔ گوبندر کے جسم پر فقط ایک زیر جامہ تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے جسم پر برف کے ذرات تھے۔ مجھے لگا جیسے میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے

دیکھا، خوبرو آشا کور کا منہ خوفناک انداز میں کھلا پڑا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اسے گولی مارنے کے بعد پسٹل کی نال اس کے منہ میں سے نکالی گئی ہو۔ یہ سب کچھ بہت ہولناک تھا۔ میں نے جلدی سے فریزر کا دروازہ بند کیا اور واپس پلٹا۔

یہی وقت تھا جب مجھے کسی قریبی کمرے سے بڑی عجیب سی آواز سنائی دی۔ یہ در و دیوار کو چیرتی ہوئی سی تیز آواز کسی انسان کی تو ہرگز نہیں تھی۔ یہ کسی درندے کی آواز تھی لیکن کس درندے کی؟ شیر، ہاتھی، چیتے وغیرہ کی آواز میں نے سنی ہوئی تھی۔ کسی اور آواز کا تجربہ نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔ آواز کا ماخذ عمارت کے اندر ہی تھا لیکن کچھ فاصلے پر تھا۔ غالباً کئی دیواروں نے اس آواز کو ملفوف کر رکھا تھا۔

اب سامنے والی راہداری میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دونوں دروازے کھولے اور باہر آ گیا۔ آگ بجھ چکی تھی لیکن دھواں راہداریوں میں پھیلا ہوا تھا۔ دھوئیں کے سبب لوگ کھانس رہے تھے اور آنسو بہا رہے تھے۔ میں سیڑھیوں تک ہی پہنچا تھا کہ نریندر کمار کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”وہ ہے...... وہ سامنے۔“

دو مسلح افراد لپک کر میرے پاس آ گئے اور مجھے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اتنے میں چوڑی ناک والا پریم چوپڑا بھی پہنچ گیا۔ ”تم اوپر کیسے آ گئے؟“

”جیسے کئی دوسرے لوگ آئے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”تم ٹھیک ہو؟“

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ میرے ہینڈ کف چیک کرنے کے بعد وہ لوگ مجھے نیچے لے آئے۔ بیرونی کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے گئے تھے، ایگزاسٹ چل رہے تھے۔ دھواں تیزی سے چھٹنا شروع ہوگیا تھا۔ گول ہال میں شیشے کی قیمتی کرسیاں اور میزیں الٹی پڑی تھیں۔ کافی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ رقص گاہ والی سائیڈ جل گئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس آتشزدگی میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دو تین افراد معمولی زخمی ہوئے۔ ان میں شاربہ بائی بھی تھی۔ اس کا ایک بازو، کہنی کے پاس سے جل گیا تھا۔ معروف فلمی اداکار اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً وہ واپس جا چکا تھا۔ بیشتر مہمان بھی کچھ بدمزہ سے ہوگئے تھے۔

تاہم جاوا نے اعلانیہ انداز میں کہا۔ ”دوستو! پارٹی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ پارٹی جاری ہے۔ ہم دوسرے ہال میں انتظام کر رہے ہیں۔ چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا آپ کو۔ بہت سے مزیدار تماشے آپ کے منتظر ہیں۔“

مجھے واپس کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مجھے دیکھ کر ثروت کا چہرہ کھل اُٹھا۔ کمرے کا سلائیڈنگ دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ پھر مختصر کھڑکی کھلی اور پریم چوپڑا نے اس میں سے جھانک کر ثروت کو مخاطب کیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''اس کی کڑی کھول دو۔'' ثروت نے میرے ہاتھ کھول دیئے۔ مختصر کھڑکی بند ہوگئی۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ...... اور یہ بھاگ دوڑ کی آوازیں کیسی تھیں؟'' وہ شکوہ کناں آواز میں بولی۔

''اوپر ہال کمرے میں آگ لگ گئی تھی۔ جہاں شراب کی بدمستیاں زیادہ ہوں وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔''

''مجھے بھی دھوئیں کی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟''

''ہو جاتا تو اچھا تھا لیکن...... پھر ہم تم بھی خطرے میں پڑ سکتے تھے۔''

''آپ...... مجھے اس طرح چھوڑ کر نہ جایا کریں۔'' وہ پلکیں جھکا کر بولی۔

میں بغور اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ہولے سے کہا۔ ''میں زندہ رہنے کے لیے تھوڑی سی آس چاہتا ہوں ثروت بس امید کی ایک کرن...... جو مجھے...... اس اندھے رستے پر نظر آتی ہے۔ میں کچھ اور نہیں چاہتا۔ بس میری اتنی سی بات مان لو۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! تم نے کہا ہے کہ تمہارے دل و دماغ میں نصرت کی بیماری کا خوف بیٹھ گیا ہے۔ مجھے اپنے رب سے پوری امید ہے کہ وہ اچھی ہو جائے گی۔ جب وہ بالکل اچھی ہو جائے، پہلے کی طرح ہنسنے بولنے لگے تو پھر تمہاری سوچ کا رُخ کیا ہوگا ثروت! کیا پھر بھی تم مجھے اسی طرح سے Avoid کرتی رہو گی۔ ایک خطرہ سمجھتی رہو گی؟''

وہ بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی۔ ہونٹوں پر چپ کی مہر تھی۔

میں نے جواب پر اصرار کیا تو وہ بولی۔ ''تابش! آپ ایسے سوال کیوں کرتے ہیں جو مجھے اندر سے زخمی کر دیتے ہیں۔ میں آپ کے سوال کا کیا جواب دوں جو کچھ بھی ہے، میں یوسف کی بیوی ہوں۔ قانونی، شرعی، اخلاقی ہر لحاظ سے پابند ہوں تابش۔''

''کم از کم ''اخلاق'' کی بات تو نہ کرو ثروت! وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے بعد اخلاق کے حوالے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے اور اب تو وہ بالکل کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ گریس اپنی تمام بے راہ روی کے باوجود پھر اس کی زندگی میں گھس رہی ہے اور کامیاب بھی ہو رہی ہے۔''

''لیکن آئندہ کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں تابش؟ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اگر

حالات بہتر نہیں ہوتے اور بھی خراب ہو جاتے ہیں تب بھی مجھے یقین ہے کہ یوسف اتنی آسانی سے...... مجھے...... آزاد نہیں کریں گے۔''

''ہاں...... حقِ ملکیت کا احساس تو اس بندے میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن تم نے یہ بھی ٹھیک کہا ہے کہ کل کے بارے میں ہم آج کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیا پتا کل کسی اور کے اصرار پر وہ تمہیں آزاد کرنے پر مجبور ہو جائے۔'' میرا اشارہ گریس کی طرف تھا۔

ثروت کی خوبصورت پیشانی پر اُلجھن کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ ''پلیز تابش! آپ کسی اور موضوع پر بات کریں۔ میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔''

میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بج اُٹھی۔ پاکستان سے کال تھی۔ نصرت والا نمبر تھا۔ ''ہیلو نصرت! کیا حال ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ پیر صاحب کے گھر پر ہوں۔ وہ سگی بیٹیوں کی طرح میرا خیال رکھ رہے ہیں۔ اگر کسی نے انسان کے روپ میں فرشتہ دیکھنا ہو تو انہیں دیکھ لے۔ اتفاق سے ڈاکٹر رضوان جو میرا ٹریٹ منٹ کر رہے ہیں، وہ بھی پیر صاحب کے عقیدت مندوں میں سے نکل آئے ہیں۔ وہ اب مجھے زیادہ توجہ دینے لگے ہیں۔''

دو منٹ کی گفتگو کے بعد وہ پھر یوسف والے موضوع پر آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے تابش بھائی! وہ خبیث گریس پھر پاکستان میں ہے۔ اسلام آباد کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ اپنا کتا یہیں چھوڑ گئی تھی نا۔ یوسف ''اس کتے'' سمیت اس سے ملنے گیا ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ یوسف کو اور اس کے علاوہ اپنے کتے کو یہاں سے لے جانے کے لیے آئی ہے۔ یقیناً اسلام آباد میں دونوں اس کے آگے پیچھے دُم ہلا رہے ہوں گے۔ پلیز تابش بھائی! باجی کو سمجھائیں۔ ان سے کہیں کہ اب تو اپنی آنکھیں کھول لیں۔ آپ کوشش تو کریں تابی بھائی! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں، ان کے دل میں اب بھی آپ کے لیے بے پناہ محبت ہے۔ بس اس محبت پر لوہے کے خول چڑھائے ہوئے ہیں انہوں نے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا۔''

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں کہ آپ اس وقت کہاں ہیں اور کن حالات میں ہیں لیکن یہ تو ہے نا کہ قدرت نے آپ کو ایک بہترین موقع دیا ہوا ہے۔ یوسف پاکستان میں ہے اور آپ دونوں وہاں اکٹھے ہیں۔ آپ اس قربت سے فائدہ اُٹھائیں۔ کسی وقت...... سارے اندیشے ایک طرف رکھ کر باجی کا ہاتھ پکڑ لیں۔ ان سے کہہ دیں کہ آپ انہیں برباد نہیں ہونے دیں گے۔ آپ انہیں نہیں چھوڑیں گے۔''

"ٹھیک ہے۔" میں نے بات ختم کرنا چاہی۔

"آپ کو پتا ہے...... پرسوں کون سا دن ہے؟"

"کون سا؟"

"آپ مرد حضرات بھول جاتے ہیں لیکن ہم خواتین نہیں بھولتیں۔ پرسوں کے دن آپ کی اور باجی کی منگنی ہوئی تھی۔ مجھے اس دن کی ایک ایک گھڑی یاد ہے۔ ایک ایک واقعہ۔ مجھے پتا ہے اس دن باجی بہت اُداس ہو جاتی ہیں۔ خود کو کسی کمرے میں بند کر لیتی ہیں۔ اپنی آنکھیں بھگوتی رہتی ہیں۔ پرسوں آپ ضرور اس بارے میں ان سے بات کرنا۔"

"ٹھیک ہے نصرت...... یوسف کی طرف سے پھر تو کوئی رابطہ نہیں ہوا تمہارے ساتھ؟"

"نہیں تابی بھائی! اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ صرف ایک بار فاروقی انکل کا فون آیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ پیر قدرت اللہ کے گھر پر ہوں۔ بس یہی جاننے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے دوسری بار پوچھنے کی زحمت نہیں ہی نہیں کی کہ زندہ ہے یا مر گئی۔"

میں نے کہا۔ "لو باجی سے بات کرو۔" اور فون ثروت کو تھما دیا۔ دونوں بہنیں باتیں کرنے لگیں۔

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ اوپر خاص کمرے کے اندر دیکھا ہوا منظر جیسے دل پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے یہ منظر جیتی جاگتی زندگی کا حصہ ہی نہیں ہے، میں نے کسی ڈراؤنی فلم کا سین دیکھا ہے۔ وہ سب کیا تھا؟ ان لاشوں کو کیوں محفوظ کیا گیا تھا؟ یہ سفاکی اور درندگی کی انتہا تھی اور پھر وہ آواز جو بالائی منزل کے کسی حصے سے اُبھری تھی۔ ایک خون آشام آواز۔ کیا ان منجمد لاشوں کا اور اس آواز کا کوئی تعلق تھا؟ جاوا جیسے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا اور اپنی حیرت میں اضافہ کرتا رہا۔

مجھے عمران کے فون کا شدت سے انتظار تھا لیکن فون نہیں آ رہا تھا۔ میری نگاہ بار بار فون سیٹ کی طرف اُٹھ جاتی تھی۔ ثروت اپنی گفتگو ختم کر چکی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میری ہدایت کے مطابق نصرت نے اسے پریشان کن خبروں سے دور رکھا ہوا ہے۔ ثروت نے زیادہ تر نصرت کی طبیعت اور اس کے علاج معالجے کی بات ہی کی تھی۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ نصرت نے پیر قدرت اللہ سے بھی ثروت کی تھوڑی سی بات کرا دی تھی۔ ان پر ثروت کو بہت یقین تھا۔ ان کی گفتگو سے اس پر اچھے اثرات پڑے تھے۔

اگلے روز سویرے میں اپنے فرشی بستر سے اُٹھا تو سب سے پہلے رات والے بھیانک

مناظر ہی ذہن میں آئے۔ ثروت بیڈ پر موجود نہیں تھی۔ میں نے دیکھا، وہ بے چین سی ٹہل رہی تھی۔ "کیا بات ہے ثروت؟" میں نے پوچھا۔

"دم سا گھٹ رہا ہے۔ پتا نہیں یہ کیسی بُو ہے۔ رات کو بھی پریشان کرتی رہی ہے۔"

بُو واقعی موجود تھی۔ یہ دھوئیں اور آگ بجھانے والی گیسوں کی ملی جلی بُو تھی۔ کمرا چونکہ بالکل بند تھا، یہ بُو یہاں ٹھہر کر رہ گئی تھی۔ میں نے بیل بجا کر گارڈ کو طلب کیا۔

مختصر کھڑکی کے پینل نے سلائیڈ کیا اور نریندر کا کرخت چہرہ نظر آیا۔ "ہاں جی! کیا پرابلم ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے بُو کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔ "ایگزاسٹ فین چلا دو۔"

میں نے کہا۔ "وہ کل سے چل نہیں رہا۔ اسے ٹھیک کراؤ لیکن اس سے پہلے کچھ دیر کے لیے دروازہ کھول دو۔"

"دروازہ نہیں کھل سکتا۔ ہاں...... یہ کھڑکی مَیں کھلی رہنے دیتا ہوں۔" اس نے خشک لہجے میں کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

مختصر کھڑکی کھلی رہی۔ اس سے تھوڑا بہت فرق پڑ گیا۔ اسی دوران میں ناشتہ بھی آ گیا۔ میں واش روم سے نکلا تو ثروت ناشتہ میز پر سجا چکی تھی۔ میری پسند ناپسند کا اسے بہت عرصے سے پتا تھا۔ اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ دو سلائس، دونوں پر آدھا مکھن آدھا ایپل جیم۔ میں اس کے کومل ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ چوڑیوں کی ہلکی کھنک سنائی دیتی رہی۔ ایک بھولا بسرا منظر پردۂ تصور پر چمک گیا۔ وہ ہمارے گھر میں تھی۔ کچن میں کھڑی اسی طرح سلائس پر چھری سے مکھن لگا رہی تھی۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور میری نیت بھانپ کر چھری سیدھی کر لی۔ "خبردار! میں شریف لڑکی ہوں، میرے قریب نہ آنا۔ میں قتل کر دیا کرتی ہوں۔"

"شریف لڑکیاں اپنے ہونے والے شوہروں کو چھری سے نہیں اداؤں سے قتل کرتی ہیں۔ تھوڑی سی بات پر خون خرابا اچھا نہیں ہوتا۔"

"میں جانتی ہوں آپ کی تھوڑی سی باتیں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"ارے آگ ہے پیچھے۔" میں نے ایک دم کہا۔

وہ پلٹی اور میں نے اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔ اس کی چھری والی کلائی میری گرفت میں تھی۔ "اب بتاؤ تھانے جانا ہے یا یہیں پر مک مکا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"رشوت لینے اور دینے والا دونوں آگ میں جلتے ہیں۔"

''رشوت لینے والا تو ویسے بھی آگ میں جل رہا ہے۔ فائر بریگیڈ والی کو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔'' دست درازی روکنے کے لیے اس نے آخری حربہ آزمایا اور فرح کو آوازیں دینے لگی۔ حربہ کامیاب رہا اور مجھے موقع سے کھسکنا پڑا۔

ایسے بھولے بسرے مناظر ہر وقت میرے ذہن پر یلغار کرتے رہتے تھے اور میرے بے پناہ آتشیں درد کو ہوا دیتے تھے۔

ناشتے کے بعد میں نے اُٹھ کر مختصر خلا میں سے جھانکا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک بار پھر مجھے لگا کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے مختصر کھڑکی سے صرف چھ سات فٹ کی دوری پر دو عدد بہت بھاری بھرکم ریچھ دیکھے۔ ان کی جسامت ناقابلِ یقین تھی۔ ان کے رنگ براؤن تھے، وہ مست ہاتھیوں کی طرح ہال کمرے میں چکرا رہے تھے۔ ان کی ایک ایک پچھلی ٹانگ سے اسٹیل کی نہایت مضبوط زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ فرش پر گھسٹنے سے یہ زنجیر رگڑ کی زوردار آواز پیدا کرتی تھی۔ سفید پولر ریچھوں کے برعکس ان کے دانت زیادہ بڑے اور خوفناک تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کل شب میں نے بالائی منزل پر جو نامانوس آواز سنی، وہ ان میں سے ہی کسی خوفناک درندے کی تھی۔ ان جانوروں کا قوی ہیکل سیاہ فام رکھوالا بھی ان کے قریب موجود تھا۔ تاہم وہ ان سے معقول فاصلہ رکھے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی ان سرخ انگارہ آنکھوں والے جسیم جانوروں پر پوری طرح بھروسا نہیں کر پا رہا تھا۔ جانوروں کو غالباً چہل قدمی کے لیے اس وسیع مستطیل ہال میں لایا گیا تھا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ آیا۔ ثروت بستر کی سلوٹیں درست کر رہی تھی۔ وہ اس ساری صورتِ حال سے بے خبر تھی اور بے خبر ہی رہتی تو اچھا تھا۔

وہ آج قدرے بہتر موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے تھوڑی سی توجہ اپنے ابتر حلیے پر بھی دی تھی۔ بالوں میں برش کیا ہوا تھا۔ تین چار دن بعد اس نے لباس بھی تبدیل کیا تھا۔ سرخ پھولوں والی کالی شلوار قمیص اس کے جسم پر بہت سج رہی تھی۔ شانوں پر دوپٹا تھا۔ وہ جھاڑ پونچھ کرتی ہوئی مختصر کھڑکی کی طرف چلی گئی۔ میری خواہش تھی کہ وہ کھڑکی سے باہر نہ جھانکے لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں کچھ کرتا، اس نے جھانک لیا اور یہی وقت تھا جب دونوں میں سے ایک جانور اپنی مخصوص آواز نکالتا ہوا تیزی سے کھڑکی کی طرف آیا۔ اس نے بڑی وحشت سے اپنا چہرہ کھڑکی کے ایک فٹ چوڑے خلا میں گھسانے کی کوشش کی تھی۔ یوں لگا کہ اس نے پوری دیوار ہلا دی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہوا مگر ثروت کی آواز لرزہ خیز تھی۔ وہ چلاّ کر میری طرف پلٹی اور مجھ سے

چمٹ گئی۔ ''تابش...... تابش!'' وہ پکار رہی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ میری چھاتی میں گھسیڑ دیا۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

اسی طرح اپنے ساتھ لگائے لگائے میں اسے کھڑکی سے دور لے آیا۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ اس کی معصوم نسوانیت دل لبھانے والی تھی۔ شاید ایسے ہی کسی حسین ساتھی کی ''قربت'' کے لیے شاعر حضرات، بجلی کڑکنے یا طوفان اُچھلنے کی تمنا کرتے ہیں۔ سنگین صورتِ حال کے باوجود میں ان لمحوں سے محظوظ ہوا۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے خود سے جدا کیا تو وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ''پلیز تابش! اسے بند کرائیں۔ ابھی بند کرائیں۔'' اس کا اشارہ کھڑکی کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! گھبراؤ مت۔ وہ جانور کمرے میں نہیں آ سکتے۔ ان کا رکھوالا بھی ساتھ ہے۔''

''پہلے آپ کھڑکی بند کرائیں۔'' وہ ذرا غصے سے بولی۔

میں نے نریندر کو پکارا اور اس سے کہا کہ وہ کھڑکی بند کر دے۔ وہ مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے آیا اور بولا۔ ''شاید تمہاری سندر پتنی جانوروں کو دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ چلو سندر لڑکیوں کو زیادہ ڈرانا نہیں چاہیے لیکن اپن کی ایک بات یاد رکھنا۔ ہم جس بٹن کو دبا کر یہ کھڑکی کھولتے ہیں، اسی بٹن کو تین دفعہ دبانے سے یہ دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔'' اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔

اس نے کھڑکی بند کر دی۔ میں ثروت کے قریب بیٹھ گیا اور اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ میں اس کے سامنے نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ذہن میں کھلبلی سی تھی۔ اس چھت تلے آنے کے بعد کچھ انوکھے مناظر دیکھنے میں آئے تھے۔ فریزر میں منجمد انسانی لاشیں اور یہ دیوہیکل بھورے ریچھ۔ یہ سوچ بار بار دماغ میں آتی تھی کہ منجمد لاشوں اور ان جانوروں میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ شاید انسانی لاشیں ان کی خوراک کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ جاوا جیسے لوگ اپنی ہیبت میں اضافہ کرنے کے لیے اکثر اس قسم کے شوق پالا کرتے ہیں۔ شیر، شکاری چیتے، خونخوار عقاب اور کتے وغیرہ ان لوگوں کے اردگرد نظر آتے ہیں اور خوف و ہراس کی فضا قائم کرتے ہیں لیکن ریچھوں کے اس جوڑے کی دید تو ناقابلِ یقین تھی۔ ایسے دیوہیکل جانور اور اتنی خونخوار شکلیں...... میں نے اتنے بڑے ریچھ کبھی دیکھے تھے، نہ ان کے بارے میں سنا تھا۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہولناک چنگھاڑ سنائی دی۔ یوں لگا کہ

ہمارے کمرے کے دھاتی دروازے سے کوئی بم آٹکرایا ہے۔ پورا دروازہ ہل کر رہ گیا۔ ثروت ایک بار پھر چلا کر میرے بازو سے لپٹ گئی۔ دوسرا دھماکا ہوا اور سلائیڈنگ دروازہ ٹیڑھا ہو گیا۔ یہ وحشی جانور تھا جو دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے ثروت کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ محسوس ہوا کہ جانور کسی بھی لمحے اندر گھس آئے گا۔ میرے اندر مزاحمت کی حس پوری شدت سے بیدار ہوگئی۔ میں ثروت کو اپنے ساتھ لگائے لگائے واش روم تک لایا، واش روم کا دروازہ کھولا۔ ثروت کو اندر دھکیل کر دروازے کو باہر سے بولٹ لگا دیا۔

تہلکہ خیز آوازیں اب ہال کمرے کے وسط سے آ رہی تھیں۔ ٹیڑھے ہو جانے والے سلائیڈنگ ڈور کی جانب ڈیڑھ دو انچ چوڑی اور تین چار فٹ لمبی جھری سی بن گئی تھی۔ میں نے آنکھ لگا کر دیکھا۔ کسی وجہ سے دونوں ریچھوں میں سے ایک مشتعل ہو گیا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس ریچھ نے وحشت کے عالم میں اپنے پاؤں کی وزنی زنجیر توڑ ڈالی تھی۔ زنجیر کا قریباً دو فٹ لمبا ٹکڑا ریچھ کے ساتھ ساتھ فرش پر پھسل رہا تھا۔ یہ دیوہیکل جانور اپنے سامنے آنے والی ہر شے پر دیوانہ وار جھپٹ رہا تھا۔ اس نے لوہے کی ایک الماری پر پنجہ رسید کیا اور اسے کھلونے کی طرح دور لڑھکا دیا۔ الماری کے ساتھ ہی شیشے کی ایک دیوار بھی دھماکے سے چکنا چور ہو گئی اور تب میں نے ایک اور چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ ریچھوں کا رکھوالا چوڑا چکلا شخص ہال کے عین وسط میں اوندھا پڑا تھا۔ خدا کی پناہ...... اس کے پہلو پر سے قریباً دو کلو گوشت غائب تھا۔ اس گوشت کے ساتھ ہی بدقسمت شخص کے اندرونی اعضا بھی غائب تھے۔ اس بہت بڑے زخم میں سے بہنے والا خون فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ ابھی دس پندرہ منٹ پہلے میں نے اس چاق و چوبند بندے کو جیتی جاگتی حالت میں دیکھا تھا، اب وہ یقیناً زندگی کی سرحد پار کر چکا تھا۔ اس ہال کمرے میں اندر کی طرف تین سائیڈز پر ایک گیلری سی تھی۔ اس گیلری پر کئی افراد موجود تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ان کے پاس رائفلیں موجود تھیں لیکن وہ گولی نہیں چلا رہے تھے۔ یقیناً انہیں اس کا حکم نہیں تھا۔ وہ نیچے ایک گوشے میں دیکھ رہے تھے۔ میں نے غور کیا اور ایک بار پھر پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ گیلری کے بالکل نیچے ایک اور خونچکاں جسم نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی بہاری رقاصہ تھی جسے ہم نے لنگڑی پورہ گاؤں میں دیکھا تھا۔ اسے شاربہ بائی جاوا اور اس کے ساتھیوں کی تفریح طبع کے لیے وہاں لائی تھی۔ اب یہ رقاصہ پہلو کے بل فرش پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا تاہم جسم میں حرکت موجود تھی۔ وہ زندہ تھی۔ مگر شدید خطرے میں تھی۔ وحشی جانور کسی بھی وقت اس پر جھپٹ سکتا تھا۔ وہ جتنا طاقتور تھا، پلک جھپکتے میں اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر سکتا تھا۔ گیلری

میں موجود افراد اس پر مختلف اشیا پھینک رہے تھے تاکہ وہ لڑکی کی طرف آنے سے باز رہے۔

پھر میں نے پریم چوپڑا کو دیکھا۔ اس نے اپنے مشین پسٹل سے کئی ہوائی فائر کیے اور پکار کر بولا۔ ''فائر نہیں کرنا...... کسی نے سیدھا فائر نہیں کرنا۔''

بدمست جانور نے فرش پر پڑی ایک رائفل کو پنجوں سے بھنبھوڑا اور یوں توڑ موڑ دیا جیسے وہ کاغذ کی بنی ہوئی ہے۔ طاقت کا ایسا مظاہرہ میں نے زندگی میں دیکھا تھا اور نہ کبھی اس کا تصور کیا تھا۔ وہ پلٹ کر بہاری لڑکی کی طرف آیا، گیلری میں کھڑے افراد نے اس پر شیشے کی بوتلیں اور چھوٹے گملے پھینکے، وہ غضبناک انداز میں چلاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر گیلری کی سیڑھیوں کی طرف آیا۔ یہ منظر دیکھ کر گیلری میں موجود افراد بھی دہشت زدہ ہو گئے۔ وہ نکاسی کے دروازوں کی طرف سمٹنے لگے۔

''گولی نہیں چلانی...... گولی نہیں۔'' پریم چوپڑا پھر دھاڑا۔

یہی وقت تھا جب دو افراد تیزی سے گیلری میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک جاوا تھا اور دوسرا وہی شخص جو شاید پیدائشی طور پر خطروں کا کھلاڑی تھا۔ وہ موت کے پیچھے بھاگتا تھا اور زندگی اپنی تمام تر خوش بختیوں کے ساتھ اس پر عاشق تھی۔ وہ عمران تھا۔ میں اسے جاوا کے ساتھ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یوں لگا کہ وہ اسی عمارت میں موجود تھا۔

وحشی ریچھ (جس کا وزن بعد ازاں 1400 پاؤنڈ یعنی چودہ پندرہ من کے قریب معلوم ہوا) سیڑھیوں کی ریلنگ کو لکڑی کی تیلیوں کی طرح بکھیر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی دوسرا ریچھ بھی موجود تھا۔ وہ بندھا ہوا تھا لیکن وہ بھی اضطراب کی حالت میں تھا۔

''عمران...... عمران!'' میں نے بے ساختہ پکارا لیکن اس قیامت کے شور میں میری آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔

وحشی جانور سیڑھیاں اُتر کر پھر خون آلود فرش پر آ گیا۔ اب وہ کسی بھی وقت پھر لڑکی کی طرف بڑھنے والا تھا۔ لڑکی کے جسم میں موجود حرکت اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی اور پھر میں نے عمران کو موقعہ کی طرف لپکتے دیکھا۔ ہیرو...... جو واقعی ہیرو تھا۔ چوڑا سینہ، روشن پیشانی، آنکھوں میں ذہانت اور دلیری کی بجلیاں چمکتی ہوئی۔ وہ دیواروں میں در بنانا جانتا تھا۔ پانی میں دیے جلانے کا ہنر اسے آتا تھا اور وہ یہاں تھا۔ اپنی تمام تر غیر معمولی توانائیوں کے ساتھ۔ میں نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں فقط ایک رول کیا ہوا اخبار ہے۔ وہ ناقابلِ یقین دلیری کے ساتھ دیوہیکل ریچھ کے رُوبرو آیا۔ دل دھڑکنا بھول گئے، سانسیں رُک گئیں۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں خود کو جھکایا اور اخبار کو فرش پر مارتے ہوئے آواز پیدا کی۔ ساتھ

ساتھ اس نے ہاتھوں کے خاص اشاروں سے جانور کو ''کول ڈاؤن'' کرنا چاہا۔ جانور نے چنگھاڑ جیسی آواز نکالی لیکن حملہ آور نہیں ہوا۔ ایک قدم پیچھے ہٹا پھر دو قدم...... عمران کا طلسم کام کر رہا تھا۔ وہ جانور جو سرتاپا وحشت تھا خود کو جیسے کسی نادیدہ حصار میں محسوس کر رہا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے یہ حصار ٹوٹ گیا۔ جانور بے پناہ درندگی سے عمران پر جھپٹا۔ اگر اسے سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی تاخیر ہوتی تو ''کوڈیاک براؤن'' ریچھ اپنے پنجے سے اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا جاتا۔ میرا سانس جیسے سینے میں اٹک گیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں سلائیڈنگ دروازہ توڑ کر نکلوں اور عمران کے ساتھ اس خطرے میں کود پڑوں۔ میں اب اسے پکارنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ مبادا عمران کی توجہ اپنے خونخوار دشمن سے ہٹے اور وہ اسے شدید زخمی کر دے۔ واش روم کے اندر ثروت مسلسل پکار رہی تھی۔ ''تابش! کیا ہو رہا ہے؟ تابش دروازہ کھولیں۔'' ساتھ ساتھ وہ دروازہ پیٹ رہی تھی۔

ریچھ اب ایک بار پھر وحشت کے جوبن پر تھا۔ عمران پر حملہ کرنے کے بعد وہ پھر زخمی بہاری لڑکی کی طرف بڑھا۔ عمران تڑپ کر لڑکی اور ریچھ کے درمیان آ گیا۔ ہاں وہ ہیرو تھا۔ حقیقی زندگی کے حقیقی خطروں سے کھیلنے والا۔ فلمی اور کتابی دنیا کے ہیرو اس کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ ریچھ نے اپنے سامنے رکاوٹ دیکھی تو اس کی وحشت مہمیز ہوئی، اس کی درندگی میں اُبال آیا۔ وہ طاقت سے عمران پر جھپٹا۔ عمران اس کے پنجے سے تو بچ گیا مگر اس کے فولادی کندھے کی ضرب لگنے سے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ یہ جدوجہد آنکھوں کو پتھرا دینے کے لیے کافی تھی۔ جہاں عمران گرا، وہاں ایک طویل جھاڑن پڑا تھا۔ عمران نے اس جھاڑن کو اُلٹی طرف سے پکڑا اور اس کے چوبی دستے سے ریچھ کی تھوتھنی پر ضربیں لگانے لگا۔ مقصد صرف یہی تھا کہ کوڈیاک ریچھ کی توجہ بے ہوش لڑکی کی طرف سے ہٹ جائے اور وہ کامیاب ہوا۔ عمران کے لیے ریچھ کے اشتعال میں اضافہ ہوا۔ وہ اس کی طرف لپکتا چلا گیا۔ عمران اُلٹے قدموں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ دیو ہیکل جانور کو گیلری میں لے آیا۔ گیلری میں موجود افراد دروازوں میں اوجھل ہو گئے تھے۔ ہال کے عین درمیان چھت سے ایک بڑا فانوس جھول رہا تھا۔ سرکس کی تربیت عمران کے کام آئی۔ وہ جست لگا کر اس فانوس پر چڑھ گیا۔ طویل جھاڑن ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس جھاڑن سے مسلسل ریچھ کی تھوتھنی پر ضربیں لگا رہا تھا۔ یہ ضربیں اس عفریت کا کیا بگاڑ سکتی تھیں۔ بس اس کے اشتعال میں اضافہ کر رہی تھیں۔ پریم چوپڑا اور اس کے دو ساتھیوں کو موقع مل گیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترے اور بے ہوش بہارن کو گھسیٹ کر ایک دروازے میں اوجھل ہو گئے۔

جاوا پکار رہا تھا۔ ''انجکشن لاؤ۔ کہاں مر گئے ہو؟ جلدی کرو۔''

نریندر کمار نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بے ہوشی کا انجکشن تھرو کرنے والی ٹرنکو لائزر ڈارٹ گن تھی۔ لگتا تھا کہ وہ عام گن کی طرح اس گن کے استعمال میں بھی خاص مہارت رکھتا ہے۔ اس نے قریباً پچیس فٹ کی دوری سے گن چلائی۔ نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ انجکشن ریچھ کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ اس دوران میں شہ زور جانور گیلری کا طویل جنگلا اُکھاڑ کر نیچے فرش پر پھینک چکا تھا۔ ٹرنکولائزر کا اثر ہونے میں قریباً پانچ منٹ مزید لگ گئے۔ اس دوران میں ہال کمرے کے اندر دہشت کا راج رہا اور توڑ پھوڑ ہوتی رہی۔

میں عمران کو آوازیں دیتا رہا تھا لیکن میری آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ وہ واپس جا چکا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ پچھلے دو تین منٹ سے ثروت کی آواز سنائی نہیں دی۔ میں جلدی سے واش روم کی طرف آیا اور اس کا بولٹ گرا کر دروازہ کھولا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ثروت واش روم کے قالین پر گری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے تڑپ کر اسے اُٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ ''ثروت...... ثروت...... آنکھیں کھولو۔'' میں نے اسے جھنجھوڑا۔

وہ بے ہوش تھی۔ زرد رنگ اور بھی زرد ہو رہا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ اب بھی واش روم کے قالین پر تھا۔ میں نے اسے بازوؤں میں اُٹھایا اور بستر پر لے آیا۔ اس کی نبض دیکھی۔ سانسوں کی آمدورفت کا جائزہ لیا۔ شدید صدمے نے اسے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ میں نے سلائیڈنگ دروازے کی سلائیڈ میں بن جانے والی جھری سے منہ لگایا اور سینے کی پوری طاقت سے پکارنے لگا۔ ''دروازہ کھولو۔ چوپڑا! دروازہ کھولو۔''

دو افراد ریچھوں کے رکھوالے کی لاش کو اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔ فرش پر خون کی ایک لکیر سی بنتی جا رہی تھی۔ میری آواز کسی نے نہیں سنی اور اگر سنی تو توجہ نہیں دی۔ اسی دوران میں، مَیں نے محسوس کیا کہ ثروت نے اپنے ہاتھ کو تھوڑی سی حرکت دی ہے۔ میں واپس اس کی طرف پلٹ آیا۔

میں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ اس کی ہتھیلیوں کی مالش کی۔ ساتھ ساتھ میں اسے پکار رہا تھا۔ ''ثروت! آنکھیں کھولو۔ سب ٹھیک ہو گیا ہے ثروت۔''

اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کا چہرہ بدستور ہلدی رہا۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں خشک تھیں۔ تاہم سانسوں کی آمدورفت بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ اسے ہولے ہولے پکارتا بھی جا رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ پھر

اس میں ہوش کے آثار نمودار ہونے لگے۔ کمرے کے باہر جو آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں، ان سے پتا چل رہا تھا کہ دوسرے ریچھ کو بھی بے ہوش کیا گیا ہے اور اب دونوں کو مکمل طور پر ''کنٹرول'' میں رکھنے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ وزنی زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ گاہے بگاہے پریم چوپڑا کی پاٹ دار آواز بھی گونجتی تھی۔ وہ کام کرنے والوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

میں نے ثروت کے چہرے پر پھر پانی کا چھینٹا دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں نیم وا کیں۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، تب اس کے چہرے پر ایک دم کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ اسے یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ میں اس پر جھکا ہوا ہوں۔ ایک خوف آمیز مدہوشی کے عالم میں وہ میرے گلے سے لگ گئی۔ سسکنے لگی۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ میں اس سے دور ہٹ جاؤں گا۔ میں اس کے بال سہلاتا رہا۔ اسے تسلی دیتا رہا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس میں اپنے سینے پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کرتا رہا۔ وہ ابھی مکمل طور پر ہوش میں نہیں آئی تھی۔ تاہم اس کے تنے ہوئے اعصاب اب ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اسی طرح سو گئی۔ میں نے اسے خود سے جدا کیا اور آہستہ سے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا۔ اس کے بال چہرے سے ہٹائے اور چادر اس کے سینے تک کھینچ دی۔ وہ نقاہت، مایوسی اور افسردگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ وہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی، میرے چاروں طرف تاریکیاں ہیں، میں اپنے اردگرد دور دور تک زندگی اور خوشی کی کوئی کرن نہیں دیکھتی اور جس طرح کی یہ زندگی ہے، مجھے زندہ رہ کر کرنا بھی کیا ہے۔

میرا دل سینے میں کٹ کر رہ گیا۔ نہ جانے کیوں سائیں لڑکے کی پُراندیش آواز پھر میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

میں ایک طرف قالین پر بیٹھ گیا۔ دیوار سے ٹیک لگا لی۔ حالات کتنے بھی بُرے سہی لیکن میرے سینے میں امید کی ایک توانا کرن روشن ہو چکی تھی۔ عمران یہاں تھا اور جب وہ یہاں تھا تو پھر یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہر طرح کے روشن امکانات یہاں موجود تھے۔ ہر طرح کی انہونیوں کے لیے در وا ہو چکے تھے۔ وہ نہ صرف یہاں موجود تھا بلکہ جاوا کے ساتھ اس کی زبردست انڈر اسٹینڈنگ بھی نظر آ رہی تھی۔ بس اس حوالے سے ایک پھانس میرے سینے میں چبھی ہوئی تھی۔ ''گریٹ گیم'' والی بات کسی طرح مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ عمران کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کسی صورت نہیں۔ یہ سوچ ہی میرے پسینے چھڑا دیتی تھی کہ عمران

ریوالور کے پانچ خانوں میں گولی ڈال کر اس کا بیرل اپنی کنپٹی پر رکھ رہا ہے اور ٹریگر دبا رہا ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں ہر قیمت پر اسے روکوں لیکن وہ مجھے اس سلسلے میں کوئی بات ہی کرنے نہیں دے رہا تھا۔ کیا وہ اندر خانے کوئی خاص پلاننگ کر چکا تھا یا پھر اس اندھے اعتماد کا سہارا لے رہا تھا جو وہ اپنے اوپر رکھتا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ یہ عمران ہی تھا۔ ''ہیلو جگر پیارے! کیا حال ہے؟''

''تمہارا کیا حال ہے؟ کہاں ہو تم؟''

''سمجھو تمہارے آس پاس ہی ہوں۔''

''یہ بکواس نہیں کرتے کہ یہیں پر ہمارے ساتھ ہو۔ جاوا کے ساتھ اسی گھر میں۔''

''تو تمہیں پتا چل گیا ہے۔''

''پتا چل گیا ہے اور ابھی سارا ہنگامہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا ہے۔''

''زبردست...... اب تو میری ذات پر تمہارا اعتماد کچھ اور بڑھ جانا چاہیے۔ میں جو کچھ کہوں تمہیں اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینا چاہیے۔ یار! میں ہوں ہی اس قابل۔ ریما، نرگس کو کتے نے نہیں کاٹا ہوا کہ یوں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ پوری دنیا میں میرے جیسے بس دو تین ''پیس'' ہی اور ہوں گے۔ ایک اپنا وہ ٹام کروز، دوسرا جان ریمبو اور تیسرا جیکی چن...... بلکہ جیکی چن بھی اب کچھ ماٹھا ہی ہو چکا ہے۔''

''تم اپنی بکواس بند کرو تو کچھ کہوں؟''

''یار! میں بہت جلدی میں ہوں۔ تم ابھی کچھ نہ کہو۔ بس تیار ہو جاؤ۔ ایک زبردست ایکشن پیک، سنسنی خیز، سچے ڈرامے کے لیے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے، کیسے یار سے پالا پڑا تھا۔''

''یاد تو میں کر ہی رہا ہوں۔''

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''دو دن اچھی طرح ڈنڈ بیٹھکیں لگا لو۔ پرسوں رات کو کام شروع ہو رہا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

O......❖......O

عمران ایکشن پیک، سچے ڈرامے کی بات کر رہا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اگر اس کا مطلب ریوالور والے ہلاکت خیز کھیل سے تھا تو یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی۔ وہ مجھے اور ثروت کو جاوا کے چنگل سے نکالنے کے لئے ایک ایسی شرط قبول کرنے جا رہا تھا جس میں موت کا پلڑا ناقابلِ یقین حد تک بھاری تھا۔

رات گئے ثروت جاگ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے گہرے سائے اب بھی

موجود تھے۔ اس نے باتھ روم کے اندر رہتے ہوئے دیوہیکل جانور کی خوفناک چنگھاڑیں سنی تھیں اور اس ساری ٹوٹ پھوٹ کی صدائیں بھی اس تک پہنچی تھیں جو ہال کمرے میں ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے مسلسل سوالات پوچھ رہی تھی۔ ریچھ کہاں ہے؟ اسے مار دیا گیا ہے؟ اس نے کسی کی جان تو نہیں لی؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اسے ان سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے اور اسے بتایا کہ جانور کسی وجہ سے بپھر گیا تھا۔ اسے بے ہوش کر کے یہاں سے ہٹا لیا گیا ہے اور کسی دوسری جگہ حفاظت سے بند کر دیا گیا ہے۔ میں نے اصرار کر کے ثروت کو تھوڑا سا کھانا کھلایا اور چائے بھی پلائی۔ اس کا دھیان بٹانے کے لئے میں نے کمرے میں موجود ٹی وی آن کیا۔ ہم کچھ دیر تک مزاحیہ خاکوں کا ایک پروگرام دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی ہمارے کمرے کا وہ سلائیڈنگ دروازہ مرمت کر دیا گیا جو بھورے ریچھ کی خوفناک ٹکر سے ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ دونوں ریچھ یقیناً اب بھی اسی عمارت میں موجود تھے۔ ایک دو بار مجھے ان میں سے کسی ایک کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز یقیناً بالائی منزل کے کسی دور افتادہ کمرے سے آئی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ ثروت کے کانوں تک یہ مدھم آواز نہیں پہنچی۔

ثروت بالکل گم صم تھی۔ مجھے یاد آیا کہ آج وہی دن ہے جس کے بارے میں نصرت نے مجھے بتایا تھا۔ چند برس پہلے آج ہی کے دن ہماری منگنی ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ آنکھوں میں روشن سپنے سجائے تھے...... اور مرادوں والی رات تک پہنچنے کے لئے ایک ایک پل گننا شروع کیا تھا۔ ''کیا بات ہے ثروت! تم کوئی بات کیوں نہیں کر رہی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ خالی خالی نظروں سے سلائیڈنگ دروازے کو دیکھتی رہی۔ ہولے سے بولی۔ ''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں...... بس...... کل والی بات ذہن سے نہیں نکل رہی۔ اگر وہ جانور یہ دروازہ توڑ دیتا تو پھر؟''

''میرا خیال ہے، تم چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ آج کوئی اور بات ہے جو تم دل سے لگائے ہوئے ہو۔''

''نہیں تابش! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی اور یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

دوپہر کو میرے اصرار کے باوجود اس نے ایک لقمہ نہیں لیا۔ بس طبیعت کی خرابی کا بہانہ

کرتی رہی۔ چادر اوڑھ کر لیٹی رہی۔ سہ پہر کے وقت اٹھی تو آنکھیں سرخ تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ روتی رہی ہے۔ میرے دل کے زخموں سے جیسے خون رسنے لگا۔ اس نے واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ آنکھوں کی سرخی کم تو ہو گئی لیکن ختم نہیں ہوئی۔

میں نے پوچھا۔ ''ثروت! تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ گڑبڑا گئی۔ ''شاید الرجی سی ہے۔''

میں کہنا چاہتا تھا...... یہ الرجی نہیں ہے ثروت! یہ وہ روگ ہے جو میری، تمہاری جان کو ایک زمانے سے لگا ہوا ہے۔ جس کا کوئی علاج نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو تم اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو، میں کہنا چاہتا تھا، یہ الرجی نہیں ہے ثروت...... یہ آنسوؤں کی یلغار ہے۔ یہ اس دن کی یادیں ہیں جب ہماری نسبت ٹھہری تھی...... جب ہمارے دل میں پنپنے والی آس، امیدوں کو ایک شکل ملی تھی۔ منزل کا تعین ہوا تھا اور منزل تک پہنچنے والے راستے پر قدم اٹھنا شروع ہوئے تھے۔ تمہاری طرح مجھے بھی سب یاد ہے ثروت! ایک ایک بات، ایک ایک جملہ، ایک ایک منظر...... لیکن میں یہ سب کچھ اس سے کہہ نہ سکا۔ کہہ دیتا تو شاید وہ اپنے خول میں چھپ جاتی۔ میں اس کے چہرے پر اور اس کی سرخ آنکھوں میں اپنی محبت کے جو شواہد دیکھ رہا تھا، وہ معدوم ہو جاتے اور میں انہیں معدوم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں بے چینی سے عمران کی فون کال کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسی عمارت میں موجود تھا لیکن اب تک اس نے صرف ایک بار مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ وہ کن چکروں میں ہے۔ میں پریم چوپڑا سے بھی دو تین بار کہہ چکا تھا کہ وہ عمران سے رابطہ کرائے لیکن اس نے سنی اَن سنی کر دی تھی۔ اوپر کی منزل پر فریزر میں پڑی ہوئی لاشوں کا منظر بھی ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا تھا۔ ابھی تک وہاں ان لاشوں کی موجودگی کی ''وجہ'' کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ ذہن میں رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ شاید وہ انسانی لاشیں کوڈیاک ریچھوں کی خوراک کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

مجھے پتا تھا کہ جب عمران ملے گا تو بہت سے سوالوں کا جواب مل جائے گا لیکن وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھا۔ میں عمران ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا جب کمرے میں لگے ہوئے اسپیکر میں سرسراہٹ جاگی پھر جاوا کی بھاری بھرکم نشیلی آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بچے! کیا کر رہے ہو؟''

''آپ کی اور اپنی جان کو رو رہا ہوں۔'' میں نے ترت جواب دیا۔

"بکواس نہیں۔" وہ پھنکارا پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر بعد نیٹ آن کرنا۔ وہاں تمہارے لئے زبردست تماشا موجود ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہی ریوالور کا کھیل۔ مزہ آئے گا تمہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ پس منظر میں بہت سے لوگوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ موسیقی کی دھما دھم بھی تھی۔

"عمران کہاں ہے؟" میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

میرے فقرے سے پہلے ہی اسپیکر خاموش ہو چکا تھا۔ میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ میں نے اسپیکر کی طرف منہ اٹھا کر کئی بار "ہیلو...... ہیلو" کہا مگر جواب نہیں آیا۔

اسی دوران میں مختصر کھڑکی کے پینل نے سلائیڈ کیا۔ مستطیل خلا میں پریم چوپڑا کا تمتمایا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس نے حسبِ معمول ثروت کو حکم دیا کہ وہ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے۔ میرے اشارے پر ثروت نے اس حکم پر عمل کیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ شاید مجھے پھر باہر لے کر جائیں گے لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ ہتھکڑی لگ چکی تو پریم چوپڑا خود اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک کارندہ تھا۔ کارندے کے پاس ایک سی پی یو (کمپیوٹر اور مانیٹر) موجود تھا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں میز پر سیٹ کر دیں اور تار وغیرہ لگا دیئے۔ نیٹ آن ہو گیا۔ کارندہ کچھ دیر کی بورڈ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تب اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ پریم چوپڑا اور یہ کارندہ باہر چلے گئے اور دروازہ مقفل کر دیا۔ چوپڑا کی ہدایت پر ثروت نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ جاتے جاتے پریم چوپڑا مجھ کو ایک بٹن دکھا گیا تھا اور بتا گیا تھا کہ اسے پریس کر کے میں "آن لائن" تماشا دیکھ سکوں گا۔

دروازہ بند ہونے کے بعد میں بے دم سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ثروت کا رنگ بھی زرد ہو رہا تھا۔ وہ میرے تاثرات دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ دوسری طرف میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی تھی کہ جاوا اور چوپڑا وغیرہ نے جس تماشے کا ذکر کیا ہے، وہ ریوالور والے کھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ ممبئی میں کسی خاص مقام پر یہ مہلک کھیل کھیلا جا رہا تھا اور اسے انٹرنیٹ کے ذریعے دکھایا بھی جا رہا تھا۔ تو کیا آج میں عمران کو مرتے ہوئے دیکھوں گا؟ یہ سوال ایک دہکے ہوئے نیزے کی طرح میرے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں یہ آہنی دروازہ توڑ کر نکل جاؤں۔ عمران تک پہنچوں اور اسے کسی بھی صورت اس جنونی عمل سے روک لوں۔

میں کافی دیر اسی طرح بے دم سا بستر پر پڑا رہا۔ ثروت بھی الجھی الجھی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں آن لائن کچھ بھی دیکھنا نہیں چاہ رہا۔ قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا...... آخر بہت ہمت کر کے میں نے بٹن پش کیا۔ مانیٹر کی اسکرین پر وہی منظر ابھرا جس کے اندیشے میرے دل و دماغ کو بے طرح جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بڑا ہال دیکھا۔ ہال میں کم از کم ڈھائی تین سو تماشائی موجود ہوں گے لیکن ان سب کے چہرے تاریکی میں تھے۔ صرف ان کی موجودگی محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ ایک بڑے اسٹیج کے رُوبرو بیٹھے تھے۔ اسٹیج روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ میری نظر سب سے پہلے عمران پر ہی پڑی۔ وہ اسٹیج پر موجود تھا۔ اس کے جسم پر وہی چست ٹراؤزر تھا جو وہ سرکس میں استعمال کیا کرتا تھا۔ بالائی جسم عریاں تھا...... اور روشنیوں میں دمک رہا تھا۔ ثروت نے عمران کو فوراً ہی پہچان لیا۔ "یہ آپ کا دوست عمران ہی ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری تمام تر توجہ اسکرین پر تھی۔ دل، سینے میں وحشی گھوڑے کی طرح بھاگ رہا تھا۔ یہاں ریوالور کا کھیل ہونا تھا لیکن ابھی اس کھیل کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاں، اسٹیج پر کچھ اور طرح کی مصروفیت تھی۔ عمران کے علاوہ...... دیگر افراد بھی نظر آ رہے تھے۔ سائیکل کے پہیے جیسا ایک "رِنگ" ایک بڑے راڈ میں نصب کیا جا رہا تھا۔ اس "رِنگ" کے اندر کی طرف کئی تیز دھار برچھیاں لگی ہوئی تھیں۔ سرکس میں بازی گر ایسے "رِنگ" کے اندر سے جست لگا کر گزرتے ہیں۔ عام طور پر "رِنگ" کو آگ بھی لگائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں آگ کے بجائے برچھیاں تھیں۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے تک اس اسٹیج پر اس طرح کے اور بھی خطرناک مظاہرے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کے فرش پر ایک جانب خون کے دھبے صاف کئے جانے کے نشان نظر آ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد تماشا شروع ہو گیا۔ عمران نے تیز دھار برچھیوں والے اس "رنگ" میں سے جست لگا کر گزرنا تھا۔ ذرا سی غلطی اس کا پیٹ چاک کر سکتی تھی یا جسم کے کسی بھی حصے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ لیکن وہ عمران تھا۔ خطرات کو بڑی خوش دلی سے گلے لگانے والا۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس کا ورزشی جسم یقیناً ہر نگاہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پھر وہ نپے تلے انداز میں اپنی جگہ سے بھاگا۔ اس نے جست کی اور کسی سبک بدن مچھلی کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا خطرناک رِنگ کے اندر سے گزر گیا۔ نیم تاریک ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ بعد اس کھیل کا دوسرا مرحلہ ناظرین کے سامنے پیش کیا گیا اور یہ زیادہ

خطرناک تھا۔ برچھیوں والا ''رِنگ'' پہلے سے چھوٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس میں بمشکل عمران کے جسم کے گزرنے کی جگہ ہی موجود ہے۔ تیز دھار نکیلی برچھیاں اب پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک لگ رہی تھیں۔ اندازے کی ذراسی غلطی جست لگانے والے کو جان لیوا طور پر زخمی کرسکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چند ہی لمحوں میں سب کے سامنے جان سے ہار جاتا۔

عمران نے سرکس کے پروفیشنل انداز میں اپنا سر اور کندھے اس خطرناک رِنگ کے اندر گھسائے اور ناظرین کو دکھایا کہ ان برچھیوں اور اس کے جسم کے درمیان کتنا مختصر فاصلہ ہے۔ ایک کیمرے نے زوم اِن کیا اور یہ فاصلہ دکھایا۔ یہ جان لیوا مارجن تھا۔

''یہ کیا کررہا ہے؟'' ثروت لرزاں آواز میں بولی۔

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ یقیناً کسی کے پاس نہیں تھا۔ ہال میں مکمل سناٹا تھا۔ یقیناً دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ نگاہیں جم کر رہ گئی تھیں۔ عمران بڑے اعتماد سے اپنے اسٹارٹنگ پوائنٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے گھوم کر رِنگ کی طرف دیکھا۔ چند گہری سانسیں لیں...... اور پھر رِنگ کی طرف بھاگا۔ اس کا انداز دیدنی تھا...... خاص پوائنٹ پر پہنچ کر اس نے زقند لگائی۔ اس کا چیتے جیسا جسم کسی چیتے ہی کی طرح صاف، رِنگ کے اندر سے گزر گیا۔ وہ دوسری طرف فوم کے گدے پر سر کے بل گرا اور پھر قلابازی لگا کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ دادطلب انداز میں...... دونوں طرف پھیلا دیئے تھے۔ ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس بار دیر تک تالیاں بجتی رہیں لیکن تماشا یہاں ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی کھیل باقی تھا۔ ابھی ایک شیر دل نے اپنی دیوانی جرأت سے دیکھنے والوں کو کچھ اور ششدر کرنا تھا۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ ایسا بھی ہوگا۔ ایک خوب صورت نیم برہنہ لڑکی نے ایک سیاہ پٹی عمران کو تھما دی۔ عمران کی زندگی بخش، مسکراتی ہوئی آواز ابھری۔ ''محترم حاضرین میں سے کوئی ایک شخص اسٹیج پر تشریف لے آئے۔'' اس نے یہ الفاظ انگریزی میں ادا کئے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک درمیانی عمر کا ہٹا کٹا شخص اسٹیج پر آگیا۔ وہ اپنی شکل وصورت سے ایرانی یا ترک لگتا تھا۔ عمران نے سیاہ پٹی اس کی آنکھوں پر باندھی اور اس سے تصدیق کروائی کہ اس پٹی میں سے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ بعدازاں عمران کے کہنے پر اس شخص نے یہی پٹی عمران کی آنکھوں پر باندھ دی۔ اس کے بعد حاضرین سے ہی کسی شخص کا رومال لیا گیا...... اور مزید احتیاط کے طور پر یہ رومال بھی پٹی پر باندھ دیا گیا۔ اب یقیناً عمران دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس کے سامنے پھر وہی رِنگ تھا۔

وہ جو کچھ کرنے جارہا تھا، اس کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کردینے کے لئے کافی تھا لیکن اسے کون روک سکتا تھا؟ وہ جو ٹھان لیتا تھا، وہ کرکے رہتا تھا۔ دیکھنے والوں کی سانسیں روک دینا، ان کی دھڑکنوں کو منجمد کردینا، اس کا مشغلہ تھا۔ وہ بڑے اعتماد اور وجدانی جوش کے ساتھ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تھا اور اسے شکست دیتا تھا۔ ایک لڑکی سے جدا ہونے کے بعد وہ شاید ہمیشہ کے لئے شکست اور موت کے خوف سے بھی جدا ہوگیا تھا...... اندر کے کرب نے اسے کچھ ایسی توانائیاں بخش دی تھیں جو دیکھنے والوں کو انگشت بدنداں کردیتی تھیں۔ میں حیرت اور صدمے سے دوچار تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا وہ آج رات بھی شکست کو شکست دے سکے گا۔ میں نے اسے بڑے بڑے معرکے سر کرتے دیکھا تھا...... اور وہ شعبدہ بازی نہیں تھی، جیتی جاگتی حقیقتیں تھیں۔ پچاس فٹ کی بلندی پر بغیر کسی حفاظتی جال کے جھولے پر خطرناک کرتب دکھانا، ریوالور کا کھیل کھیلنا، ایک جیتے جاگتے انسان کے سر پر سیب یا مالٹا وغیرہ رکھ کر پستول اور چاقو سے ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانا (جہاں ہدف ہوتا ہے) وہ یہ سب کچھ کرتا تھا اور آج پھر ایک ناقابلِ یقین مظاہرہ کرنے جارہا تھا۔

ثروت کراہی۔ ''تابش! یہ سب کیا ہے؟ اگر یہ سچ ہے تو پلیز اسے بند کردو۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بیٹھا رہا۔ مجھے دیکھنا تھا۔ یہ بھی عمران نے ہی مجھے سکھایا تھا کہ موت سے آنکھیں چار کیسے کی جاتی ہیں اور اب میں آنکھیں چار کرنے کے قابل ہوچکا تھا۔ مجھے اپنی جسمانی تکلیف کی طرح بدترین خطرات اور اندیشوں کو بھی جھیلنا آگیا تھا۔

ثروت چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔ میں دیکھتا رہا۔ عمران کی آنکھوں پر دہری پٹی تھی۔ اس نے آہنی برچھیوں والے ''رِنگ'' کو اپنے ہاتھوں سے چھوا پھر نہایت نپے تلے دس بارہ قدم اٹھائے۔ اسٹارٹنگ پوائنٹ پر نشانی کے طور پر کوئی چیز رکھی۔ ایک بار وہ ٹرائی کے طور پر بھاگا اور برق رفتاری سے ''رِنگ'' کو اپنے دائیں ہاتھ سے چھوتا ہوا گزر گیا۔

اب فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ وہ اسٹارٹنگ پوائنٹ پر کھڑا ہوگیا۔ آنکھوں پر پٹی تھی۔ اس نے حسبِ سابق چند گہری سانسیں لیں۔ اپنے دونوں پاؤں جوڑے۔ دیکھنے والوں کی سانسیں اٹک گئی تھیں۔ دل سینوں میں ٹھہر گئے تھے۔ موسیقی کی لہریں بھی اضطرابی کیفیت کو ابھار رہی تھیں۔ اس صورتِ حال میں اگر کوئی پُرسکون تھا تو وہ عمران تھا...... اس کا قول تھا...... اگر ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور اگر مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا۔ وہ اپنی جگہ سے بھاگا...... مخصوص جگہ پر پہنچ کر ہوا میں اچھلا۔ اس نے اپنا قول سچ کر دکھایا۔ وہ اتنی صفائی سے برچھیوں کے درمیان سے گزرا

کہ کسی کو یقین نہیں آیا۔ اس نے فوم کے گدے پر قلابازی کھائی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلا دیئے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ لوگ یقیناً اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تاریکی میں ان کے ہیولے بتا رہے تھے کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ عمران کے ایک کندھے پر ایک معمولی خراش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میری آنکھوں میں نمی تھی...... لیکن میرا سینہ ابھی اندیشوں سے خالی نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا، ابھی جنونی لوگوں کا یہ دیوانہ شو ختم نہیں ہوا۔ ابھی اس شو کا اہم ترین مرحلہ یعنی ریوالور والا کھیل باقی تھا۔ ریوالور والا کھیل میں پہلے لاہور میں بھی دو تین بار دیکھ چکا تھا لیکن یہاں اس کی شرائط کچھ اور تھیں۔

○......❖......○

قریباً ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد اس شو کا اہم ترین کھیل شروع ہوا۔ ثروت منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ثروت کو پریشانی سے بچانے کے لئے مانیٹر کی آواز بہت کم کر دی تھی۔ اس کھیل کے آغاز میں ہی میری ہتھیلیوں پر پسینا آ گیا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ میں نیٹ بند کر دوں۔ مگر بدترین مناظر کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا حوصلہ بھی مجھے عمران نے ہی دے رکھا تھا۔

اسٹیج پر ایک گول میز لا کر رکھ دی گئی۔ اس پر ایک شاندار کولٹ ریوالور رکھا تھا۔ ساتھ میں بہت سی گولیاں بھی شیشے کے ایک جار میں پڑی تھیں۔ مائیک پر کئی طرح کے اعلانات ہوئے۔ اعلانات میں کھیل کے قواعد اور کھلاڑی پر لگائی جانے والی ملین ڈالرز کی شرطوں کی تفصیل تھی۔ شرطیں باندھنے والوں میں مجھے فربہ اندام ریان ولیم کا نام بھی سنائی دیا۔ ممکن تھا کہ وہ بھی حاضرین میں موجود ہو لیکن نیم تاریکی کی وجہ سے کسی تماشائی کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔

سنسنی اور تناؤ کی شدید ترین کیفیت کے دوران میں پہلا کھلاڑی اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا اور لباس پر سامنے کی طرف نمبر 1 لکھا ہوا تھا۔ کھلاڑی کا چہرہ بھی مکمل نقاب میں تھا، فقط آنکھیں نظر آتی تھیں۔ یعنی اس کھیل میں کھلاڑی کی شناخت صرف اس کا نمبر تھا۔ نمبر 1 اپنی زندگی کی بازی لگانے کے لئے میدان میں آ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کی خواہش تھی کہ جو کچھ بھی ہونا ہے، جلدی سے ہو جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ریوالور کا چیمبر کھول کر اس میں گولیاں چیک کیں۔ چند گہری سانسیں لیں۔ ریوالور کی چرخی کو کئی بار گھمایا اور پھر بیرل عین اپنی دائیں کنپٹی پر رکھ لیا۔ مائیک پر اعلان ہوا۔

"کھلاڑی نمبر ایک، ریوالور کے چار خانوں میں گولی رکھ کر دو دفعہ ٹریگر دبائیں گے۔"

وہ موت کا سناٹا تھا۔ وہ ناقابلِ فراموش مناظر تھے۔ اس صورتِ حال کی تصویر کشی کے لئے شاید کئی صفحات بھی ناکافی ہوں۔ ایک جیتا جاگتا شخص ہمارے سامنے بیٹھا تھا اور غالب امکان یہی تھا کہ اگلے ایک دو منٹ میں وہ موت کی وادی میں اتر چکا ہوگا۔ اس نے ٹریگر دبایا۔ چار خانوں میں گولی تھی، صرف دو خانے خالی تھے...... پھر بھی "ٹرچ" کی مخصوص آواز ابھری۔ گولی نہیں چلی تھی۔ شور بلند ہوا تھا۔ یقیناً یہ وہی حاضرین تھے جنہوں نے کھلاڑی نمبر ایک کے زندہ رہنے پر شرط لگائی تھی۔ کھلاڑی نے اپنا سر میز پر ڈال دیا اور کئی لمحے بالکل ساکت رہا۔ وہ موت کو چھو کر آیا تھا لیکن ابھی اس کا امتحان ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی، اسے چرخی گھما کر دوسری دفعہ ٹریگر دبانا تھا......

میں بغور اس کھلاڑی کو دیکھ رہا تھا اور مسلسل یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ عمران ہے یا کوئی اور؟ جسامت اور قد کاٹھ سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا پھر بھی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ عمران نہیں ہے۔

دو تین منٹ بعد شدید ترین سنسنی کی دوسری لہر آئی۔ کھلاڑی نمبر ایک نے چرخی گھمائی اور بیرل کنپٹی پر رکھ لیا...... اس دفعہ دھماکا ہوا۔ کھلاڑی نمبر ایک کا سر ایک بے ساختہ جھٹکے سے بائیں طرف گیا اور کولٹ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر میز پر گرا۔ وہ خود بھی مردہ چھپکلی کی طرح بائیں طرف لڑھک گیا۔ خون کی لکیر اسٹیج کے سفید فرش پر رینگتی ہوئی نظر آئی۔

ہال سے ایک دفعہ پھر آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ آوازیں یقیناً ان لوگوں کی تھیں جنہوں نے کھلاڑی نمبر ایک کی موت پر شرط باندھ رکھی تھی۔ ایک انسان کی ایسی آناً فاناً موت پر نعرہ ہائے تحسین بلند کرنا بے شک نہایت سنگ دل لوگوں کا کام تھا۔

ایک طرف سے چاق و چوبند باوردی ملازم برآمد ہوئے۔ چار ملازمین نے مرنے والے کی لاش اٹھائی۔ باقیوں نے پھرتی سے فرش کی صفائی کی اور اسے پہلے کی طرح چمکا دیا۔ کچھ خونی چھینٹے گول میز پر بھی پڑے تھے، اسے بھی پہلے کی طرح صاف ستھرا کر دیا گیا۔ ریوالور میں پھر سے گولیاں بھر دی گئیں۔

اسپیکر پر آواز ابھری۔ "حاضرین و ناظرین! اب کھلاڑی نمبر دو آپ کے سامنے آئیں گے۔ یہ پانچ چھ کا کھیل کھیلیں گے۔ یعنی پانچ خانوں میں گولی، ایک خانہ خالی۔ قاعدے کے مطابق ان کو صرف ایک دفعہ ٹریگر دبانا ہوگا۔"

دوسرا کھلاڑی اسٹیج پر آ گیا۔ میری سانس سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔ بہر حال، کھلاڑی کا قد

کاٹھ دیکھ کر میرے شدید اضطراب میں وقتی کمی آئی۔ کھلاڑی کا قد عمران کے قد سے کم تھا، اس کی چال بھی واضح اشارہ دے رہی تھی کہ وہ عمران نہیں ہے۔ یہ کھلاڑی بھی چست لباس میں تھا اور نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ صورتِ حال کی سنگینی کھلاڑی کے جسم و جان پر پوری طرح عیاں تھی۔ چست لباس کے اندر سے اس کے کشادہ سینے کا زیر و بم صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر سر کو جھکایا۔ یوں لگا جیسے کچھ پڑھ رہا ہے، اس شدید ترین خطرے میں کسی اور روحانی عمل کا سہارا لے رہا ہے۔

پھر اس نے چرخی گھمائی اور نال اپنی کنپٹی پر رکھ لی۔ پانچ خانوں میں موت...... صرف ایک میں زندگی تھی اور معجزے تو کبھی کبھی ہی رُونما ہوتے ہیں۔ شعلہ چمکا، دھماکا ہوا اور کھلاڑی نمبر دو بھی کرسی سے لڑھک کر اوندھے منہ سفید فرش پر جا گرا۔ اس کے سر سے بڑی تیزی سے خون نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے دو تین مربع فٹ میں فرش رنگین ہو گیا۔ گولی چلتے ہی ہال کا سکتہ ٹوٹا تھا اور ملا جلا شور بلند ہوا تھا...... مرنے کے بعد بھی ریوالور اس بدنصیب شخص کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔ باوردی ملازمین نے ریوالور اس کے ہاتھ سے نکالا اور باقی کے امور انجام دیئے۔ پانچ دس منٹ میں "موقعہ واردات" کو پھر سے صاف ستھرا کر کے چمکا دیا گیا۔

یہ دل دہلا دینے والا کھیل تھا۔ میں اسے اسکرین پر دیکھ رہا تھا پھر بھی یوں لگ رہا تھا کہ میرے جسم سے سارا خون نچڑ گیا ہے۔ کیا اگلا شکار عمران ہو گا؟ یہ سوال دہکے ہوئے نیزے کی طرح میرے سینے میں اترا اور مجھے پوری جان سے تڑپانے لگا۔

پسِ پردہ موسیقی کے ساتھ مختلف اعلانات کئے جا رہے تھے جن میں شرطوں کے بھاؤ تاؤ بتائے جا رہے تھے۔ یہ لاکھوں ڈالرز کی شرطیں تھیں۔ شرطیں باندھنے والوں میں حاضرین کے ساتھ ساتھ ناظرین بھی شامل تھے۔ مختلف ممالک سے بڑے بڑے جواری اپنے اصلی یا نقلی ناموں کے ساتھ اس "گریٹ گیم" میں حصہ لے رہے تھے۔ اس کھیل میں "زندگی" کے لئے چانس بہت کم تھا مگر "زندگی" پر شرط لگانے والوں کو کامیابی کی صورت میں لامتناہی فائدہ ملتا تھا۔ یہ لالچ بڑی بڑی تجوریوں کے منہ کھول رہا تھا۔ بڑے بڑے بینک اکاؤنٹس سے چیک ڈرا ہو رہے تھے۔ یہ ایک نہایت منظم سیٹ اَپ تھا اور اس کی تیاری یقیناً مہینوں پہلے سے کر لی گئی تھی۔

اسپیکر پر تیسرے کھلاڑی کے لئے اعلان ہوا۔ انگلش میں کہا گیا۔ "کھلاڑی نمبر تین اسٹیج پر آ رہا ہے۔ کھلاڑی نمبر تین چار چھ کا آپشن استعمال کرے گا۔ ریوالور کے چار خانوں میں

گولی ہے۔ کھلاڑی نمبر تین کو خود پر دو دفعہ ٹریگر دبانا ہو گا۔"

کھلاڑی نمبر تین اسٹیج پر وارد ہوا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ زیادہ تر کھلاڑی اس مہلک کھیل میں اپنی مرضی سے حصہ نہیں لے رہے۔ انہیں مختلف طریقوں سے مجبور کر کے یہاں لایا گیا ہے اور اگر کوئی اپنی مرضی سے کھیل رہا ہے تو بھی وہ اپنے حالات سے ہی مجبور رہا ہو گا...... کوئی ایسا شخص جو واقعی مرنے کی حد تک زندگی سے تنگ آ چکا ہو۔ کھلاڑی نمبر تین اچھے قد کاٹھ کا مالک تھا۔ مجھے اس پر عمران کا قوی شبہ ہو سکتا تھا لیکن وہ بڑے بے ڈھنگے طریقے سے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ یہی لگا جیسے اسے بیک اسٹیج سے دھکیل کر اسٹیج پر پہنچایا گیا ہو۔ وہ چند سیکنڈ تک تذبذب میں کھڑا رہا۔ وہ ہانپا ہوا تھا۔ اس کا چست کاسٹیوم بھی درہم برہم نظر آتا تھا۔ پھر اس نے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ اس نے پلٹ کر اپنا رخ بیک اسٹیج کی طرف کیا اور کسی غیر ملکی زبان میں چلّا کر کچھ کہا۔ تب وہ تیزی سے مڑا اور گول میز پر رکھے ریوالور کی طرف لپکا۔ اس کے انداز میں غم وغصہ، خوف، جھنجلاہٹ، سب کچھ یک جاں ہو گئے تھے۔ اسپیکر پر ایک تیز تحکمانہ آواز گونجی۔ "رک جاؤ...... رک جاؤ"

اس کے ساتھ ہی دھماکے سے گولی چلی۔ یہ رائفل کا فائر تھا۔ میں نے دیکھا، سنہری لباس میں ملبوس، کھلاڑی نمبر تین اپنی ٹانگ پکڑ کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کی سنہری پتلون ران کے اوپر سے رنگین ہوئی جا رہی تھی۔ تب وہ ایک دم اٹھا اور دوبارہ کولٹ ریوالور کی طرف بڑھا۔ اس دفعہ گولی اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ کسی کیچوے کی طرح دہرا ہو گیا۔ رائفل اسٹیج کے بالکل پاس سے چل رہی تھی...... لیکن کہاں سے، یہ پتا نہیں چل رہا تھا۔ غالباً اسٹیج کی دائیں جانب دیوار کے پیچھے ایک یا دو رائفل مین تیار حالت میں موجود تھے۔

زخمی ایک بار پھر کسی غیر ملکی زبان میں دہاڑا۔ یقیناً وہ فائر کرنے والوں کو بدترین گالیوں سے نواز رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم اٹھا اور اسٹیج کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ غالباً تماشائیوں میں گھسنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ سیڑھیوں سے آٹھ دس قدم دور ہی تھا کہ خفیہ مقام سے چلنے والی تیسری گولی اس کی کھوپڑی میں لگی۔ وہ سفید فرش پر گر کر بالکل ساکت ہو گیا۔ اس کا خون فرش کی سفیدی پر گل کاریاں کرنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد باوردی ملازم نمودار ہوئے۔ انہوں نے مردہ شخص کو ٹانگوں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے بیک اسٹیج پر لے گئے۔

ہال میں خاموشی تھی۔ صفائی ستھرائی کا عمل دہرایا گیا۔ مختلف اعلانات ہوئے اور قریباً پندرہ منٹ بعد چوتھا کھلاڑی اسٹیج پر نمودار ہو گیا۔ وہ مردہ سی چال چلتا ہوا موت کی کرسی پر آن

بیٹھا۔ اس کے بارے میں اعلان ہوا تھا کہ وہ چار چھ کا کھیل کھیلے گا۔ یعنی چھ خانوں والے چیمبر میں چار گولیاں رکھے گا اور دو دفعہ خود پر فائر کرے گا۔ دوسری دفعہ فائر کی نوبت ہی نہیں آئی پہلی بار ہی گولی اس کے بھیجے میں گھس گئی اور وہ آناً فاناً ایک جیتے جاگتے انسان سے لاش میں تبدیل ہو گیا۔

......اگلا تقریباً ڈیڑھ گھنٹا میری زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ میں اپنی آنکھوں کو پتھر محسوس کر رہا تھا۔ جسم پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ دل گاہے بگاہے وحشی گھوڑے کی طرح سرپٹ ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں، مَیں نے صرف دو بار اپنی جگہ سے حرکت کی جب نیٹ بند ہوا اور میں نے اسے پھر سے آن کیا۔

ثروت نے ایک بار بھی اسکرین کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی تھی۔ وہ چادر اوڑھ کر دیوار کی طرف منہ کیے لیٹی تھی۔ اسی طرح لیٹے لیٹے اس نے دو تین بار مجھے روہانسی آواز میں مخاطب کیا تھا اور کہا تھا۔ ''تابش! بند کر دیں اسے۔ کیوں تکلیف دے رہے ہیں خود کو؟''

میں بند نہیں کر سکتا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود دیکھنے پر مجبور تھا۔ یہاں میرا یار تھا اور موت کے منہ میں تھا۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں مزید 14 کھلاڑیوں نے اس خونی کھیل میں حصہ لیا۔ ان کھلاڑیوں میں سے کئی ایسے تھے جن پر مجھے عمران کا شبہ ہوا اور ان کی موت پر میری رگوں میں خون منجمد ہوا۔ میرے دل۔ نے کام کرنا چھوڑا۔ درندگی کے اس تماشے میں جو پہلا کھلاڑی زندہ بچا، اس کا نمبر نواں تھا۔ اس نے چار خانوں میں گولی رکھ کر دو بار ٹریگر دبانے والا آپشن استعمال کیا تھا۔ دونوں دفعہ ریوالور کے اندر سے ''ٹرچ'' کی آواز آئی۔ ہال میں ایسا قیامت خیز شور بلند ہوا کہ کئی منٹ تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دی۔ زندہ بچ جانے والا خود بھی خوشی سے رقصاں تھا۔ وہ گاہے بگاہے فرش پر دوزانو بیٹھ جاتا تھا اور مسرت کے عالم میں اپنے ہاتھ فرش پر مارتا تھا۔ اس کی جیت نے بے شمار لوگوں کو کنگال کر دیا تھا اور بہت سوں کو دولت میں غرق بھی کر ڈالا تھا۔ وہ خود بھی پلک جھپکتے میں نہ جانے کتنی دولت سمیٹ چکا تھا۔

''کیا یہ عمران ہے؟'' میرے دل کی آس میرے اندر کی آواز بن کر ابھری۔

میں نقاب پوش کی ایک ایک ادا کا جائزہ لینے لگا۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اناؤنسر نے کامیاب ہونے والے کھلاڑی نمبر 9 کو اسٹیج کے وسط میں کھڑا کیا اور اس کی نقاب کشائی کی۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا کہ وہ عمران ہے یا نہیں؟ وہ عمران نہیں تھا۔ یہ ایک سیاہ فام تھا۔ اناؤنسر نے پکار کر کہا۔ ''اسٹیفن ڈورے......فرام برازیل......''

ہال تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ دیر تک گونجتا رہا تھا۔ ٹوٹل اٹھارہ کھلاڑیوں میں سے جو دوسرا خوش قسمت موت کے بے رحم پنجوں سے محفوظ رہا، وہ کھلاڑی نمبر 19 تھا...... یعنی اس کھیل کا آخری کھلاڑی۔ (اس کھلاڑی کا اصل نمبر تو اٹھارہ تھا لیکن تیرہ نمبر کو منحوس خیال کر کے اسے نمبروں کی فہرست میں رکھا ہی نہیں گیا تھا)۔

اس آخری کھلاڑی کو پانچ خانوں میں گولی رکھ کر صرف ایک دفعہ ٹریگر دبانا تھا۔ اس نے تین چار منٹ کے نہایت سنسنی خیز و جاں گسل مرحلوں کے بعد ٹریگر دبایا۔ ریوالور میں سے ''ٹرچ'' کی زندگی بخش آواز نکلی اور اس نے سارے ہال کو گھما کر رکھ دیا۔ جیتنے والوں کے فلک شگاف نعروں سے در و دیوار گونجنے لگے۔ باقی سب اعلانات اور انکشافات بھی ویسے ہی تھے جیسے کھلاڑی نمبر نو کے زندہ بچ جانے کے بعد ہوئے تھے۔

میرا گلا بالکل خشک ہو چکا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ لگتا تھا کہ جان میری آنکھوں میں اٹکی ہوئی ہے۔ یہ بچ جانے والا کھلاڑی کون تھا؟ اس کی جسامت عمران جیسی ہی تھی۔ یہ عمران تھا...... یہ عمران تھا۔ اگر یہ عمران نہیں تھا؟ تو پھر کیا تھا؟ اس ''کیا'' کے آگے ایک ایسی گہری تاریکی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کا تو پھر یہی مطلب تھا کہ جن سولہ عدد خونچکاں مردہ کھلاڑیوں کو یہاں سے اٹھا کر لے جایا گیا ہے، ان میں سے ہی کوئی ایک عمران تھا۔ اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

اب کھلاڑی......خوش بخت کھلاڑی کی نقاب کشائی کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ یہ انتظار بالکل، سولی پر لٹکنے جیسا تھا۔ میری ساری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ میری پتھرائی ہوئی نگاہ سنہری نقاب کے پیچھے عمران کے سوا کسی کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی اور پھر اس دوسرے خوش قسمت ترین شخص کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا...... ''راکیش کمار فرام انڈیا......'' اناؤنسر کی آواز ہال میں ایک زہریلی پھنکار کی طرح گونجی۔ میری بے جان آنکھوں کے سامنے گھنگریالے بالوں اور لمبے پتلے چہرے والا ایک سانولا نوجوان کھڑا تھا۔ ہال تالیوں اور نعروں کے بے پناہ شور سے گونجا۔ میری نگاہوں میں اردگرد کی ہر شے دھندلا سی گئی۔

فون کی گھنٹی بجتی رہی تھی۔ مجھے جیسے آس پاس کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ثروت نے ہی کال ریسیو کی۔ ''ہیلو کون؟'' اس نے پوچھا۔

دوسری طرف سے عمران کی چہکتی ہوئی آواز فون کے اسپیکر پر ابھری۔ وہ پاٹ دار لہجے میں بولا۔ ''رشتے میں تو میں آپ کا بھائی ہوں......لوگ مجھے شہنشاہ کہتے ہیں۔''

''کیا؟'' ثروت سٹپٹائی۔

"دسس......سوری میری بہن! تابی کہاں ہے؟"

میں نے جھپٹ کر فون ثروت کے ہاتھ سے لیا۔ میرا سارا جسم لرز رہا تھا۔ "ہیلو عمران! کہاں ہو تم؟" میں نے چلّا کر کہا۔

وہ بولا۔ "عالمِ بالا میں بھی ہوتا تو تمہاری یہ چنگھاڑ سن کر بدک جاتا۔ آہستہ بولو یار! میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ بس یہیں ذرا ممبئی تک آیا ہوا ہوں۔ یہ سلمان خان ہے نا...... وہی کالے ہرن کا شکاری۔ اس نے ڈنر پر بلایا ہوا تھا۔ وہی اپنے پرانے قصے سنا رہا تھا۔ اس کی پہلی محبت کون سی تھی اور ایشوریا رائے سے اس کی کیسے بگڑی وغیرہ وغیرہ......"

"عمران! تم میرے سامنے ہوتے نا تو سچ مچ تمہارا سر توڑ دیتا۔ جان سے مار دیتا تمہیں۔ تم نے مجھے ختم کر دیا تھا۔ جان کھینچ لی تھی میری......" میری آواز بھرا گئی۔

"اچھا سمجھ گیا...... تم انٹرنیٹ پر وہ تھرڈ کلاس قتل پروگرام دیکھ رہے ہو...... چار خانوں میں گولی اور پانچ خانوں میں گولی......"

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم اس کھیل میں شریک ہو۔" میں نے کانپتی آواز میں کہا۔

"شریک تو تھا لیکن وہاں تک جہاں تک تم نے دیکھا ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر برچھیوں والے "رِنگ" میں سے گزرا تھا۔ اس کے بعد وہ آ گیا......"

"وہ کون؟"

"وہی جو بہت تیز آتا ہے۔ کبھی کبھی پتلون کی زپ کھولنی بھی مشکل ہو جاوت ہے۔ میں باتھ روم میں چلا گیا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو سامنے سلو بھائی کھڑا تھا۔ وہی اپنا سلمان خان۔ کہنے لگا چھوڑو یار اس گندے ناٹک کو۔ آؤ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں اور اپنی ایک منہ بولی گھر والی بھی۔ اب میں اسی کے بنگلے سے بات کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "عمران! دل چاہتا ہے کہ تمہیں جان سے مار ڈالوں یا پھر تم مجھے مار ڈالو۔ تم بہت دکھ دینے والے شخص ہو۔ اگر تم اس کھیل میں شامل نہیں تھے تو تمہیں مجھے بتانا تو چاہئے تھا۔ تمہیں کیا پتا میں نے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے کس طرح گزارے ہیں۔" میری آواز غصے سے لرزنے لگی۔

"میں ممبئی سے واپس فرید کوٹ آ رہا ہوں۔ کل تم سے ملاقات ہو گی...... پھر ساری بات بتاؤں گا۔ اس وقت میری پیاری بہن (ثروت) کے سامنے مجھے اس طرح ذلیل نہ کرو۔"

دو تین منٹ کی مزید گفتگو کے بعد ہمارا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں بے دم سا ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ شدید ترین کرب سے گزرنے کے بعد جب

سکون کا سانس آتا ہے تو بندہ نڈھال سا ہو جاتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ عمران موت کے اس گھیرے سے کس طرح بچ پایا ہے۔ بد بخت جاوا کی تو پہلی شرط ہی یہ تھی کہ عمران اس کی طرف سے ریوالور والے کھیل میں حصہ لے گا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ عمران نے میری اور ثروت کی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اس شرط سے چھٹکارا حاصل کیا ہو۔ پھر کیا صورتِ حال بنی تھی؟ یہ بات تو طے تھی کہ عمران بدترین مشکلات میں سے رستہ نکالنے کا خداداد ہنر رکھتا ہے مگر جاوا جیسے شخص کو شیشے میں اتارنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اگر عمران نے اس سے کچھ حاصل کیا تھا تو یقیناً کچھ دیا بھی ہو گا یا دینے کا پختہ وعدہ کیا ہو گا......

میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ اس کھیل میں حصہ لینے کی شرط پر انڈین ڈان نے کئی ناقابلِ فراموش باتوں کو فراموش کیا تھا جن میں نادر ٹی ٹی کا قتل، سیکرٹری ندیم کی معذوری اور ہوٹل لالہ زار کا خونی ہنگامہ شامل تھا۔ اب اس شرط سے پیچھے ہٹنا اس کے لئے ہرگز آسان نہیں تھا۔

ثروت جانتی تھی کہ پچھلے ڈھائی تین گھنٹے میں، مَیں شدید ترین ہیجان سے گزرا ہوں لیکن اس ہیجان کی تفصیل پوچھ کر وہ مجھے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھ سے دل جوئی کی باتیں کیں پھر اس نے مجھ پر چادر کھینچ دی۔ لائٹ آف کر دی اور مجھے سونے کا مشورہ دیا۔ میری آنکھوں میں مسلسل...... ممبئی کے جواخانے کے خونی مناظر گھوم رہے تھے۔

O......❖......O

اگلے روز دوپہر کے بعد جب ثروت اور میں اپنی اپنی سوچوں میں گم خاموش بیٹھے تھے اور شاید سوچ رہے تھے کہ اس بوجھل خاموشی کو کیسے توڑا جائے تو مختصر کھڑکی کا تختہ سلائیڈ کر کے کھلا۔ میرا خیال تھا کہ حسبِ معمول دوسری طرف پریم چوپڑا کی چوڑی ناک اپنا جلوہ دکھائے گی...... لیکن دوسری طرف عمران کا مسکراتا چہرہ تھا۔ "ہیلو تابی، ہیلو ثروت!" وہ بولا۔ "کیسے ہیں آپ دونوں؟"

ثروت نے اسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں منہ پھلائے کھڑا رہا۔ اس وقت میں اندر اور وہ باہر نہ ہوتا تو ہم دونوں میں یقیناً زبردست قسم کی کشتی ہو جاتی جس میں ہم دونوں کو چھوٹی بڑی چوٹیں آتیں۔

ثروت اور عمران میں یہ پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چند فٹ کی دوری سے دیکھ رہے تھے۔ عمران کے چہرے پر حیرت جلوہ گر ہوئی۔ وہ ہکلایا۔ "میری نگاہیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں...... آپ ثروت ہی ہیں نا؟"

ثروت تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے تمہیں؟"

وہ بولا۔''آج ان کو دیکھا ہے اور اتنے قریب سے اور سکون سے دیکھا ہے۔ان کو دیکھ کر مجھے اپنی چھوٹی بہن غزال یاد آ گئی ہے۔ان کی شکل بڑی ملتی ہے غزال سے۔بس تھوڑا سا آنکھوں کا......اور قد کاٹھ کا فرق ہے۔وہ کافی صحت مند تھی۔وہ مجھے بڑے پیار سے عمو بھائی جان کہا کرتی تھی......آہ......'' وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

وہ یک ٹک ثروت کو گھورتا رہا۔اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ثروت خاموش رہی لیکن پھر اس سے رہا نہ گیا۔''آپ کی بہن کہاں ہے عمران صاحب؟''

''جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔تیرہ، چودہ سال کی تھی جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔بس چند دن بخار رہا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ہم اکٹھے کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔بچپن میں وہ مجھے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔''

ثروت نے حیرت سے عمران کو دیکھا۔''آپ تو کہہ رہے تھے کہ وہ آپ سے چھوٹی تھی۔''

''ہاں......چھوٹی تھی......لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ وہ کافی صحت مند تھی۔میں اس کے سامنے چھوٹا سا لگتا تھا......بچونگڑا سا......'' اس نے ٹھنڈی ٹھار سانس بھری۔

میں جانتا تھا کہ اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔وہ عادت کے مطابق ثروت کو گولی دے رہا تھا۔اگلے دو تین منٹ تک وہ ثروت کے ساتھ بڑی سنجیدگی اور روانی سے اپنی بہن غزال کی ہی باتیں کرتا رہا۔اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔زبردست اداکار تھا۔میں بڑی مشکل سے اسے ٹریک پر واپس لایا۔میں نے کہا۔''عمران! یہ ساری گفتگو تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔فی الحال میں تم سے دو چار بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضروری باتیں تو مجھے بھی کرنی ہیں تابی! چلو میں کوشش کرتا ہوں کہ ہم کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر سکیں۔''

''کتنی دیر میں؟''

''بس دس پندرہ منٹ میں۔'' اس نے کہا اور تب ایک بار پھر بڑی محویت سے ثروت کو دیکھنے لگا۔ثروت گڑبڑا گئی۔

وہ بولا۔''ثروت! پتا ہے میرا دل کیا چاہتا ہے......میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں ثروت کے بجائے ثروال کہہ کر پکاروں۔''

''ثروال؟ اس کا کیا مطلب؟'' ثروت نے پوچھا۔

''ثروت اور غزال کی جمع، ثروال۔سچ، مجھے لگ رہا ہے کہ میری کھوئی ہوئی بہن مجھے مل گئی ہے۔''

رسمی کلمات ادا کر کے وہ کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔

''یہ کس طرح کے آدمی ہیں؟'' ثروت نے کہا۔

''بہت عجیب ہے......اور بہت انوکھا۔میں سچ کہتا ہوں ثروت! تم سے دور ہونے کے بعد میں مرنے کی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ سیٹھ سراج کے غنڈوں سے لڑائی ہوئی۔میں اپنی جان لینے کا ارادہ کر چکا تھا۔اس وقت یہ بندہ رحمت کے فرشتے کی طرح میرے سامنے آیا۔اس نے مجھ میں جینے کا، حالات سے ٹکرانے کا اور پھر جیتنے کا حوصلہ پیدا کیا۔اس نے اب تک کی مشکلات میں قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے ثروت......اور صرف میں ہی نہیں، وہ ہر مصیبت زدہ کے کندھے سے کندھا ملانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔وہ بہت خوش بخت بھی ہے ثروت! کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ خطرے خود اس کی حفاظت کرتے ہیں۔روپیا پیسا اس کے ہاتھ کا میل ہے۔لاہور شہر میں درجنوں نہیں، سیکڑوں ضرورت مند ہوں گے جن کے گھروں کے چولہے اس کی مدد سے جلتے ہیں۔اس کا سینہ انسان دوستی اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہے ثروت! وہ اب بھی ہمارے لئے بہت کچھ کر رہا ہے۔جاوا جیسے شخص کو شیشے میں اتارنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔پتا نہیں، اس کے لئے وہ کیا قیمت دے رہا ہے۔''

''ان کے والدین؟''

''والد اس کی کم عمری میں ہی فوت ہو گیا تھا۔والدہ بچھڑ گئی جسے آج تک ڈھونڈ رہا ہے۔کبھی ایک لڑکی سے محبت ہوئی۔دونوں نے ایک دوجے کو ٹوٹ کر چاہا مگر ایک دوجے کے ہو نہ سکے۔لڑکی کی شادی ہو گئی پھر وہ اپنے شوہر کی گولی سے زخمی ہو کر مر گئی۔''

''شادی نہیں کی انہوں نے؟''

''شادی تو نہیں کی لیکن اب برسوں بعد ایک لڑکی اس کی زندگی میں آ چکی ہے۔شاہین نام ہے اس کا۔جس سرکس میں عمران پرفارم کرتا تھا، وہیں وہ بھی تھی۔دھیرے دھیرے دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو چکے ہیں۔آپس میں لڑتے بھی بہت ہیں لیکن ایک دوجے کو چاہتے بھی ہیں۔خاص طور سے شاہین تو ہزار جان سے فدا ہے اس پر۔''

''ہاں، نصرت نے مجھے بتایا تھا کہ فرح اور عاطف کے ساتھ ایک شوخ سی لڑکی بھی رہتی ہے۔وہ آپ کے ایک دوست کی گرل فرینڈ ہے۔''

''ہاں، یہ وہی ہے......بہت اچھی فن کارہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ امورِ خانہ داری بھی خوب جانتی ہے۔باتوں باتوں میں دل موہ لیتی ہے۔''

اسی دوران میں مختصر کھڑکی کی دوسری طرف کھٹ پٹ ہوئی۔کھڑکی کھلی......وہی

ناپسندیدہ چوڑی ناک نظر آئی۔ چوپڑا نے حسبِ معمول پھنکار کر احکامات جاری کئے۔ یہ سارا عمل ہم کئی بار دہرا چکے تھے۔ ثروت نے میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے۔ سلائیڈنگ دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ میں چوپڑا کے ساتھ عمران سے ملنے چل دیا۔

عمران اس خوب صورت عمارت کی بالائی منزل پر تھا۔ فرید کوٹ کوئی جدید شہر نہیں تھا لیکن اس عمارت پر جدید شہروں سے بڑھ کر سرمایہ خرچ کیا گیا تھا۔ یہ جاوا کے ایک امیر کبیر مقامی شخص کی رہائش گاہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ فربہ اندام شخص کپاس کا ایک بڑا تاجر تھا...... میں عمارت کی بالائی منزل پر پہنچا تو مجھے وہ منحوس فریزر یاد آئے اور ان میں پڑی ہوئی انسانی لاشیں بھی۔ جی مالش کرنے لگا۔ چند راہداریوں سے گزر کر ہم ایک سلائیڈنگ دروزے کے سامنے پہنچے۔ چوپڑا کے ساتھی نے ایک بٹن دبایا۔ اسٹیل کا دروازہ بے آواز کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے تعجب خیز منظر دیکھا۔ ایک مضبوط جنگلے کی دوسری جانب دونوں دیوہیکل ریچھ نظر آ رہے تھے۔ حیوانی گوشت کے پہاڑ جنہیں دیکھ کر دل و دماغ پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ ایک ریچھ کشادہ پنجرے کے ایک گوشے میں سو رہا تھا۔ دوسرا جنگلے کے قریب تھا۔ پنجرے میں مختلف سبزیوں اور گوشت کے بچے کھچے ٹکڑے پڑے تھے۔ سارے چیمبر میں عجب سی حیوانی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جنگلے سے باہر دو تین آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک کرسی پر عمران نیم دراز تھا اور سگریٹ پھونک رہا تھا۔

''آؤ جگر آؤ...... تمہارا ہی انتظار تھا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ وہ چپ تھا۔ میری آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی آ گئی۔ یہ نمی اپنے ساتھی راجا کے لئے تھی۔ راجا جو کل تک ہمارے کندھے سے کندھا ملائے مشکلات کا مقابلہ کر رہا تھا، آج ہماری دشمنی کا شکار ہو کر منوں مٹی کے نیچے سو رہا تھا۔

ہم نے جدا ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ راجا کے دکھ نے ہمیں کچھ دیر کے لئے خاموش کر دیا۔ آخر عمران نے گہری سانس لی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''راجا اب ماضی کی کہانی ہے تابی! حال اور مستقبل کی مشکلیں ہمارے سامنے کھڑی ہیں۔ اب ہمیں ان کے بارے میں سوچنا ہے۔''

''راجا کے ساتھ جو ہوا، وہ میری اور ثروت کی وجہ سے ہوا نا۔ ہم یوسف کو ڈھونڈنا چاہتے تھے۔''

''کس کے ساتھ کیا ہوتا ہے اور کیوں؟ اس کا معاملہ قدرت بہتر جانتی ہے۔ بہرحال، وہ ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر چل رہا تھا۔ ہم اسے یاد رکھیں گے۔''

''اس کے مرنے کی عمر نہیں تھی۔''

''تمہارے میزبانوں گوبندر سنگھ اور آشا کور کے مرنے کی عمر بھی کہاں تھی۔ یہاں عمر کا کوئی حساب نہیں ہے تابی! نہ ہی دنیا سے جانے کی کوئی ترتیب ہے...... تم سناؤ ثروت کیسی ہے؟''

گوبندر اور آشا کے ذکر پر مجھے پھر وہ منحوس فریزر یاد آ گیا جس میں، میں نے گوبندر، آشا اور روہیل سنگھ کی لاشیں دیکھی تھیں۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! یہاں اس کوٹھی میں بہت کچھ عجیب و غریب ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''مثلاً کیا؟''

''مثلاً ان جانوروں کو ہی دیکھو۔ اتنے بڑے ریچھ میں نے کبھی نہیں دیکھے اور نہ ہی اتنے خونخوار۔ یہ یہاں کیوں ہیں؟ کیا یہ جاوا کے پالتو ہیں؟''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''ایسی بری چیزیں کسی برے بندے کی پالتو ہی ہو سکتی ہیں۔ پرسوں انہوں نے اپنے رکھوالے کو مار ڈالا ہے لیکن وہ جونیئر رکھوالا تھا۔ اصل رکھوالا کہیں گیا ہوا تھا...... اور وہ بہاری لڑکی بھی بے چاری زخمی ہوئی ہے۔''

''میں نے سب دیکھا تھا عمران! اس کی جان تمہاری کوشش سے ہی بچی ہے۔ لیکن تم خود بھی تو مرتے مرتے بچے ہو۔ کچھ خدا کا خوف کرو یار! اپنی زندگی کو اس طرح ارزاں نہ کرو۔ کم از کم آج کل تو کچھ احتیاط کر لو۔ یہی سوچ لو کہ ہمیں ثروت کو یہاں سے زندہ سلامت نکالنا ہے۔''

''تو میں کیا کر رہا ہوں؟'' وہ سگریٹ کے دھوئیں کا چھلا بنا کر بولا۔

''تم وہ سب کچھ کر رہے ہو جو تمہارا وتیرہ بن چکا ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ خوش بختی تمہارے کندھوں پر چڑھ کر بیٹھی ہوئی ہے اور تمہارے لئے لگاتار معجزے اور کرشمے ہوتے چلے جائیں گے۔ ایسا نہیں ہوتا عمران! یہ دنیا دلیل اور سبب پر چلتی ہے۔ میں نے وہ ممبئی والا شو دیکھا ہے۔ سیلف شوٹنگ (ریوالور والے کھیل) سے پہلے تم نے جو تماشا کیا، وہ بھی خودکشی کے قریب قریب ہی تھا۔ برچھیوں والے ''رِنگ'' میں سے تم آنکھیں باندھ کر گزر رہے۔''

وہ آواز دبا کر بولا۔ ''یار! تم ٹی وی اینکرز کی طرح بس ایک یہی بات کو پکڑ کر دھوبی پٹکے مارتے رہتے ہو۔ دوسرا پہلو بھی تو دیکھو نا۔ میں نے ''رِنگ'' والا آئٹم دکھایا لیکن ریوالور والے آئٹم سے خود کو بچا لیا۔ وہ تو سیدھا سیدھا قبر میں لیٹنے کا پروگرام تھا۔ تم نے دیکھا ہی ہو گا۔ اٹھارہ میں سے فقط دو کی جان بخشی ہوئی ہے۔''

میں نے غور سے عمران کو دیکھا۔ ''لیکن عمران! جاوا کی تو پہلی شرط ہی یہی تھی کہ تم کھیلو گے۔''

''اور میں نے کہا تھا کہ میں کوئی رستہ نکال لوں گا۔'' اس نے سرگوشی کی۔

تب اس نے سگریٹ کا طویل کش لیا اور جنگلے کی سلاخوں پر ہاتھ مارنے لگا۔ دیوہیکل ریچھ تیزی سے سلاخوں پر جھپٹا۔ اس کو قریب سے دیکھنا ہیبت ناک تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں قاتل چمک تھی۔ اس نے سلاخوں پر اپنے دانت آزمائے اور انہیں جیسے اکھاڑ پھینکنا چاہا۔

عمران نے کہا۔ ''یہ نر ہے۔ پندرہ من کے قریب وزن ہے اس کا... مادہ وہ سو رہی ہے۔ اس کا وزن اس نر سے کچھ زیادہ ہی ہوگا...... اس نسل کے براؤن ریچھوں کا ریکارڈ وزن اس سے بھی زیادہ ہے۔ شاید بائیس تیئس سو پونڈ تک یعنی بائیس تیئس من کے قریب۔ ہے نا ناقابلِ یقین بات۔ بہت وزنی ہونے کے باوجود یہ تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔ وہ پریم چوپڑا بتا رہا تھا۔ یہ چالیس پینتالیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھاگ سکتے ہیں۔''

''عمران! میں تم سے کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔ تم نے جاوا کی شرط یہ چھٹکارا کیسے حاصل کیا؟''

عمران مسکرایا۔ اس نے قریب رکھے ایک بڑے باکس کا ڈھکنا اٹھایا اور اس میں سے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا نکال کر پنجرے میں پھینکا۔ یہ بھیڑ کا گوشت تھا۔ ریچھ کی حسِ شامہ حرکت میں آئی۔ اس کی آنکھوں میں بھوک ابھری اور وہ گوشت کی طرف متوجہ ہوا۔

اسی دوران میں عمران نے ایک بار پھر باکس میں ہاتھ ڈالا اور تین چار کلو وزن کی ایک مچھلی دُم سے پکڑ کر باہر نکالی۔ اس نے اسے آہنی سلاخوں کے سامنے لہرایا۔ ریچھ نے بو سونگھی اور گوشت کو چھوڑ کر تیزی سے مچھلی کی طرف آیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم تھوتھنی سلاخوں کے خلا میں گھسیڑتا چلا جا رہا تھا۔ عمران نے مچھلی اندر پھینک دی۔ ریچھ اس پر جھپٹ پڑا۔

عمران پست آواز میں بولا۔ ''ریچھ کے لئے مچھلی بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اس لئے وہ بھیڑ کے گوشت کو بھول گیا۔ ہر جاندار اسی طرح اپنی ترجیح مقرر کرتا ہے۔ جاوا نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ممبئی میں وہ ریوالور والا کھیل اس کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ لاکھوں ڈالرز کی لاٹری تھی...... لیکن...... جب جاوا کو اس سے بھی زیادہ فائدہ بخش کام نظر آیا تو وہ یہ لاٹری بھول گیا۔''

''تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ سیدھی بات کرو عمران۔''

عمران نے کہا۔ ''فاسٹنگ بدھا کی مورتی...... آرا کوئے۔''

''آرا کوئے؟'' میں حیرت زدہ تھا۔

''ہاں، میں نے جاوا سے آرا کوئے کا وعدہ کیا ہے۔''

''آرا کوئے؟ آرا کوئے تمہارے پاس ہے؟''

''پاس ہوتا تو اس وقت سر کے بل ناچ نہ رہا ہوتا۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ ہم اسے حاصل کر لیں گے۔ میں نے جاوا کو اس کی ضمانت دی ہے۔''

میں سناٹے میں تھا۔ ''آرا کوئے ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر مہناز کے پاس۔''

''اور ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟''

''ہمارے آس پاس ہی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یہاں فرید کوٹ میں؟''

''نہیں یار! انڈیا میں۔'' عمران نے کہا اور سگریٹ کا گہرا کش لے کر پُرسوچ انداز میں چھت کو گھورنے لگا۔

''اس سے میں کیا سمجھوں؟ کیا تم جانتے ہو کہ مہناز اس وقت کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم جاوا کو اتنی بڑی گارنٹی دے رہے ہو۔''

''پتا تو نہیں لیکن پتا چلنے والا ہے۔'' وہ وثوق سے بولا۔

''کس طرح؟''

''انگلینڈ میں رہنے والے ایک ہمدرد کے ذریعے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ ابھی تم اپنا سارا دھیان ثروت پر رکھو۔ یار! تم اب بھی اسے اپنا نہ سکے تو پھر یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔''

''سمجھو میں...... میں ڈوب چکا ہوں عمران۔'' میں نے یاسیت سے کہا۔ ''لگتا ہے کہ وہ بہت دور جا چکی ہے مجھ سے۔''

''اوئے پھر وہی ہندی فلمیں۔ پھر وہی دلیپ کماری اور راج کپوری۔ میں سر توڑ دوں گا تمہارا۔ تم دونوں کے سامنے خود کو باقاعدہ آگ لگا لوں گا۔''

''پھر بھی کچھ نہیں ہو سکے گا۔ یہ ایک بند گلی ہے یار...... اور یہاں سفر ختم ہو جاتے

ہیں۔"

وہ پریشان نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "اچھا اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تم یہ بتاؤ، ڈنڈ بیٹھکیں وغیرہ لگائی ہیں نا...... تیل شیل مل لیا ہے؟"

"لیکن کس لئے؟"

"یار! ڈنڈ بیٹھکیں کس لئے لگائی جاتی ہیں؟ شادی کے لئے یا لڑائی کے لئے۔ اور شادی کا ابھی دور دور تک پتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ لڑائی کے لئے ہی کہہ رہا ہوں۔"

"کیا کرنا ہے؟"

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ آراکوئے تک پہنچنے کے لئے۔"

"اور ثروت؟"

"ثروت تو یہیں رہے گی۔ جیسے ٹیپو سلطان کے بیٹے رہے تھے انگریزوں کے پاس یرغمالی کے طور پر۔"

"یعنی ہمیں آراکوئے کے بدلے ثروت کی رہائی ملے گی؟"

"ہاں، یہی طے ہوا ہے۔" عمران نے گہرا کش لے کر کہا۔

"اور اگر ہم ناکام ہوئے تو؟"

"ناکامی کی گنجائش نہیں ہے۔ دادا جی فرماتے تھے۔ دنیا میں دو کاموں کے علاوہ ہر کام ممکن ہے۔ میزبانوں کے سامنے باعزت طریقے سے آم چوسنا اور سخت گرمی میں کھوئے ملائی والی قلفی کو گرنے سے بچانا۔ یہ اپنے نوپی کا جو مشہور قول ہے، وہ دراصل دادا جی نے ہی نوپی کے منہ میں دیا تھا۔ نوپی سمجھتے ہو نا۔ نپولین بوناپارٹ، دادا جی کا لنگوٹیا تھا۔ دونوں اکٹھے بیٹھ کر لڑکیوں کو لوّ لیٹر لکھتے تھے۔ نپولین نے کہا تھا کہ میری ڈکشنری میں ناممکن کا لفظ ہے ہی نہیں۔ ہمیں بھی یہی سوچ کر آگے بڑھنا ہوگا۔"

"لیکن کرنا کیا ہے؟"

"وقت سے پہلے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ دیکھو، منو بھائی سے لے کر امجد اسلام امجد تک اور محی الدین نواب سے لے کر احمد اقبال تک کسی نے بھی وقت سے پہلے کچھ بتایا ہے؟ قبل از قسط کچھ پتا نہیں چلتا، کچھ نہیں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "جن رائٹر لوگوں کا تم نے نام لیا ہے، ان کے بارے میں جانتے ہو؟"

"کسی کے بارے میں بات کرنے کے لئے اس کے بارے میں جاننا ضروری نہیں

ہوتا۔ یار! لوگ تو بغیر جانے کسی شخص پر پوری کتاب لکھ مارتے ہیں۔ ایسے ایسے خفیہ گوشوں سے نقاب اٹھاتے ہیں کہ شخصیت بے چاری تڑپ تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ کئی شخصیات تو صدمے سے اسپتال کے سی سی یو وغیرہ میں جا پہنچتی ہیں۔ دادا جی کا وصال بھی تو ایک ایسی حرکت کی وجہ سے ہوا تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ان پر کس نے کتاب لکھی تھی؟"

"ان پر نہیں لکھی تھی، انہوں نے لکھی تھی۔ گوجرانوالہ کے ایک مشہور پہلوان کے بارے میں۔"

"کون سا پہلوان؟"

"نام نہیں بتاؤں گا۔ اس کے پوتے بھی بڑے غصیلے پہلوان ہیں اور لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ کیا تم مجھے بھی دادا جی کے پاس پہنچانا چاہتے ہو؟"

وہ پٹری سے اتر چکا تھا۔ ایک بار اس کی قوتِ گویائی حرکت میں آئی تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ پنجرے کے اندر خوں خوار ریچھ اب مچھلی کے بعد بھیڑ کے گوشت کا ٹکڑا بھی کھا چکا تھا اور ایک بار پھر بھوکی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

O......❖......O

ثروت ابھی تک اس صدمے سے سنبھلی نہیں تھی جس نے اسے پرسوں بے ہوش کیا تھا۔ اس کے بالکل سفید رنگ میں ایک نقاہت زدہ زردی گھلی ہوئی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ میں دو چار روز کے لئے اسے یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں تو وہ دہل گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھیں ایک دم کھنڈرات کی طرح ویران ہو گئیں۔

"نہیں تابش! میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ آپ کہیں گے وہاں خطرہ ہے لیکن مجھے وہ خطرہ منظور ہے۔"

"ثروت! جس طرح میں اور عمران سچویشن کو سمجھ رہے ہیں، تم نہیں سمجھ رہی ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے۔" میں ثروت کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں ایک یرغمالی کے طور پر موجود ہے۔

وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھی۔ آخر میں نے اسے بتایا۔ "جاوا ہم سے جو کام لینا چاہ رہا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمہیں کسی طرح کا کوئی گزند نہ پہنچائے۔ اس نے گارنٹی دی ہے اور جاوا جیسے لوگ ایسی گارنٹیوں کا پاس کرتے ہیں۔"

وہ بڑی زود فہم تھی۔ سمجھ گئی کہ میری بات کے پیچھے کیا ہے۔ میری آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے بولی۔ ''میرا یہ اندازہ درست ہے کہ یہ شخص مجھے اپنے پاس رکھ کر آپ کو کسی بہت خطرناک کام کے لئے مجبور کر رہا ہے۔ پلیز تابش! آپ اس کے چکر میں نہ آئیں۔ اگر آپ کو کوئی خطرہ ہی مول لینا ہے تو پھر اس بندے کے چنگل سے نکلنے کے لئے مول لیں۔''

''ثروت! ہم نے سب کچھ ناپ تول لیا ہے۔ جو رسک ہم لے رہے ہیں، وہ اس رسک سے بہت چھوٹا ہے جو ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش میں لیں گے۔ تم اپنے دماغ کو ان سوچوں سے تکلیف مت دو۔ تم بس دعا کرو اور حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جانا ہے اور یہ بھی مت سمجھو کہ تم یہاں بالکل اکیلی رہو گی۔ عمران نے تمہاری کمپنی کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ ایک دبنگ خاتون یہاں تمہارے ساتھ رہے گی۔ بہت ہوشیار اور بہت جی دار۔ تمہارا وقت اچھا گزرے گا اس کے ساتھ۔''

''کس کی بات کر رہے ہیں؟''

''میڈم صفورا۔ وہ بھی آرا کوئے کے لئے بھاگ دوڑ کرنے والوں میں شامل رہی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں وہ ہمارے ساتھ ہی تھی۔ اب بھی وہ عمران کے ساتھ یہاں آئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ یہاں تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ ویسے بھی میں اور تم ہر وقت رابطے میں رہیں گے۔ جاوا سے بات ہو گئی ہے۔ میڈم صفورا اپنا سیل فون اپنے ساتھ رکھ سکے گی۔ میں اس پر وقتاً فوقتاً تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔''

کافی دیر کی بحث کے بعد آخر میں ثروت کو آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میڈم صفورا اسی بلڈنگ میں عمران کے ساتھ موجود تھی۔ پروگرام کے مطابق وہ ثروت کے پاس پہنچ گئی۔ وہ حسبِ معمول پینٹ اور شرٹ میں ملبوس تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں اس کا سر مونڈ دیا گیا تھا لیکن اب ہمیشہ کی طرح بوائے کٹ بال اس کی پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ اپنی چھوٹی بہن کی موت کی وجہ سے وہ عمران کی جانی دشمن رہی تھی مگر اب دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی عمران کی گرویدہ تھی۔ زرگاں میں عمران نے جس طرح اس کے زخم پر ہونٹ رکھ کر سانپ کا زہر چوسا تھا اور اس کی جان بچائی تھی، وہ ناقابلِ فراموش تھا۔

میڈم صفورا مجھ سے باقاعدہ گلے ملی اور پھر ثروت کو بھی گلے سے لگا کر اس کا سر چوما۔ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر بولی۔ ''بالکل وری نہیں کرنا ڈیئر...... سمجھو تابش کہیں نہیں جا رہا، وہ یہیں تمہارے پاس ہے۔ ہم بہت اچھا وقت گزاریں گے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''اب یہاں کھڑے کیوں ہو؟ کیا پرابلم ہے...... کیا جانے کو دل نہیں چاہ رہا؟'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''بس چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ ثروت کو بغور دیکھ کر بولی۔ ''مجھے نہیں پتا ثروت ڈیئر کہ تم دونوں میں اب کیا تعلق ہے...... لیکن جب میں بھانڈیل اسٹیٹ میں تھی تو تمہارے ساتھ ایک زبردست قسم کا غائبانہ انٹروڈکشن ہو چکا تھا۔ تابش سب کچھ بھول چکا تھا لیکن تمہارا نام نہیں بھولا تھا۔ یہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر جنگل میں بھاگتا تھا اور تمہارا نام لیتا تھا۔ سلطانہ اس کو پکڑ پکڑ کر لاتی تھی......''

میں دہل گیا۔ سلطانہ کے بارے میں ثروت کو ابھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ ثروت بھی جیسے سوالیہ نظروں سے میڈم صفورا کو دیکھنے لگی۔ وہ اطمینان سے بولی۔ ''سلطانہ پگوڈا کی ایک بوڑھی ملازمہ کا نام تھا۔ بڑا خیال رکھتی تھی اس کا۔''

میں سمجھ گیا کہ صفورا نے مجھے جان کر پریشان کیا ہے، ورنہ عمران اسے سب کچھ سمجھا چکا تھا کہ ثروت کے سامنے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں۔

میں نے ابھی تک ثروت کو اپنی اس شادی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو میری ''مکمل خود فراموشی'' کے زمانے میں ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک میرے بیٹے بالو کی موجودگی سے بھی بے خبر تھی۔ میں یہ سب کچھ ثروت سے چھپانا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی مجھے چھپانا تھا لیکن ابھی تک تیز رفتار حالات اور پریشانیوں نے مجھے اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔

جاوا کے اہلکار مجھے لے جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ حسبِ معمول دروازہ سلائیڈ ہو کر کھل گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں نہیں جکڑے گئے۔ میں ثروت کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا، وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہ کسی مرئی چیز کی طرح میرے جسم پر سرسرا رہی تھی۔ مجھے چھو رہی تھی۔ اس نگاہ کو جیسے زبان مل گئی تھی اور یہ کہہ رہی تھی...... اس دیارِ غیر میں...... دنیا کے بدترین دشمنوں کے درمیان خدا کے اور تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔ اس بات کو بھول مت جانا۔

○......❖......○

کافی دنوں بعد میں نے نیلا آسمان دیکھا اور کھلی فضا میں سانس لیا۔ عمران میرے ساتھ تھا۔ ہم نے نہا دھو کر شیو کیا تھا اور پریم چوپڑا کے فراہم کردہ نئے کپڑے پہنے تھے۔ ہم دونوں ایک ہلمین کار پر سوار تھے۔ جاوا کی طرف سے ہمیں بیس پچیس ہزار روپے کیش دیا گیا تھا۔ اپنے کسی بھی مسئلے کے حل کے لئے ہمیں تین فون نمبرز دیئے گئے تھے۔ دو موبائل، ایک لینڈ لائن۔ یہ نمبرز ہمارے لئے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ ہم اس رابطے کے ذریعے جاوا سے کچھ بھی طلب کر سکتے تھے اور کسی بھی مشکل میں مدد حاصل کر سکتے تھے اور یہ سہولت صرف فرید کوٹ یا پنجاب تک محدود نہیں تھی۔ اس کا دائرہ انڈیا کے ہر شہر تک پھیلا ہوا تھا۔ جاوا نے عمران کو ہدایت کی تھی کہ پولیس یا قانون نافذ کرنے والی کسی بھی ایجنسی کی مداخلت پر ہم کسی سے الجھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ فون پر اسے صورتِ حال سے آگاہ کریں۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ دن روشن اور قدرے خشک تھا۔ ہم فرید کوٹ کی سڑکوں پر گاڑی چلاتے رہے اور شہر کا نظارہ کرتے رہے۔ یہاں گوردوارے کثرت سے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں سائیکل رکشا بھی نظر آئے۔ ہر طرف رنگ برنگی پگڑیوں کی بہار تھی۔ عمران ایک بار پھر سخاوت کے موڈ میں تھا۔ وہ کئی جگہ رکا اور اس نے بڑی خاموشی سے، محتاج دکھائی دینے والوں کی مدد کی۔

کچھ دیر بعد ہم ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ ہم نے ''ہائی ٹی'' لی اور عمران نے آتی جاتی سکھ خواتین کو تاڑا اور ٹھنڈی آہیں بھریں۔ اس قسم کی حرکات وہ صرف تفریحِ طبع کے لئے کرتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اداکاری چھوڑو اور حقیقت نگاری کی طرف آ جاؤ۔ اب منہ سے کچھ پھوٹو کہ کرنا کیا ہے؟''

خلافِ توقع اس نے بے پرکی نہیں اڑائی اور چائے کے کپ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''تابی! آراکوئے ڈاکٹر مہناز کے پاس ہے...... اور کھوج ملا ہے کہ ڈاکٹر مہناز اس وقت انڈیا

میں ہے۔ شاید رتناگری شہر کے آس پاس۔''

''یہ کھوج ملا کیسے ہے؟''

''پھر ایک فون کال۔ یہ فون کال، سیل فون کے ذریعے کوئی دو ہفتے پہلے انڈیا سے انگلینڈ میں کی گئی ہے۔ نوٹنگھم کے ایک پروفیسر ڈاکٹر اویس چوہان کے نمبر پر۔ ان ڈاکٹر صاحب نے بابے جلالی کو اطلاع دی ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ ڈاکٹر مہناز، جلالی کے فارم میں رہ رہی ہے اور اس کا علاج معالجہ کر رہی ہے۔''

''کال کس نے کی؟''

''ڈاکٹر مہناز نے۔ پروفیسر ڈاکٹر چوہان پاکستانی ہیں اور اس میڈیکل کالج میں پڑھاتے رہے ہیں جہاں سے ڈاکٹر مہناز نے ایم بی بی ایس کیا تھا۔''

''کیا بات ہوئی دونوں میں؟''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ بات ہو نہیں سکی۔ ڈاکٹر مہناز بس چند فقرے ہی بول پائی...... سلسلہ منقطع ہو گیا۔''

''کیا کہا اس نے؟''

''یہی کہ وہ رتناگری میں ہے۔ بڑی مشکل میں ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے...... پروفیسر چوہان نے اس سے پوچھا کہ وہ کس جگہ ہے۔ وہ اس کا جواب نہیں دے سکی۔ وہ جلالی صاحب کی صحت کے بارے میں پوچھ رہی تھی جب فون بند ہو گیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر مہناز کے ساتھ اس کا ایک کلاس فیلو ڈاکٹر بھی تو تھا؟''

''ہاں ڈاکٹر رسام۔ لیکن اس کے بارے میں مہناز نے کوئی بات نہیں کی۔''

''حیرانی کی بات ہے۔ تم ڈاکٹر مہناز کو لاہور اور راولپنڈی وغیرہ میں ڈھونڈتے رہے ہو اور وہ یہاں رتناگری میں پائی جا رہی ہے۔ وہ کیا کرتی پھر رہی ہے؟''

''وہ کچھ نہیں کر رہی۔ شاید کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی ہے۔''

''کون لوگ ہو سکتے ہیں؟''

''زیادہ امکان یہ ہے کہ ان کا تعلق بھی آراکوئے والے معاملے سے ہی ہو گا۔''

''اگر ایسا ہے تو...... پھر مہناز کو پکڑ کر رکھنے کا مطلب کیا ہے؟''

''یہی کہ آراکوئے اب مہناز کے پاس نہیں ہے۔ وہ اسے کہیں کھو چکی ہے یا پھر اس نے اسے کہیں محفوظ کر دیا ہے۔ اب اسے پکڑنے والے اس کے ذریعے مورتی تک پہنچنا

چاہتے ہیں لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہوسکتا ہے اور یہ رخ زیادہ خطرناک ہے......''
عمران کی کشادہ پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔

''کیسا رخ؟''

اس نے سگریٹ کا کش لیا اور دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے بولا۔''پروفیسر چوہان جنھوں نے مہناز کی کال سنی ہے، ایک خاص بات بتا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے اندازے کے مطابق مہناز کسی ایسی جگہ سے فون کر رہی تھی جہاں بیک گراؤنڈ میں ڈھول وغیرہ بجنے کی آواز آرہی تھی اور یہ ایسے ڈھول نہیں تھے جو آرکسٹرا میں بجائے جاتے ہیں بلکہ یہ نقارے کی طرح تھے۔''

''نقارے کی طرح؟''

''میرا ذہن تو اس سلسلے میں پگوڈا کی طرف ہی جاتا ہے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ مہناز ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی ہو جو اس سے پہلے بھی آرا کوئے کو پاکستان سے برآمد کر کے بھانڈیل اسٹیٹ لے گئے تھے۔ تمہیں یاد ہی ہوگا، وہاں عبادت گاہوں میں کس طرح کے ڈھول پیٹے جاتے تھے۔''

عمران بڑی سنسنی خیز بات کہہ رہا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ بات قابلِ غور تھی۔ یہ ممکن تھا کہ مہناز اس وقت کسی پگوڈا کے بھکشوؤں کے پاس ہو اور اسے پگوڈا کے اندر ہی کہیں چھپا دیا گیا ہو لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ یہاں تک پہنچی کیسے؟''

میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا۔''عمران! پھر تو ایک اور بات بھی ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ آرا کوئے اور مہناز دونوں بھکشوؤں کے قبضے میں ہوں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''پہلے بھی تو ایسا ہو چکا ہے۔ بھکشوؤں نے نہ صرف آرا کوئے برآمد کیا بلکہ آرا کوئے کے ساتھ ساتھ مجھے، میڈم صفورا اور دیگر لوگوں کو بھی مجرم گردان کر اپنے ساتھ پاکستان سے بھانڈیل لے گئے۔ بھانڈیل میں ہمیں آرا کوئے چرانے کی سزا دی گئی۔ پگوڈا کا جبری خادم بنا دیا گیا۔ ممکن ہے کہ مہناز کو بھی کسی سزا کے لئے ہی کہیں بند رکھا گیا ہو۔''

''اس پہلو سے میں نے نہیں سوچا تھا۔ تمہاری بات میں وزن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مورتی اور مہناز دونوں ان لوگوں کے پاس ہوں۔''

میں نے گہری سانس لی۔''پتا نہیں کیا شے ہے یہ مہناز۔ بوڑھے جلالی کے علاج میں اتنا آگے چلی گئی کہ اس سے شادی کر بیٹھی۔ اب ایک بیوی کی حیثیت سے اس کی بات

نبھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مورتی کے لئے جان جوکھم میں ڈال رہی ہے بلکہ جان گنوا رہی ہے۔ مجھے تو کم ہی امید ہے کہ بچ پائے گی۔''

''صنفِ نازک کی بغاوت اسی طرح کی ہوتی ہے پیارے۔ انوکھے سے انوکھا کام کیا جاتا ہے اور پھر اسے پورا کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی جاتی ہے۔ مرنے سے پہلے بابے جلالی نے مہناز سے یہی فرمایا ہوگا کہ اس کا عہد نبھانا ہے۔ مورتی کو اس کے اصل مالک تک پہنچانا ہے۔ چوروں کے ہاتھ نہیں آنے دینا۔ اس نے کہا ہوگا جو حکم میرے بزرگ سرتاج۔ اب ہوا یہ ہے کہ بابا جلالی بسترِ مرگ سے اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ اب عاشق شیخوپورہ میں اور محبوبہ رتناگری میں پائی جا رہی ہے۔ کم از کم اب تک تو پائی جا رہی ہے۔ بابا جلالی اپنے پرانے گراموفون پر آج کل یقیناً یہی غزل سن رہا ہوگا، کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں......اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو......اب مہناز کو ڈھونڈنا کیسے ہے؟''

''ظاہر ہے، اگر وہ رتناگری میں ہے تو اسے جہلم یا خانیوال میں تو نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔ ہمیں رتناگری ہی چلنا ہوگا۔ وہ اچھا خاصا شہر ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ بدھ مت کی عبادت گاہیں زیادہ نہ ہوں۔ اگر ہمارا اندازہ درست ہے اور فون کال کے پیچھے سنائی دینے والے ڈھول کسی پگوڈا ہی کے تھے تو پھر ہمیں اپنی تلاش رتناگری کے پگوڈوں سے شروع کرنی ہوگی۔''

''یہ رتناگری ہے کس طرف؟''

''بات تو ایسے کر رہے تھے جیسے رتناگری میں تمہارا ننھیال ہے۔ اب پوچھ رہے ہو ہے کس طرف؟''

''معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''ہم میڈیا والے ہیں۔ ہم نے تو بین چینل پر بڑوں بڑوں سے معافی منگوائی ہے۔'' وہ مسکرایا پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔''یہ مہاراشٹر کا ایک ساحلی شہر ہے۔ ممبئی سے بس کے ذریعے ساڑھے چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ وہاں ائیرپورٹ نہیں ہے۔ بائی روڈ ہی جانا پڑے گا۔ ممبئی میں اتریں گے، وہاں سے بس پکڑیں گے۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔''جاوا کو پتا ہے کہ تمہیں آرا کوئے کے حوالے سے کلیو ہاتھ آیا ہے؟''

''کبھی کبھی بالکل گھامڑ ہو جاتے ہو۔ جاوا کو بتا دیا تو پھر اپنے ہاتھ کیا رہ جائے گا۔ اسے کچھ نہیں بتایا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ آرا کوئے ڈھونڈیں گے اور اس کے منہ پر ماریں گے۔''

"میرا خیال ہے کہ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ اگر مہناز کو اس علاقے سے کہیں اور پہنچا دیا گیا تو کام اور مشکل ہو جائے گا۔"

"میں دیر نہیں کرتا۔ ہمارے خاندان میں دیر کرنے کا رواج ہی نہیں ہے۔ ہم ہر کام میں جلدی کرتے ہیں بلکہ میرے ایک تایا تو اتنے پھرتیلے تھے کہ رکشے میں ہی پیدا ہو گئے تھے۔"

"زبردست...... انہوں نے اپنی شادی کا بھی انتظار کیا تھا یا نہیں؟"

"بکواس نہ کرو۔ دراصل ان پر اپنے یار نپولین کے خیالات کا بڑا اثر تھا۔ وہ بھی ہر کام میں بڑی پھرتی کرتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ نپولین اپنے بڑے بھائی سے پہلے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے، دونوں بھائیوں میں آخر تک جھگڑا رہا۔ جھگڑا بڑھ جاتا تھا تو دادا جی ان کی صلح کراتے تھے۔ اس صلح کی خوشی میں اکثر نرالے کی مٹھائی کھائی جاتی تھی۔"

"یعنی اس زمانے میں بھی نرالے کی مٹھائی تھی؟"

"کھوتے! جو لوگ وقت سے آگے ہوتے ہیں، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تم نے خود ہی تو ذکر کیا تھا ابن صفی صاحب کا۔ دیکھو، محترم نے میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی مجھ سے ملتا جلتا کردار تخلیق کر لیا تھا نا۔ چلو اٹھو، اب تم خود دیر کر رہے ہو۔"

اس نے ویٹر کو فراخ دلی سے ایک ہزار روپے کی ٹپ دی اور ہم اٹھ کر باہر گاڑی میں آ بیٹھے۔

O......❖......O

اگلے روز ہمارا سفر فرید کوٹ سے شروع ہوا۔ بذریعہ سڑک ہم دہلی پہنچے۔ پریم چوپڑا بنفس نفیس ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ہمیں ہر قسم کی لاجسٹک سہولت فراہم کر رہا تھا۔ ہمارے ٹکٹ تیار تھے۔ چوپڑا نے ہمیں سی آف کیا۔ ہمارے بس میں ہوتا تو "اسے" سی آف کرتے اور عدم آباد کے لئے کرتے۔ اس خبیث نے آشا کور کو بے آبرو کیا تھا۔ بعدازاں وہ جاوا کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئی تھی۔ لیکن ابھی ہم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چوپڑا پر اکثر لوگوں کو فلمی پریم چوپڑا کا ہی شبہ ہوتا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے تھے اور شاید حیران بھی ہوتے تھے کہ یہ بوڑھا ولن پھر سے جوان کیسے ہو گیا۔ وہ اس صورتِ حال سے لطف اٹھاتا تھا۔

"ہم دہلی ایئر پورٹ سے سہ پہر کے وقت اڑے اور ممبئی میں پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ فضا سے ممبئی کا نظارہ دلفریب تھا۔ بحر ہند کے کنارے دور تک یہ روشنیوں اور رنگوں کا شہر پھیلا ہوا تھا۔ اس شہر میں سب رنگ تھے۔ غلیظ بستیاں بھی تھیں اور عالی شان محلات بھی۔

یہاں گندی نالیوں میں کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے لوگ بھی تھے اور شان و شوکت کی اونچی مسندوں پر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے سپر اسٹار بھی۔ یہ انڈیا کی فلم نگری تھی۔ تضادات سے بھری ہوئی اور گلیمر میں لتھڑی ہوئی اور ہم یہاں لینڈ کر رہے تھے۔ میں اور عمران دانش۔ ایک ایسا مشن ہمارے سپرد تھا جو کچھ لوگوں کو آرا کوئے کی صورت میں بے انتہا دولت دے سکتا تھا اور جس کی کامیابی کئی بین الاقوامی طالع آزماؤں میں تہلکہ مچا سکتی تھی۔ گوشت کے پہاڑ ریان ولیم جیسے وہ سب لوگ جو آرا کوئے کے پیچھے تھے...... اور سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے ڈان، گینگسٹر، جواری اور فتنہ ساز۔ یہ لوگ آرٹ کے اس نادر نمونے کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ اس نمونے کی خاص شہرت اس کی طلب میں مزید شدت پیدا کر رہی تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ آرا کوئے کا مطلب وہ مورتی ہے۔ جو اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور ان لوگوں کی حفاظت بھی کرتی ہے جن کے پاس ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دوسری جنگ عظیم کے چھ واقعات بھی بڑے وثوق سے بیان کئے جاتے تھے۔

عمران سارے راستے، چمکیلی ساڑھی والی انڈین ایئر ہوسٹس سے آنکھیں لڑاتا رہا اور مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہا کہ وہ سخت ڈانٹ کھائے گا لیکن خیریت گزری۔ ممبئی کے چترا پتی ایئر پورٹ پر ہمارا استقبال جاوا ہی کے ایک سوٹڈ بوٹڈ کارندے نے کیا۔ ہمیں ایک شاندار گاڑی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچا دیا گیا۔

ہوٹل کے شاندار سوئٹ میں پہنچ کر عمران نے ٹائی اتار کر ایک طرف پھینکی اور قمیص کے بٹن کھول کر گداز بستر پر گر پڑا۔

یہاں ہماری سہولت کا ہر سامان موجود تھا۔ وارڈ روب میں کپڑوں کے کئی جوڑے اور سلیپنگ گاؤن وغیرہ آویزاں تھے۔ ایک طرف دو بڑے شولڈر بیگ رکھے تھے۔ میں نے ایک بیگ کی زپ کھولی۔ سب سے پہلے نگاہ ایک زبردست پسٹل اور اس کے میگزینز پر پڑی۔ پسٹل کا ایک شاندار سائلنسر بھی دکھائی دیا۔ فالتو ایمونیشن بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں تھیں۔ دستانے، دھوپ کا چشمہ، پی کیپس، ٹارچ، ٹیلی اسکوپ، ڈیجیٹل کیمرا وغیرہ۔

عمران نے اپنے پسندیدہ برانڈ کا سگریٹ سلگایا اور اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ "سچ بتاؤ جگر! اس وقت ہم جیمز بانڈ نہیں لگ رہے۔ ایک خطرناک مشن پر ممبئی میں وارد ہوئے ہیں۔"

"جیمز بانڈ واحد ہے جمع نہیں۔" میں نے کہا۔

''یار! واحد ہی سمجھو۔ تم تو کسی گنتی میں ہی نہیں ہو۔ بس تمہاری عزت بڑھانے کے لئے تمہیں ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارر......رے یہ غضب نہ کرنا۔ یہ ممبئی ہے پیارے۔ بچے راستہ بھول جاتے ہیں بلکہ جوان اور بوڑھے بھی بھول جاتے ہیں۔ ایسی ایسی کافر حسینائیں ہیں یہاں جو بندے کو چٹکیوں میں اڑاتی ہیں اور منٹوں میں اس کی مت مار کر اسے بیڈ روم تک پہنچا دیتی ہیں۔ خبردار، ہوشیار، یہ ممبئی ہے میرے جگر پارے...... ممبئی۔''

''لیکن جیمز بانڈ جی! ہم ممبئی میں تو نہیں آئے۔ رتنا گری جانا ہے ہمیں۔''

''مگر آج کی رات تو ممبئی میں ہی گزرے گی۔ مستقبل کے بجائے حال پر...... بلکہ کسی اچھے ڈانسنگ ہال پر نظر رکھنی چاہئے۔''

''تم رکھو نظر۔ میں تو سونے لگا ہوں۔ بشرطیکہ تم مزید بکواس نہ کرو۔''

''میرا خیال ہے کہ ثروت کی یاد ستانے لگی ہے۔ اس شہر کی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔ چلو فون کرلو اسے۔''

''نہیں، اب صبح ہی کروں گا۔''

''اچھا تو میں کرلوں۔''

''کس کو؟''

''یار چند ایک فرشتے ہیں یہاں۔ تم ان کو میرے مؤکل بھی کہہ سکتے ہو۔ ان کو ذرا حرکت میں لانا ہے۔''

اس کے بعد وہ فون کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اس نے ممبئی میں اور رتنا گری میں چار پانچ بندوں کو فون کیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہم سے پہلے ہی رتنا گری پہنچ چکے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک بندے کا نام شیکھر بھی تھا اور یقیناً یہ مقامی ہی ہوگا۔ عمران نے شیکھر کے ساتھ بھی بے تکلفی سے بات چیت کی اور اندازہ ہوا کہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہے۔

اس نے گفتگو ختم کی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! آج مجھے ایک بات بتاؤ۔ مجھے اتنا عرصہ ہوگیا تمہارے ساتھ رہتے ہوئے لیکن مجھے ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ تمہارے لئے کون لوگ کام کرتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''یہی کہ یہ تمہارے مؤکل کہاں کہاں پائے جاتے ہیں؟ میں تو ان میں سے صرف دو چار کو ہی جانتا ہوں۔ ایک یہ جیلانی۔ اس کے علاوہ اقبال، امتیاز اور شاہین وغیرہ۔''

''شاید تمہارا خیال ہے کہ میں نے اپنی کوئی خفیہ ایجنسی وغیرہ بنا رکھی ہے۔ کوئی ایسی خفیہ سروس جو منہ پر نقاب چڑھا کر مجرموں کا پیچھا کرتی ہے اور ان کو چھاپتی ہے، وطن دشمنوں کی ناک میں نکیل ڈالتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسا کچھ نہیں ہے یار، بس اپنے یار دوست ہیں، تعلق والے ہیں جو ضرورت پڑنے پر میری مدد کرتے ہیں۔ میں وقت پڑنے پر ان کی مدد کرتا ہوں۔''

''لیکن یہ لوگ تو ہر جگہ موجود ہیں۔ آسٹریا میں، انگلینڈ میں اور اب پتا چل رہا ہے کہ انڈیا میں بھی۔ یہ ہر بڑے شہر میں تمہاری آواز پر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سسٹم کی طرح ہے۔''

''سسٹم یہی ہے جو میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے۔ تم دوسروں کی مدد کرو، وہ تمہاری مدد کریں گے۔ مجھے دوستیاں بنانا اور انہیں قائم رکھنا اچھا لگتا ہے۔ زندگی میں اور رکھا بھی کیا ہے یار؟''

مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے یا غلط...... لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔

ٹی وی پر کوئی فلم چل رہی تھی جس میں مار دھاڑ اور قتل و غارت کے مناظر تھے۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر انٹرنیٹ پر دیکھے ہوئے خونی سین گھومنے لگے۔ 16 افراد کا قتل اور وہ بھی ایسے سنسنی خیز انداز میں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے خود کو گولی ماری۔ صرف ایک بندے نے مزاحمت کی اور وہ اسٹیج کے بالکل پاس سے چلنے والی رائفل کی گولیوں کا شکار ہوا۔ میں ان میں سے بس ان دو بندوں کے چہرے ہی دیکھ پایا تھا جو بچ گئے تھے۔ میں اس بارے میں عمران سے مزید تفصیلات پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ ہر بار طرح دے گیا...... اسی دوران میں اچانک میری نگاہ کھڑکی سے نیچے ہوٹل کے صحن میں گئی۔ ایک گاڑی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ اس میں پچھلی نشست پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ دو تین ماڈرن لڑکیاں کچھ فاصلے پر کھڑی بڑے اشتیاق سے گاڑی میں بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں اور چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ میں نے دھیان سے کار سوار لڑکی کو دیکھا اور چونک گیا۔ وہ مشہور ایکٹریس ایشوریا رائے تھی۔ ایشوریا رائے یا پھر اس کی ہم شکل۔ تب میری نگاہ اس کی سبز ساڑھی پر پڑی۔ یہ خوب صورت ساڑھی میں نے پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی۔ سرحدی گاؤں میں جب چودھری انور کی پیلی حویلی میں ایشوریا، راجا کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہی تھی، یہی شاندار ساڑھی اس کے جسم پر تھی۔ اسی دوران

میں کار سوار ایشوریا رائے کسی بات پر مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ بھی میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ یہ اصلی ایشوریا والی مسکراہٹ سے کچھ مختلف تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی سویٹی عرف ایشوریا ہے جسے ہم پہلے شیخوپورہ میں اور پھر انڈین بارڈر کے قریب چودھری انور کے گاؤں میں دیکھ چکے ہیں۔ میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ بھی لڑکی کو دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی۔ یہ وہی لڑکی ہے ایشوریا کی ہم شکل۔ یہ پاکستان سے یہاں آئی ہے۔''

عمران نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا، اس میں سے ٹیلی اسکوپ نکالی۔ وہ بڑے دھیان سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ٹیلی اسکوپ میری طرف بڑھائی۔ میں نے فوکس درست کر کے دیکھا، وہ اب موبائل فون سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چمک تھی۔ مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہ وہی سویٹی ہے جو جاوا اور سلطان چٹے کے ساتھ تھی۔ میں نے عمران کو اس بارے میں بتایا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ کندھے سے لٹکایا اور بولا۔ ''آؤ اس کا پتا کریں۔''

اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میرا بازو پکڑا اور قریباً کھینچتا ہوا سوئٹ میں سے نکل آیا۔ ہم فرسٹ فلور کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے پہنچے۔ جس گاڑی میں ہمیں ہوٹل پہنچایا گیا تھا، وہ یہیں پارکنگ میں موجود تھی اور اس کی چابی عمران کے پاس تھی۔ ہم گاڑی تک پہنچے اور اسے کچھ آگے لے آئے۔ سویٹی عرف ایشوریا والی سفید گاڑی اب حرکت میں آ چکی تھی۔ تاہم خوش قسمتی سے زیادہ دور نہیں گئی تھی...... سفید گاڑی سڑک پر پہنچی اور پھر ٹریفک کے سیل رواں میں شامل ہو گئی۔ ہم اس کے پیچھے تھے اور اپنے تعاقب سے باخبر رہنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ ہمارا تعاقب نہیں ہو رہا۔ بس ایک خطرہ تھا کہ ہم رش میں سفید گاڑی کو کہیں کھو دیں گے۔ لیکن تعاقب کرنے والا عمران تھا۔ اس کی عقابی نظر اور ڈرائیونگ میں اس کی چابک دستی سے بچنا آسان نہیں تھا۔ نہایت مشکل ٹریفک کے باوجود ہم کسی نہ کسی طرح سفید گاڑی کے پیچھے لگے رہے۔ گاڑی ایک نیم رہائشی علاقے میں داخل ہوئی اور ایک عمارت کے گیٹ میں چلی گئی۔

ہم نے اپنی گاڑی عمارت کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک منی مارکیٹ کے سامنے روک دی۔ مارکیٹ میں خریداروں کی آمد و رفت تھی۔ کسی نے ہم پر توجہ نہیں دی۔ کچھ دیر تک گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ہم باہر نکلے۔ ٹہلتے ہوئے عمارت کے سامنے سے گزرے۔ کسی سرکاری ٹھیکیدار انیل مہرہ کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے پورچ میں روشنی تھی۔ گیٹ کے نچلے حصے سے ایک کتا حرکت کرتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے سوا کوئی نقل و حرکت نہیں تھی۔

ہم نے ایک شاپ سے ناریل پانی پیا۔ پھر ایک اسنیک بار سے سبزی کے رول لئے اور وہیں سڑک پر کھڑے کھڑے کھائے۔ اس تمام وقت میں ہماری نگاہیں کوٹھی کے گیٹ پر ہی لگی رہیں۔ عمران کو شاید توقع تھی کہ سویٹی عرف ایشوریا جلد ہی کوٹھی سے نکلے گی اور ہم دوبارہ اس کا پیچھا کر سکیں گے لیکن عملاً ایسا ہوا نہیں۔ ہم دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھے۔

آخر میں نے کہا۔ ''عمران! یار، ہم اپنی لائن سے ہٹ رہے ہیں۔ ہمیں صبح رتنا گری کے لئے نکلنا ہے۔ وہاں اس سے کہیں زیادہ ضروری کام ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''یار! اتنی خوب صورت پاکستانی لڑکی یہاں بدنیت اجنبیوں کے درمیان ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں جاننے کا حق ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کے پاکستانی ہونے سے زیادہ اس کا خوب صورت ہونا تمہارے لئے زیادہ اہم ہے۔''

''جو بھی سمجھو لیکن جستجو کرنا ہمارا حق ہے۔''

''یہ حق استعمال کرتے ہوئے ہمیں اب دو گھنٹے ہونے والے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ اس حق کو استعمال کرتے کرتے ہم اپنے رتنا گری والے فرض سے غافل ہو جائیں۔ یہ کوئی بھولی بھالی دیہاتی مٹیار نہیں ہے۔ ہوشیار، چالاک لڑکی ہے اور ممبئی میں قسمت آزمائی کے لئے اپنی مرضی سے جاوا وغیرہ کے ساتھ یہاں آئی ہے۔ اس کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بارے میں اگر تمہیں زیادہ ہی تجسس ہے تو بعد میں جاوا سے معلوم کر لینا......''

دو چار منٹ میں، مَیں نے عمران کو نیم رضامند کر لیا۔ ہم کوٹھی کے سامنے سے روانہ ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ کوٹھی کا گیٹ کھل گیا۔ ہم الرٹ ہو گئے۔ ہمیں توقع تھی کہ سویٹی عرف ایشوریا اپنی گاڑی پر باہر آ رہی ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کوئی گاڑی کوٹھی سے نہیں نکلی۔ ہاں، ایک گاڑی داخل ضرور ہوئی۔ وہ تیزی سے آئی تھی اور سیدھی اندر چلی گئی تھی۔ غالباً گاڑی کی آمد سے پہلے ہی گیٹ کیپر کو علم تھا کہ گاڑی آ رہی ہے۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے۔ گاڑی جب گیٹ میں داخل ہو رہی تھی...... ایک لمحے کے لئے، صرف ایک لمحے کے لئے ہمیں ایک منظر کی جھلک نظر آئی۔ یہ جھلک شاید کسی اور نے نہ دیکھی ہو لیکن ہم دونوں چونکہ گہری نظروں سے گاڑی کو تاڑ رہے تھے، اس لئے ہم دیکھ پائے۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ تیزی سے کھلا...... مگر تھوڑا سا کھل کر دوبارہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کے درمیان ہم نے گلابی کپڑوں والی کسی عورت کی جھلک دیکھی۔ وہ جیسے گاڑی

سے باہر نکلنا چاہ رہی تھی۔ لیکن کسی نے دروازہ بند کر کے اسے زبردستی روک دیا تھا۔

''ہائیں...... یہ کیا تھا؟'' عمران نے دیدے گھمائے۔

''کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔''

عمران خاموش رہا۔ پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ''اب تو یہاں رکنا ضروری ہو گیا ہے۔ یقیناً کوئی چکر چل رہا ہے یہاں۔''

''رکنے سے کیا ہوگا؟''

''تو پھر اندر چلتے ہیں۔''

''کس طرح؟''

''ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی راستہ۔''

میں نے کہا۔ ''تم بھی جانتے ہو عمران کہ ایشوریا اور دوسری لڑکیوں کو یہاں لانے والا جاوا ہی ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، جاوا کی زیرنگرانی ہو رہا ہے۔ اگر ہم مداخلت کریں گے تو جاوا کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اس نے تو ہمیں رتنا گری جانے کے لئے روانہ کیا تھا۔''

''جاوا صاحب کمینے کو کچھ پتا چلے گا تو پھر ہے نا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب بھی تمہیں بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے اس کوٹھی کا ایک راؤنڈ لگانے دو۔''

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک بغلی سڑک سے گزر کر ہم کوٹھی کے عقب میں آ گئے۔ یہاں تکون کی شکل کا ایک چلڈرن پارک تھا۔ پارک میں لائٹس کا انتظام نہیں تھا اور وہ سنسان پڑا تھا۔ کوٹھی کی عقبی دیوار پارک کی دیوار سے ملتی تھی۔ عمران نے اچھی طرح جائزہ لیا پھر بولا۔ ''چلو اندر گھستے ہیں۔''

''کس طرح؟''

''سلیمانی ٹوپی پہن کر۔ ہم کسی کو نظر نہیں آئیں گے۔'' اس نے شولڈر بیگ کی زپ کھولی۔ اس میں سے جدید پسٹل نکالا۔ اس پر سائلنسر فٹ کیا اور دو فالتو میگزین جیب میں رکھ لئے۔ تب اس نے بیگ کے اندر ہی سے دو نقاب نکالے۔ ایسے نقاب میں سے فقط آنکھیں ہی دکھائی دیتی ہیں اور یہ چہرے کو گردن تک ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ اسکائی ماسک بڑے باریک میٹریل کے بنے ہوئے تھے ان میں تین سوراخ بنے ہوتے ہیں۔ عمران نے بتایا تھا کہ انہیں ''تھری ہول بالاک لاوا'' بھی کہا جاتا ہے۔

عمران نے نقاب چڑھایا اور پھر میرے چہرے پر بھی چڑھا دیا۔ یہ تجربہ زندگی میں پہلی

بار ہو رہا تھا۔ ہم کار کو لاک کر کے اترے۔ دیوار دس فٹ کے قریب بلند تھی۔ عمران کو اس پر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے پہلے مجھے ہاتھ کا سہارا دے کر اوپر چڑھایا پھر خود چڑھ آیا۔ ہم بے آواز اندر کے گراسی لان میں کود گئے۔ اچانک اندھیرے میں ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ ہم کوٹھی میں موجود السیشیئن کتے کو فراموش کر چکے تھے۔ کم از کم میں تو فراموش کر چکا تھا۔ میری نگاہوں میں وہ ہیجان خیز منظر گھوم گیا جب کچھ عرصے پہلے میں اور فتح محمد شیخوپورہ کے قریب انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں داخل ہوئے تھے اور سلطان چٹا کے خوں خوار کتوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔

کتا تیزی سے ہمارے پاس آیا۔ اس کی آواز بلند اور انداز جارحانہ تھا لیکن پھر ایک دم ہی اس کے تیور بدل گئے۔ میں نے دیکھا، عمران اسے پچکار رہا ہے پھر وہ کتے کے بالکل قریب چلا گیا۔ اس کی گردن کو سہلانے لگا۔ اس کی تھوتنی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے ''جادو'' نے کام دکھایا۔ چند ہی سیکنڈ بعد کتا بالکل نارمل نظر آنے لگا۔ اس کی اوپر کو اُٹھی ہوئی دُم لٹک گئی پھر وہ کسی نادیدہ چیز کا پیچھا کرتا ہوا لان کے درختوں کی طرف چلا گیا۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین لیکن میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

ہم عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ ایک سنسان کوریڈور سے گزر کر ہم ایک ایسے کمرے کے سامنے پہنچے جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ ایک عام رہائشی کوٹھی تھی۔ گرد و پیش سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکین خاصا خوش حال ہے لیکن زیادہ اعلیٰ ذوق نہیں رکھتا۔ نہایت قیمتی اشیاء بے ترتیبی سے یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔

غالب گمان یہی تھا کہ سویٹی عرف ایشوریا رائے کو یہاں عیاشی کے لئے لایا گیا ہے۔ شاید نیم پلیٹ والا سرکاری ٹھیکیدار انیل مہرہ بھی آج کی رات سویٹی سے مستفید ہونے والا تھا...... بالکل جیسے کچھ عرصے پہلے یوسف فاروقی لاہور میں ''چندو'' کے شباب سے ''فیض یاب'' ہوا تھا۔ ہم ایک ایسی روشن کھڑکی کے سامنے پہنچے جس کا اندرونی پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ عمران نے اندر جھانکا۔ سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ عمران کے بعد میں نے کھڑکی سے چہرہ لگایا۔ اندر کوٹھی کے ڈائننگ ہال میں ایک شاندار کلاس روم کا منظر تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ حقیقی کلاس روم نہیں بلکہ کلاس روم کا ''سیٹ'' ہے۔ بہت سی لائٹس اور دو تین جدید مووی کیمرے نظر آ رہے تھے۔ بچوں کی شاندار کرسیاں، ڈیسک، بلیک بورڈ، پروجیکٹر، اسکرین اور کمپیوٹرز وغیرہ سب کچھ اس کلاس روم میں موجود تھا۔ دو افراد اس سیٹ پر چکرا رہے تھے تاہم اداکار وغیرہ کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"یہ تو اور معاملہ نکل آیا۔ کسی فلم کے سین شوٹ ہو رہے ہیں۔" عمران نے سرگوشی کی۔

"لیکن وہ عورت کون تھی جس نے کار سے نکلنے کی کوشش کی؟" میں نے جوابی سرگوشی کی۔

"ہو سکتا ہے ہمیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ دروازہ اتفاق سے کھلا ہو۔"

مگر دو تین منٹ بعد عمران کا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ ہمیں سویٹی عرف ایشوریا نظر آئی۔ اس نے ایک ٹائٹ ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ کندھے پر شولڈر بیگ تھا۔ سیٹ پر لانے سے پہلے اس کا مناسب میک اَپ بھی کیا گیا تھا۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے جب ہم نے سویٹی عرف ایشوریا کو ہوٹل کی پارکنگ میں دیکھا تو وہ کافی خوش وخرم تھی مگر اب صورتِ حال بالکل برعکس نظر آتی تھی۔ وہ بالکل گم صم تھی۔ اس کی کاجل بھری آنکھوں میں پریشانی اور ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ اسے بہت مجبور کر کے یہاں تک پہنچایا گیا ہے۔ گول چہرے والا ایک فربہ اندام گنجا پائپ پی رہا تھا اور کیمرا مین کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ دیگر دو تین افراد بھی اس کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص اس فلم کا ہدایت کار ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے سویٹی عرف ایشوریا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اپنا اسکرپٹ سمجھ رہی ہو نا تم؟ یہ ممبئی کا ہائی فائی انگلش میڈیم اسکول ہے۔ شہر کے باحیثیت ترین لوگوں کے بچے یہاں پڑھتے ہیں۔ تم یعنی ایشوریا رائے اپنی ایک دوست کے بچے کے داخلے کے لئے یہاں آئی ہو...... پرنسپل کا شوہر جو دراصل اس "اسکول چین" کا مالک بھی ہے، شراب کے نشے میں دھت دفتر میں بیٹھا ہے۔ وہ دفتر کا اندرونی دروازہ کھول کر تمہیں اس خالی کلاس روم میں لے آتا ہے۔ سب کچھ بڑے نیچرل انداز میں شوٹ ہو گا۔ بے حد نیچرل انداز میں۔ جیسے یہ کسی خفیہ کیمرے سے ریکارڈ کیا گیا ہے۔ حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے کبھی کبھی تم دونوں جزوی طور پر فریم سے آؤٹ بھی ہو جاؤ گے...... یعنی صرف تمہارا بالائی یا نیچے کا دھڑ کیمرے میں نظر آئے گا۔ ہم باہر سے ابھرنے والی بے ڈھنگی آوازوں کو بھی "ڈبنگ" میں شامل کریں گے۔ بات سمجھ رہی ہو نا تم؟"

سویٹی عرف ایشوریا خاموش تھی۔ اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ ڈائریکٹر نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر گرج کر بولا۔ "اے آنسو کیوں بہا رہی ہے؟ کس کا دیہانت ہو گیا ہے تیرے خاندان میں؟"

سویٹی ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے ڈائریکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "پلیز راج صاحب...... پلیز...... مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہو گا۔ میں نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں کر سکتی...... حرام زادی! کیوں نہیں؟ فلموں میں کام کرنے کے لئے نہیں آئی تھی یہاں؟ تجھے فلم میں ہی لے رہے ہیں نا۔"

"ایسی فلموں کے لئے نہیں آئی تھی۔ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ پلیز! مجھے معاف کر دیں۔"

"کتے کی بچی! بات تو ایسے کر رہی ہے جیسے کسی مندر کی پوتر گوپی ہو۔ کیا کیا نہیں ہوا تیرے ساتھ؟ کتنے لوگ تیرے شریر کو شرابی کتوں کی طرح بھنبھوڑتے رہے ہیں۔ اب یہ کیمرے کے سامنے ہو جائے گا تو کون سا آسمان ڈھے جائے گا۔"

"مم...... میرے لئے تو آسمان ہی ڈھے جائے گا جی۔ میری بدنامی کے اشتہار لگ جائیں گے۔ مم...... میں کیسے جاؤں گی پاکستان؟"

"تُو نے اب وہاں جا کر کرنا بھی کیا ہے۔ یہیں پر تیری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں جانے والا ہے۔ تیرے لیکھ چمکنے والے ہیں چندر مکھی۔" ڈائریکٹر راج نے دانت پیس کر کہا پھر میک اَپ مین سے بولا۔ "چلو دوبارہ کرو اس کی ٹچنگ۔ بیڑا غرق کر لیا ہے آنکھوں کا آنسو بہا کر۔"

اب سب کچھ واضح ہو رہا تھا۔ سویٹی عرف ایشوریا کو یہاں کسی عیاش کی شب رنگین کرنے کے لئے نہیں لایا گیا تھا۔ یہ اور ہی چکر تھا۔ اب وہ رو پیٹ رہی تھی اور ٹھیک ہی رو پیٹ رہی تھی۔ وہ دوسری لڑکی جو کار میں یہاں لائی گئی تھی اور جس نے کار میں سے نکلنے کی کوشش کی تھی، یقیناً اس کا معاملہ بھی یہی تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

"کچھ بھی ہے، پاکستانی ہے۔ اس کو بچانا ہے۔" عمران بولا۔

اس سے پہلے کہ ہم مزید کچھ سوچتے یا کرتے، اندر کا منظر کچھ تبدیل ہوا۔ ڈائریکٹر راج کے سیل فون پر کال آئی۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ اس کی آواز ہم تک صاف پہنچ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

پھر وہ ایک دم اٹین شین اور مؤدب ہو گیا۔ "جی سارو صاحب! میں بول رہا ہوں...... جی جی...... اوہ، یہ کیسے ہوا؟......" راج کے چہرے پر تاریکی سی پھیل گئی۔ وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا، تب پریشان لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے سارو صاحب! میں پیک اَپ کرواتا ہوں۔ او کے جی۔"

فون بند کر کے اس نے کھا جانے والی نظروں سے سویٹی کو دیکھا۔ تب اپنے کارندوں

سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پولیس کے چھاپے کی اطلاع ہے۔ جلدی نکلنا ہو گا یہاں سے، پندرہ منٹ کے اندر اندر سامان سمیٹو فٹافٹ، گاڑیوں میں رکھو۔''

ایک دم کھلبلی سی نظر آئی۔ تمام کارندے مصروف ہو گئے۔ کلاس روم کا ''سیٹ'' آناً فاناً ختم کر دیا گیا۔ لائٹس، کیمرے، ساؤنڈ سسٹم سب کچھ اٹھا لیا گیا۔ چند ہی منٹ میں کلاس روم پھر سے ڈرائنگ روم نظر آنے لگا۔ سویٹی بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھی۔ خوش قسمتی سے ہم اپنی جگہ پر محفوظ کھڑے رہے۔ پورچ کی طرف سے گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آئیں۔

''میرا خیال ہے یہ راج یہیں رہے گا۔''

عمران ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ راج ابھی تک کمرے میں موجود تھا اور اطمینان سے ٹی وی لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک ہٹا کٹا ملازم بھی اس کے آس پاس ہی موجود تھا۔

......گاڑیوں کی روانگی کے آٹھ دس منٹ بعد ہی پولیس اس کوٹھی میں آن موجود ہوئی۔ اندیشہ تھا کہ کوٹھی کا جائزہ لیتے ہوئے پولیس والے اس طرف بھی آ جائیں۔ ایسی صورت میں ہم پیچھے ہٹ کر کوٹھی کے پائیں باغ کی طرف نکل سکتے تھے۔ پولیس کے آنے کے فوراً بعد فربہ اندام راج اٹھ کر کسی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے سے پولیس والوں اور راج کی مدھم آوازیں ہم تک پہنچتی رہیں۔ قریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہم پر انکشاف ہوا کہ پولیس کوٹھی سے واپس جا رہی ہے۔ غالباً راج وغیرہ پولیس پارٹی کو مطمئن کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ پولیس کی گاڑی واپس چلی گئی۔ بیرونی گیٹ بند ہونے کی آواز آئی۔ فربہ اندام گنجا راج پھر سے ڈرائنگ روم میں آن موجود ہوا۔ وہ اب کافی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

اس نے ولایتی شراب کی بوتل کھولی۔ گلاس نکالا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر کوئی تامل فلم چل رہی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوٹھی میں راج کے سوا بھی ایک دو ملازم ہی ہیں۔ عمران نے دبی آواز میں کہا۔ ''چلو آؤ، ہدایت کار صاحب سے ہیلو ہیلو کریں۔''

ہم کھڑکی کے سامنے سے ہٹے اور گھوم کر اس حصے میں آئے جہاں سے ایک راہداری اندرونی حصے میں جاتی تھی۔ السیشین کتا برآمدے کی جالی کی دوسری جانب موجود تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا لیکن شور مچانے کی کوشش نہیں کی۔ بس دوستانہ انداز میں دُم ہلاتا رہا۔ سنی سنائی پر شک وشبہ ہو سکتا ہے لیکن آنکھوں دیکھی کو کیونکر جھٹلایا جائے۔ ایرانی بلیوں کے بعد یہ کتا بھی عمران کی خداداد صلاحیت کا ٹھوس ثبوت فراہم کر رہا تھا۔

پستول عمران کے ہاتھ میں تھا۔ تاہم ہم دونوں چوکس تھے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ کچن میں

کوئی موجود ہے۔ وہ دروازے کے بالکل پاس تھا اور کچھ گنگنا رہا تھا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہوا اور ملازم پر جھپٹا۔ یہ وہی ہٹا کٹا شخص تھا جسے ہم نے کچھ دیر پہلے ڈرائنگ روم میں دیکھا تھا۔ میری کامیابی یہی تھی کہ میں اس شخص کو آواز نکالنے کا موقع نہ دوں اور میں کامیاب رہا۔ میں نے اس کی توانا گردن اپنے بازو میں جکڑی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔ اس نے چار پانچ سیکنڈ کے لئے بہت زور مارا پھر اسے پتا چل گیا کہ ''کام بھاری'' ہے۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی اور ڈری ڈری نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران نے پستول اس کے سر سے لگا دیا اور خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ کچن کا دروازہ عمران پہلے ہی بند کر چکا تھا۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد جب اس شخص نے دوبارہ مزاحمت شروع کی تو عمران نے گھٹنے کی دو تین شدید ضربیں اس تنومند شخص کے پیٹ میں لگائیں اور اس کا دم خم ختم کر دیا۔

اگلے دو تین منٹ میں اس شخص نے وہی کیا جو ہم نے کہا۔ اس نے بتایا کہ پولیس واپس جا چکی ہے۔ کوٹھی میں راج صاحب اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ یہاں کچن میں راج صاحب کے لئے تکا بوٹی مائیکرو اوون میں تیار کر رہا تھا۔ اس کا نام نجیب تھا۔

ہمارے کہنے پر اس نے اوون بند کیا اور تکا بوٹی پلیٹ میں نکال لی۔ وہ ابھی کچی تھی۔ ہم اس پلیٹ سمیت راج کے پاس ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ پلیٹ ملازم کے ہاتھ میں تھی۔ عمران پستول بدست اس کے پیچھے تھا۔ ہمارے اندر پہنچنے کے باوجود راج ہماری آمد سے باخبر نہیں ہوا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا اور ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ لرزتے کانپتے ملازم نے پلیٹ راج کے سامنے تپائی پر رکھ دی۔ گوشت تقریباً کچا تھا۔

راج نے پہلے حیرت سے گوشت کی طرف اور پھر ملازم کی طرف دیکھا۔ ''اوئے، یہ اپنی ماں کا سر لایا ہے؟''

اچانک اسے احساس ہوا کہ گڑبڑ ہے۔ اس نے رخ پھیرا۔ عقب میں ہم تھے۔ راج کا چہرہ تاریک ہو گیا اور شراب کا گلاس اس کے ہاتھ میں ڈگمگا گیا...... ہمارے چہرے نقاب کے پیچھے گم تھے۔ ''کون ہو تم؟'' اس نے سنبھل کر پوچھا۔

عمران قدرے بھاری آواز میں بولا۔ ''تمہاری پھوپی کا اکلوتا بھائی ہوں۔ اب سمجھ لو کہ تمہارا کون ہوں...... اور خبردار ہاتھ اپنی جیبوں سے دور رکھو۔ ورنہ گولی سیدھی سر میں جائے گی۔'' وہ آخر میں پھنکارا۔

''ہاتھ سر سے اوپر کرو۔'' میں نے حکم دیا۔

ملازم نجیب نے تو فوراً عمل کیا مگر راج کام دکھا گیا۔ اس نے تیزی سے شیشے کی وزنی میز عمران پر الٹ دی۔ وہ شاید دو تین گنا تیزی بھی دکھاتا تو اپنا مقصد حاصل نہ کر سکتا۔ عمران نے بہ آسانی خود کو میز کی زد سے بچایا۔ فربہ اندام راج نے کافی پھرتی دکھائی اور عمران پر جھپٹا لیکن راستے میں ہی اس کی ٹھوکر کھا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

میں نے نجیب اور عمران نے راج کو سنبھال لیا۔ پہلے ایک آدھ منٹ میں دونوں نے مزاحمت کی لیکن پھر ان کی وہ دھنائی ہوئی جو اب تک نہیں ہوئی ہوگی۔ راج کی کلائی ٹوٹ گئی اور ملازم نجیب کے ناک منہ سے پرنالے کی طرح خون بہنے لگا۔ وہ دونوں فرش پر گرے پڑے تھے۔ ٹی وی کی اسکرین بھی چکنا چور ہو چکی تھی۔ عمران نے راج کو گریبان سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ پھر نجیب کو حکم دیا کہ وہ فرش پر بکھری ہوئی تکا بوٹی اکٹھی کر کے پلیٹ میں رکھے۔ چارو ناچار نجیب نے ہدایت پر عمل کیا۔ نجیب کا بالائی لباس مکمل طور پر تار تار ہو چکا تھا۔ اس کے ورزشی جسم پر بڑے بے ہودہ ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ یہ ٹیٹو ان لوگوں کے کاروبار سے مکمل میل کھاتے تھے۔

عمران نے تکا بوٹی راج کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''کھاؤ اسے۔''

راج کراہت کا اظہار کرتا رہا لیکن جب عمران نے پستول اس کے سر پر رکھا تو اس نے عمران کو خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک بوٹی منہ میں رکھی۔ عمران نے دانت پیس کر کہا۔ ''کچا گوشت تو تمہیں بڑا پسند ہے۔ ہر وقت اس گوشت میں دھنسے رہتے ہو۔ اب ایسے برے منہ کیوں بنا رہے ہو؟ لڑکیوں کو نوچ سکتے ہو تو یہ گوشت بھی کھا سکتے ہو۔ کھاؤ ورنہ کھوپڑا توڑ دوں گا۔''

وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس نے بوٹی تھوک دی اور دیوانہ وار عمران پر جھپٹا۔ اس نے عمران کے سینے پر ٹکر رسید کی پھر اس کے ہاتھوں سے پستول چھیننا چاہا۔ عمران نے یہ کوشش ناکام بنائی اور اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ لی۔ پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ ''ٹھنڈے ہو جاؤ ورنہ بالکل ٹھنڈا کر دوں گا۔'' عمران گرجا۔

لیکن وہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ مغلظات بکتا رہا اور بڑی شدت سے ہاتھ پاؤں چلاتا رہا۔

عمران نے ایک بار پھر اسے وارننگ دی...... اور پھر گولی چلا دی۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔

ایک سیکنڈ میں راج نے ہاتھ پاؤں پھینک دیئے۔ اس کی دیوانی مزاحمت یوں ختم ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ سائلنسر لگے پستول سے زیادہ آواز بھی نہیں آئی تھی۔ عمران نے بے پروائی سے اس کی لاش فرش پر پھینکی اور اب پستول ملازم نجیب کے سر پر رکھ دیا۔ ''ہاں تمہیں بھی ٹھنڈا

ہونا ہے یا کچھ بکنا ہے؟''

نجیب کا چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی نظریں اپنے باس ہدایت کار راج کی لاش پر مرکوز تھیں۔ ساری زندگی ایکشن اور کٹ کہنے والے کی اپنی زندگی کا سین پہلے ہی ٹیک میں او کے ہو چکا تھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں اس نجیب نامی ملازم نے وہ سب کچھ بتایا جو ہم نے پوچھا اور جو اسے معلوم تھا۔ اس کی باتوں سے ایک انکشاف یہ بھی ہوا کہ وہ ایک بنگلہ دیشی مفرور ہے اور پچھلے دس بارہ برس سے انڈیا میں رہ رہا ہے۔ بہر حال اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔

عمران نے اس سے پوچھا۔ ''ایشوریا کی ہم شکل پاکستانی لڑکی اب کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے اسے اب گولڈن بلڈنگ لے گئے ہیں۔''

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ سارو صاحب کا پروڈکشن ہاؤس ہے۔ ٹی وی ڈراموں اور ٹیلی فلموں وغیرہ کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ وہاں سے ایکسٹرا بھی سپلائی کئے جاتے ہیں۔''

''یہ سارو کون ہے؟''

''بڑے باس ہیں۔ فلمیں بناتے ہیں۔''

''ایسی ہی فلمیں جیسی یہاں بننے لگی تھی؟''

''ہر طرح کا کام ہوتا ہے گولڈن بلڈنگ میں۔''

''تم بھی جاتے ہو گولڈن بلڈنگ؟''

''نہیں، وہاں ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ کوئی خاص کام ہو تو پھر ہی بلایا جاتا ہے۔ میں بس ایک دو بار ہی گیا ہوں لیکن اندر کی جانکاری مجھے بالکل نہیں۔''

''یہ سارو صاحب اس وقت کہاں ہوگا؟''

''میرا آئیڈیا ہے کہ گولڈن بلڈنگ میں ہی ہوں گے۔ ابھی کچھ دیر پہلے راج صاحب کو ان کا فون وہیں سے آیا تھا۔'' یہ الفاظ کہتے ہوئے نجیب نے ایک بار پھر ڈری ڈری نظروں سے راج کی لاش دیکھی۔ لاش کے سر سے بہنے والا خون کمرے کی دہلیز تک جا رہا تھا۔

''اگر ہم گولڈن بلڈنگ میں جانا چاہیں تو پھر؟''

''اگر آپ کا مطلب ہے کہ آپ یہاں کی طرح وہاں بھی گھسنا چاہتے ہیں تو یہ کافی مشکل ہے۔ وہاں بہت سے گارڈز ہوتے ہیں، سی سی ٹی وی کیمرے بھی لگے ہوئے ہیں۔ راج صاحب کی ہتھیا کے بعد تو وہاں بالکل ریڈ الرٹ ہو جائے گا۔''

"اس کی فکر نہ کرو۔ راج کی اور تمہاری موت کا پتا ابھی کسی کو نہیں چلے گا۔"

نجیب کے چہرے پہ پھر ہلدی پھر گئی۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "میں بس ایک نوکر ہوں۔ جو حکم ملتا ہے، وہی کرتا ہوں۔ اس دھندے میں پھنس چکا ہوں۔ نکلنا چاہوں تو بھی نکل نہیں سکتا۔"

"ان فلموں میں کام بھی کرتے ہو؟" میں نے اس کے کسرتی جسم پر بنے ٹیٹوز دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ "جج...... جی ہاں...... کبھی کبھی۔"

"اچھی نوکری ہے۔ عیش کے لئے پیسا اور پیسے کے لئے عیش۔ تمہیں، تمہارے ہدایت کار کے پاس پہنچا کر ہمیں یقیناً کوئی دکھ نہیں ہوگا۔" عمران نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

نجیب کا دم خم بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر دی...... "مم...... میں مرنا نہیں چاہتا۔ آپ جو کہیں گے، میں کروں گا۔"

"سارو کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سنا ہے وہ چندی گڑھ کے رہنے والے ہیں۔ سکھ ہیں لیکن داڑھی پگڑی وغیرہ نہیں ہے۔ ممبئی کے بڑے بڑے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ ان میں فلمی لوگ بھی شامل ہیں اور فلموں سے باہر کے بھی۔ وہ چار پانچ سال پہلے ممبئی آئے تھے اور اب زیادہ تر یہیں رہتے ہیں۔ عام لوگوں سے بہت کم ملتے ہیں۔ میں نے بھی پچھلے چار پانچ سالوں میں انہیں تین چار بار ہی دیکھا ہوگا۔"

"جاوا کو جانتے ہو؟" عمران نے پوچھا۔

وہ چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ "انہیں کون نہیں جانتا جی۔"

"جاوا اور اس سارو صاحب میں کیا تعلق ہے؟"

"جاوا صاحب، ممبئی کے چند بڑے ڈانوں میں سے ایک ہیں۔ سارو صاحب ایسے تمام "بھائی لوگوں" سے بنا کر رکھتے ہیں۔ جاوا صاحب سے بھی ان کا ملنا جلنا ہے۔"

"ملنا جلنا ہے یا کاروبار میں ساجے داری ہے؟" عمران نے زور دے کر پوچھا۔

"میں ایک چھوٹا ملازم ہوں۔ مم...... مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں۔ ہاں...... کبھی کبھی کوئی لڑکی جاوا صاحب کے ذریعے بھی سارو صاحب تک پہنچتی ہے۔ یہ عام طور پر بڑی ایکٹرسوں کی ہم شکل لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

"یہ ایشوریا رائے کی ہم شکل، کس کے ذریعے آئی ہے؟"

"مجھے اس کا بھی پتا نہیں۔ بس راج صاحب نے اتنا بتایا تھا کہ یہ پاکستانی مال ہے۔"

راج کا ذکر کرتے ہوئے نجیب نے ایک بار پھر ڈری ڈری نگاہ اس کی خونچکاں لاش پر ڈالی۔

"اس لڑکی کے علاوہ کوئی اور پاکستانی بھی یہاں ہے؟"

"پہلے تو کوئی نہیں تھی، آج کل کا پتا نہیں۔ سنا ہے کہ انڈین فلموں میں کام ملنے کا جھانسا کھا کر کئی پاکستانی اور بنگلہ دیشی فنکارائیں یہاں پہنچ رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ کو تو واقعی کام مل جائے گا۔ باقی خراب ہو جائیں گی۔"

عمران نے سگریٹ سلگانے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پھر فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں کے چہروں پر ماسک تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے نجیب سے مخاطب ہوا۔ "ہم آج رات اس گولڈن بلڈنگ کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے...... یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جی۔ اگر تو آپ کی فلم لائن کے کسی بڑے سے واقفیت ہے تو کوئی طریقہ نکل سکتا ہے......"

"ہماری کسی بڑے چھوٹے سے واقفیت نہیں۔" میں نے کہا۔

عمران بولا۔ "اچھا، اس بات کو ایک اور طریقے سے کرتے ہیں۔ میں تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں تمہارے اس کمینے ڈائریکٹر کے ساتھ لمبا لٹا کر یہاں سے جاؤں گا اور یہ بات سو فیصد طے ہے۔ تمہیں صرف ایک صورت میں رعایت مل سکتی ہے۔ تم ہمیں کسی طرح اس گولڈن بلڈنگ کے اندر پہنچا دو۔ بہتر ہے کہ تم یوں سمجھو کہ تمہیں خود اس بلڈنگ میں گھسنا ہے اور اپنی جان بچانی ہے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں......"

"قسم کھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔" عمران نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔ "میں تمہیں سوچنے کے لئے صرف دس منٹ دیتا ہوں۔ اس کے بعد بغیر کسی وارننگ کے تمہیں شوٹ کر دوں گا۔" عمران نے دھکا دے کر باڈی بلڈر نجیب کو کمرے کے باتھ روم میں پھینک دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ نجیب کی اچھی طرح تلاشی لی جا چکی تھی۔ اس کے پاس کوئی ایسی شے نہیں تھی جس سے وہ کسی سے رابطہ کر سکتا۔

"کیا تم واقعی اسے مار دو گے؟"

"اگر مدد کر سکنے کے باوجود اس نے مدد نہیں کی تو مار بھی دیں گے۔ خس کم جہاں پاک۔ اس کے پنڈے پر بنے ہوئے ٹیٹو دیکھیں ہیں تم نے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ وہ اپنی جان

بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟"

"یار چھٹی حس بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور میرے پاس دو ڈھائی حسیں اور بھی ہیں۔ آخر چڑیلا ہوں میں...... اور وہ بھی ٹی وی چینل کا۔ ہم اُڑتی چڑیا کے پَر گنتے ہیں...... ویسے یار! ایک بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ اُڑتی چڑیا کے پَر کیوں گنے جاتے ہیں، اڑتے چڑے کے کیوں نہیں گنے جاتے۔ جل بن مچھلی ہی کیوں ہوتی ہے، مچھلا کیوں نہیں ہوتا۔ اللہ میاں کی گائے ہی کیوں ہوتی ہے، اللہ میاں کا بیل کیوں نہیں ہوتا۔ محاورے بنانے والوں کا زیادہ زور بھی صنفِ نازک پر ہی چلا ہے......" ہم باتیں کر رہے تھے اور ماسک بدستور ہمارے چہروں پر موجود تھے۔

اسی دوران میں کتے کی آواز آئی۔ وہی السیشین جسے عمران نے پلک جھپکتے میں رام کر لیا تھا۔ وہ کسی طرح اندر آ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کمرے میں آ گیا اور ڈائریکٹر راج کی لاش کے خوفناک منظر پر توجہ دیئے بغیر عمران کے قدموں میں لوٹ لگانے لگا۔ عمران بولا۔ "دیکھا نا میری ساڑھے آٹھ حسیات کا کمال۔ اس کو کہتے ہیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا...... لو دیکھو اس محاورے میں پھر صنف نازک آ گئی...... آرسی۔"

"آرسی شیشے کو یعنی آئینے کو کہتے ہیں۔"

"تو یار آئینے سے زیادہ نازک اور کون ہو گا؟ آرسی کی بوتل کو ہی دیکھو، ایک سیکنڈ میں ٹوٹتی ہے......" وہ بے تکی ہانک رہا تھا۔

اسی دوران میں اندر سے نجیب دروازہ کھٹکھٹانے لگا اور عمران کو چپ ہونا پڑا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ عمران نے پستول ہاتھ میں لے لیا۔ نجیب کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ ایک دم ٹوٹا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنا خون آلود منہ اچھی طرح دھو لیا تھا پھر بھی نتھنوں اور ہونٹوں سے خون کا رساؤ موجود تھا۔

اس نے عمران سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ عمران نے صرف ایک وارننگ کے بعد راج کو گولی مار دی تھی اور نجیب کو ایک وارننگ مل چکی تھی۔ وہ عمران کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "یہ جگہ پولیس کی نظروں میں آ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب یہاں شوٹنگ نہیں ہو گی۔ سارو صاحب کو کوٹھیوں کی کون سی کمی ہے۔ شوٹنگ کا کچھ سامان ابھی یہیں پڑا ہے۔ کچھ دیر میں پروڈکشن ہاؤس...... میرا مطلب ہے گولڈن بلڈنگ سے لوڈر سامان چھوڑ کر واپس آئے گا اور باقی کا سامان لے جائے گا۔ یہ کلاس روم کا فرنیچر اور دوسری

چیزیں ہیں۔ آپ کسی طرح اس لوڈر میں سوار ہو جائیں، گولڈن بلڈنگ میں پہنچ جائیں گے۔"

اسی دوران میں ڈائریکٹر راج کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ موبائل چھوٹی میز پر دھرا تھا۔ عمران نے نجیب کو اشارہ کیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "جی ہاں...... جی ہاں...... وہ ذرا باتھ روم میں ہیں۔ ٹھیک ہے...... آپ بھیج دیں۔ ہم یہیں ہیں۔ او کے...... او کے......"

"کون تھا" عمران نے پوچھا۔

"گولڈن بلڈنگ کے گودام کا منیجر۔ کہہ رہا تھا کہ لوڈر واپس آ رہا ہے۔"

"کتنی دیر میں پہنچ جائے گا؟"

"زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمیں کچھ اسلحہ چاہئے۔ کوئی چیز مل جائے گی یہاں سے؟"

نجیب کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ "یہ کوٹھی راج صاحب کے بہنوئی کی ہے۔ وہ آج کل انڈیا سے باہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم ایک رائفل آپ کو یہاں سے ضرور مل جائے گی۔"

نجیب کی مدد سے ہم نے کوشش کی اور ایک بیڈروم کی الماری میں سے ایک کے بجائے دو رائفلیں برآمد ہو گئیں۔ دونوں چھوٹی نال والی رشین رائفلیں تھیں۔ ایک آٹو میٹک دوسری سیمی آٹو میٹک۔ فالتو راؤنڈز بھی موجود تھے۔

کچھ ہی دیر بعد مین گیٹ کی طرف سے ہارن کی آواز سنائی دی۔ ہم سب کچھ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ نجیب نے اندر ہی سے بٹن دبا کر مین گیٹ کھول دیا۔ ہم نے کھڑکی میں سے دیکھا، لوڈر اندر آ کر پورچ میں رک گیا۔ تنومند ڈرائیور اترا۔ وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ ممبئی کی جرم زدہ گلیوں کا مخصوص چہرہ۔ رنگ سانولا، کانوں میں مرکیاں، ٹیکنی کلر شرٹ۔ نجیب نے کھڑکی میں سے اسے آواز دی۔ "اندر آ جاؤ موہن۔"

"کہاں ہو؟" اس نے کہا اور جھومتا ہوا سا کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ بے خبر تھا کہ یہاں ایک بڑی مصیبت اس کا انتظار کر رہی ہے اور اس کی آج کی رات سخت تکلیف اور اذیت کا شکار ہونے والی ہے۔ وہ کمرے میں آیا اور منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ نجیب دیوار کے ساتھ لرزہ براندام کھڑا تھا۔ عمران کے ہاتھ میں رائفل تھی اور فرش پر راج کی بے گور و کفن لاش پڑی تھی۔

لاش دیکھ کر موہن بری طرح بدکا اور اضطراری کیفیت میں واپس بھاگا۔ میں راستے

میں تھا۔ میں نے اسے اڑنگا لگایا اور وہ لڑھک کر کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں اس کی پشت پر سوار ہو گیا اور اس کی توانا گردن گرفت میں لے لی۔ اس نے پکارنے کی کوشش کی لیکن آواز گلے میں ہی گھٹ گئی۔ اگلے پندرہ بیس سیکنڈ میں اس نے بہت زور لگایا لیکن میں نے اسے ٹس سے مس نہیں ہونے دیا۔ بندہ سمجھ دار تھا۔ اسے پتا چل گیا کہ یہاں اس کی کوئی پیش نہیں چلنے والی۔ زیادہ پھڑکے گا تو کوئی ہڈی تڑوا بیٹھے گا۔ اس نے ہار مان لی۔ میں نے اسے گریبان سے کھینچ کر اٹھایا اور دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ اس نے کھل نائیک کے انداز میں لمبے بال رکھے ہوئے تھے بلکہ پورا حلیہ ہی ویسا بنا رکھا تھا۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو یار! اس کی چولی کے پیچھے کیا ہے؟''

میں نے اس کی تلاشی لی۔ کچھ دیگر اشیاء کے علاوہ ایک شکاری چاقو بھی برآمد ہوا۔ یہ شخص اب وحشت زدہ نظروں سے بار بار ڈائریکٹر راج کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ عمران نے رائفل اس کے سر سے لگاتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''دیکھ پیارے...... ہمارے سر پر خون سوار ہے۔ آج رات دو بندے اس ڈائریکٹر صاحب کے علاوہ بھی ٹپکا چکے ہیں۔ جو کہتے ہیں چپ چاپ کرتا جا ورنہ کھل نائیک کے بجائے کل نائیک ہو جائے گا۔ یعنی ماضی کا حصہ بن جائے گا......''

بندہ واقعی معاملہ فہم تھا۔ سمجھ گیا کہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو کہنے کے مطابق کر گزرتے ہیں...... قریباً دس منٹ بعد ہم نجیب بنگالی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے باتھ روم میں بند کر چکے تھے اور دیگر سامان کے ساتھ لوڈر کے عقبی حصے میں بیٹھے تھے۔ لوڈر کے کیبن اور پچھلے حصے کے درمیان ایک مستطیل شیشہ تھا اور اس میں سے ہمیں ڈرائیور موہن کی ہر حرکت نظر آ رہی تھی۔ موہن جانتا تھا کہ آٹومیٹک رائفل کی نال اس کی طرف اٹھی ہوئی ہے اور اس کی کوئی مزاحمتی کوشش اس کے جیون کا چراغ گل کر سکتی ہے۔ کوٹھی کا گیٹ ہم پہلے ہی کھول چکے تھے۔ عمران نے موہن سے کہا۔ ''انجن اسٹارٹ کر...... اور چل نائیک۔''

لوڈر کوٹھی میں سے نکل آیا۔ میں نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے گیٹ بند کر دیا۔

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ممبئی کی سڑکوں پر رونق تھی۔ بازاروں میں آمد و رفت تھی۔ سینماؤں کے بڑے بڑے ہورڈنگز جگمگا رہے تھے۔ سمندر کی طرف سے ایک نم ہوا چل رہی تھی۔ یہ کراچی سے ملتی جلتی ایک شب تھی...... اور اس شب کے سینے میں ایک ہلچل پروان چڑھ رہی تھی۔

قریباً بیس منٹ بعد ہم مین روڈ سے ایک بغلی سڑک پر مڑے۔ دور ہی سے ہمیں گولڈن

بلڈنگ نظر آ گئی۔ اس کی پیشانی پر ''سارو پروڈکشن'' کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ اس جگمگاہٹ کے پیچھے جو کچھ تھا، وہ ہمیں تھوڑی دیر بعد معلوم ہونے والا تھا۔ ہم دو جگہ گارڈز کے درمیان سے گزرے اور عمارت کے وسیع احاطے میں پہنچ گئے۔ ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر ہم عمارت کے پچھواڑے آئے اور گودام کے اونچے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ ہم نے لوڈر کے اندر سے ہی دیکھ لیا۔ گودام میں گیٹ کیپر کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی موجود تھا۔ اور یہ کوئی عام گارڈ نہیں تھا۔ ''خطرناک'' اس کے کرخت چہرے پر درج تھی۔ عمران نے سرگوشی کی۔ ''گیٹ کیپر تمہارا...... گارڈ میرا...... لیکن پہلے اس کھل نائیک کو ٹل نائیک بنانا ہے، یعنی اس کا ٹل کھڑکانا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لوڈر رک چکا تھا۔ عمران نے کیبن کی مستطیل کھڑکی کا شیشہ ہٹایا اور پستول کی ایسی جچی تلی ضرب موہن کی کنپٹی پر لگائی کہ میں ششدر رہ گیا...... جیسے کوئی جادو ہوا تھا۔ موہن بے آواز ڈھے گیا۔ عمران نے اسے پھر سے سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ گارڈ گھوم کر کھڑکی کی طرف آیا۔ غالباً وہ ڈرائیور موہن سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اس وقت تک لوڈر سے نیچے اتر چکا تھا۔ جب گارڈ قدرے حیرت سے ڈرائیور موہن کو دیکھ رہا تھا میں نے عقب سے اسے چھاپ لیا۔ دوسری طرف عمران نے دراز قد گیٹ کیپر کو دبوچ لیا۔ یہ مختصر جدوجہد چند سیکنڈ ہی جاری رہی۔ میں نے تنومند گارڈ کا سر زور سے ایک ستون سے ٹکرا دیا۔ اس نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ستون کی دوسری ضرب نے اسے میرے ہاتھوں میں لٹکا دیا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔ خلافِ توقع گیٹ کیپر نے زیادہ مزاحمت کی مگر عمران جیسے مدِمقابل سے چھٹکارا پانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ عمران نے اس کی گردن یوں اپنے بازو میں جکڑی تھی کہ اس کے لئے آواز نکالنا ناممکن ہو گیا تھا۔ عمران اسے گھسیٹ کر لوڈر کے اندر لے آیا۔

میں نے گودام کا گیٹ اندر سے بند کر دیا تھا۔ میں لوڈر کے اندر گیا تو عمران نے گیٹ کیپر کو فرش پر بٹھا رکھا تھا اور اس کے سر پر سائلنسر لگا پستول تان رکھا تھا۔ گیٹ کیپر نے اپنا نام سرجیت کمار بتایا۔ وہ گیٹ کیپر اور اسٹور کیپر ہونے کے علاوہ گولڈن بلڈنگ کے گارڈز کا انچارج بھی تھا۔ اس کے مطابق بگ باس سارو صاحب گولڈن بلڈنگ میں ہی موجود تھے۔ وہ آج شام ہی دبئی سے یہاں تشریف لائے تھے۔ سرجیت سے ہماری گفتگو کے دوران میں ہی اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ عمران کے اشارے پر سرجیت نے کال سنی۔ اس کا انداز مؤدب تھا۔ اس سے کچھ کہا گیا جس کے جواب میں اس نے کہا کہ وہ روی صاحب کو

گارڈ کے ساتھ چھوٹے ڈرائنگ روم میں بھیجتا ہے......

اس نے فون بند کیا تو عمران نے اسٹور کیپر سر جیت سے پوچھا۔ ''یہ روی صاحب کون ہے؟''

وہ بولا۔ ''ایک بڑا پروڈیوسر ہے۔ آج کل سخت مشکل میں ہے۔ اسی سلسلے میں سارو صاحب سے ملنے آیا ہے۔ سارو صاحب نے اسے چھوٹے ڈرائنگ روم میں بلایا ہے۔''

اس کے بعد عمران کی اجازت سے اسٹور کیپر سر جیت نے کسی گارڈ ارشد کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ سیٹھ روی پرشاد صاحب کو چھوٹے ڈرائنگ روم میں باس کے پاس پہنچائے۔ اس نے فون بند کیا تو عمران نے پوچھا۔ ''کیا موت پڑی ہوئی ہے اس سیٹھ روی پرشاد کو؟''

''بس لین دین کا معاملہ ہے۔ سیٹھ روی صاحب نے باس سے کوئی لڑکی منگوائی تھی شوٹنگ کے لئے۔ اس لڑکی کو حفاظت سے واپس بھیجنا سیٹھ ہی کی ذمے داری تھی لیکن وہ لڑکی کہیں نکل گئی۔ اب اسی کا لفڑا ہے۔''

''کیا لفڑا ہے؟''

''باس لڑکی مانگ رہا ہے یا اس کے بدلے میں روکڑا۔ جاوا صاحب کو تو جانتے ہوں گے آپ۔ فلم لائن کے ایسے سارے لفڑے ٹینٹے وہی ''سیٹل'' کرواتے ہیں۔ باس نے جاوا صاحب سے شکایت کر رکھی ہے اسی لئے سیٹھ روی صاحب بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔''

''لڑکی کون تھی؟'' میں نے پوچھا۔

اس کے جواب میں اسٹور کیپر سر جیت نے جو کچھ بتایا، اس سے سارا واقعہ سامنے آ گیا۔

ہمارے اندازے کے عین مطابق سارو پروڈکشن سے فلم اسٹوڈیوز والوں کو ایکسٹرا بھی سپلائی کئے جاتے تھے۔ ''سارو پروڈکشن'' سے ایک خاص کام بھی کیا جاتا تھا اور وہ یہ کہ فلم میکرز کی ڈیمانڈ کے مطابق انہیں بہ وقتِ ضرورت مشہور اداکاروں کے ہم شکل بھی مہیا کئے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کو مشکل مناظر میں ڈپلی کیٹس کے طور پر استعمال کرنے کا رواج ہمیشہ سے موجود ہے۔ کچھ دنوں پہلے ایک معروف ہیروئن کو اپنے ہیرو کمل ہاسن کے ساتھ کچھ جذباتی رومانی مناظر فلمانے تھے۔ ایک دو شارٹس ایسے تھے جن کے لئے ہیروئن بالکل تیار نہیں تھی۔ اس مسئلے کے حل کے لئے سارو صاحب سے رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے ایک ایسی لڑکی سیٹھ روی کو دی جو اسی نوے فیصد ہیروئن سے ملتی تھی اور بیڈ روم کی نیم تاریکی میں فلمائے

جانے والے مناظر کے لئے بالکل فٹ تھی۔ معقول معاوضہ طے ہو گیا لیکن شوٹنگ کے فوراً بعد وہ لڑکی کہیں فرار ہو گئی۔ اب یہ اسی کا چکر چل رہا تھا۔

سر جیت نے ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ اعتراف بھی کیا کہ گولڈن بلڈنگ میں دیگر دھندوں کے علاوہ فحش فلموں کی میکنگ بھی ہوتی ہے۔

ہم دونوں بڑے خطرناک موڈ میں تھے، خاص طور سے عمران...... اگلے پانچ دس منٹ کے اندر عمران نے سر جیت کا وہی حال کیا جو نجیب بنگالی کا کیا تھا۔ سر جیت کے تھوبڑے پر نیل پڑ چکے تھے اور پیٹ میں شدید ضربیں آئی تھیں۔ وہ کسی معمول کی طرح ہمارا ہر کہا ماننے کو تیار تھا۔ اس کے پاس ایک ایسے دروازے کی چابی تھی جو گودام کے اندر سے اندرونی عمارت کے پچھواڑے میں کھلتا تھا۔ سر جیت ہمیں اس دروازے سے گزار کر ایک خالی کوریڈور میں لے آیا۔ میرے ہاتھوں میں رائفل اور عمران کے پاس سائلنسر والا پستول تھا۔ عمران والی رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ ہمارے چہروں پر ماسک تھے اور ہم ہر طرح کی صورتِ حال کے لئے یکسر تیار تھے۔ سر جیت جانتا تھا کہ وہ ہر لحظہ عمران کے پستول کی زد میں ہے۔

خیریت گزری کہ ہمیں اس طویل کوریڈور میں ایک بالکل ٹن شخص کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا، ورنہ ہمیں گولی چلانا پڑتی۔ ٹن شرابی نے ہمارا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ ہم ایک ہال نما کمرے سے گزرے۔ یہاں ایک لڑکا، لڑکی گٹار تھامے میوزک ترتیب دے رہے تھے۔ ہم ان سے کچھ فاصلے سے گزرے۔ انہوں نے یا تو ہمارے ماسک والے چہروں کو دیکھا ہی نہیں یا یہ سمجھے کہ ہم یہاں کسی سیٹ پر شوٹنگ میں مصروف ہیں۔

سر جیت ہمیں ایک وسیع دفتر میں لے آیا۔ دفتر کی شان و شوکت مرعوب کر دینے والی تھی۔ یہاں مدھو بالا سے لے کر کرشمہ کپور تک اور بھارت بھوشن سے لے کر سنجے دت تک بہت سے اداکاروں کے پورٹریٹ سجے ہوئے تھے۔ حالانکہ جس قسم کے کام یہاں ہوتے تھے، ان اداکاروں سے اس پروڈکشن ہاؤس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ دفتر کے ایک حصے میں بار اور دوسرے میں سی سی ٹی وی کیمروں کے مانیٹرز تھے۔ غالباً کروڑوں روپیا اس دفتر کی آرائش پر ہی صرف کر دیا گیا تھا...... اور یہ چندی گڑھ کے سردار سارو کا مسکن تھا جس نے شکلوں کی مشابہت کو ایک بڑے کاروبار کی شکل دے رکھی تھی۔ سارو اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھا۔

سر جیت کمار ہماری دیدہ دلیری پر حیران تھا۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ ہم شیر کی کچھار میں

گھس آئے ہیں اور اپنے انجام سے قطعی بے خبر ہیں۔ اسی دوران میں ساتھ والے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کسی کے گرجنے برسنے کی آواز آئی۔ ’’بکواس نہ کر روی! میں سوگند کھاتا ہوں۔ میری کُڑی نہ ملی تو تیری دس سال کی چھوکری کو ایتھے لے کر آؤں گا۔ اپنے پیو کا نہیں جو اس کو گھنگھرو نہ پہنا دوں تو...... روپا سوسائٹی کے ولایتی انگلش اسکول وچ پڑھتی ہے ناوہ؟ بس وہاں سے گھر واپس نہیں جائے گی۔ سیدھی ایتھے آئے گی۔‘‘

وہ پتا نہیں کس کس کا نام لے کر گالیاں بکنے لگا۔ کسی دوسرے شخص نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے سر کو جیسے ہوا چڑھی ہوئی تھی۔

’’کون ہے یہ؟‘‘ عمران نے سرگوشی میں سرجیت سے پوچھا۔

’’یہی سارو صاحب ہیں۔ سیٹھ روی پرشاد پر برس رہے ہیں۔ وہی لین دین کا جھگڑا ہے......‘‘

ایک اور آواز ابھری۔ ’’سارو بھائی! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ مجھے جاوا صاحب کا خیال ہے۔ میں لڑنا نہیں چاہتا......‘‘

’’جاوا صاحب کو رکھو ایک طرف۔ تم نے جو توپ چلانی ہے چلاؤ۔ میں ویکھدا (دیکھتا) ہوں کون مائی دا لال یہاں سے پیسے دیئے بغیر جاندا ہے۔ لاتیں چیر دوں گا۔‘‘

’’پیسے نہ دینے کی بات کون کر رہا ہے۔ دے تو رہا ہوں پیسے۔‘‘ دوسرے شخص نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔ یقیناً یہی روی پرشاد تھا۔ وہ بھی کوئی معمولی شخص نہیں ہوگا لیکن یہاں بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔

’’مجھے ابھی کے ابھی چاہی دے نے...... اسی تھاں پر۔‘‘ سارو گرجا۔

پتا نہیں کیوں اس کی آواز مجھے کچھ سنی ہوئی سی لگی۔ شاید یہ لہجہ کسی کے لہجے سے ملتا تھا۔

لین دین کا یہ جھگڑا دس پندرہ منٹ مزید رہا۔ اس دوران میں ہم پوری طرح الرٹ رہے۔ عمران نہ صرف الرٹ رہا بلکہ سرجیت سے سوال جواب بھی کرتا رہا۔ سرجیت ہمارے خوں خوار موڈ کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اسے اندزہ ہو گیا تھا کہ ہم بڑے خطرناک ارادوں سے یہاں گھسے ہیں اور جہاں کوئی کام ہماری مرضی کے خلاف ہوگا ہم گولی چلا دیں گے۔ سرجیت یہاں کے سیٹ اَپ کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے تک جاوا کا چھوٹا بھائی اور سارو صاحب اس کالے کاروبار میں پارٹنرز تھے۔ یہ لوگ ہم شکل چہرے تلاش کرتے تھے اور پھر انہیں مختلف طریقوں سے استعمال کرتے تھے۔ کوئی دو سال پہلے دونوں صلح صفائی سے علیحدہ ہو گئے۔ اب تھوڑا عرصہ پہلے جاوا کا چھوٹا بھائی

مارا گیا اور اس سارے کاروبار کا کرتا دھرتا پھر سارو ہی رہ گیا ہے۔

عمران اور سرجیت کمار کی گفتگو ابھی جاری تھی کہ فیصلہ کن لمحہ پہنچ گیا۔ ساتھ والے کمرے میں معاملہ طے ہو گیا اور روی پرشاد وغیرہ چلے گئے۔ دروازہ کھلا اور لحیم شحیم سارو صاحب اپنی تمام تر ہیبت کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر صفا چٹ تھا اور اس پر تیل چپڑا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں ایک اور بدمعاش تھا۔ سارو نے دو رائفلیں اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھیں اور دنگ رہ گیا۔ اس کے عقب میں موجود سیاہی مائل بدمعاش نے اپنا ہاتھ تیزی سے اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھانا چاہا۔

’’خبردار۔‘‘ عمران پھنکارا۔ ’’سیدھی ماتھے پر گولی ماروں گا۔‘‘

دونوں ٹھٹک گئے۔ میں سارو کو دیکھ رہا تھا اور میرے دل و دماغ شدید ترین حیرت کی زد میں تھے۔ میری بصارت دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ صفاچٹ سر والا جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا، میں اسے پہلے سے جانتا تھا۔ میری ہنستی مسکراتی زندگی کو کانٹوں سے بھری راہ پر گھسیٹنے اور لہولہان کرنے میں اس شخص کا اہم کردار تھا۔ یہ سارو نہیں تھا۔ سراج تھا...... سیٹھ سراج...... جس کے بیٹے واجی نے اپنے یاروں کے ساتھ مل کر ثروت کو بس اسٹاپ سے اٹھایا تھا اور میرے شب و روز کو ایک نئے رخ پر ڈالا تھا۔

میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیٹھ سراج کو یہاں اور اس روپ میں دیکھوں گا۔ سیٹھ کے بارے میں مجھے جو آخری اطلاع ملی، وہ یہ تھی کہ وہ بیرونِ ملک ہے اور کبھی کبھار کراچی میں دیکھا جاتا ہے۔

اپنی طرف اٹھی ہوئی آٹومیٹک رائفلیں اور اپنے خاص ملازم کا زخمی تھوبڑا دیکھ کر سارو یعنی سیٹھ سراج سب کچھ سمجھ گیا۔ لیکن وہ گھبرایا بالکل نہیں۔ ’’کون ہو تم؟‘‘ اس نے دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بھاری آواز میں پوچھا۔

’’فرشتے، تمہارا حساب کتاب کرنے کے لئے آئے ہیں۔‘‘ عمران بھی سکون سے بولا۔

’’فرشتے تو مرنے کے بعد آندے ہیں۔‘‘

’’تو تم خود کو زندہ کیوں سمجھ رہے ہو۔ تم مر چکے ہو۔ بس تمہارا جنازہ اٹھنا باقی ہے۔‘‘

پھر عمران مجھ سے مخاطب ہوا۔ ’’کیوں جگر! اس کا جنازہ اٹھنا ہی باقی ہے نا؟‘‘

ماسک کی وجہ سے میں عمران کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ میری طرح وہ بھی اس پرانے دشمن کو پہچان چکا ہے۔ سیٹھ سراج سے عمران کا تعارف پانچ سال

پہلے اس وقت ہوا تھا جب عمران نے لاہور کی ایک سڑک پر سیٹھ کی شاندار گاڑی کو اپنی گاڑی سے ٹکر ماری تھی اور پھر اس بہانے اس کی ٹھکائی کی تھی۔ اس وقت سیٹھ سراج ایک نسبتاً چھوٹا بدمعاش تھا لیکن آج وہ ایک بہت بڑا ''جرائم پیشہ'' بن چکا تھا۔ گناہوں کے نگر ممبئی میں وہ جاوا جیسے کرائم کنگز کے ساتھ رابطے رکھتا تھا اور اس کے ارد گرد لٹیروں اور قاتلوں کی فوج تھی۔

سراج بڑے سکون سے بولا۔ ''تم جنازے کی گل کیوں کر رہے ہو۔ میں تو سکھ ہوں اور خالصوں کا جنازہ نہیں ہوندا...... ارتھی ہوندی ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں پورا وشواس دلاتا ہوں، تمہارا جنازہ ہی اٹھے گا کیونکہ تم سکھ ہو ہی نہیں۔ تم لاہور کی نالیوں میں گندے کیڑے کی طرح رینگتے رہے ہو اور اب یہاں آ کر سارو صاحب بن بیٹھے ہو۔''

میں نے سیٹھ سراج کے چہرے پر پہلی بار رنگ سا گزرتے دیکھا۔ اس نے اپنی شفاف ٹنڈ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''کون ہو تم...... اور یہاں وڑنے کی بے وقوفی تم نے کس اُلو دے پٹھے کے کہنے پر کیتی ہے؟''

''تمہارے اس چھوٹے سے کھوپڑے میں شاید گوبر بھرا ہوا ہے۔ تمہیں بتایا تو ہے کہ ہم فرشتے ہیں اور تمہارا حساب کتاب کرنے آئے ہیں۔''

سیٹھ سراج کے عقب میں موجود شخص نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ اس بار عمران نے سائلنسر لگے پستول سے فائر کیا۔ ''ٹھک'' کی آواز آئی اور گولی عین اس بدقسمت شخص کی پیشانی پر لگی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے سیٹھ سراج کے پاؤں میں گرا اور ساکت ہو گیا۔ خون کی پتلی سی لکیر اس کے چہرے پر رینگنے لگی تھی۔

سیٹھ سراج نے اپنا ہاتھ دائیں طرف میز کی جانب بڑھانے کی کوشش کی۔ ''خبردار''

عمران دہاڑا۔

سیٹھ ساکت ہو گیا۔ عمران نے سیٹھ کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ میز کے نیچے ایمرجنسی کال کا بٹن موجود تھا۔ عمران نے سیٹھ کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ ماتھے کے درمیان گولی ماروں گا۔ فیتا ہے تو ناپ کر دیکھ لو دونوں طرف سے۔ ایک ملی میٹر کا فرق بھی نکلے تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔''

سیٹھ سراج اب اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کا پالا آج رات کچھ غیر معمولی لوگوں سے پڑ گیا ہے۔ اس کے ساتھی کو بے دریغ شوٹ کر دیا گیا تھا اور اس کا خاص ملازم سرجیت جو خود بھی ایک کڑک شخص تھا، بالکل بے دست و پا کھڑا تھا۔ ہم نے دفتر کے دروازے اندر سے

لاک کر لئے تھے اور سی سی ٹی وی کیمروں کے تار کھینچ دیئے تھے۔

میں نے چوڑے چکلے سیٹھ سراج کی تلاشی لی اور اس کے دونوں موبائل فونز اپنے قبضے میں لے کر آف کر دیئے۔ سیٹھ سراج کی شاندار میز کی دراز میں ایک جدید پسٹل موجود تھا، وہ بھی سیٹھ کی دسترس سے دور کر دیا گیا۔

''شانتی سے بیٹھ جاؤ...... اور بات کرو۔'' عمران نے اسے حکم دیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''کیا میں تمہارے منہ دیکھ سکدا ہوں؟''

''وقت آئے گا تو وہ بھی دکھا دیں گے۔ فی الحال حساب کتاب کی بات کرو۔''

''کیسا حساب کتاب؟'' وہ ساتھی کی لاش سے نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔

''کیا لینا ہے اپنی اس دکان کا؟''

''کس دکان کی گل کر رہے ہو؟''

''یہ تمہاری گولڈن بلڈنگ اور اس میں ہونے والا دھندا۔ اور اس کے علاوہ بھی جو دو تین چھوٹے موٹے ٹھکانے ہیں تمہارے۔''

''میں تمہاری گل نئیں سمجھا۔''

''تمہارا یہ کاروبار خریدنا چاہتے ہیں ہم۔ سارے اسٹاک اور لائیو اسٹاک (زندہ سامان) سمیت۔''

''تم ہوش وچ ہو؟'' سراج نے ہمیں حیرت سے دیکھا۔

''بارہ بج چکے ہیں لیکن تمہاری طرح ہم بھی سکھ نہیں ہیں۔ تم قیمت بولو۔ اور کسی بہت بڑی انٹرنیشنل کمپنی کے مالک نہیں ہو تم۔ بس ممبئی میں بیٹھ کر یہ ہٹی چلا رہے ہو۔ زیادہ لمبا چوڑا حساب کتاب نہیں کرنا پڑے گا تمہیں۔ دس پندرہ منٹ میں ٹوٹل جوڑ لو گے۔''

سراج کے چہرے پر اب پریشانی کے ساتھ ساتھ دلچسپی کے آثار بھی نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے بھینسے کی طرح سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو تم گولڈن بلڈنگ خریدنا چاہندے ہو؟''

''ہاں...... اور اس کے سارے سیٹ اَپ...... اور چھوکرے چھوکریوں سمیت۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتا دوں۔ پہلے پوری پے منٹ کریں گے پھر تمہاری تشریف پر لات ماریں گے۔''

سیٹھ سراج اُلجھی اُلجھی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''اگر تم کسی طرح کا مذاق کر رہے ہو تو یہ تمہیں بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔''

"اگر تم کہتے ہو تو تمہارے اس دوسرے کتے کو بھی گولی مار کر اپنی سنجیدگی کا ثبوت دے سکتا ہوں۔" عمران نے پستول کا رخ سرجیت کمار کی طرف کیا۔ اس کا چہرہ ٹوٹی پلیٹ جیسا ہو گیا۔ ہونٹ بے ساختہ پھڑکنے لگے۔

"کیا دے سکتے ہو؟" سیٹھ سراج نے کہا۔ انداز ٹائم پاس کرنے والا تھا۔

"جو بھی تم شرافت کے دائرے میں رہ کر مانگو۔ اس ہٹی کی اصل قیمت سے دگنا بھی...... یا جو تم چاہو۔"

"لیکن تم ہو کون؟"

"دیکھو تم گندا کام کر رہے ہو۔ گندا کام کرنے والیاں یا کرنے والے گاہک کا نام پتا نہیں پوچھا کرتے۔ بس رقم وصول کرتے ہیں۔ تم بھی اپنی اس ہٹی کی قیمت بتاؤ۔ بیس کروڑ...... پچیس کروڑ...... بولو۔"

سیٹھ سراج کے چہرے پر اب حیرت گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ گلابی اردو میں بولا۔

"ماردھاڑ کے علاوہ تمہارے پاس ہور کیا ثبوت ہے کہ تم سنجیدہ ہو؟"

عمران نے کہا۔ "انٹرنیٹ ہے تمہارے پاس؟" سیٹھ نے گھڑا سا سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ عمران بولا۔ "اپنا کوئی پڑھا لکھا بندہ بلاؤ جو ایک اکاؤنٹ چیک کر سکے...... اور خبردار! کوئی فالتو بات نہیں۔ ورنہ وہ جنازے والی بات سچ ہو جائے گی۔"

سیٹھ سراج نے انٹرکام اٹھایا اور کسی انوپم نامی ملازم کو اندر آنے کی ہدایت کی۔ دو تین منٹ بعد ہی تیس بتیس سال کا ایک اسمارٹ سا شخص اندر آ گیا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ دفتر کا ماحول دیکھ کر وہ گھبرایا۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ واپس پلٹ جائے گا لیکن پھر سراج کے کہنے پر رک گیا اور اندر آ گیا۔ میں نے دروازہ لاک کر دیا۔

عمران نے اس سے کہا۔ "نیٹ آن کرو۔"

وہ ایک کونے میں رکھے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا اور کانپتے ہاتھوں سے نیٹ آن کر دیا۔ عمران اس کے پاس جا بیٹھا...... اور چار پانچ منٹ تک مصروف رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اسے کسی غیر ملکی بینک میں ایک بڑے اکاؤنٹ کی تفصیلات بتا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے انوپم نامی اس شخص کے چہرے پر تعجب اور مرعوبیت کے آثار نظر آئے۔ اس نے سراج سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جی سر! یہ ایک سوئس بینک اکاؤنٹ ہے۔ کسی جی جی تھری نام کی کمپنی کا ٹائٹل ہے۔ کافی بڑا اماؤنٹ موجود ہے اس میں۔"

"کتنا بڑا؟"

"کوئی ساڑھے نو ملین ڈالرز۔"

"روپے کتنے بنتے ہیں؟" سیٹھ سراج چیخ کر بولا۔

انوپم نے انڈین روپوں میں حساب کر کے بتایا۔ ظاہر ہے رقم کروڑوں میں تھی۔ اس سے پہلے کہ سیٹھ سراج کچھ مزید پوچھتا، عمران بولا۔ "تم نے رقم دیکھ لی۔ اب ذرا مال کے درشن بھی کراؤ۔"

"کی مطلب اے؟"

"مطلب کھوتی کا سر۔ گولڈن بلڈنگ کا سودا ہو گا۔ گولڈن بلڈنگ کی جھلکیاں تو دکھاؤ۔"

"گولڈن بلڈنگ تمہارے سامنے ہے لیکن مجھے اب بھی یقین نہیں کہ تم واقعی کوئی سودا کرنا چاہندے ہو...... یہ جس کمپنی کے نام اکاؤنٹ ہے، یہ کرتی کیا ہے؟"

"آلو والے نان بیچتی ہے...... تم کو اس سے کیا۔ تم "دھندے والیوں" والا کام کر رہے ہو۔ وہ بس نوٹ ڈالتی ہیں اپنے گریبان میں...... سوال جواب نہیں کرتیں۔"

سیٹھ سراج کا چہرہ پہلی بار سرخ ہوا۔ لگا کہ وہ غصے سے پھٹ پڑے گا مگر وہ ابھی ایک لاش گرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس نے تحمل سے کام لیا۔ عمران نے انوپم نامی شخص سے کہا کہ وہ سی سی ٹی وی کیمروں کے ذریعے ہمیں گولڈن بلڈنگ کے مناظر دکھائے۔

انوپم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر باس سراج کی طرف دیکھا۔ سراج کچھ دیر برے برے منہ بناتا رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ انوپم نے کلوز سرکٹ ٹی وی کے کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے۔ تین قطاروں میں بارہ اسکرینیں روشن ہو گئیں۔ گولڈن بلڈنگ کے مختلف حصوں کے مناظر بڑی وضاحت سے نظر آنے لگے۔ یہ واقعی شاندار بلڈنگ تھی۔ وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ہال نما کمرے میں کسی کلب کا سیٹ لگا ہوا تھا اور تیز روشنی میں دو نیم عریاں لڑکیاں ایک پولیس والے کو شراب پلانے اور ریجھانے میں مصروف تھیں۔ ایک جگہ کوئی میٹنگ چل رہی تھی۔ گنجے اور نیم گنجے سروں والے کئی افراد سر جوڑے بیٹھے تھے۔ طویل میز پر کاغذ پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایک نہایت آرام دہ لاؤنج میں دو نوجوان اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ گداز صوفوں پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے شراب کی بوتل کھلی پڑی تھی اور گلاس رکھے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کو دیکھ کر میں چونکا اور مجھے اپنے جسم کا خون سر کو چڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ کوئی اور نہیں...... واجد عرف واجی تھا۔ سراج کا وہی اوباش بیٹا جس نے چند برس پہلے اپنی ہوس ناک نظروں سے ثروت کو دیکھا تھا اور پھر ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ یہ وہی واجی تھا۔ اب یہ پہلے سے فربہ ہو چکا تھا۔ اس نے

فرنچ کٹ داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ گلے میں کسی قیمتی دھات کی زنجیر تھی۔ بال بھی عجیب انداز سے بنے ہوئے تھے۔

میں دیر تک اس پر سے اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکا۔ سینے میں جلتی ہوئی آگ کے شعلے کچھ اور بلند ہو گئے۔

ایک بہت بڑے ہال کمرے کے مناظر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہاں کم وبیش پچاس لڑکیاں نہایت مختصر لباس میں موجود تھیں۔ ایک کوریوگرافر انہیں کسی ہیجان خیز ڈانس کی ریہرسل کروا رہا تھا۔ یہاں آرکسٹرا بھی موجود تھا۔ لڑکیاں بار بار ہیجان خیز انداز میں اپنے جسم کو حرکت دیتی تھیں اور پھر سوالیہ نظروں سے کوریوگرافر کو دیکھنے لگتی تھیں۔ ایک دوسری اسکرین پر چار خوبرو لڑکیاں کھانے کی میز پر کھانا کھاتی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی شکل واضح طور پر معروف انڈین ہیروئن کاجل سے ملتی تھی۔ دیگر تین بھی غالباً اسی طرح کسی نہ کسی سیلیبریٹی کی ہم شکل تھیں۔ عین ممکن تھا کہ پاکستان سے لائی جانے والی سویٹی عرف ایشوریا بھی یہیں کہیں بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی ہو۔ مجھے وہ مناظر یاد آ گئے جب وہ کچھ دیر پہلے ٹھیکیدار انیل کی کوٹھی میں ڈائریکٹر راج کی منت سماجت کر رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ چالبازوں کے جال میں پھنسی ہوئی کئی اور پاکستانی لڑکیاں بھی یہاں موجود ہیں۔

انوپم، کنٹرول پینل پر مختلف بٹن دبا رہا تھا۔ ایک اسکرین روشن ہوئی تو اس پر گودام کا منظر نظر آیا۔ لوڈر اسی طرح کھڑا تھا۔ لوڈر کے دروازے کے پاس بے ہوش گارڈ کا بے حرکت جسم پڑا تھا۔

عمران نے اوپر والی اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اس میٹنگ میں کیا چل رہا ہے اور کون بندے ہیں یہ؟“

”اپنے بندے ہی ہیں۔“ سراج نے اجڈ انداز میں کہا۔

”میں نے سوالیہ نظروں سے انوپم کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ”اپنی کمپنی کے لوگ ہی ہیں۔ نئی بھرتی کے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں۔“

”نئی بھرتی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں...... ہم شکل لوگوں کی تلاش کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ اب ہم پاکستان کے علاوہ بنگلہ دیش اور نیپال وغیرہ میں بھی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے نئے ورکروں کی ضرورت ہے۔ اسی کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔“

اسی دوران میں میٹنگ ہال میں سے موٹی توند والے ایک مہاشے نے انٹرکام پر کال

کی۔ یہ کال سراج کے دفتر میں ہی آئی۔ میرے اشارے پر سراج نے ریسیور اٹھایا...... ”کی گل اے؟“

اندازہ ہوا کہ اسے میٹنگ ہال میں بلایا جا رہا ہے۔ سراج نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میرا وہاں جانا ضروری ہے۔“

”پر تمہارا یہاں رہنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔“ عمران نے کہا۔

سیٹھ سراج کچھ دیر پھاڑ کھانے والی نظروں سے عمران کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور کال کرنے والے سے بولا۔ ”میں ابھی نہیں آ سکدا۔ ضروری کام ہے۔ واجد کو بھیج رہا ہوں۔“

انٹرکام بند کر کے اس نے دوسرا بٹن دبایا۔ اسکرین نمبر 4 پر واجد اپنی ساتھی لڑکی اور دوست کے ساتھ بیٹھا بدستور فلم دیکھ رہا تھا۔ سیٹھ سراج نے بیٹے کو میٹنگ میں شریک ہونے کے لئے کہا اور انٹرکام بند کر دیا۔

میں نے اس دوران میں آفس کی ایک الماری کھولی تھی اور فائلوں کی ورق گردانی بھی کی تھی۔ ایک فائل مجھے اہم معلوم ہوئی۔ اس میں سارو پروڈکشن کے اہم لوگوں کے نام بھی موجود تھے۔ آٹھ دس نام تھے۔ یہ تقریباً سارے ہی ممبئی کے جرائم پیشہ لوگ تھے۔ ان میں سے فقط ایک اپنے نام کے اعتبار سے سکھ معلوم ہوتا تھا، باقی ہندو تھے۔ میٹنگ میں بھی پگڑی والا ایک سیٹھ نما سکھ موجود تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہی لوگ ہیں جو اس پروڈکشن کمپنی کے کرتا دھرتا ہیں۔

میں نے یہ فائل عمران کو دکھائی اور اپنا تجزیہ بھی بیان کیا۔ عمران نے مجھے پوری طرح چوکس رہنے کی ہدایت کی اور انوپم کو گن پوائنٹ پر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ فائل بھی اس کے پاس تھی۔

عمران اور میں بات چیت کرتے ہوئے دانستہ ہندی کے لفظ بھی استعمال کر رہے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ ہماری پہچان کے بارے میں ان لوگوں کو غلط فہمی رہے۔

سیٹھ سراج اب بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ذرا سا موقع ملنے پر بھی کوئی کارروائی ڈال دے گا۔ میں اسے یہ ذرا سا موقع دینے پر ہرگز تیار نہیں تھا...... دوسرے کمرے میں انوپم کے بری طرح چلانے کی آوازیں آئیں۔ سیٹھ سراج مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ میں نے رائفل سے اس کے سر کا نشانہ لیا اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی تو وہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ اس کی نگاہیں میرے ماسک کے پار دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ جاننا چاہتا

ہم کون ہیں؟ میں بھی اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں۔ لیکن ابھی شاید اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ وہ بہت دبنگ بدمعاش بن چکا تھا تو میں بھی وہ کم ہمت تابش نہیں رہا تھا جسے سراج اور اس کے ساتھیوں نے لاہور کے ایک پارک میں روئی کی طرح دھنک دیا تھا۔ میری جون بدل چکی تھی۔ میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے انسان کو چیونٹی کی طرح مسلنا آ گیا تھا اور آج میں سیٹھ سراج کو بتانا چاہتا تھا کہ جب اس جیسے سفاک، میرے جیسے عام لوگوں پر باعزت زندگی کے دروازے بند کرتے ہیں تو پھر ان کے لئے کیسے کیسے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ کسی انجان سمت کا رخ کر لیتے ہیں، نشوں میں ڈوب جاتے ہیں، خودکشیاں کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی میری طرح انہیں کوئی عمران مل جاتا ہے۔ وہ اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھاتے ہیں، ہتھیار تولتے ہیں، آنکھوں میں چنگاریاں جگاتے ہیں اور ظالموں کے سر پر موت کی بجلی بن کر چمک جاتے ہیں...... ہاں، میں آج سیٹھ سراج کو بتانا چاہتا تھا۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور انوپم لڑکھڑاتا ہوا سا اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر نیلگوں نشان تھے اور ایک آنکھ تیزی سے سوجتی جا رہی تھی۔ عینک کا کہیں پتا نہیں تھا۔

عمران نے اسے سرجیت کے ساتھ ہی قالین پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ بے چون و چرا بیٹھ گیا۔ عمران نے سراج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بڑی اچھی بات ہے سیٹھ سراج کہ تمہارے قریبی ساتھی بھی اس سے یہیں تمہارے ساتھ موجود ہیں، میٹنگ ہال میں۔''

اپنے لئے سیٹھ سراج کا لقب سن کر سیٹھ بری طرح چونکا۔ ''کون سیٹھ سراج؟'' اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''تم سیٹھ سراج! مالک سراج پلازا۔ سکنہ لاہور...... لاہور کے ماتھے کا بدنما داغ ہو تم۔ تم جیسوں کی کوئی قومیت ہوتی ہی نہیں۔ تم بس مال زادے ہو۔ سونے کی چمک دیکھ کر ہر طرح کی غلاظت میں ڈبکی لگاتے ہو اور اس کا حصہ بن جاتے ہو۔''

''پتا نہیں تم کیا بک رہے ہو؟''

''میں جو بک رہا ہوں تمہاری کھوپڑی میں اچھی طرح آ رہا ہے لیکن تم مان نہیں رہے ہو، نہ مانو۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ ہمیں بس سودا کرنا ہے۔ اچھی بات ہے کہ تمہارے ساجھے دار بھی یہاں موجود ہیں۔ بس دو کی کمی ہے، ان کو بھی بلا لو۔''

''کیا کروں گا ان کو بلا کر؟''

''سودے کی بات چیت۔''

''اتنی جلدی کوئی سودا شودا نئیں ہوسکدا۔'' سراج نے منہ بنایا۔

''چلو شروع کی گل بات تو ہو ہی سکتی ہے نا۔ پرسوں ایک میٹنگ اور رکھ لیں گے۔ تمہارا سودا ہمیں پسند آیا ہے۔ آشا ہے کہ تمہاری ڈیمانڈ بھی پسند آ جائے گی۔''

سیٹھ نے کہا۔ ''اگر ہم نے یہ سودا نہ کرنا ہوئے تو پھر؟''

''پھر تم گھاٹے میں رہو گے۔ ہم پہلے سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں پھر دوسرے طریقے برتتے ہیں۔''

''دھمکیاں دے رہے ہو؟''

''کہو تو ابھی عمل کر کے بھی دکھا دیتا ہوں اور عمل کی شروعات تمہارے ان دونوں بندوں سے کر دیتا ہوں۔'' عمران نے پستول سرجیت کمار کی طرف سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ پھر ٹوٹی پلیٹ جیسا ہو گیا اور اس دفعہ پلیٹ واقعی ٹوٹ بھی گئی۔ عمران نے بغیر کسی وارننگ کے گولی چلائی جو سیدھی سرجیت کمار کے منہ میں لگی اور اس کے دانت توڑتی ہوئی اس کے تالو میں گھس گئی۔ وہ بیٹھا بیٹھا ''دھپ'' سے قالین پر گرا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک خم دار چاقو دبا ہوا تھا۔ پتا نہیں یہ اس نے کہاں چھپا رکھا تھا جو تلاشی میں بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ چند سیکنڈ میں سرجیت کی بے جان مٹھی کھل گئی اور چاقو کا سرخ دستہ نظر آنے لگا۔ سراج اب سکتہ زدہ تھا۔ میں نے چاقو اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

عمران کے لہجے میں درندگی تھی۔ ''یہ کافی ہے یا دوسرا ثبوت دوں؟''

انوپم کے زخمی چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔ سراج نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا چاہندے ہو تم؟''

عمران نے فائل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''امرناتھ کو بلاؤ جو ساؤتھ ممبئی میں نائٹ کلب چلاتا ہے اور سارو پروڈکشن میں آٹھ فیصد کا حصے دار ہے۔ اور ٹرانسپورٹر تیواری کو بلاؤ جس نے تمہیں پچھلے سال کولکتہ سے ہیروئنی دیول کا سو فیصد ہم شکل لا کر دیا تھا اور جس کے صلے میں تم نے اسے اپنا منیجر بنا رکھا ہے۔''

عمران کو یہ معلومات یقیناً انوپم سے ہی حاصل ہوئی تھیں۔ سراج ان دونوں افراد کو بلانے میں متذبذب تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ عمران کا ارادہ اٹل ہے اور وہ اس کام میں تاخیر نہیں چاہتا تو اس نے فون پر یکے بعد دیگرے دونوں افراد سے رابطہ کیا اور انہیں فوراً گولڈن بلڈنگ پہنچنے کے لئے کہہ دیا۔

سراج نے اس ہدایت پر اس لئے بھی عمل کیا کہ شاید اسے کسی بہتری کی توقع تھی۔ اس

کا خیال تھا کہ شاید نئے آنے والوں میں سے کوئی موجودہ صورتِ حال کا پانسا پلٹ سکے۔
جیسا کہ بعد میں پتا چلا، ان دونوں افراد میں سے تیواری بڑا خطرناک شخص تھا۔ اس نے کولکتہ کی دو بنگالی بہنوں کو زبردستی گھر میں ڈالا ہوا تھا اور انہیں گھر میں ڈالنے کے لئے اس نے اڑیسہ کے علاقے میں ایک ہی خاندان کے دس افراد کو آگ میں زندہ جلا ڈالا تھا۔ اپنے مزید پیاروں کو موت سے بچانے کے لئے ان دونوں بہنوں نے عدالت میں بیان دیا تھا کہ وہ تیواری کے ساتھ اپنی مرضی سے رہ رہی ہیں۔ ایک بیوی کی حیثیت سے، دوسری سالی کی حیثیت سے۔ دونوں نے اپنا مذہب تبدیل کرنے کے بارے میں بھی بیان دیا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد تیواری بھی میٹنگ ہال میں پہنچ گیا۔ وہ شکل سے ہی ایک بدبودار جانور لگتا تھا۔ دوسرے شخص امرناتھ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ نشے میں اتنا دھت ہے کہ گھر سے باہر نکلنے میں ناکام رہا ہے۔

اب کورم تقریباً پورا تھا۔ مجھے عمران کے ارادے بڑے خطرناک لگ رہے تھے۔ خود میرے سینے میں بھی ایک ایسی آگ روشن تھی جس نے مجھے سرتاپا ڈھانپ لیا تھا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اپنے پرانے ''خیرخواہ'' سیٹھ سراج کو یہاں اس روپ میں دیکھوں گا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا اور میرے سارے پرانے زخموں سے خون رِسنے لگا تھا۔ ثروت کی بربادی آنکھوں کے سامنے آرہی تھی۔ خالو عثمان اور خالہ صفیہ کے مردہ چہرے...... اور پھر اپنی ماں کا مرنا۔ اذیت کی انتہا کو چھو کر ان کا کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگانا۔ کچھ بھی تو بھولا نہیں تھا۔ سب کچھ راکھ کے ڈھیر میں سلگتے انگاروں کی طرح دبا ہوا تھا...... ایک ہوا کا منتظر تھا اور وہ ہوا آج چلی تھی۔

عمران نے کمپیوٹر انجینئر انوپم کو ہدایات دیں اور اس نے کانفرنس ہال کے کیمروں کا رابطہ کنٹرول پینل سے مکمل طور پر منقطع کردیا۔ اس دوران میں، مَیں الماریوں کی تلاشی لیتا رہا۔ ایک الماری سے جدید قسم کی چابیوں کے دو بڑے گچھے ملے۔ عمران نے سیٹھ سراج سے معلومات حاصل کیں کہ کانفرنس ہال سے باہر کتنے گارڈز ہیں اور ان کے پاس کیا اسلحہ ہے۔ اس کے بعد ہم جانے کے لئے تیار ہوگئے۔

ہم نے سیٹھ سراج اور انوپم کو گن پوائنٹس پر رکھا اور دفتر سے نکل کر ایک کوریڈور میں داخل ہوگئے۔ تیس چالیس قدم چلنے کے بعد ہم اس ہال کے مین دروازے کے سامنے پہنچ گئے جہاں میٹنگ ہو رہی تھی۔ سیٹھ سراج کے بیان کے عین مطابق یہاں دو باوردی گارڈز مسلح لک الکا ، ازی موڈ میں کھڑے تھے۔ مجھے ان کو ہینڈز اَپ

کرانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔
وہ ہکا بکا رہ گئے۔ ''چلو، تم دونوں بھی اندر چلو۔'' عمران نے کہا۔

ہم میٹنگ ہال میں یکے بعد دیگرے داخل ہوئے۔ سب سے آگے سیٹھ سراج اور انوپم تھے۔ ان کے پیچھے میں تھا، عقب میں عمران تھا۔ اس نے دونوں گارڈز کو کور کیا ہوا تھا۔ یہ گارڈز شکلوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ ہم میٹنگ ہال میں پہنچے تو طویل میز کے گرد بیٹھے افراد کے چہرے تصویرِ حیرت بن گئے۔ چند لمحے کے لئے وہ جیسے سکتے میں آگئے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مجھے بس یہی لگا کہ میرے پیچھے ایک جھماکے کے ساتھ تیز حرکت ہوئی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، مجھے اپنے پیچھے شیشے کی ایک دیوار سی نظر آئی۔ یہ دیوار فرش سے لے کر قریباً نو فٹ اونچی چھت تک چلی گئی تھی۔ عمران اور ایک گارڈ اس دیوار کے پیچھے تھے۔ گارڈ کا ایک پاؤں اس موٹی بلوری دیوار کے نیچے آگیا تھا اور وہ زمین پر گرا مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ میں ایک سیکنڈ کے لئے چکرا گیا۔ اچانک ایک پرچھائیں سی میری طرف آئی۔ ایک پتھریلا جسم مجھ سے ٹکرایا، میں دور تک لڑھک گیا۔ میری رائفل سے ایک برسٹ چلا اور چھت میں کئی سوراخ ہو گئے۔ کوئی زورآور شخص مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میں نے اسے ٹانگوں پر اچھالنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران میں دو تین مزید افراد مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں جانتا تھا کہ ان لمحوں میں میرے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ میں رائفل اپنے ہاتھوں سے نکلنے نہ دوں۔ میں اپنی انگلی ٹریگر پر نہیں رکھ سکا تھا مگر دستہ ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے پوری جان سے اسے تھام لیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ حملہ کرنے والے بھڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے ہیں۔ میرا پورا جسم شدید ضربوں کی زد میں آگیا۔ پھر رائفل بھی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے لگا کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلتا جارہا ہے۔ میں مزاحمت کی کوشش کررہا تھا لیکن یہ کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ میری قمیص کے ساتھ ساتھ میرے چہرے کا ماسک بھی چیتھڑوں میں بدل چکا تھا۔ مجھے لگا کہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ادھ موا کرکے چھوڑ دیا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے ساتھ آنے والا تنومند گارڈ رائفل تانے میرے سر پر کھڑا ہے۔ چکنے فرش پر اوندھے پڑے پڑے میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ شیشے کی موٹی دیوار کے دوسری طرف سے عمران نے برسٹ چلایا لیکن یہ مکمل بلٹ پروف شیشہ تھا۔ عقبی دروازہ بھی آٹومیٹک طریقے سے لاک ہوچکا تھا۔ اب عمران اور گارڈ، ہال کے قریباً 16 فٹ

ضرب 10 فٹ کے ایک مختصر حصے میں بند تھے۔ چھت بھی کافی نیچے تھی، یعنی صرف ساڑھے آٹھ نو فٹ کے قریب۔ گارڈ کا پاؤں بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور پھنسا ہوا تھا۔ جب دیوار تیزی سے نیچے آئی تھی تو یہ پاؤں اس کی زد میں آیا تھا۔ اگر گارڈ خود آ جاتا تو معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوتا۔ میں نے دیکھا، سیٹھ سراج عرف سارو اس آٹومیٹک بلوری دیوار کو اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک سائیڈ پر ایک چھوٹا سا پینل تھا۔ اس پر لاک کا سوراخ تھا۔ سیٹھ نے اس میں تین چار انچ لمبی ایک چابی داخل کی ہوئی تھی۔ پینل پر ایک بلب بار بار اپنا رنگ بدلتا تھا، کبھی سرخ اور کبھی زرد ہو جاتا تھا۔ سیٹھ سراج بار بار چابی گھما رہا تھا اور بائیں ہاتھ سے ایک سبز بٹن دبا رہا تھا لیکن دیوار اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ گارڈ کا پاؤں پھنس جانے سے اس میں یقیناً کوئی خرابی واقع ہو گئی تھی۔

ان لوگوں نے مجھے ادھ موا سمجھ لیا تھا اور یہ ان کی غلطی تھی...... یا شاید ان کی غلطی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے اتنی شدید چوٹیں لگائی تھیں کہ وہ مجھے مردہ یا نیم جان سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ میرے سر کو رائفل کے کندوں کی ضربوں سے پلپلا کر دیا گیا تھا۔ میرا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اور ایک بازو شدید چوٹ کی وجہ سے بالکل سن ہو چکا تھا۔ مجھے ٹھیک سے علم نہیں تھا کہ اس کا کیا حال ہے۔ اگر میں یہ تمام تشدد سہہ گیا تھا اور ابھی تک پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا تھا تو اس کی وجہ میری وہ غیر معمولی سخت جانی تھی جو میں نے پچھلے کچھ عرصے میں بتدریج حاصل کی تھی۔ پہلے اس بے مثال کردار بارونداجیکی کے ذریعے اور پھر اپنی مسلسل نفس کشی کے ذریعے۔ ہاں، میں وہ سب کچھ سہہ گیا تھا اور مجھے مارنے والے مجھے اس قابل نہیں سمجھ رہے تھے کہ میں مزاحمت کر سکتا۔ وہ اپنی جگہ صحیح تھے، میں اپنی جگہ صحیح تھا۔ میرے سینے میں جو آگ بھڑک رہی تھی، اس کی حدت کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ آج برسوں بعد مجھے وہ چہرے دکھائی دیئے تھے جن کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھوں کے اندر آتشیں زخم بن گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ایک پہاڑ جیسا قرض میرے سینے پر دھرا ہوا تھا۔ آج مجھے یہ قرض اتارنا تھا، یا مرنا تھا۔ مجھے یہ ''ابھی یا پھر کبھی نہیں'' والا معاملہ نظر آ رہا تھا۔

اسی دوران میں سیٹھ سراج شیشے کی دیوار کو حرکت دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے سبز بٹن دبا کر دیوار کو تین چار انچ بلند کیا۔ گارڈ نے اپنا پاؤں اندر کھینچ لیا۔ اس کے پاؤں کی ہڈیاں چُور ہو گئی تھیں اور انگلیاں باقی پاؤں سے برائے نام ہی جڑی رہ گئی تھیں۔ اس کا خون تیزی سے چکنے فرش پر پھیلنے لگا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

یہی وقت تھا جب میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنی تمام تر بچی کچھی

طاقت کو جمع کیا۔ گارڈ کی رائفل کی نال میری طرف جھکی ہوئی تھی...... مجھ سے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر تھی۔ گارڈ اتنا چوکس نہیں تھا جتنا اسے ہونا چاہئے تھا۔ اس کی چالیس پچاس فیصد توجہ شیشے کے پار اپنے تڑپتے ہوئے ساتھی پر تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنی جگہ سے جست کی اور رائفل کے بیرل پر ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ گارڈ کی انگلی ٹریگر پر بے ساختہ دب جائے گی۔ یہی ہوا۔ رائفل سے گولی نکلی۔ میں نے بیرل کا رخ سیٹھ سراج اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہی رکھا تھا۔ گولی کا نشانہ سیٹھ سراج کا بیٹا واجد عرف واجی بنا۔ گولی اسؐ کے کندھے پر لگی اور وہ کندھا پکڑ کر جھک گیا۔ میں نے زوردار لات گارڈ کے سینے پر ماری۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ چکنے فرش پر دور تک لڑھک گیا۔

ایک شخص نے مجھ پر پستول کی گولی چلائی۔ میں زمین پر گرا۔ فائر خالی گیا۔ اس دوران میں، مَیں رائفل کو پوزیشن دے چکا تھا۔ میں نے پستول بردار پر یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ ایک گولی سیدھی اس کے سر میں لگی۔

''خبردار...... ماردوں گا۔'' میں چنگھاڑا اور اس کے ساتھ ہی رائفل کو برسٹ پر کر لیا۔

ایک اور شخص نے میز پر سے رائفل اٹھانا چاہی۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ کم و بیش پانچ گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ ''خبردار۔'' میں نے پھر وارننگ دی اور اس کے ساتھ ہی حاضرین کے پاؤں میں وارننگ برسٹ مارا۔ لکڑی کے چکنے ملائم فرش پر کئی سوراخ ہو گئے۔ زبردست تڑتڑاہٹ نے دیواریں لرزا دیں۔ میں جانتا تھا کہ اس مکمل ساؤنڈ پروف اور ''باپردہ'' کانفرنس ہال میں سے کوئی آواز باہر نہیں جا سکتی اور کوئی نظر اندر نہیں آ سکتی۔ یہاں قیامت کا منظر تھا۔ ممبئی کے نو دس چھٹے ہوئے دولت مند بدمعاش یہاں میرے سامنے موجود تھے۔ میرے قہرناک انداز نے ان کے چہرے دھواں کر دیئے تھے۔ ''ہاتھ کھڑے کرو۔'' میں دہاڑا اور حرکت کر کے ہال کی سب سے مناسب جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہ لمبوتری طویل میز تھی جس پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں سے میں ہر فرد پر بہ آسانی نگاہ رکھ سکتا تھا اور اسے نشانہ بنا سکتا تھا۔ ہال کمرے میں اب دو لاشیں تھیں اور سراج کا سوہنا پتر واجی اپنے لہولہان کندھے کو پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے۔ تاہم چہرہ خون میں بری طرح لتھڑا ہوا تھا اور یہ خون بار بار میری آنکھوں میں بھر کر میری بصارت کو دھندلا رہا تھا۔ میرا بالائی جسم تقریباً عریاں تھا۔

میں نے سیٹھ سراج کو حکم دیا کہ وہ شیشے کی دیوار کو اوپر اٹھائے۔

سیٹھ نے تذبذب دکھایا تو میں نے بے دریغ اس کے بیٹے کونشانہ بنایا۔ میں نے سنگل شاٹ چلایا اور گولی واجی کے دوسرے کندھے میں اتر گئی۔ اس بار وہ لکڑی کے فرش پر ڈھے گیا اور درد سے ڈکرانے لگا۔

میرے تیور دیکھ کر سیٹھ سراج آگے بڑھا۔ اس نے لاک کے سوراخ میں قریباً چار انچ لمبی چمک دار چابی داخل کی۔ سبز بٹن دبایا اور شیشے کی دیوار اوپر اٹھا دی۔ عمران باہر آ گیا......

میرا ماسک پہلے ہی اتر چکا تھا، عمران نے بھی اپنا ماسک نوچ کر اتار دیا۔ اب ایک کی جگہ دو آٹومیٹک رائفلیں سراج اینڈ کمپنی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ عمران نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔ ہم ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھ گئے۔ عمران نے گرج کر کہا۔ ''چلو اندر...... سب اندر چلو۔''

وہ انہیں شیشے کی دیوار کی دوسری جانب بھیج رہا تھا۔

سیٹھ سراج کے چھوٹے سے ماتھے پر رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ تڑخ کر بولا۔

''اوئے، کیا چاہندے ہوتم؟''

''پہلے تمہاری اس ہٹی کا سودا چاہتے تھے، اب کچھ نہیں۔ اب وہاں دیوار کے پیچھے جاؤ۔ ورنہ تیسری گولی ولی عہد واجد صاحب کے پیٹ شریف میں لگے گی۔'' عمران کی آواز میں لرزا دینے والی سفاکی تھی۔

دو تین بندے اندر چلے گئے مگر باقی وہیں کھڑے رہے۔ ان میں مکروہ چہرہ تیواری بھی شامل تھا۔ یہی خطرناک شخص تھا جس نے بٹن دبا کر شیشے کی دیوار نیچے گرائی تھی۔ بعد میں مجھ پر جست کرنے والا بھی یہی تھا۔ عمران نے کہا۔ ''دوستو! میں صرف پانچ تک گنوں گا۔ اگر تم لوگ دوسری طرف نہیں گئے تو گولی چلاؤں گا۔''

اس نے گنتی شروع کی۔ وہ چار تک پہنچا تھا جب سیٹھ سراج نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ یقیناً ''آرگو'' کرنا چاہتا تھا لیکن عمران کسی گفت وشنید کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے تیواری پر برسٹ چلایا اور اسے بھون کر رکھ دیا۔ لیکن وہ نصف بھونا گیا تھا۔ چار پانچ گولیوں کا برسٹ بس اس کی ٹانگوں میں لگا تھا۔ وہ تڑپ کر گرا اور پھر رینگتا ہوا سب سے پہلے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں کچھ دیر پہلے عمران موجود تھا۔ باقی افراد بھی آناً فاناً اندر گھس گئے۔ انہوں نے جیسے موت کے فرشتوں کو اپنے رُوبرو دیکھ لیا تھا۔ اب صرف سیٹھ سراج اور اس کا زخمی بیٹا واجی باہر تھے۔ عمران نے رائفل ان دونوں کی طرف سیدھی کی اور دہاڑا۔ ''تم دونوں بھی۔ آخری وارننگ دے رہا ہوں۔''

سیٹھ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ عمران نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ ''ٹھہرو عمران!'' میں نے کہا۔ ''اگر یہ نہیں جانا چاہتا تو رہنے دو۔''

عمران نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اسے آمادہ کر لیا۔ عمران نے اپنے پہلو میں کھڑے انوپم سے کہا۔ ''شیشہ نیچے گراؤ۔'' انوپم طویل میز کے پیچھے گیا۔ اس نے میز کے نیچے ہاتھ ڈال کر کوئی کھٹکا دبایا۔ بلٹ پروف شیشہ بمشکل ایک سیکنڈ کے اندر چھت سے نوفٹ نیچے فرش تک آ گیا۔ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ زبردست تکنیک تھی۔ اب سراج اور اس کے بیٹے کے علاوہ سب لوگ شیشے کے دوسری جانب تھے۔ یہ ایک طرح سے 16 فٹ ضرب 10 فٹ کا کیبن سا بن گیا تھا۔ کیبن نما جگہ کی چھت پر سوراخ بھی نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں نہ صرف لوگوں کو آناً فاناً بند کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کی ایذا رسانی کا سامان بھی موجود ہے۔

میں ایذا پسند ہرگز نہیں تھا لیکن آج پتا نہیں کیوں مجھے ایذا رسانی بُری نہیں لگ رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو مار دینا چاہتا تھا جس طرح اس نے میری ماں کو مارا تھا۔ عمران نے انوپم سے پوچھا۔ ''یہ چھت پر چھوٹے سوراخ کیسے ہیں؟''

اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''وہ دائیں طرف والے سوراخ تو مائیک کے ہیں۔ آپ ان لوگوں سے کیول مائیک کے ذریعے ہی بات کر سکتے ہیں۔''

''اوپر چھت والے سوراخ؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچانے کے بعد بولا۔ ''یہ ائیر کنڈیشننگ کے سوراخ ہیں۔ کیبن کے ٹمپریچر کو باہر سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔''

''کیا رینج ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

وہ مردہ لہجے میں بولا۔ ''مائنس پچاس سے لے کر پلس 250 تک۔''

''250 سینٹی گریڈ پر تو آگ لگ جاتی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''جی ہاں۔'' انوپم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ٹھیک ہے بھئی، لگا دو آگ۔'' عمران نے کہا۔ ''اور مائیک کھول دو پورا۔''

اگلے سات آٹھ منٹ بڑے لرزہ خیز تھے۔ عمران کے حکم پر انوپم کو وہ ناب گھمانا پڑی جو کیبن کے ٹمپریچر کو تیزی سے بڑھاتی تھی۔ مائیک کھلے ہوئے تھے۔ اندر موجود افراد دہائی مچانے لگے تھے۔ زخمی تیواری کی چلاّتی ہوئی آواز آئی۔ ''سارو! روکو ان کو...... بھگوان کے لئے روکو۔''

سارو یعنی سراج کیا کرسکتا تھا۔ میں نے رائفل اس کی طرف اور واجی کی طرف سیدھی کر رکھی تھی۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ ایک لمحے میں ان کے جسم چھلنی ہو جائیں گے۔ اندر ٹمپریچر بڑھتا جارہا تھا۔ تیواری پھر چلایا۔ ''سارو۔''

عمران نے مائیک میں کہا۔ ''لگتا ہے تیواری صاحب، تمہیں بڑی گرمی لگ رہی ہے۔ گرمی تو یقیناً ان نردوش لوگوں کو بھی لگی ہوگی جنہیں تم نے زندہ جلایا تھا اور ان کے علاوہ بھی پتا نہیں کتنے لوگوں کو تم نے آگ میں جھونک رکھا ہوگا۔''

اب وہ سب چلا رہے تھے۔ دہائی دے رہے تھے۔ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے۔ ان کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ ان کے چہرے پسینے سے تر ہوتے جارہے تھے۔ پھر بات پسینے سے آگے نکل گئی۔ حدت سے ان کی جلد جھلسنے لگی۔ وہ شیشے کی بُلٹ پروف دیوار سے ٹکرانے لگے۔ پچھاڑیں کھانے لگے۔ یہ سب زندہ انسانی گوشت کے بیوپاری تھے۔ انہوں نے بس آرٹ اور فلم میکنگ کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ وہ بے رحم قصاب تھے اور آج خود کند چھری کے نیچے آگئے تھے۔ وہ تڑپ رہے تھے اور اذیت کی شدت سے ان کی آوازیں پھٹنا شروع ہوگئی تھیں۔ عمران کے کہنے پر انوپم نے مائیک آف کر دیئے۔ پھر ایک دوسرا بٹن دبا کر شیشے کے سامنے ایک کرٹن کھینچ دیا۔ سراج سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا، شاید پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

پانچ منٹ بعد انوپم نے عمران کی ہدایت پر پردہ ہٹایا تو شیشے کی دوسری جانب وہ سب ختم ہو چکے تھے۔ ٹمپریچر جب ایک حد سے بڑھا تھا تو ان کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ یقیناً اس مرحلے کے بعد وہ دس پندرہ سیکنڈ کے اندر مر گئے تھے۔ وہ سب مادرزاد برہنہ پڑے تھے۔ بس کسی کسی کے جسم پر کوئی چیتھڑا رہ گیا تھا۔ یہ بڑا عبرت ناک منظر تھا۔ عمران کے کہنے پر انوپم نے ایک بار پھر شیشے کے سامنے کرٹن کھینچ دیا۔

سیٹھ سراج کا پتا پانی ہو چکا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر عجیب لرزتی سی آواز میں بولا۔

''کون ہو تم؟''

میں نے اپنی پھٹی ہوئی شرٹ سے اپنا خون آلود چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔ ''تم مجھے کافی حد تک پہچان چکے ہو سراج۔''

''تم...... عثمان کے بھانجے ہونا...... تابش!''

''اور خالو عثمان کے علاوہ میری والدہ کو بھی تم نے ہی مرنے پر مجبور کیا۔ میں نے تم سے کہا ہے نا کہ آج حساب کتاب کا دن ہے۔''

سیٹھ سراج کی آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ زندگی کی فلم میں من مانیوں کے طویل ''سیکوئنس'' کے بعد یہ وہی وقت ہے جو ہر ولن پر آتا ہے۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ اب بچنے کا امکان بہت کم ہے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''عمران! تم اس ولی عہد واجد کا دھیان رکھو۔ میں بادشاہ سلامت سے دو دو ہاتھ کرلوں۔''

واجد کے دونوں کندھے زخمی تھے اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال بیٹھا تھا...... وہ جانتا تھا کہ اس موقع پر وہ اپنی کوئی مدد کرسکتا ہے اور نہ اپنے باپ کی۔ وہ آنکھیں بند کئے بس کراہ رہا تھا۔ بلاشبہ سراج کی طرح اس نے بھی مجھے اور کسی حد تک عمران کو پہچان لیا تھا۔ ممکن تھا کہ پانچ سال پہلے کے مناظر اس کی نگاہوں میں گھومنا شروع ہو گئے ہوں۔

ایک جانب شیشے کے ایک خوب صورت شوکیس میں دو جدید بیکال رائفلیں آویزاں تھیں ان کے نیچے اسٹیل کی ایک چمک دار کلہاڑی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ کلہاڑی سیٹھ سراج کا خاص شوق ہے۔ اس نے جس کسی کو بری طرح دھمکانا ہوتا تھا، اسے کہتا تھا کہ...... کلہاڑی سے تیرا گاٹا اتاروں گا۔ وہ کلہاڑی کو پنجابی لہجے میں گواڑی کہتا تھا اور یہ بات ہے بھی حقیقت۔ کلہاڑی سے مرنا یقیناً مرنے والوں کے لئے بہت اذیت ناک ثابت ہوتا ہے۔ کلہاڑی کے زخم نہ تو ہتھوڑے کی طرح کند ہوتے ہیں اور نہ ہی خنجر وغیرہ کی طرح تیز دھار۔

میں نے رائفل کے کندے سے ضرب لگائی اور خوب صورت شوکیس کا شیشہ توڑ کر کلہاڑی نکال لی۔

''اس کا کیا کرو گے؟'' عمران نے پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ کروں گا لیکن پہلے تم ایک کام کرو۔ یہاں جو باقی گارڈز ہیں، ان کو کسی ایک جگہ جمع کرلو۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' عمران نے کہا۔ اس نے انوپم کمار سے اس بارے میں پہلے ہی معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔

عمران کے حکم پر انوپم کمار نے کانفرنس ہال کے اندر سے ہی اسپیکر پر بلڈنگ کے گارڈز سے رابطہ کیا۔ اس کی آواز چھوٹے مائیکس کے ذریعے بلڈنگ کے ہر حصے میں سنی گئی، وہ بولا۔

''ہیلو گارڈز...... ہیلو گارڈز...... ایمرجنسی ہے۔ آپ سب لوگ کمرا نمبر تین میں جمع ہو جائیں۔ یہ اعلان سارے گارڈز کے لئے ہے۔ کمرا نمبر تین میں جمع ہو جائیں...... فوراً، یہ ایمرجنسی ہے۔''

اس نے یہ اعلان دو تین بار دہرایا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اس نے سیل فون پر ایک سینئر سکھ گارڈ سے رابطہ کیا اور تصدیق چاہی کہ تمام گارڈز کمرے میں موجود ہیں...... کانفرنس روم کے اندر ہی موجود ''کنٹرول'' کے ذریعے اس نے کمرا نمبر تین کو لاک کر دیا۔ عمران نے اپنی پتلون کی جیب میں سے دو اور اسکائی ماسک نکال لئے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس ہال سے باہر جانا چاہ رہا ہوں۔ اس نے ایک ماسک میرے چہرے پر چڑھا دیا اور دوسرا اپنے لئے رکھ لیا۔ کانفرنس ہال کے ایک گوشے سے ایک چھوٹی سی جدید کیپسول لفٹ اوپر جا رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو گن پوائنٹ پر اس لفٹ میں لے آیا۔ وہ اڑیل ٹٹو کی طرح آسانی سے نہیں اٹھا لیکن جب میں نے اس کے پاؤں کے قریب رائفل سے فائر کئے تو اس کو لفٹ میں آتے ہی بنی۔ لفٹ چند سیکنڈ میں ہمیں گولڈن بلڈنگ کی چھت پر لے آئی۔ یہ چوتھی منزل کی چھت تھی۔ ہم دونوں باہر نکلے۔ چھت بالکل خالی تھی۔ بس ایک طرف تھوڑی سی آگ جل رہی تھی اور چائے کے دو کپ اور سگریٹ کے ٹوٹے وغیرہ پڑے تھے۔ اندازہ ہوا کہ کچھ دیر پہلے تک یہاں ایک دو گارڈز موجود تھے۔ میرے جسم پر نیل ہی نیل تھے۔ ایک ہاتھ کا انگوٹھا شاید ٹوٹ گیا تھا۔ سر میں درد سے دھماکے ہو رہے تھے۔ لیکن یہ ساری اذیت مجھے مزہ دے رہی تھی۔

خنک ہوا نے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ میں نے رائفل ایک طرف رکھی اور کلہاڑی کا پہلا بے رحم وار سیٹھ سراج کے کندھے پر کیا۔ یہ کاری ضرب تھی۔ سیٹھ سراج کا تنومند جسم دہل گیا۔ کھڑکھڑاتی سفید قمیص کے نیچے چربی دار گوشت بھی کٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو سراج...... گواڑی کی مار واقعی بُری ہوتی ہے۔''

موت کو سامنے دیکھ کر سراج نے آخری کوشش کی۔ وہ دیوانہ وار میری طرف آیا لیکن اس کے بھاری جسم میں وہ تیزی نہیں تھی جو اس قسم کی صورتِ حال میں اس کی مدد کر سکتی۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ قریباً پانچ فٹ لمبے دستے والی کلہاڑی ایک بار پھر گھومی۔ اس بار سیٹھ سراج کی کلائی پر زخم لگا۔ ہڈی ٹوٹ گئی اور خون فوارے کی طرح بہہ نکلا۔ یہ اتنی تکلیف دہ چوٹ تھی کہ سیٹھ چلا اٹھا اور کلائی پکڑ کر دہرا ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''سراج! یہ تو ''شروع اسٹارٹ'' ہے۔ ابھی ایسے بہت سے پھٹ تجھے لگنے ہیں۔ تُو واقعی ''سائنس داں'' ہے۔ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ گواڑی سے مرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ گولی سوراخ کر دیتی ہے، چاقو چیر دیتا ہے لیکن یہ مارتی بھی ہے اور رولتی بھی ہے۔''

سیٹھ کی آنکھوں میں اب اذیت اور خوف کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسے اپنا انجام سو فیصد نظر آ گیا تھا۔ اس نے یقیناً میری آنکھوں میں ناچتی ہوئی وحشت بھی دیکھ لی تھی۔ میں

نے کہا۔ ''سراج! بندہ جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ اس میں کچھ دیر ضرور لگ سکتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے۔''

میں نے پھر کلہاڑی اٹھائی۔ اس مرتبہ سراج نے وار ہاتھ پر روکنے کی کوشش کی۔ اس کی ہتھیلی پر گہرا گھاؤ آیا۔

میں نے کہا۔ ''سراج! اگر گواڑی کی موت سے بچنا چاہتے ہو تو پھر نیچے چھلانگ لگا دو۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں اٹل ارادے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہم دونوں اب چھت کی منڈیر سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر تھے۔ نیچے گولڈن بلڈنگ کا عقبی صحن تھا۔ پتھر کا فرش دودھیا لائٹ میں چمک رہا تھا۔ یہ چوتھی منزل کی چھت تھی...... سیٹھ نے میری کلہاڑی کی طرف دیکھا...... پھر نیچے دیکھا...... پھر کلہاڑی کی طرف دیکھا۔ میں بالکل ساکت کھڑا تھا۔ سیٹھ سراج کے دونوں طرف موت تھی لیکن ایک موت زیادہ اذیت ناک تھی اور سیٹھ جان چکا تھا، اب اسے بچانے کوئی نہیں آئے گا۔

''جلدی کرو سراج! مجھے اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔'' میں نے کلہاڑی کو ہاتھ میں گھمایا اور ایک قدم آگے بڑھایا۔

سیٹھ سراج نے پھر نیچے دیکھا۔ نیم تاریکی کی وجہ سے مجھے صاف نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یقینی بات تھی کہ سیٹھ کی تنگ پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ اس نے آخری بار میرے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر وہاں کوئی رعایت نہ پا کر دو فٹ اونچی منڈیر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ زندگی آخر تک ''جینے'' کی خواہش رکھتی ہے۔ شاید سیٹھ سراج کے ذہن میں بھی ہو کہ ممکن ہے وہ گر کر بچ جائے۔ قریباً تین من وزن کے ساتھ پچاس پچپن فٹ کی بلندی سے گرنا اور بچنا کرشمہ ہی کہلاتا۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر میں نے رائفل اٹھائی اور نیچے جھانکا۔ دودھیا روشنی میں سیٹھ کا سر دو لخت نظر آیا۔ خون فرش کو رنگین کرتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بلی ''مردہ سیٹھ'' سے چند فٹ کے فاصلے پر حیرت زدہ سی کھڑی تھی۔

بلندی سے اس طرح گر کر مرنے کا ''ایک منظر'' میں پانچ سال پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

''ماں جی!'' میں نے کہا اور میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

چار پانچ منٹ بعد میں کیپسول لفٹ کے ذریعے پھر ساؤنڈ پروف کانفرنس ہال میں تھا۔ یہاں میرے آنے تک ایک اور معرکہ ہو چکا تھا۔ عمران کی چلائی ہوئی گولی سیدھی واجد عرف واجی کے رخسار پر لگی تھی اور کھوپڑی توڑ کر گدی کی طرف سے نکل گئی تھی۔ واجی کی لاش

لکڑی کے فرش پر چت پڑی تھی۔ انوپم کمار سہا ہوا، دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔

''سوری شارق مجھے اسے مارنا پڑا۔'' عمران بولا۔

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں پتا ہے، یہ جب سے زخمی ہوا ہے ایک ہی جگہ بیٹھا رہا ہے۔''

''ہاں۔''

''اس کے نیچے یہ پسٹل دبا ہوا تھا۔ عمران نے مجھے ایک چھوٹا لیکن طاقتور پسٹل دکھایا۔ یہ سراج کے ساتھیوں میں سے ہی کسی کا تھا اور ہنگامے کے دوران میں گر گیا تھا۔'' عمران نے بتایا۔ ''اس نے ایک دم مجھ پر فائر کیا۔ یہ دیکھو گولی کتنے قریب سے گزری ہے۔'' عمران کی قمیص کی ایک آستین میں گولی کا سوراخ تھا۔

''بہت اچھا کیا۔'' میں نے واجی کی لاش پر نفرت بھری نگاہ ڈالی۔ خون اس کی فرنچ کٹ داڑھی کو بھگو رہا تھا اور اس کے گلے میں حمائل پلاٹینیم کی زنجیر کو داغ دار کر رہا تھا۔

یہ وہ امیر زادہ تھا، عیش و قانون شکنی جس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن میری دانست میں اس سے بڑا مجرم اس کا باپ تھا جو اس کا پشت پناہ اور مربی تھا۔ جس نے اسے اپنے سے بڑا قاتل اور ہوس کار بنانے کی پلاننگ کر رکھی تھی۔

ہم کچھ دیر تک واجی کی اس اچانک موت پر بات کرتے رہے پھر عمران نے انوپم سے کہا۔ ''تم نے ہماری کافی مدد کی ہے لیکن افسوس کہ تم ہمیں ماسک کے بغیر دیکھ چکے ہو۔ دوسروں کی طرح اب تمہیں بھی مرنا پڑے گا انوپم۔''

انوپم کے چہرے کا سارا خون نچڑ گیا۔ اس نے رحم طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ جو کہیں گے، میں کروں گا۔''

''بس ہم یہی کہتے ہیں کہ تم مر جاؤ۔'' عمران نے اسپاٹ آواز میں کہا...... اور...... اس کی موت آسان بنا دی۔ عمران کی چلائی ہوئی گولی اس کی عین کنپٹی پر لگی اور وہ پیٹ سے چوبی فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔ اس معقول شخص کو زندہ رکھا جا سکتا تھا لیکن ہماری مجبوریاں آڑے آ رہی تھیں۔ ہمارے سامنے بدترین حالات تھے...... اسی دوران میں کانفرنس روم کے اندر تیز الارم بجنا شروع ہو گیا۔

○......❖......○

اب اس کانفرنس ہال میں، عمران اور میں اکیلے تھے۔ ہمارے چاروں طرف خون کے چھینٹے تھے، گولیوں کے خول تھے اور لاشیں تھیں۔ ان میں سے دس لاشیں تو اس عارضی کیبن

کے اندر تھیں جہاں ٹمپریچر آناً فاناً 250 سینٹی گریڈ تک پہنچا تھا اور ان دس افراد کو جھلسا کر مار گیا تھا۔ ان لاشوں میں اس گارڈ کی لاش بھی تھی جس کے پاؤں کا پنجہ شیشے کی بلٹ پروف دیوار کے نیچے آ کر کٹا تھا۔ ان لاشوں پر آبلے تھے اور جلے گوشت کی سڑاند اٹھ کر پورے ہال میں پھیل رہی تھی۔

طویل میز کے اردگرد پڑی لاشوں میں سراج کے بیٹے واجی کی لاش سب سے اہم تھی۔ وہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ مزے سے بیٹھا مووی دیکھ رہا تھا۔ اب وہ خود ایک دردناک کہانی کے ''انجام'' کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ درحقیقت یہاں یہ سب کچھ آناً فاناً شروع ہو کر آناً فاناً ہی ختم ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ یہاں ثروت موجود ہوتی اور وہ واجی کی اس خونچکاں لاش کو دیکھتی۔

الارم مسلسل بج رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''یہ تو دروازہ کھول کر ہی پتا چلے گا۔ تم تیار ہو جاؤ۔'' عمران نے کہا اور اپنے چہرے پر اسکائی ماسک چڑھا لیا۔

میرے چہرے پر ماسک پہلے ہی موجود تھا۔ ہم نے ہال میں موجود تین رائفلیں، دو پستول اور کلہاڑی ایک جگہ جمع کیں اور انہیں ایک الماری کے اندر چھپا دیا۔ ہمارے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں بالکل تیار حالت میں موجود تھیں۔ احتیاط کے طور پر میں ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ نکاسی کے دروازے کے پاس ہی ایک چھوٹا کنٹرول پینل موجود تھا۔ عمران نے کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے، آخر مطلوبہ بٹن ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس بٹن کے دبتے ہی ہال کے مین دروازے میں تھوڑی سی حرکت پیدا ہوئی۔ عمران نے بڑی احتیاط سے بٹن دبایا اور اس سلائیڈنگ ڈور کو فقط چار پانچ انچ تک ہی کھولا۔ چار پانچ انچ کی اس درز میں ڈرے ہوئے دو تین چہرے نظر آئے۔ یہ گارڈ نہیں تھے۔ یہ گولڈن بلڈنگ میں مختلف کام کرنے والے ملازم پیشہ لوگ تھے۔ عمران درز کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا تھا اس لئے یہ لوگ اندر کے مناظر وضاحت سے نہیں دیکھ سکے۔ یقیناً عمران کے چہرے پر ماسک دیکھ کر وہ چونکے ہوں گے لیکن کسی نے بھی اس ماسک کو خاص اہمیت نہیں دی۔ عینک والا ایک شخص چلا کر بولا۔

''غضب ہو گیا ہے۔ بڑے باس...... گر پڑے ہیں۔ وہ چھت سے گرے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''پچھلے صحن میں...... واجی صاحب کہاں ہیں؟ تیواری صاحب کہاں ہیں؟'' عینک والا

بری طرح ہکلا رہا تھا۔

عمران نے مجھے اشارہ کیا۔ پھر پینل پر بٹن دبا کر دروازہ پورا کھول دیا۔ باہر تقریباً چھ ہراساں افراد موجود تھے۔ ان میں سے کوئی مسلح نہیں تھا۔ ''ہینڈز اَپ۔'' عمران گرجا۔ ان میں سے ایک بھاگ گیا، باقی پانچوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

ہال کے اندر کے مناظر دیکھ کر یہ پانچوں افراد ششدر تھے۔ عمران نے انہیں دھکیل کر ایک اسٹور نما کمرے میں لاک کر دیا۔

کہیں پاس ہی دھڑا دھڑ دروازہ بجایا جا رہا تھا۔ یہ کمرا نمبر تین کا دروازہ تھا۔ یہی کمرا تھا جس میں ہم نے انو پم کے مشورے سے گارڈز کو بند کیا تھا۔ گارڈز کو اب گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ ممکن تھا کہ باہر سے کسی نے انہیں سیل فون پر بتا دیا ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اب وہ دروازہ کھولنا چاہ رہے تھے لیکن یہ دروازہ باہر سے لگنے والی چابی ہی کھول سکتی تھی اور یہ چابی ان دو گچھوں کے اندر تھی جو ہمارے پاس تھے۔ پھر اندر سے فائرنگ کی مدھم آوازیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ وہ دروازے کے لاک پر فائر کر رہے ہیں۔

''یہ تو خطرناک ہے۔ یہ باہر نکل آئیں گے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے نہیں لگتا، ایسا ہوگا۔ انو پم نے کہا تھا کہ یہ دروازہ بالکل محفوظ ہے۔''

کچھ دیر تک کمرا نمبر تین کے اندر گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجتی رہی، تب ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ انو پم نے ٹھیک کہا تھا۔ گارڈز دروازہ نہیں توڑ پائے تھے۔

اچانک ایک طرف سے نیلی وردی والے دو گارڈز نمودار ہوئے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ عمران نے ان کا خطرناک انداز دیکھ کر سائلنسر لگے پستول سے گولی چلائی اور وہ دونوں سر میں گولیاں کھا کر ڈھیر ہو گئیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران اس موقع پر کوئی رسک لینے کو تیار نہیں۔ گارڈز کے پیچھے تین اور افراد تھے، یہ وہی لوگ تھے جو ایک سیٹ پر شوٹنگ میں مصروف تھے۔ وہ پولیس والا بھی تھا جسے نیم عریاں لڑکیاں شراب پلانے اور گناہ پر آمادہ کرنے میں مصروف تھیں۔ یہ پولیس والا بھی یقیناً کوئی اداکار ہی تھا۔ دونوں گارڈز کا انجام دیکھنے کے بعد یہ تمام افراد سکتہ زدہ کھڑے رہ گئے۔

''یہاں کا منیجر کہاں ہے؟'' عمران نے پولیس کی وردی والے سے پوچھا۔

''مم...... مجھے نہیں پتا۔ میں تو یہاں ریکارڈنگ میں حصہ لینے آیا ہوں۔'' وہ ہراساں آواز میں بولا۔

اس کے ساتھی، موٹی توند والے نے کہا۔ ''منیجر تو تیواری صاحب ہیں۔ وہ اس سے

اپنے گھر پر ہوں گے۔'' اسے پتا نہیں تھا کہ تیواری اپنے جرموں کا حساب دینے کے لئے عالمِ بالا کی طرف پرواز کر چکا ہے۔

عمران بولا۔ ''میں چھوٹے منیجر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، شاید سروش نام ہے اس کا۔''

''وہ...... لاک اَپ کی طرف گئے تھے جی۔'' تیسرا بندہ بولا۔

''چلو اس کے پاس۔'' عمران نے سفاک لہجے میں کہا اور رائفل کو حرکت دی۔

ان تینوں افراد کا وہی حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ شاید انہیں ابھی تک اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ دو سیکنڈ کے اندر دونوں گارڈز موت کے سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ گولڈن بلڈنگ میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ ہم ان تینوں افراد کو ہانک کر ایک تنگ کوریڈور میں پہنچے۔ یہاں قالین بچھے ہوئے تھے اور چھت خاصی نیچی تھی۔ موٹی توند والا سب سے آگے تھا۔ کوریڈور کے آخری سرے پر ایک کمرا نظر آیا۔ کمرے کے اندر سے کسی کے گرجنے برسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

توند والے شخص نے انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ یہی لاک اَپ ہے۔

عمران نے کوریڈور میں نظر آنے والا ایک دروازہ کھولا۔ اس طرح کے دروازے سارے کوریڈور میں موجود تھے۔ یہ ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ یہاں مساج کے لئے استعمال ہونے والے دو فٹ چوڑے کئی بیڈ پڑے تھے۔ مساج کے دیگر لوازمات بھی نظر آ رہے تھے لیکن کوئی بندی بندہ موجود نہیں تھا۔ عمران نے تینوں افراد کو کمرے میں دھکیلا۔ ''چلو ایک دوجے کا مساج کرو۔ اگر نہیں کرنا تو بس چپ چاپ لیٹے رہو۔ آواز باہر آئی تو گولی اندر آئے گی۔''

تینوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور کمرے میں چلے گئے۔ عمران نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

جو شخص لاک اَپ میں گرج برس رہا تھا، اس کی آواز اب کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ وہ کسی پر دہاڑا۔ ''دے گالی...... اب دے...... اب دے۔''

ایک بیٹھی ہوئی سی آواز صاف سنائی دی۔ ''تو کتے دا پتر......''

طمانچوں اور گھونسوں کی آوازیں آئیں۔ کسی کو بری طرح پیٹا جا رہا تھا، چند سیکنڈ بعد گرجنے والا پھر گرجا۔ ''دے گالی...... دے گالی۔''

بھرائی ہوئی آواز پھر اُبھری۔ ''کتے دا پتر......''

اس بار طمانچوں اور گھونسوں کے بجائے شڑاپ شڑاپ کی آواز ابھری۔ مجھے لگا کہ یہ چرمی کوڑے کی آواز ہے۔ قریباً نصف منٹ تک کوڑا پھنکارتا رہا پھر مارنے والا دانت پیس کر پھنکارا۔ ”نکال گالی...... پھر نکال۔“

اس مرتبہ گالی دینے والے کی آواز پہلے سے بھی بلند تھی۔ وہ زہرناک لہجے میں بولا۔ ”وڈے کتے دا پتر......“

یعنی اب اس نے اپنی گالی میں وڈے کے لفظ کا اضافہ کر لیا تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھ کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ یقیناً یہ تعریف اندر والے اس شخص کے لئے تھی جو سخت مار کھانے کے باوجود بھرائی ہوئی آواز میں، مارنے والوں کو مغلظات سنا رہا تھا۔

مجھے ساگوان کے چوڑے دروازے میں کی ہول نظر آیا میں نے ذرا جھک کر ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر کے منظر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ مجھے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں اپنے میزبان جگت سنگھ کو یہاں دیکھوں گا۔ جگت سنگھ کے جسم پر کئی چوٹیں تھیں اور اس کے لباس پر خون کے پرانے اور تازہ دھبے تھے۔ اس کی پگڑی غائب تھی، کیس کھلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے اور انہیں آہنی کڑوں میں کس دیا گیا تھا۔ اس کی ٹانگیں بھی دونوں اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ بھی کڑوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ جگت سنگھ کی طرح ایک نوجوان سال بندہ بھی لاک اپ میں بند تھا۔ اس نے بھی جگت کی طرح خون کے دھبوں والی خاکی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

جگت کے سامنے ایک سوکھا سڑا لمبا سا شخص کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے باقی جسم کے مقابلے میں کافی بڑا اور کرخت بھی تھا۔ جسے ہم نے چمڑے کا کوڑا سمجھا تھا، وہ ربر کا ایک پائپ تھا جس کے گرد لوہے کا تار لپیٹ کر اسے مزید اذیت ناک بنا دیا گیا تھا۔

سوکھے سڑے شخص نے تیسری بار جگت سنگھ سے گندی گالی سنی تھی۔ وہ غصے سے شعلہ جوالا بن گیا۔ ربر کے پائپ سے جگت کو بے دریغ پیٹنے لگا۔ جگت کی برداشت قابلِ ذکر تھی۔ وہ تکلیف کے سبب کراہ تو رہا تھا لیکن ہار ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ مارنے والا مار کر ہانپ گیا تو چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ پھنکارا۔ ”دے گالی...... حرام کے جنے دے گالی۔“

جگت نے بے خوف پھر وہی گالی دہرائی اور اس کے ساتھ ہی مارنے والے کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو کر ایک بار پھر جگت پر پل پڑا لیکن اس دفعہ بس ایک دو ضربیں لگا کر ہی رک گیا۔ اس کی اونچی ناک چمکنے لگی اور آنکھوں میں قہر کی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ ”کرتا ہوں تیرا علاج...... بہت گرمی ہے نا تیرے دماغ

میں...... کرتا ہوں تیرا علاج...... بلکہ تم دونوں کا۔“

اس نے پینٹ کی جیب سے سیل فون نکالا۔ اس پر نمبر پریس کیا۔ پھر ممبئی کے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”کالیے! ادھر ذرا لفڑا ہو گیا نی...... ایک بھینسے کی دُم کے نیچے آگ لگ گئی ہے۔ اس کو ذرا ٹھنڈا کرنا ہے۔ ڈاکٹر ہری کو بھیجو یہاں لاک اَپ میں اور اس سے کہو ذرا سرجری کا سامان بھی لے کر آئے...... ہاں ہاں...... بس کہہ دو تم۔ وہ خود ہی سمجھ جائے گا۔“

تب اس نے جواباً جگت سنگھ کے منہ پر تھوکا اور جنونی انداز میں بولا۔ ”ابھی بتاتا ہوں تجھے...... ابھی بتاتا ہوں۔“

جگت سنگھ کو ہم نے آخری بار کوئی دس دن پہلے فرید کوٹ کے راستے میں دیکھا تھا۔ جگت نے اپنی محبوبہ آشا اور لاڈلے بھائی گوبندر کی موت کا بدلہ لینے کے لئے بڑی بہادری سے جاوا کے قافلے پر حملہ کیا تھا۔ جگت اور اس کے ساتھی بے جگری سے لڑے تھے۔ انہوں نے ہمیں جاوا کے چنگل سے نکالنے کی سرتوڑ کوشش بھی کی لیکن ان کی کوئی پیش نہ چلی سکی۔ جگت کے کئی ساتھی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ اس کا ساتھی پرتاپ سنگھ گرفتار ہوا اور جگت نے چلتے پانی میں چھلانگ لگا کر اپنی جان بچائی۔ اور اب یہ جگت سنگھ یہاں ممبئی کی اس گولڈن بلڈنگ میں پایا جا رہا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ جاوا کے ہتھے چڑھا ہے اور پھر اس کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا یہاں گولڈن بلڈنگ یعنی سراج عرف سارو کے پاس پہنچ گیا ہے۔ بالکل جیسے ایشوریا رائے پہنچی تھی اور اگر کرشمہ کپور (نیتو) زندہ ہوتی تو وہ بھی پہنچتی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ تو خوب صورت لڑکیاں تھیں، جگت سنگھ جیسے شخص کا یہاں کیا مصرف ہو سکتا تھا۔

میں اور عمران باری باری کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھ رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد سفید کوٹ اور عینک والا ایک ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا میڈیکل باکس تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے چھوٹے مینجر سروش کمار کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا کرنا ہے اور کیوں؟

سروش کمار زہرناک لہجے میں بولا۔ ”ہمیں یہاں کچھ ہیجڑوں کی ضرورت بھی ہے۔ سکھوں کو جب ہیجڑا بنایا جائے تو بڑے پیارے ہیجڑے بنتے ہیں۔ بال تو ان کے پہلے ہی بہت لمبے ہوتے ہیں۔ ہاتھوں میں کڑے وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ داڑھی مونچھ مونڈ کر جب ان کو سرخی پاؤڈر لگا دیا جائے تو ایک دم قیامت ڈھانے لگتے ہیں۔“

”کن کو ہیجڑا بنانا چاہتے ہیں آپ؟“ ڈاکٹر ہری نے پوچھا۔ ڈاکٹر ہری کو یقیناً اس خونی

ہنگامے کی کچھ خبر نہیں تھی جو اسی گولڈن بلڈنگ کے ایک حصے میں برپا ہو چکا تھا۔ وہ عام انداز میں بول رہا تھا۔

منیجر سروش نے ڈاکٹر ہری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ دونوں بندے تمہارے سامنے کھڑے تو ہیں۔''

ڈاکٹر ہری نے ذرا حیرت سے کہا۔ ''لیکن ان کو تو ''چابک والی'' میں کام کرنا تھا۔''

''چابک والی؟ وہ کون بنا رہا ہے؟''

''ڈائریکٹر ملہوترا تین نمبر میں اس کا سیٹ بھی لگا ہوا ہے۔ کاسٹ بھی ہو چکی ہے......''

دونوں میں جو مختصر بات ہوئی اس سے پتا چلا کہ ''چابک والی'' گھنٹے سوا گھنٹے کی کسی ''شارٹ فلم'' کا نام ہے جس میں ایک امیرزادی، دو شریف سکھ مزدوروں کو گناہ کی طرف مائل کرتی ہے اور ان کے نہ ماننے پر مار مار کر ان کی کھال ادھیڑتی ہے اور انہیں مجبور کر دیتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہاں کمرے کے اندر صورتِ حال بدل چکی تھی۔ جگت سنگھ اور اس کے ساتھی نے منیجر سروش کمار کو اتنا مشتعل کر دیا تھا کہ وہ انہیں ناقابلِ تلافی جانی نقصان پہنچانے پر کمربستہ ہو گیا تھا۔ اس نے بے رحم لہجے میں ڈاکٹر ہری کو کہا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے۔ ڈاکٹر ہری نے اپنا میڈیکل باکس کھولا۔ منیجر سروش کا ایک کالا بھجنگ ساتھی جگت سنگھ کو بے لباس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ عمران نے دروازہ کھلوانے کے لئے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ غیر متوقع طور پر یہ ایک آسان کام ثابت ہوا۔ آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے والا کالا بھجنگ شخص ہی تھا۔ عمران کا دھکا کھا کر وہ ڈاکٹر پر گرا اور دونوں ماربل کے فرش پر دور تک لڑھک گئے۔ میڈیکل باکس بھی الٹ گیا اور سرجری کے اوزار بکھرے نظر آئے۔ منیجر نے لپک کر میز پر سے رائفل اٹھانا چاہی۔ میری چلائی ہوئی گولی سیدھی اس کے سینے میں دل کے مقام پر لگی۔ وہ چاروں شانے چت گر گیا۔ ڈاکٹر دروازے کی طرف بڑھا۔ عمران نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ وہ دہائی مچانے لگا۔ اس کی عینک دور جا گری تھی اور وہ عینک کے بغیر قریباً اندھا نظر آ رہا تھا۔ ''بھگوان کے لئے نہیں۔'' اس نے عمران کے اگلے فائر سے بچنے کے لئے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

میں نے اسے دھکا دے کر کمرے کے واش روم میں گرایا۔ ''اگر آواز نکالی تو مارے جاؤ گے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

یہی وقت تھا جب کہیں پاس ہی سے بہت سی عورتوں کے چلّانے کی آوازیں آنے

لگیں...... ساتھ ساتھ دروازے بھی پیٹے جا رہے تھے۔ یوں لگا کہ یہ عورتیں کہیں پر بند ہیں۔ شاید انہوں نے یہاں اس کمرے کا منظر دیکھا تھا اور اب مدد کے لئے پکار رہی تھیں۔

گہری رنگت والا شخص دہشت زدہ کھڑا تھا۔ اس کے قدموں میں ''منیجر صاحب'' کی خون اگلتی لاش تھی۔ میں نے میز پر رکھی رائفل اٹھا کر کندھے سے لٹکا لی۔

جگت سنگھ ہمارے سامنے کھڑا تھا اور حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہم جب سے اس گولڈن بلڈنگ میں داخل ہوئے تھے، قدرے بھاری آوازوں میں بول رہے تھے۔ ہمیں آوازوں سے پہچاننا ہرگز آسان نہیں تھا۔ جگت سنگھ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے یہ خدائی مددگار کون ہیں۔ دوسری طرف عمران بھی جگت سنگھ کی صورت سے ناآشنا تھا۔ لہٰذا جب میں نے کالے بھجنگ شخص پر رائفل تانی اور اس سے کہا کہ وہ دونوں ''سرداروں'' کے ہاتھ پاؤں کھولے تو عمران نے ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ خاکی قمیص والا جگت سنگھ ہے۔''

عمران کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

اگلے دو منٹ میں جگت سنگھ اور اس کا ساتھی آہنی کڑوں کی بندش سے آزاد ہو چکے تھے۔ قریبی کمرے سے بلند ہونے والا عورتوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ دروازے پیٹ رہی تھیں۔ عمران نے کالے ملازم کو آگے لگایا اور اس دروازے کے سامنے لے آیا جس کے عقب سے زبردست شور بلند ہو رہا تھا۔ ''اسے کھولو۔'' عمران نے ملازم کو حکم دیا۔

''اپن کے پاس اس کی چابی ناہیں ہے۔''

''کس کے پاس ہے؟''

''وڈی یہ چابیاں بڑے باس کے پاس ہوتی ہیں۔''

عمران نے اپنی جیب سے چابیوں کے وہ اسٹائلش گچھے نکالے جو سراج کے آفس کی الماری سے ہمیں ملے تھے۔ ''دیکھو ان میں ہے چابی؟'' عمران نے ملازم کو گچھا دکھاتے ہوئے کہا۔

اس نے چابیوں کو الٹ پلٹ کیا اور ایک چابی تھام لی۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا خلا بھی موجود تھا۔ یہ ویسی ہی مختصر کھڑکی تھی جو میں اس سے پہلے فرید کوٹ کی کوٹھی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اس میں سے کمرے میں جھانکا جا سکتا تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ہم نے کمرے میں جھانکا۔ ہمیں یہاں بیس کے قریب لڑکیاں نظر آئیں۔ وہ قریباً سب ہی اسمارٹ اور قبول صورت تھیں۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ انہیں یہاں بڑے سکون آرام میں رکھا گیا ہے مگر وہ

ایک دم بے چین تھیں اور باہر نکلنا چاہ رہی تھیں۔

عمران نے ان سے پوچھا۔ ''تم لوگ یہاں کیوں ہو؟''

ان میں سے ایک احتجاجی لہجے میں بولی۔ ''ہمیں فلم میں چانس کا کہہ کر دھوکے سے یہاں لایا گیا ہے۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ تیواری صاحب نے ہم سے جھوٹ بولا ہے۔''

ایک اور بولی۔ ''ہمیں چار دن سے یہاں بندی بنایا ہوا ہے۔ ہمارے گھر والوں کو مارنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ تمہاری تصویریں کھینچیں گے۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نا ہیں چھوڑیں گے......'' وہ سسکنے لگی۔

''تم میں سے کوئی پاکستانی بھی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں، یہاں تو نہیں ہے۔ لیکن اسی جگہ دو تین دیکھی ہیں ہم نے۔ ایک وہی ایشوریا رائے کی شکل والی ہے۔ اسے آج بہت مارا ہے انہوں نے۔ وہاں شیشے والے کمرے میں بند کیا ہے۔''

''شیشے والا کمرا؟'' عمران نے پوچھا۔

عمران کو لڑکیوں سے باتیں کرتا چھوڑ کر میں جگت کو لے کر ذرا دور ہٹ گیا۔ رائفل بدستور میرے ہاتھ میں تھی اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں جگت سے کہا۔

''مجھے پہچانا؟'' میں اپنی اصل آواز میں بولا تھا پھر بھی جگت مجھے فوری طور پر پہچاننے میں ناکام رہا۔

''تابش ہوں میں۔''

جگت جیسے اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس کے زخمی چہرے پر سرخی سی لہرا گئی۔ میں نے کہا۔ ''بالکل شانت رہو۔ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہئے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ہلکا سا شک بھی نہیں ہونا چاہئے۔''

اپنے کندھے سے جھولتی ہوئی فالتو رائفل اتار کر میں نے جگت سنگھ کو تھما دی...... اس کی سوجی سوجی آنکھوں میں قہر کی بجلیاں چمکنے لگیں۔

عمران نے مختصر کھڑکی کے خلا سے لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''ہم تمہاری مدد کے لئے ہی آئے ہیں۔ تمہیں ضرور یہاں سے مکتی دلائیں گے لیکن تھوڑا دھیرج رکھنا پڑے گا۔ شور ہوگا تو تمہارا کام مشکل ہو جائے گا۔''

''بھگوان کے لئے دروازہ کھول دیں۔ ہم بالکل چپ رہیں گے۔'' ایک بنگالی لڑکی فریادی انداز میں

''سب کچھ ہوگا لیکن تھوڑا سا انتظار۔'' عمران نے ذرا تحکم سے کہا اور کھڑکی کا سلائیڈنگ پینل بند کر دیا۔

میرے کہنے پر عمران نے اپنے کندھے سے جھولتی ہوئی فالتو رائفل اتاری اور جگت سنگھ کے چوڑے چکلے ساتھی کو دے دی۔ وہ بھی ہتھیار شناس بندہ تھا اور یقیناً سینے میں مار دھاڑ کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔

''یہ شیشے والا کمرا کہاں ہے؟'' عمران نے سیاہ رنگت والے ملازم سے پوچھا، وہ بدستور میری رائفل کے نشانے پر تھا۔

اس نے اپنے موٹے کالے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ہمیں ساتھ لے کر ایک کوریڈور میں آگے بڑھنے لگا۔ فائرنگ کی آواز کے بعد گولڈن بلڈنگ میں ہر طرف کھلبلی مچ گئی تھی۔ یقیناً سراج کی لاش بھی بہت سے لوگوں نے دیکھ لی تھی اور اب ہر طرف خوف کی لہریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ مجھے درجنوں لڑکیوں کے چلاّنے کی سریلی آوازیں آئیں۔ یہ لڑکیاں کسی ڈرے ہوئے ریوڑ کی طرح بیرونی حصے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ یہ وہی ڈانسرز تھیں جو ایک بڑے ہال میں کسی عریاں ڈانس کی ریہرسل کر رہی تھیں۔ ہمیں اپنے اردگرد ایک بھی مسلح گارڈ دکھائی نہیں دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ گولڈن بلڈنگ کے گارڈ اپنے ''آہنی پنجرے'' سے باہر نہیں نکل سکے۔

عمارت کے عین بیچوں بیچ جہاں کئی کوریڈورز ایک گول ہال کمرے میں کھلتے تھے، ایک چوراہا سا بن گیا تھا۔ یہاں ہمیں شیشے کا بنا ہوا ایک چوکور کمرا نظر آیا۔ قریباً بارہ فٹ ضرب بارہ فٹ کا یہ کمرا مکمل طور پر مضبوط شیشے کا بنا ہوا تھا۔ اس میں دو لڑکیاں بند تھیں۔ دونوں کے بدن پر لباس کا ایک تار تک نہیں تھا۔ وہ سکڑی سمٹی دو کونوں میں بیٹھی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ واقعی چوراہے میں ہوں اور ہر آتا جاتا انہیں دیکھ سکتا ہو...... ان میں سے ایک سویٹی عرف ایشوریا رائے تھی۔ اس کے دودھیا بدن پر مار پیٹ کے کئی نیلگوں نشان نظر آ رہے تھے۔ دوسری لڑکی کوئی ہندو تھی۔ اس کے ماتھے پر تلک نمایاں تھا۔ اس پر بھی تھوڑا بہت تشدد ہوا تھا۔

کیبن نما کمرے کی ایک بلوری دیوار پر ایک اسٹیکر چسپاں تھا۔ اس پر انگریزی کا فقرہ لکھا تھا۔ فقرے کا مطلب کچھ یوں تھا۔ ''جو خود کو چھپاتے ہیں، ان کی جھجک دور کرنے کے لئے۔'' شیشے کے اس کمرے کا دروازہ بھی لاک تھا۔ تاہم عمران کے حکم پر سیاہ فام ملازم نے چابیوں کے ایک گچھے میں سے اس کی چابی بھی ڈھونڈ لی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ لیکن لڑکیاں بیٹھی رہیں۔ جگت سنگھ نے کہیں سے دو چادریں ڈھونڈ لی تھیں۔ اس نے یہ چادریں

لڑکیوں کو تن ڈھانپنے کے لئے دیں۔

عمران نے بدلی ہوئی آواز میں سویٹی عرف ایشوریا سے پوچھا۔ ''تم پاکستانی ہو؟''

ایشوریا ذرا جھجکی پھر اثبات میں جواب دیا۔ ''کوئی اور پاکستانی بھی ہے یہاں؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''صرف دو ہیں۔''

''کہاں ہیں؟''

''میرا خیال ہے وہ دس نمبر فلور پر ڈانس کی ریہرسل کر رہی تھیں۔''

اس کا مطلب تھا کہ حواس باختہ لڑکیوں کے غول کے ساتھ وہ لڑکیاں بھی یہاں سے نکل چکی ہیں۔ اچانک میری نظر ایک طرف تنگ زینوں پر پڑی۔ یہ زینے کے نیچے جا رہے تھے۔ آخر میں ایک آہنی دروازہ تھا جس پر ''نو انٹری'' کے الفاظ لکھے تھے۔ ہم کوئی جگہ بن دیکھے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ میں زینے اتر کر نیچے دروازے تک گیا۔ یہ اسٹیل کا عام سا دروازہ تھا۔ میں اس کی چابی ڈھونڈنے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کچھ دور ہٹ کر لاک پر برسٹ مارا۔ پھر آگے جا کر لات رسید کی۔ دروازہ کھل گیا۔ یہاں ایک نیچی چھت والا چیمبر تھا جو بالکل خالی پڑا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ اوپر گراؤنڈ فلور پر مسلسل بھاگتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پوری گولڈن بلڈنگ میں ہراس کا عالم تھا۔ سائرن بھی لگاتار بج رہے تھے۔ میں نے ایک اور دروازے کا تالا توڑا...... یہ ایک چھوٹا سا اسلحہ گودام تھا۔ بہت سی چھوٹی بڑی رائفلیں، پسٹل اور مشین پسٹل نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کی پیٹیوں میں دستی بم تھے اور ڈائنامائٹ کی اسٹکس بھی۔ یہ بدمعاشی کا اڈا تھا اور یہ سارے بدمعاشی اور دہشت گردی کے لوازمات تھے۔ ایک طرف بیکار رائفلوں کو ایک بنڈل کی شکل میں رکھا گیا تھا۔ اس بنڈل پر کینوس کا ایک بڑا بیگ پڑا تھا جس میں رائفلوں کا ایمونیشن تھا۔ میرے دماغ میں آگ سی بھڑک رہی تھی اور اس کی تپش پورے جسم کو تڑخا رہی تھی۔ یہ میرے بدترین دشمن سیٹھ سراج کا ٹھکانا تھا۔ مجھے یہاں کی ہر دیوار پر سیٹھ سراج عرف سارو کی منحوس چھاپ نظر آ رہی تھی۔ میں نے بیگ پلٹ کر اسے ایمونیشن سے خالی کیا اور ان میں ڈائنامائٹ کی ایسی اسٹکس بھرنا شروع کر دیں جن پر چھوٹی چھوٹی گھڑیاں لگی ہوئی تھیں...... عمران نے اب مجھے کافی حد تک اسلحہ شناس بنا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسٹکس کے یہ چھوٹے چھوٹے بنڈل ''ٹائم بم'' کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں ذرا سی کوشش سے Active کیا جا سکتا ہے۔ پانچ چھ دستی بم بھی میں نے کینوس کے بیگ میں رکھ لئے۔ میں

تیزی سے واپس پلٹا۔ اس وقت تک جگت سنگھ اور اس کا ساتھی گلاب سنگھ...... عمران کی ہدایت پر لاک اپ میں موجود لڑکیوں کو آزاد کر چکے تھے۔ وہ گرتی پڑتی اور چلاتی ہوئی مین ایگزٹ کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ ان تین افراد کو بھی نکال دیا گیا تھا جنہیں ہم نے شروع میں اسٹور روم میں بند کیا تھا۔

''یہ دیکھو۔'' میں نے عمران کو ڈائنامائٹ کا ایک بنڈل دکھایا۔

''زبردست، نپولین اور دادا جی کا ایک مشترکہ قول ہے، برائی کو جڑ سے اکھاڑنا چاہئے۔ ہم بھی اس گولڈن بلڈنگ کو جڑ سے اکھاڑ سکتے ہیں۔''

عمران نے کمال مہارت اور تیزی سے سات آٹھ بنڈلوں پر دس منٹ کا ٹائم سیٹ کر دیا اور گھڑیاں آن کر دیں۔ بڑی پھرتی سے ہم نے یہ بنڈل گولڈن بلڈنگ کے وسطی حصے میں مختلف جگہوں پر چھپا دیئے۔ گولڈن بلڈنگ تقریباً خالی نظر آ رہی تھی۔ ہم ایشوریا اور مقامی لڑکی کو لے کر گولڈن بلڈنگ کے ایک بغلی دروازے کی طرف دوڑے۔ ایک راہداری میں اناؤنس منٹ والا مائیک موجود تھا۔ عمران نے مائیک آن کیا اور بدلی ہوئی آواز میں بولا۔ ''بلڈنگ دھماکے سے اُڑنے والی ہے۔ جو کوئی بھی یہاں موجود ہے، نکل جائے۔ میں اعلان دہراتا ہوں......''

اس نے اعلان دہرایا۔ اب صرف تین چار منٹ ہی بچے تھے۔ ہم چار دیواری سے چالیس پچاس قدم دور تھے جب سراج یا تیواری کا کوئی وفادار تیزی سے سامنے آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دبا پاتا، جگت سنگھ نے ایک للکار کے ساتھ برسٹ چلایا اور اسے ڈھیر کر دیا۔ ہم کسی کو بھی مارنے کے لئے تیار تھے۔ ہم بیرونی دروازے سے چند قدم دور تھے جب عمران ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''گارڈ وہیں بند رہ گئے ہیں۔''

میں بھی ٹپٹا گیا۔ ان کی موت یقینی تھی۔ بلاسٹ میں اب بمشکل دو ڈھائی منٹ تھے۔

''میں جاتا ہوں۔'' عمران نے کہا۔

''نہیں عمران۔'' میں نے اسے پکڑ لیا۔ ''اب مرنے دو انہیں۔''

''نہیں...... تم نکلو ان کو لے کر۔'' عمران نے کہا اور خود کو چھڑا کر واپس بھاگا۔

میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ وہ احاطہ پار کر کے راہداری میں گم ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اس کے پیچھے لپک جاؤں۔ جگت سنگھ نے بڑی مضبوطی سے میری کلائی پکڑ لی اور باہر

کی طرف کھینچا۔ ہم گولڈن بلڈنگ کی چار دیواری سے باہر آ گئے۔ یہاں بھی افراتفری تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ میری نگاہیں مسلسل اس دروازے پر لگی تھیں جہاں سے عمران کو واپس نکلنا تھا۔ وہ نہیں نکلا...... اور تب پہلا دھماکا ہوا...... پھر دوسرا...... آگ کے شعلے اوپر تک جاتے نظر آئے۔ ڈائنامائٹ پھٹ رہے تھے اور پھر ہمیں اندھا دھند بھاگتے ہوئے گارڈز دکھائی دیئے۔ وہ بچ کر نکل آئے تھے۔ بالکل کسی فلم کا سا منظر تھا۔ میری نگاہیں عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ عمران سب سے پیچھے تھا۔ اس نے کسی کو کندھے پر لادا ہوا تھا۔ وہ کوئی بے ہوش شخص تھا۔

مجھے اس پر غصہ آیا۔ وہ ہر جگہ خدائی فوجدار بن جاتا تھا۔ کیا ضرورت تھی اس مشکل کو مزید مشکل بنانے کی۔ یکایک ایک ساتھ کئی ڈائنامائٹ پھٹے۔ اندرونی کمروں کی کھڑکیاں اور چھتیں ہوا میں اڑتی نظر آئیں۔ عمران سب سے پیچھے تھا۔ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ کندھے پر لدے شخص کو اچھی طرح تھاما اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

میں اور جگت سنگھ لپک کر آگے گئے اور بے ہوش شخص کو سنبھال لیا۔ وہ دبلا پتلا تھا۔ اس کے جسم پر ڈرائیور کی سفید وردی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گاڑھے دھوئیں میں دم گھٹنے کی وجہ سے بے ہوش ہوا ہے۔ ہم اسے لے کر سڑک پر پہنچے۔ یہی وقت تھا جب ایک نیلی اسٹیٹ کار دھوئیں میں سے نکلی اور ہمارے سامنے آ کر رکی۔ کار کو دیکھتے ہی عمران نے ہمیں اشارہ کیا۔ ہم کار کی طرف لپکے اور سوار ہو گئے۔ چادر میں لپٹی ہوئی ایشوریا رائے پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔ میں جگت اور اس کا ساتھ اگلی سیٹ پر۔ عمران گھوم کر ڈرائیور کی عین پیچھے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی نیلی اسٹیٹ کار کے پہیے چرچرائے اور وہ دھوئیں کے مرغولوں میں راستہ بناتی ہوئی تیزی سے ایک طرف بڑھی۔ گولڈن بلڈنگ کے اندرونی حصوں میں اب بھی دھماکے ہو رہے تھے اور دھواں اردگرد کے علاقے کو ڈھانپ رہا تھا۔ قریبی عمارتوں کے مکین نکل نکل کر بھاگ رہے تھے۔ ایک جگہ دو تین گاڑیاں آپس میں ٹکرائی ہوئی تھیں۔ یہ افراتفری ہمارے حق میں تھی...... ہم نکلتے چلے گئے۔ تب میں نے غور کیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص تو مقامی تھا لیکن اس کے برابر بیٹھا ہوا شخص میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جیلانی تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ عمران کی ہدایت پر بلڈنگ کے آس پاس ہی موجود تھا اور عین وقت پر موقع پر پہنچ گیا تھا۔ ہمارے چہروں پر ابھی تک ماسک تھے۔ ایشوریا رائے وحشت زدہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں اور کہاں لے جا رہے ہیں۔ کوئی اور سچویشن ہوتی تو وہ اس طرح ہرگز ہمارے ساتھ نہ بیٹھتی لیکن ہم اسے بدترین

حالات سے نکال رہے تھے، لہٰذا وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔

میرے اور جگت کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ہم بالکل تیار تھے۔ تاہم بڑی سڑک تک کوئی ہمارے راستے میں نہیں آیا اور نہ کسی نے پیچھا کیا۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

عمران نے جیلانی سے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے یا شیخ؟''

''زیادہ دور نہیں۔ بس پانچ منٹ کا راستہ ہے۔''

ایک ایمبولنس اور فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں شور مچاتی ہوئی ہمارے قریب سے گزریں۔ ان کا رخ گولڈن بلڈنگ کی طرف تھا۔

بے ہوش شخص کو ہم تینوں نے ابھی تک اپنے زانو پر لٹا رکھا تھا۔ وہ بہت ہلکا پھلکا تھا۔ اسے طبی امداد کی ضرورت تھی مگر گاڑی کے نیم اندھیرے میں ہم اس کے چہرے پر صرف پانی کے چھینٹے ہی دے سکتے تھے اور یہ ہم نے دیئے۔

''کون ہے یہ؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''یار! یہ کافی نہیں کہ یہ ایک انسان ہے؟ اگر میں اسے وہیں گیراج میں چھوڑ آتا تو یہ اب تک اللہ بیلی ہو گیا ہوتا۔''

راستے میں ایک جگہ پولیس کا ناکا نظر آیا۔ بہرحال ہم بخیریت گزر گئے۔ اگر روکا جاتا تو ہم فوراً مشکوک ٹھہر جاتے...... بلکہ مشکوک ترین۔ ہمارے ساتھ فقط ایک چادر میں لپٹی ہوئی ایشوریا رائے تھی۔ اس کے پاؤں بھی ننگے تھے۔ ہم نے زانو پر ایک بے ہوش بندہ لٹایا ہوا تھا۔ میرا بالائی جسم زخمی اور لباس سے عاری تھا۔ جگت سنگھ اور اس کا ساتھی گلاب سنگھ عرف گوگا بھی زخمی تھے۔ ہمیں روکا جاتا تو یقیناً ہمیں اپنی رائفلوں کے منہ کھولنے پڑتے اور یہ سنگین رات کچھ اور بھی سنگین ہو جاتی۔

یہ رات کے چار بجے کا وقت تھا۔ ممبئی کی سڑکوں پر اب ٹریفک بہت کم رہ گیا تھا۔ سمندر کی طرف سے ہوا چل رہی تھی۔ اردگرد کی ہر شے اونگھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ قریباً پانچ چھ منٹ میں ہم ایک چھوٹی سی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔

''یہ...... آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟'' ایشوریا ہکلائی۔

عمران بھنا کر بولا۔ ''یہ چڑیا گھر ہے۔ یہاں تمہیں ریچھ کے ساتھ بند کریں گے۔ تم دونوں کی محبت سے جو بچہ پیدا ہو گا، وہ ہالی وڈ کی ''اینی میٹڈ'' فلموں میں کام کرے گا۔''

''خدا کے لئے مجھے......''

''خاموش ہو جاؤ۔'' عمران گرجا۔ ''تمہیں جہاں سے نکال کر لائے ہیں، وہاں سے بری جگہ تمہارے لئے اور کوئی نہیں ہو گی۔ چلو نکلو گاڑی سے۔''

وہ سہم کر نکل آئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم کوٹھی کے اندر تھے۔ ہم نے بے ہوش بندے کو ایک بستر پر لٹا دیا۔ وہ یرقان زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بال بالکل صاف تھے۔ گردن کے قریب جلنے کا پرانا نشان تھا جس کا کچھ حصہ نظر آتا تھا، کچھ قمیص کے نیچے تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے بعد کسی چیز پر گرا تھا۔ اس کا پہلو زخمی تھا اور یہاں سے اس کی سفید وردی پھٹی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی شکل کچھ پہچانی ہوئی سی لگی۔

میں نے اور عمران نے اپنے ماسک اتار دیئے۔ میری صورت دیکھ کر ایشوریا رائے بھونچکی رہ گئی۔ ''تت...... تم...... یہاں؟'' وہ ہکلائی۔

عمران بولا۔ ''بعد میں تسلی سے حیران ہو لینا اور ''ہک ہک ہک لا'' بھی لینا۔ یہ دیکھو تمہارے کندھوں سے چادر کھسک رہی ہے۔ ابھی جا کر کپڑے پہن لو، جلدی سے۔'' پھر اس نے جیلانی سے کہا۔ ''یا شیخ! اس شیطان کی چیلی کو ذرا انسان کی چیلی بناؤ۔ کپڑے دو اسے۔''

جیلانی باہر گیا اور فوراً ہی ایک دو زنانہ جوڑے لے آیا۔ سویٹی عرف ایشوریا یہ کپڑے لے کر ایک قریبی واش روم میں گھس گئی۔ وہ بار بار مڑ کر میری طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ عمران نے بے ہوش شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یار! اس کا زخم دیکھو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ایک گری ہوئی موٹر سائیکل کے اوپر گرا ہے۔ یہاں پسلیوں میں پائدان وغیرہ لگا ہے۔''

میں نے جگت کے ساتھی گوگے کے ساتھ مل کر بے ہوش شخص کی قمیص کے بٹن کھولے پھر بنیان اتاری۔ ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ اس کے پورے جسم پر جلنے کے پرانے داغ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سر سے پاؤں تک اس کے جسم کو بار بار بڑی بیدردی سے داغا گیا ہے۔ شروع میں ہمیں گردن کے پاس صرف ایک داغ نظر آیا تھا۔ ایسے بیسیوں داغ اس کے پورے جسم پر پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نیم گول دھاتی چیز سے اس کو جگہ جگہ سے جلایا گیا تھا۔

پسلیوں کے قریب کٹ کا تازہ نشان تھا اور مسلسل خون رِس رہا تھا۔ اسے ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ بہرحال مجبوری تھی۔ ہم نے وہیں پر اس کا خون بند کیا اور اچھی طرح مرہم پٹی کر کے قمیص دوبارہ پہنا دی۔ میری نگاہ بار بار بے ساختہ اس کے چہرے کی طرف اٹھ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے کچھ پہچانا سا لگ رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''یار! لگتا ہے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے۔''

''تمہاری نظر بڑی تیز ہے، ذرا اندازہ تو لگاؤ۔''

میں نے غور کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے پھر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''یہ ابرار صدیقی ہے۔ جسے ہم مولانا ابرار صدیقی بھی کہتے تھے۔''

وہ دنگ رہ گیا۔ ایک بار پھر بڑے دھیان سے میں نے اس کے کمزور چہرے کو دیکھا۔ جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ شاید عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ شخص ابرار صدیقی ہو سکتا تھا۔ لیکن کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ ابرار صدیقی تو ایک تنومند، سرخ و سپید شخص کا نام تھا۔ سیاہ داڑھی، آنکھوں میں چمک، گھنے بال...... لیکن جو بندہ میرے سامنے تھا وہ بس ابرار صدیقی کا خلاصہ ہی نظر آتا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے بھی یہی لگا تھا۔'' میں نے کہا۔

''یار! یہ یہاں انڈیا میں کیسے؟ مجھے لگتا ہے کہ اس کہانی کے سارے کردار یہاں انڈیا میں ہی سمٹ آئے ہیں۔''

''اسی کو کہتے ہیں، کرلو تماشا۔''

''ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے ساتھ بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلا تھا اور پاکستان پہنچ گیا تھا۔''

''مجھے لگتا ہے کہ ہم ٹھیک ہی سمجھتے تھے۔ یہ پاکستان چلا گیا تھا۔ شاید وہاں سے پھر واپس آیا ہے۔ اصل حقیقت تو یہ ہوش میں آنے کے بعد ہی بتا سکتا ہے۔''

''مگر اس کے ساتھ ہوا کیا ہے......؟ یہ تو وہ رہا ہی نہیں۔'' میں حیرت زدہ تھا۔

ایسی ہی حیرت عمران کی آنکھوں میں بھی نظر آتی تھی۔

اس کی بے ہوشی اب غنودگی میں بدلتی جا رہی تھی اور امید تھی کہ وہ جلد ہی ہوش میں آ جائے گا۔ اسی دوران میں ایشوریا کپڑے پہن کر باہر نکل آئی۔ یہ ایک نارنجی ساڑھی تھی۔ اسے ساڑھی باندھنے کا سلیقہ بڑی اچھی طرح سکھایا گیا تھا...... لیکن اتارنے کا سلیقہ شاید وہ پوری طرح نہیں سیکھ سکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اپنے چہرے پر کئی نیل لے کر اب وہ یہاں ہمارے ساتھ موجود تھی۔

اس نے میری طرف دیکھا اور رو دینے والے انداز میں بولی۔ ''پلیز مجھ پر رحم کریں۔ مجھے کسی طرح واپس پاکستان پہنچا دیں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میرے ساتھ بہت

دھوکا ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔''تم نے آنکھوں دیکھ کر مکھی نگلی تھی۔ اب دوسروں کو الزام نہیں دے سکتی ہو۔ کچھ نہ کچھ تو اب تمہیں بھگتنا ہی پڑے گا۔''

''میں بہت بھگت چکی ہوں۔ اب میں واپس اپنے بہن بھائیوں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔'' اس کی ٹھوڑی پر بھی ایک نیل تھا۔ یہ مار پیٹ یقیناً اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ اس نے انیل کی کوٹھی میں ڈائریکٹر راج کو مطلوبہ شاٹس دینے سے انکار کیا تھا۔

میں نے ایشوریا سے کہا۔''وہاں دو اور پاکستانی لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ اب کہاں ہوں گی؟''

''مم...... مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

''لیکن پتا چلانا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔''ہم انہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتے...... اگر تم پاکستان واپس پہنچو گی تو وہ بھی پہنچیں گی۔'' عمران نے میری تائید کی اور لڑکیوں کے حوالے سے ایشوریا کو پوری تسلی دی۔

وہ ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔''ان میں سے ایک کا نمبر میرے پاس ہے۔ آپ لوگ فون کر کے دیکھ لیں۔''

عمران نے جیلانی کے سیل فون سے کال کی۔ فوراً جواب آیا۔ عمران نے اسپیکر آن کر دیا تا کہ ہم بھی سن سکیں۔ ایک گھبرائی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔''کون ہے؟''

عمران نے فون ایشوریا کو تھما دیا۔ ایشوریا نے کہا۔''ہیلو فاخرہ! میں سویٹی بول رہی ہوں۔ کہاں ہو تم؟''

''مم...... میں اور کنول یہاں ایک بس اسٹینڈ میں بیٹھے ہوئے ہیں چھپ کے...... تم کہاں ہو؟''

''یہاں کچھ پاکستانی ہیں، میں ان کے پاس آ گئی ہوں۔ اچھے لوگ ہیں۔ یہ ہمیں واپس پاکستان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ تمہارے پاس اگر کوئی اور ٹھکانا نہیں تو یہاں پہنچ جاؤ کسی طرح۔''

''لیکن کہاں؟''

عمران نے سویٹی عرف ایشوریا رائے سے فون لے کر بات کی۔ اس نے فاخرہ نامی لڑکی سے معلوم کر لیا کہ وہ کس بس اسٹینڈ پر ہیں۔ اس نے ان سے کہا۔

''ابھی بیس پچیس منٹ تک نیلی گاڑی میں دو بندے آئیں گے۔ تم ان کے ساتھ یہاں پہنچ جاؤ۔ ہم تمہیں حفاظت سے سفارت خانے تک پہنچا سکتے ہیں۔''

عمران کے بعد پھر ایشوریا نے بات کی اور دونوں لڑکیوں کو پوری تسلی دی۔

میں بار بار حیرت کے عالم میں ابرار صدیقی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ پتا نہیں اس پر کیا کیا بیتی تھی؟ وہ کس طرح یہاں انڈیا پہنچا اور اس کے داغ داغ جسم پر یہ ڈرائیور کی سفید وردی کیسے سجی تھی؟

ابرار صدیقی کے بارے میں ہمیں جو آخری معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق وہ ہم سے پہلے ہی بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور یہ مصدقہ اطلاع بھی موجود تھی کہ وہ زرگاں کے بڑے پگوڈا میں سے آرا کوئے چرا کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ بعد ازاں آرا کوئے بھانڈیل اسٹیٹ سے کوئی ڈیڑھ ہزار میل دور شیخو پورہ کے ایک نواحی جنگل میں پائی گئی تھی۔ بابا جلالی کے بیان کے مطابق کچھ لوگ ایک جیپ پر اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔ ان کے پیچھے کچھ گاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ جیپ والوں یا جیپ والے نے بھاگتے بھاگتے یہ نادر مورتی درختوں میں پھینک دی تھی تا کہ وہ پیچھا کرنے والوں سے محفوظ رہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ گر گئی ہو۔ جلالی نے اس مورتی کو ایک امانت کے طور پر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر جتنا کمزور تھا، ارادے کا اتنا ہی پکا تھا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اس مورتی آرا کوئے کو اس کے اصل مالک کے سوا کسی کے حوالے نہیں کرے گا۔ اور وہ قریب المرگ بڈھا اب تک اپنے اس ارادے پر قائم تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس رات مورتی پھینک کر بھاگنے والا یہ ابرار صدیقی ہی تھا۔ ہم نے ابرار صدیقی کو بہت تلاش کیا تھا...... اور پھر تھک ہار کر یہ سوچ لیا تھا کہ وہ کہیں مر گیا ہو گا۔ لیکن آج بالکل اچانک...... اور بالکل غیر متوقع جگہ پر وہ ہمارے سامنے تھا۔

عمران نے مجھے ساتھ والے کمرے میں بلایا اور بولا۔''یہ ابرار صدیقی والی کہانی تو اس کے مکمل ہوش میں آنے کے بعد ہی کھل سکے گی۔ فی الحال ہم دونوں کو جلد از جلد ہوٹل واپس پہنچنا چاہئے۔ جاوا کے ذہن میں ہلکا سا شک بھی نہیں جاگنا چاہئے کہ آج گولڈن بلڈنگ میں جو ہوا ہے اس میں ہمارا ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

''یہاں کے معاملات کون سنبھالے گا؟''

''یار! جیلانی یہاں موجود ہے اور اس گھر کا مالک نصیر احمد بھی۔ وہ سب کچھ آسانی سے سنبھال سکتے ہیں۔ ہم کل موقع دیکھ کر پھر یہاں آئیں گے۔''

اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہم نے اچھی طرح منہ دھویا اور لباس تبدیل کر لئے۔ یہ سب سامان یہاں جیلانی کے پاس موجود تھا۔ ہم نے گولڈن بلڈنگ سے حاصل ہونے والی رائفلیں بھی یہیں رہنے دیں اور کینوس کا وہ بڑا بیگ بھی جس میں دستی بم اور کچھ دیگر اشیاء موجود تھیں۔ یہ اشیاء میں نے جگت سنگھ کو سونپ دیں اور اسے تھوڑی بہت صورتِ حال سمجھا دی...... جگت سنگھ کی پُر درد کہانی ابھی سننا باقی تھی لیکن فی الحال وقت کم تھا۔ میں نے اسے گلے لگا کر بس گو بندر سنگھ اور آشا کور کا پُرسہ ہی دیا اور چند گھنٹوں بعد دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے باہر آ گیا۔ یہاں سے ہم ایک چھوٹی جیپ میں بیٹھے۔ یہ جیپ جیلانی کا ایک ساتھی ہی چلا رہا تھا۔ نیلی اسٹیٹ کار گیراج میں موجود نہیں تھی۔ یقیناً وہ ایشوریا کی ساتھی لڑکیوں کو لینے بس اسٹینڈ کی طرف جا چکی تھی۔ ہماری منزل گولڈن بلڈنگ کی وہ قریبی گلی تھی جہاں ہم نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ عمران ہوٹل سے جو بیگ لے کر نکلا تھا، وہ بھی اسی گاڑی میں موجود تھا۔ اس گاڑی کو گولڈن بلڈنگ کے پاس سے ہٹایا جانا ضروری تھا۔ دوبارہ اس علاقے میں جانے میں تھوڑا سا رسک تو تھا مگر یہ رسک لینے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ یہ گولڈن بلڈنگ کا عقبی علاقہ تھا۔ ہم اندرونی گلیوں سے ہوتے ہوئے مطلوبہ جگہ تک پہنچے۔ پارک کے قریب پہنچ کر ہم نے دور ہی سے گولڈن بلڈنگ کا جائزہ لیا۔ اب بھی دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ پولیس کی گاڑیاں بھی گشت کر رہی تھیں۔ تاہم زیادہ سرگرمی بلڈنگ کے سامنے کی جانب تھی۔ یہاں بس اِکا دُکا لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے اور رات کے اس آخری حصے میں گولڈن بلڈنگ کی مصیبت کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

میرے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے، میں تو وہیں نصیر احمد کے ساتھ جیپ میں بیٹھا رہا۔ عمران آگے گیا۔ اس نے چند تماشائیوں سے باتیں بھی کیں۔ ان میں سے اس ''حادثے'' کا حال احوال پوچھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں جو آفت...... مچی ہے، اس کا اہم ترین کردار ان کے درمیان موجود ہے اور آفت کا حال احوال دریافت کر رہا ہے۔ عمران ٹہلنے والے انداز میں بائیں طرف چلا گیا۔ یہاں سڑک کے کنارے اور بھی کئی گاڑیاں پارک تھیں۔ عمران ان گاڑیوں کے درمیان سے گزرا۔ دو پولیس والے یہاں موجود تھے مگر انہوں نے عمران پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہ بڑے اعتماد سے گاڑی میں بیٹھا اور اسے ڈرائیو کر کے ہمارے پاس آ گیا۔

میں عمران والی گاڑی میں چلا گیا۔ نصیر احمد جیپ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ گاڑی میں

ہمارا سامان پورا تھا۔ ہم نے گولڈن بلڈنگ پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔ یہ برائی کا گڑھ تھا اور آج کی رات اس پر بڑی بھاری ثابت ہوئی تھی۔ گولڈن بلڈنگ گو جزوی طور پر تباہ ہوئی تھی لیکن اس کا سارا ڈھانچا ہل گیا تھا۔ بلڈنگ کے چاروں طرف وسیع احاطہ تھا اس لئے بلڈنگ کے اندرونی حصے میں ہونے والے دھماکوں کی وجہ سے اردگرد کی عمارتیں قریباً محفوظ ہی رہی تھیں۔ ہم واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے تھے، اہلِ محلّہ؟''

''وہی جو انہیں کہنا چاہئے۔ دل ہی دل میں خوش ہیں۔ ان کی کھڑکیوں کے شیشے وغیرہ ضرور ٹوٹے ہیں لیکن ان کے دل جڑ گئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی یہ سب جانتے تھے کہ گولڈن بلڈنگ کے اندر پروڈکشن ہاؤس کی آڑ میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ لیکن آواز اٹھانے اور لڑائی مول لینے کی ہمت کوئی نہیں رکھتا تھا۔''

جلد ہی ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی اور بیگ سمیت کمرے میں آ گئے۔ کسی نے وہاں اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہم گئے دوسرے لباس میں تھے، آئے دوسرے میں ہیں۔ میرے چہرے کے ایک دو نیل بھی کسی کے نوٹس میں نہیں آئے۔

صبح دس بجے کے لگ بھگ عمران نے ٹی وی آن کیا تو وہاں نیوز چینلز پر گولڈن بلڈنگ والے خونی ہنگامے کی خبر چل رہی تھی۔ خبر کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جا رہا تھا۔ بتایا جا رہا تھا کہ دو خطرناک گروپوں میں خوفناک تصادم ہوا ہے۔ درجنوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں۔ گولڈن بلڈنگ کا بڑا حصہ تباہ ہو چکا ہے۔ دھماکوں سے اردگرد کی عمارتوں کو نقصان پہنچا ہے۔ ابھی تک گولڈن بلڈنگ میں کہیں کہیں آگ لگی ہوئی ہے۔ سارو اور تیواری وغیرہ کی ہلاکت کی خبر بھی بار بار نشر ہو رہی تھی۔ سراج کی ہلاکت کی خبر میرے دل و دماغ پر عجیب اثر کر رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی جاگ رہی تھی۔ جب بوڑھی ماؤں پر ظلم ہوتا ہے تو جوان بیٹے ظالموں کے گریبان پکڑتے ہیں، بدلہ چکاتے ہیں۔ دیر سے ہی سہی لیکن میں نے بھی آج اپنی مظلوم ماں کا بدلہ چکا دیا تھا۔

ثروت سے رابطہ ہوئے قریباً تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے اسے فون کرنا ضروری سمجھا۔ میڈم صفورا کے نمبر پر کال کی۔ فوراً ہی میڈم صفورا کی قدرے بھاری آواز سنائی دی۔

''ہیلو بوائز! کہاں ہو تم دونوں؟''

''بس ممبئی سے نکل رہے ہیں۔''

"کہاں کے لئے؟"

"ابھی یہ نہیں بتا سکتے۔"

"وہ......عمران کدھر ہے؟"

عمران شیو کرنے کے بعد ٹھوڑی پر تولیا رگڑ رہا تھا۔ اس نے انگلی ہلا کر مجھے "نہ" کا اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ "وہ ابھی باہر نکلا ہے۔ آجاتا ہے تھوڑی دیر میں۔"

"سنا ہے رات کو کوئی ہنگامہ بھی ہوا ہے ساؤتھ ممبئی میں۔ دو گروپس میں "کلیش" کی نیوز آ رہی تھی۔"

"یہ تو شہر ہی ہنگاموں کا ہے۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

"ثروت تمہارے لئے بڑی پریشان تھی۔ بار بار سیل فون کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لو بات کرو اس سے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

چند سیکنڈ بعد ثروت کی آواز ابھری۔ "ہیلو تابش! آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"بالکل ٹھیک ہوں، اور تم؟ کسی طرح کی پریشانی تو نہیں؟"

"نہیں، بس آپ کی اور......عمران صاحب کی طرف سے فکر ہے۔ آپ کب تک لوٹیں گے؟"

"ابھی تو نکلے ہی ہیں ثروت! کچھ دن تو لگنے ہیں۔"

"آپ کہتے تھے کہ میں جلد جلد فون کروں گا۔ لیکن اب دیکھ لیں کتنی دیر کی ہے۔ میں نصرت کی طرف سے بھی پریشان ہوں۔ رات کو اس کا فون آیا تھا۔ وہ بتا نہیں رہی تھی لیکن آواز سے کمزور لگ رہی تھی......وہ بتا رہی تھی کہ پرسوں یوسف آئے تھے۔"

"یوسف......کہاں؟"

"احمد تھانوی صاحب کے آستانے پر......نصرت سے ملنے۔ انہوں نے نصرت سے معافی مانگی ہے اور اسے منا کر واپس گھر لے آئے ہیں۔ لیکن نصرت وہاں زیادہ خوش نہیں ہے۔" تھانوی صاحب کو کچھ لوگ قدرت اللہ بھی کہتے تھے۔

یوسف کا فریبی چہرہ میری نگاہوں میں آیا اور دماغ میں چنگاریاں سی چمک گئیں۔ یہ بندہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا۔ اپنا مطلب نکالنے کے لئے ہاتھ جوڑنے سے لے کر پاؤں پڑنے تک سب کچھ کر سکتا تھا۔ مطلب نکلنے کی صورت میں بے رحمی سے آنکھیں پھیر لینا بھی اس کا شیوہ تھا۔

میں نے کہا۔ "اور وہ گریس والا معاملہ ثروت؟ یہ بھی تو پتا چلا ہے کہ وہ پھر اس سے مل رہی ہے۔"

چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد ثروت بولی۔ "تابش! اصل حقیقت تو مجھے وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ نصرت بے چاری بھی تو بس اندازے ہی لگا رہی ہے۔"

میرا دل چاہا فون بند کر دوں۔ شوہر پرستی میں ثروت کبھی کبھی ہر حد سے گزری محسوس ہوتی تھی۔ چند روز پہلے اس نے یوسف کے بارے میں سب کچھ اچھی طرح جان لیا تھا۔ نائیکا شاربہ بائی کی زبانی اسے یوسف کا سارا کچا چٹھا معلوم ہوا تھا۔ پھر ثروت نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ کس طرح اسے یہاں تنہا چھوڑ کر پاکستان جا پہنچا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کے لئے دل میں نرم گوشے رکھتی تھی۔ کیوں تھے یہ نرم گوشے؟ یہ نرم گوشے شاید یوسف کے لئے نہیں تھے، یہ ان واہموں کے لئے تھے جو ثروت نے دل و دماغ میں پال رکھے تھے۔ اس نے چھوٹی بہن کی بیماری کو یوسف سے علیحدگی کے ساتھ منسوب کر رکھا تھا۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن اس کے گرد خوف نے ایک ایسا حصار بنا رکھا تھا جس سے نکلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کسی وقت ہمت ضرور کرتی تھی لیکن پھر جلد ہی ہتھیار پھینک دیتی تھی۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ "پلیز تابش! آپ جلدی آنے کی کوشش کریں۔ میں نے ساری رات ڈر میں گزاری ہے۔ وہ ریچھ ابھی یہیں ہیں جو ہم نے دیکھے تھے۔ اوپر والی منزل سے ان کی آوازیں آتی رہی ہیں۔ ایک ملازم نے بتایا ہے کہ یہ آدم خور جانور ہیں۔ مجھے میڈم کا حوصلہ ہے۔ ورنہ میں تو شاید اب تک مر ہی گئی ہوتی۔"

میں نے کہا۔ "ثروت! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں تم یہاں اتنی ہی محفوظ ہو، جتنی لاہور میں اپنے گھر میں ہوتیں۔ اور اس بات کا بھی یقین رکھو کہ ہم جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے۔"

"میں نے ابھی ٹی وی پر ایک خبر دیکھی تھی۔ ممبئی میں کوئی ہنگامہ ہوا ہے۔ میرا دل ہول رہا تھا۔"

"نہیں ثروت! ہم شہر کے دوسرے حصے میں ہیں اور اب تو ہم ویسے ہی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں......"

ثروت سے تسلی تشفی کی چند باتیں کر کے میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ یوسف کے حوالے سے دل پر عجیب بوجھ سا تھا۔ ہم اس شخص کی خاطر یہاں انڈیا آئے تھے اور موجودہ حالات میں پھنسے تھے۔ وہ خود لاہور جا پہنچا تھا اور وہاں اپنی خباثت دکھانے میں مصروف تھا۔ عین

ممکن تھا کہ وہ ایک دو روز میں فون پر ثروت کو بتاتا کہ انڈیا سے اس کا جانا ایک پلاننگ کے تحت تھا اور وہ وہاں لاہور میں رہ کر اس کی رہائی اور واپسی کے لئے بھرپور کوششیں کر رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

''خبیث۔'' میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

عمران فوراً بولا۔ ''بہت بری بات ہے تابی...... ثروت تم سے محبت کرتی ہے اور جو محبت کرتے ہیں ان کو خبیث نہیں کہا جاتا۔''

''میں اِس بدذات کے لئے کہہ رہا ہوں...... یوسف کے لئے۔''

''اب کیا کیا ہے اس نے؟''

''جلیبی کی طرح گول مول بندہ ہے یہ۔ پہلے نصرت سے جھگڑا کیا، اسے برا بھلا کہا ہے۔ ثروت کے بارے میں بدزبانی کی ہے۔ اب ٹسوے بہا رہا ہے۔ نصرت کو احمد تھانوی صاحب کے گھر سے منا کر اور معافی مانگ کر واپس لے گیا ہے۔''

''جگر پارے! تُو فکر نہ کر۔ یوسف نے یہاں سے چپ چاپ راہِ فرار اختیار کر کے ہمیں اور ثروت کو اپنی اصلیت دکھا دی ہے۔ ثروت مانے یا نہ مانے لیکن وہ اپنے عمل سے ثروت کی نظروں میں گرا ہے۔''

''تم ثروت کو نہیں جانتے عمران! وہ ارادے کی بڑی پکی ہے اور اس کے وہم اس سے بھی پکے ہیں۔ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے پھر بھی اس پر یقین نہیں کرتی۔ مجھے لگتا ہے کہ یوسف کا فون دوبارہ آ گیا اور اس نے معافی تلافی کی تو ثروت پھر اس کے سامنے جی جی کرنے لگے گی۔''

عمران نے عجیب انداز میں کہا۔ ''لیکن جگر! وہ تجھ سے محبت بھی تو کرتی ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا؟'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ اور میری بات یاد رکھ پیارے! وہم کی اپنی طاقت ہوتی ہے تو محبت کی بھی اپنی طاقت ہوتی ہے...... اور محبت کی طاقت بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ دیر ہو جاتی ہے لیکن ارادہ پکا ہو تو اندھیر نہیں ہوتا۔ تُو غم نہ کر...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تیرے بچوں کا چاچو بنوں گا بلکہ شاید میں اور شاہین چاچو چاچی بنیں گے۔''

بارہ بجے کے لگ بھگ ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور روانہ ہو گئے۔ ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی۔ ہمارے بیگ ہمارے ساتھ تھے۔ جو بندہ ہمیں ایئرپورٹ سے اپنے ساتھ لے کر ہوٹل آیا تھا، اس نے ہمیں سی آف کیا۔ عمران اور جاوا کے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا، اس کے

مطابق ممبئی پہنچنے کے بعد ہم بالکل آزاد تھے اور اپنی مرضی سے کہیں بھی آ جا سکتے تھے۔ جاوا نے یقین دلایا تھا کہ کسی بھی طرح ہماری نگرانی نہیں ہو گی۔ ظاہر ہے کہ ثروت ضمانت کے طور پر اس کے پاس تھی۔ ہاں...... اگر ہمیں کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہوتی تو ہم دیئے گئے فون نمبرز پر جاوا سے رابطہ کر سکتے تھے۔

ٹیکسی میں سوار ہونے کے بعد ہم کافی دیر تک ممبئی کی سڑکوں پر چکراتے رہے۔ مقصد یہ دیکھنا ہی تھا کہ ہمارا تعاقب وغیرہ تو نہیں ہو رہا۔ غالباً جاوا وعدے کی پاسداری کر رہا تھا۔ ہمیں نگرانی کے کوئی شواہد نہیں ملے۔ ممبئی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کے دوران میں ہم ایک بار پھر گولڈن بلڈنگ کے پاس سے گزرے۔ کہیں کہیں ابھی تک ملبا سلگ رہا تھا۔ بہت سے لوگ یہاں وہاں ٹولیوں میں کھڑے بلڈنگ کا بچا کھچا ڈھانچا دیکھ رہے تھے۔ اخبار میں جو خبریں آئی تھیں، ان میں بھی یہی بتایا گیا تھا کہ بلڈنگ کے اندر دو بڑے گروپوں میں لڑائی ہوئی ہے۔ درجنوں مسلح نقاب پوش بلڈنگ میں گھسے اور انہوں نے تہلکہ مچا دیا۔

ہم اس مکان سے کچھ فاصلے پر اتر گئے جہاں جیلانی موجود تھا اور اس کے ساتھ ایشوریا، ابرار صدیقی اور جگت بھی موجود تھے۔ ہم پیدل چل کر مکان تک آئے۔ جیلانی نے خود ہی دروازہ کھولا۔ ''یا شیخ! کیا حال ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے۔ ابرار صدیقی ہوش میں آ چکا ہے۔ وہ بہت ڈرا ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

جیلانی بولا۔ ''ہوش میں آتے ہی اس نے واویلا شروع کر دیا۔ ہمارے سامنے ہاتھ جوڑنے اور معافیاں مانگنے لگا۔ پھر رونا شروع کر دیا۔ کہنے لگا کہ ہم اسے تکلیف دینے کے بجائے جان سے مار دیں، وہ ہمیں کچھ نہیں بتا سکتا وغیرہ وغیرہ۔ اسے سکون بخش دوا دی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سویا ہے۔''

''اپنے بارے میں کچھ بتایا ہے اس نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی تو نہیں۔''

''وہ لڑکیاں پہنچ گئی ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

جیلانی نے اثبات میں جواب دیا اور ہمیں اندر لے آیا۔ ایشوریا سمیت تینوں لڑکیاں ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے چائے کے کپ تھے۔ تینوں ڈری سہمی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام فاخرہ اور دوسری کا عروج تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ دونوں باقاعدہ رونے لگیں۔ عروج ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''خدا کے لئے ہمیں کسی طرح ہمارے گھر پہنچا دیں۔ ہم

سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ پیسے اور شہرت کے لالچ میں ہم نے بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہمیں اب کچھ نہیں چاہئے۔ بس اپنے گھر پہنچ جائیں۔''

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اب یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تم ایک غیر ملک میں ہو۔ تمہارے پاس کوئی سفری کاغذات نہیں ہے۔ بہرحال، ہم ہر طرح تمہاری مدد کریں گے اور تم ضرور اپنے گھر بھی پہنچو گی لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

عروج نے الٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے۔ اس کی شکل زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت فلمی ہیروئن ''تبو'' سے ملتی تھی۔ وہ پاکستان میں ٹی وی اور اسٹیج پر بھی چھوٹے موٹے رول کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ ایک اسٹیج ڈرامے میں نائیکا شاربہ بائی نے اسے دیکھا اور شیشے میں اتارلیا۔ اس نے کہا کہ وہ تو بہت اچھا ڈانس کرتی ہے۔ اوپر سے اس کی شکل بھی ''تبو'' سے بہت ملتی ہے۔ وہ کسی طرح انڈیا چلی جائے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ وہ اس کی باتوں میں آ گئی اور پھر مختلف ہاتھوں سے گزرتی ہوئی یہاں ممبئی آ پہنچی۔ گولڈن بلڈنگ پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ بدترین حالات کا شکار ہے اور غلیظ ترین لوگوں میں ہے۔ جو کیمرا اس کا ''عشق'' تھا اسی کیمرے سے اسے گھن آنے لگی۔ اس نے ایک بار بھاگنے کی کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ اسے شرابی غنڈوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ایشوریا رائے یعنی سویٹی کی کہانی بھی عروج کی کہانی سے بہت مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی نائیکا شاربہ کے ہتھے چڑھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ سویٹی کی شکل مشہور ہیروئن ایشوریا رائے سے بہت زیادہ ملتی تھی۔ اسے شاربہ اور سلطان چٹا وغیرہ کی طرف سے زبردست پذیرائی ملی۔ سویٹی کو بنانے سنوارنے میں بہت زیادہ روپیا بھی خرچ کیا گیا اسے ڈانس اور بول چال کی خصوصی تربیت دی گئی۔ وہ اب ایشوریا رائے کی شخصیت سے اتنی قریب تھی کہ بڑے ''تیز نگاہ'' لوگوں کو بھی دھوکا دے سکتی تھی تیسری لڑکی فاخرہ کا تعلق بھی عروج کی طرح ''اس بازار'' سے تھا۔ وہ بھی کئی جگہ خراب ہو چکی تھی اور اب گولڈن بلڈنگ کے بدترین حالات کا شکار تھی۔

اس دوران میں جیلانی نے اطلاع دی کہ ابرار صدیقی جاگ گیا ہے۔ عمران نے لڑکیوں کو تسلی تشفی دی اور میرے ساتھ دوسرے کمرے میں ابرار صدیقی کے پاس آ گیا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ابرار صدیقی ہے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا...... پہچانا...... حیرت زدہ ہوا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ ہم دونوں سے لپٹ گیا۔ اسے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ہمیں یہاں دیکھ رہا ہے۔

وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ''میں تباہ ہو گیا...... ختم ہو گیا...... میں نے اپنی زندگی خود برباد کر لی۔''

کچھ دیر بعد جب جذبات کا چڑھا ہوا طوفان اتر گیا تو وہ بے دم سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا اور تکیے سے ٹیک لگا لی۔ میں نے کہا۔ ''ابرار صاحب! آپ کی چوٹ اب کیسی ہے؟''

وہ لمبی آہ بھر کر بولا۔ ''یہ چوٹ تو اب ٹھیک ہے لیکن دل پر جو چوٹیں لگی ہیں ان کا کوئی علاج نہیں...... کوئی نہیں۔ اس...... مورتی کے چکر نے مجھے فنا کر دیا۔'' اس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''میں نے کہا۔'' آپ شاید آرا کوئے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ اب کہاں ہے؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں...... کچھ خبر نہیں۔'' اس نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔

اس کا رنگ زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔

''کچھ اندازہ تو ہو گا؟'' عمران نے کہا۔

''مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ بہت برباد کرنے والی چیز ہے۔ وہ جس کے پاس بھی ہو گی، اسے زندہ درگور کر دے گی۔ بہت خطرناک لوگ اس کے پیچھے ہیں۔ وہ ہر جگہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ سایوں کی طرح ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ وہ مجھے مار دیں گے...... تمہیں بھی مار دیں گے۔ ان کی دی ہوئی موت سے بہتر ہے کہ بندہ خود کو اپنے ہاتھوں سے مار لے۔'' ابرار صدیقی کسی بچے کی طرح سسکنے لگا۔

میں اور عمران ششدر تھے۔ اس ابرار صدیقی کو ہم نے جہلم شہر میں بڑے طمطراق میں دیکھا تھا۔ یہ کوئی پانچ برس پہلے کی بات تھی۔ اس وقت ابرار صدیقی کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ لیکن اب وہ پینتالیس پچاس کا نظر آ رہا تھا۔ وہ خاصا تنومند ہوا کرتا تھا۔ ہر وقت اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح نظر آتی تھی۔ تسبیح گھمانے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے تواتر سے نوادرات اور ان کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی باتیں کرتا تھا۔ اس نے وکالت کی ہوئی تھی اور ضرورت مندوں کو قانونی امداد فراہم کرنے کے لئے کوئی ادارہ وغیرہ بھی بنایا ہوا تھا لیکن اب تو وہ خود سر تا پا امداد کا مستحق نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کسی نادیدہ شے کا خوف جم کر رہ گیا تھا۔

ہم دیر تک اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے دل کا غبار آنکھوں کے راستے نکلتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ قدرے نارمل نظر آنے لگا۔ ہم نے اس کے ساتھ چار

بجے کی چائے پی۔ وہ ہم سے جاننا چاہتا تھا کہ ہم یہاں ممبئی میں کیسے پائے جا رہے ہیں۔ وہ میڈم صفورا اور دیگر لوگوں کے بارے میں بھی جاننا چاہ رہا تھا۔ ہم نے اسے مختصر لیکن تسلی بخش جواب دیئے۔ وہ یہ جان کر قدرے حیران ہوا کہ گندھارا آرٹ کا نادر نمونہ آرا کوئے اس وقت انڈیا میں موجود ہے۔ یوں لگتا تھا کہ ابرار صدیقی کو پچھلے کچھ عرصے سے آرا کوئے کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے۔ وہ جیسے اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ ہو چکا تھا۔ ہم نے جتنی بار بھی آرا کوئے کا نام لیا، ابرار کے چہرے پر زردی سی بکھر گئی۔

پھر وہ بھانڈیل اسٹیٹ کی باتیں کرنے لگا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پانچ سال پہلے آرا کوئے پر ہاتھ ڈالنے کے جرم میں میڈم صفورا اور میں بھی بطور سزا بھانڈیل اسٹیٹ پہنچائے گئے تھے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں جو جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں زیادہ تر باتیں ابرار کو معلوم تھیں۔

آخر میں ابرار سے پوچھا۔ ''ابرار صاحب! کیا یہ بات درست ہے کہ چند مہینے پہلے آپ ایک بار پھر آرا کوئے کو بھانڈیل اسٹیٹ سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟''

ابرار پہلے خاموش رہا۔ پھر اس نے اس بات کو گول کرنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے اصرار کیا تو اس نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔ ایک طرح سے ہم نے کل رات اس کی جان بچائی تھی اور اب بھی اسے ایک محفوظ ٹھکانا مہیا کئے ہوئے تھے پھر میڈم صفورا کا حوالہ بھی موجود تھا۔ نوادرات کے حوالے سے میڈم اور ابرار صدیقی ایک دوسرے سے کاروباری تعاون کرتے رہے تھے۔ ان کا یہ تعلق پرانا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ ابرار صدیقی کو میڈم صفورا کی آواز سنا سکوں۔ میں نے سیل فون پر میڈم سے رابطہ کیا اور رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرا مقصد صرف ابرار کو میڈم کی آواز سنانا تھا۔

اب ابرار صدیقی کو ثبوت مل چکا تھا کہ میڈم صفورا بھی یہاں ہمارے ساتھ ہی انڈیا میں موجود ہے۔ اس نے بتایا کہ چند ماہ پہلے اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لئے چہرے اور سر کے بال صاف کروا دیئے تھے، اب وہ یہاں دلجیت کے نام سے ایک میراٹھی سیٹھ کا ڈرائیور ہے اور گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتا ہے۔ آج وہ وہاں اپنے سیٹھ کو گولڈن بلڈنگ لے کر آیا تھا۔

''لیکن آپ یہاں انڈیا کیوں آئے؟'' عمران نے پوچھا۔

''میں آیا نہیں مجھے لایا گیا۔ وہ لوگ مجھے لے آئے۔ وہ بہت خطرناک ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ وہ بندے کو دنیا کے کسی کونے سے بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے

بھی ڈھونڈ لینا ہے۔ آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں۔ میں نے آرا کوئے کو دوبارہ بھانڈیل اسٹیٹ سے نکال کر بڑی غلطی کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے سمجھ جانا چاہئے تھا کہ وہ لوگ آرا کوئے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ہر حد تک جا سکتے ہیں۔ یہ بات...... تم لوگوں کو بھی سمجھ لینی چاہئے۔ ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے یا پھر...... میری طرح سسک سسک کر جیو گے۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

مجھے اس کے جسم کے داغ نظر آئے اور دل کانپ گیا۔

عمران نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''ابرار صاحب! ہم ان لوگوں کو پہلے بھی شکست دے چکے ہیں۔ اب دوبارہ دیں گے۔ ہم میں اتنا حوصلہ ہے۔ ہم ایسا کر سکتے ہیں لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے آپ ہمیں اپنے بارے میں تو کچھ بتائیں۔ اگر آپ شروع سے بتائیں تو ہمارے لئے آسانی ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''ہمیں اتنا تو معلوم ہے ابرار صاحب جب زرگاں میں لڑائی زوروں پر تھی اور ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی، آپ کو آرا کوئے سمیت وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا اور آپ پاکستان بھی پہنچ گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟''

ابرار نے رک رک کر بھرائی ہوئی آواز میں جو رُوداد سنائی، وہ مختصر الفاظ میں کچھ یوں تھی۔

چند ماہ پہلے ابرار صدیقی مجسمے سمیت یہاں پہنچ گیا تھا۔ نوادرات کی بھوک ابرار کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ خطرناک ترین حالات کے باوجود وہ خود کو اس ''ماسٹر پیس'' سے دور نہ رکھ سکا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے ہرکارے پھر آندھی اور طوفان کی طرح اس ماسٹر پیس یعنی آرا کوئے کے پیچھے آئے۔ اس مرتبہ ان کی تلاش کی شدت اور سنگینی ابرار صدیقی کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ بھانڈیل اسٹیٹ کے خطرناک ترین لوگ تھے۔ وہ شکاری کتوں کی طرح ابرار صدیقی کی بو سونگھتے ہوئے پاکستان میں داخل ہو گئے...... اور ان کی میں سے ہر ایک کی ناک بے حد تیز تھی۔ ان میں ایک ایسا کھوجی بھی شامل تھا جسے یہ دعویٰ تھا کہ وہ فاصلے سے آرا کوئے کی دھات کی بو سونگھ سکتا ہے۔ ان لوگوں نے کراچی میں ابرار صدیقی کے دو ساتھیوں کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ ابرار کسی طرح جان بچا کر بھاگا۔ وہ اس کے پیچھے تھے۔ ملتان اور پھر ساہیوال میں بھی وہ ان لوگوں سے بال بال بچا۔ ملتان میں اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد ان لوگوں نے ابرار صدیقی کی تین رشتے دار خواتین کو بیدردی سے ذبح کر دیا اور کسی ''روحانی عمل'' کے لئے ان تینوں کی انگلیاں کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مارنے سے پہلے ان خواتین کو بیدردی سے داغا بھی گیا۔

ابرار صدیقی بہت خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے ساہیوال میں ہی ہڑپہ کے نزدیک آراکوئے اپنے قریبی ساتھی عنایت کے حوالے کر دیا۔ یہی کوتاہ قامت شخص تھا جس کے ذریعے ہم ایک دفعہ نوادر کے بیوپاری بن کر ابرار صدیقی تک پہنچے تھے۔ عنایت نامی یہ شخص ایک جیپ پر سوار ہو کر لاہور کی طرف نکل گیا اور ابرار صدیقی نے خود کو ساہیوال میں ہی روپوش کر لیا۔ عنایت بھی بھانڈیل اسٹیٹ کے خطرناک ہرکاروں سے بچ نہیں سکا۔ ان کے ایک مقامی مخبر نے عنایت کو لاہور کے نواح میں پہچان لیا۔ بھانڈیل کے ہرکارے ایک بار پھر اس کے پیچھے لگ گئے۔ عنایت لاہور سے ہوتا ہوا پہلے گوجرانوالہ کی طرف گیا پھر شیخوپورہ کی طرف بھاگ گیا۔ وہ جان چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن جان نہیں چھوٹ رہی تھی۔ اس کے بارے میں ابرار کو جو آخری اطلاع ملی، وہ یہی تھی کہ وہ شیخوپورہ کے آس پاس کہیں ہے۔

تیسرے دن ابرار صدیقی کو معلوم ہوا کہ عنایت کی لاش ایک خشک برساتی نالے کے اندر سے ملی ہے۔ اس نے نالے کے اونچے پل پر سے چھلانگ لگائی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ لوگ اسے پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ ان سے بچنے کے لئے پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے کود گیا۔ عنایت کی لاش وزیرآباد کے قریب سے ملی تھی۔ اس کی جیپ بھی گکھڑ کے پاس گھنے درختوں کے اندر سے مل گئی تھی۔

اس واقعے کے صرف دو دن بعد ابرار صدیقی بھی ساہیوال سے پکڑا گیا۔ یہ ابرار کے لئے بہت بڑا سانحہ تھا۔ وہ جان بچانے کے لئے آراکوئے پر لعنت بھیج چکا تھا لیکن اب آراکوئے بھی نہیں تھا اور ابرار کی سلامتی بھی نہیں تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے وحشی ہرکاروں کو عنایت والی جیپ کے اندر سے ہی ایک ایسا ثبوت مل گیا تھا جو انہیں سیدھا ابرار صدیقی کی پناہ گاہ تک لے آیا تھا۔ ابرار کی اس بدقسمتی نے اسے زندہ درگور کر کے رکھ دیا...... اگلے ڈیڑھ مہینے میں ابرار صدیقی پر جو کچھ بیتی، اسے بیان کرنے کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ لوگ بہاولپور میں اسے اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر لے گئے اور تشدد کی انتہا کر دی۔ ان کے پاس لوہے کا ایک خاص سانچہ سا تھا جسے وہ لوگ انگاروں پر دہکاتے تھے اور پھر اس کے جسم کو داغتے تھے۔ وہ اس سے آراکوئے کے بارے میں پوچھتے تھے اور ابرار کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ انہیں بتاتا تھا کہ آراکوئے عنایت کے پاس تھا۔ اس نے جیپ کے اندر سیٹ کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے ہرکاروں اور بھکشوؤں کو عنایت کی جیپ کے اندر سے کچھ نہیں ملا تھا۔ صرف عنایت بتا سکتا تھا کہ آراکوئے کہاں ہے اور وہ مر چکا تھا۔ بہاولپور میں تقریباً پندرہ روز تک اسے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد یہ لوگ اسے بہاولپور سے لے

جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے کسی خاص طریقے سے اس پر لمبی بے ہوشی طاری کی اور نہ جانے کس طرح انڈیا لے آئے۔ ابرار کے اندازے کے مطابق وہ اسے کسی خاص روحانی عمل سے گزارنے کے لئے کسی بڑے پگوڈا میں لے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں بالکل غیر متوقع طور پر ابرار کی قسمت نے یاوری کی۔ ایک طوفانی رات میں نہایت تیز بارش کے دوران میں اس کنٹینر کو حادثہ پیش آیا جس میں ابرار صدیقی کو لے جایا جا رہا تھا۔ ایک کار سے ٹکرانے کے بعد یہ کنٹینر ''جیسلمیر'' کے قریب الٹ گیا۔ اس خوفناک حادثے میں ایک بھکشو سمیت چار افراد ہلاک ہوئے۔ ابرار صدیقی معجزانہ طور پر بچ گیا۔ شدید زخمی حالت میں اس نے جنگل کے اندر تیس چالیس میل کا سفر طے کیا اور پھر ریل کا طویل سفر کر کے ممبئی کے مضافات میں پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ اب بھی اس کے پیچھے ہیں اور کسی بھی وقت اسے پھر پکڑ لیں گے۔ اس نے اپنے چہرے اور سر کے بال منڈوا دیئے۔ اپنا پورا حلیہ تبدیل کر لیا اور ایک ہندو کی حیثیت سے انسانوں کے اس سمندر میں گم ہو گیا جسے ممبئی کہتے ہیں۔

یہ تھی ابرار صدیقی کی ساری رُوداد۔ پچھلے کئی ماہ سے ابرار کو کچھ پتا نہیں تھا کہ آراکوئے کے حوالے سے کیا تہلکہ مچا ہوا ہے اور کیا کیا پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔ اسے یہ خبر بھی نہیں تھی کہ آراکوئے عنایت کی جیپ سے کیسے غائب ہوا۔ وہ لاعلم تھا کہ عنایت نے نادر مجسمے کو چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا تھا۔ یہ مجسمہ سنکی بڈھے جلالی کے ہاتھ آ گیا۔ لیکن عنایت دوبارہ اس جگہ نہ پہنچ سکا جہاں اس نے مجسمہ پھینکا تھا۔ وہ موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

''آپ کا کیا خیال ہے، آراکوئے اب کہاں ہو سکتا ہے؟'' میں نے ابرار صدیقی سے سوال کیا۔

وہ بولا۔ ''یہ وہ سوال ہے جس کے بارے میں، مَیں نے ہزار بار سوچا ہے اور کبھی بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ بس اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ عنایت سے وہ مجسمہ کسی دوسرے گروپ نے چھین لیا ہو...... یا پھر اس نے خود ہی راستے میں کسی کو تھما دیا ہو...... یا پھر کہیں پھینک دیا ہو تاکہ وہ بھکشوؤں کے ہاتھ نہ آئے اور اگر وہ زندہ بچ جائے تو بعد میں آ کر اسے ڈھونڈ لے۔ لیکن ہڑپہ سے شیخوپورہ اور پھر وزیرآباد کئی سو میل کا سفر ہے۔ پتا نہیں کہ وہ مجسمہ کب اور کہاں عنایت سے علیحدہ ہوا۔''

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ لاسٹنگ بدھا کا مجسمہ مل چکا ہے اور اب ایک بار پھر اس کی تلاش کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اور یہ سو فیصد تصدیق شدہ خبر ہے۔''

ابرار ایک دم گم صم ہو گیا۔ اس کے چہرے سے جیسے سارا خون نچڑ گیا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے ابرار صاحب! آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مجسمہ وہاں پہنچ جائے جہاں اسے پہنچنا چاہیے۔''

''کیوں چاہتے ہو تم؟ کیوں چاہتے ہو؟'' وہ چلّا اٹھا۔ ''خدا کے لئے بھول جاؤ اسے۔ لعنت بھیج دو اس پر۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ اتنے زور سے بولا تھا کہ اسے کھانسی ہونے لگی۔ وہ کتنی دیر تک کھانستا رہا۔ کھانسنے سے اس کے پہلو کا زخم تکلیف دیتا تھا اور وہ دہرا ہو ہو جاتا تھا۔

ہم نے بمشکل اسے پُرسکون کیا۔ پانی وغیرہ پلایا۔ وہ آراکوئے کے حوالے سے کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں پوچھ رہا تھا کہ اگر مجسمہ واقعی مل چکا ہے تو کب اور کیسے ملا؟ وہ یقیناً دل ہی دل میں ہمارے ''لالچ'' کو بھی کوس رہا تھا۔

عمران نے اسے بتایا۔ ''ابرار صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ ہم آپ کی طرح ''نوادرات'' کے دیوانے نہیں ہیں۔ آراکوئے میں ہماری دلچسپی کی وجہ کچھ اور ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ ہماری ایک بہت قریبی عزیزہ ایک بڑے انڈین بدمعاش کے حبس بے جا میں ہے۔ اسے چھڑانے کا ہمارے پاس بس ایک ہی راستہ ہے۔ ہم کسی طرح آراکوئے تک پہنچ جائیں......اس کے لئے۔''

''مم...... میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔ بہت زیادہ مہربانی ہوگی۔ مجھ سے اس بارے میں بات نہ کرو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' اس کے پورے جسم پر لرزہ سا طاری ہونے لگا تھا۔

میں نے عمران کو اشارہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ فی الحال ہم یہ موضوع نہ چھیڑیں۔ غالباً عمران بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ ہم نے موضوع بدل دیا۔

ٹی وی اور اخبارات میں گولڈن بلڈنگ کے حوالے سے کافی کچھ آ رہا تھا۔ یہ بات بار بار دہرائی جا رہی تھی کہ وہاں دو ''گروپوں'' میں تصادم ہوا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ رہا تھا کہ فقط دو بندے وہاں گھسے تھے اور انہوں نے گولڈن بلڈنگ کی ایسی تیسی کر دی تھی۔ گولڈن بلڈنگ میں فلم اور آرٹ کے پردے کے پیچھے جو دھندا ہو رہا تھا، اس پر بھی کھل کر بات کی جا رہی تھی۔ جرنلسٹ اسے بڑے وثوق سے فحاشی کا اڈا قرار دے رہے تھے۔ سارو یعنی سراج اور تیواری کی موت کو بھی خبروں میں ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔ خبروں اور تبصروں میں یہ بات بھی وضاحت سے کہی جا رہی تھی کہ گولڈن بلڈنگ والے، فلم ٹی وی کی مشہور اداکاراؤں کے ہم

شکل چہرے ڈھونڈتے تھے۔ پھر ان چہروں کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ عیاش امرأ کو خطیر رقوم کے عوض ان سلیبریٹیز کی جعلی قربت فراہم کی جاتی تھی، اور اکثر کیسوں میں یہ ڈراما کامیاب رہتا تھا۔

عمران چاہتا تھا کہ تینوں پاکستانی لڑکیوں کو پاکستانی ایمبیسی کے ذریعے پاکستان واپس بھجوا دیا جائے۔ اس کے لئے اس نے جیلانی اور اس کے مقامی دوست نصیر احمد کو ضروری ہدایات دیں اور ان سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں معلومات حاصل کریں۔ بہرحال یہ کام فوری طور پر ممکن نہیں تھا۔ یہ تینوں لڑکیاں ہمیں دیکھ چکی تھیں اور یہ بھی جان چکی تھیں کہ گولڈن بلڈنگ کا بیڑا غرق ہم نے کیا ہے۔ جب تک ہم آراکوئے کی بازیابی اور ثروت کی رہائی کا کام مکمل نہ کر لیتے، ان لڑکیوں کو سامنے نہیں لایا جا سکتا تھا۔

ایشوریا رائے اپنے حالات اور فیصلوں پر بڑی نادم تھی۔ وہ جلد از جلد پاکستان واپس پہنچنا چاہتی تھی۔ ایشوریا رائے کو بھی راجا کی موت کا علم ہو چکا تھا اور وہ اس پر کچھ افسردہ بھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ راجا ایک بار اس کی قربت حاصل کرنے کے بعد بار بار اس کے قریب آنے کا خواہش مند تھا مگر اپنی کئی دوسری خواہشوں کی طرح وہ یہ خواہش بھی لے کر مٹی کے نیچے چلا گیا تھا۔

ایشوریا کا دل نائیکا شاربہ کی طرف سے بھی بہت کھٹا تھا۔ اس نے ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ایک بڑا کام کیا ہے مگر ایک چھوٹا کام اب بھی باقی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''شاربہ بائی......وہ بہت خبیث عورت ہے۔ شریف لڑکیوں کو اپنے چنگل میں پھنساتی ہے۔ ان کو برباد کر کے اسے خوشی ہوتی ہے۔ اب تو وہ کہیں چھپ چھپا گئی ہوگی اور ہو سکتا ہے کئی مہینوں کے لئے کہیں نظر ہی نہ آئے۔ مگر وہ بڑی ڈھیٹ ہے۔ جب معاملے ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو وہ پھر کسی بلا کی طرح نکل پڑے گی۔''

''کوئی بات نہیں، نمٹ لیں گے اس سے بھی اور اچھی طرح نمٹیں گے۔'' عمران نے کہا۔

ہم نے سویٹی عرف ایشوریا رائے اور دونوں لڑکیوں کو پوری تسلی دی کہ وہ جب تک یہاں رہیں گی، پوری حفاظت اور آرام کے ساتھ رہیں گی۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہ یہاں اپنی موجودگی کو مکمل طور پر راز میں رکھیں۔

پلان کے مطابق اب ہمیں رتنا گری جانا تھا اور علاقے کے پگوڈاؤں کا جائزہ لینا تھا مگر ابرار صدیقی کا مل جانا بھی ایک بڑی مثبت پیش رفت تھی۔ وہ ابھی کچھ بتا نہیں رہا تھا لیکن

امید تھی کہ ہم کوشش کرتے رہے تو وہ کسی حد تک اپنی زبان ضرور کھولے گا۔ اس کی باتوں سے عیاں تھا کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے جو اس کے پیچھے پاکستان پہنچے اور پھر اسے وہاں سے اٹھا کر یہاں انڈیا لائے۔ وہ بار بار ان کی بے پناہ خطرناکی کا ذکر کرتا تھا اور یہ بھی بتاتا تھا کہ چند ماہ پہلے وہ اسے کسی روحانی عمل سے گزارنے کے لئے یہاں انڈیا میں لے کر آئے تھے۔

جب سے ہم جاوا سے رخصت ہوئے تھے اس سے ہمارا رابطہ نہیں ہوا تھا اور ہم کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ جاوا سے ٹیلی فونک رابطے میں خطرات موجود تھے۔ عین ممکن تھا کہ موبائل کال کی صورت میں ہماری لوکیشن ڈھونڈ لی جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ کل میڈم صفورا سے بات کرنے کے بعد ہم دونوں نے اپنے سیل فون بند کر دیئے تھے۔ ابرار صدیقی کے حوالے سے بھی ہمارے ذہنوں میں شکوک موجود تھے۔ میں نے کہا۔ ''عمران! ہمیں ابرار کا دھیان رکھنا ہوگا۔ یہ غائب بھی ہو سکتا ہے۔''

''ابھی تو خیر یہ بہت ڈرا ہوا ہے۔ یہاں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بہر حال میں کسی کی ڈیوٹی لگاتا ہوں۔''

اگلے روز ہم نے ابرار کو اچھا ماحول فراہم کیا اور اس سے پھر بات چیت شروع کی۔ عمران کی زبان دانی نے کام دکھایا۔ وہ بڑی مہارت سے ابرار کو شیشے میں اتارتا چلا گیا۔ ابرار پہلے تو آراکوئے کے حوالے سے بات ہی نہیں کرتا تھا مگر اب وہ تھوڑا بہت کہنے اور سننے لگا۔ بہر حال اس کا خوف اپنی جگہ برقرار تھا۔ گفتگو کے دوران میں ابرار صدیقی نے دواری پگوڈا کا نام لیا۔

''یہ کیا جگہ ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

ابرار صدیقی چند سیکنڈ چپ رہنے کے بعد کمزور آواز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ لوگ مجھے لے جانا چاہ رہے تھے۔ اگر اس رات کنٹینر نہ الٹتا تو یقیناً میں وہاں پہنچ چکا ہوتا۔ اور لگتا تو یہی ہے کہ اب تک ختم بھی ہو چکا ہوتا۔''

''یہ دواری پگوڈا ہے کہاں؟'' عمران نے پوچھا۔

''ٹھیک سے تو پتا نہیں لیکن جو کچھ میرے کانوں تک پہنچا اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رتناگری یا اس کے آس پاس کا کوئی بودھ مندر ہے۔ سمندر کے کنارے بالکل ویران علاقے میں ہے۔''

رتناگری کے نام پر میں اور عمران دونوں چونکے۔ بہر حال ہم نے اپنے تاثرات ابرار صدیقی پر ظاہر نہیں ہونے دیئے۔

''آپ کا کیا خیال ہے، وہ لوگ آپ کو وہاں کیوں لے کر جا رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

ابرار نے ایک جھرجھری سی لی اور بولا۔ ''میں جو بھی برے سے برا خیال کر سکوں، وہ شاید ٹھیک ہی ہوگا۔ وہ بہت بے رحم لوگ ہیں۔ آپ دونوں نے میرے جسم پر جلنے کے نشان تو دیکھے ہی ہوں گے۔ یوں سمجھیں کہ وہ اس سے کہیں آگے تک جا سکتے ہیں۔ زندہ بندے کی کھال کھینچ سکتے ہیں۔ اس کے سامنے اس کے ہاتھ پاؤں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔ کہنے کو تو وہ بودھ بھکشو ہیں لیکن بھکشوؤں والی کوئی بات ان میں نہیں ہے یا پھر شاید انہوں نے بھکشوؤں کا روپ دھار رکھا ہے۔''

ابرار صدیقی کے چہرے پر ایک بار پھر بے پناہ خوف کے سائے اُمڈ آئے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہم آراکوئے کی تلاش میں ہیں۔ ہمارے ارادے اسے دل و جان سے دہلا رہے تھے۔ یہ سوچ ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھی کہ آراکوئے کو ڈھونڈا جائے۔ وہ اس معاملے میں بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں اس کا کہا ہوا کوئی لفظ اس کے لئے مصیبت بن جائے۔

وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''میرے دوستو! میں اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ ہو چکا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھوں مرنا پسند کر لوں گا لیکن یہ پسند نہیں کروں گا کہ تم اس مصیبت میں مجھے پھر سے گھسیٹو۔ بلکہ میرا ہمدردانہ مشورہ تمہیں اور صفورا کو بھی یہی ہے کہ آگ اور موت کے اس کھیل کو بھول جاؤ۔ وہ جنونی لوگ ہیں۔ انہوں نے مجسمے کے لئے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ابرار بھائی! ہم جانتے ہیں آپ نے اس سلسلے میں بہت تکلیف سہی ہے۔ ہم آپ کو مزید مصیبت میں ڈالنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ ہمیں ان حالات کے بارے میں بتائیں جن سے آپ گزرے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلوم ہو جن سے آپ کا واسطہ پڑا۔''

ابرار صدیقی کی باتوں سے یہی معلوم ہوا کہ ان میں سے کچھ بھکشو لگتے تھے اور کچھ کٹر قسم کے ہندو تھے۔ ان کے ساتھ کچھ مقامی لوگ بھی تھے۔ یہ مقامی بھی خطرناک غنڈے ہی تھے۔ یقیناً انہیں بھاری معاوضے دے کر اپنے ساتھ ملایا گیا تھا۔ بھکشو بھی صرف اپنے منڈے ہوئے سروں کی وجہ سے ہی پہچانے جاتے تھے ورنہ ان کا لباس اور حلیہ بھی عام انڈین اور پاکستانیوں جیسا ہی تھا۔ وہ بار بار جان سے مارنے کی دھمکی دیتے تھے اور خون کی ندیاں بہانے کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے پاس آتشیں اسلحے کے علاوہ دندانوں والے تیز دھار

چھرے تھے۔ آنکھوں سے ہر وقت چنگاریاں سی چھوٹتی تھیں۔ پاکستان اور انڈیا میں عام مقامی لوگ ان کے لئے کیڑے مکوڑوں کی طرح حقیر تھے۔ وہ کسی کو بھی چیونٹی کی طرح مسل دیتے تھے۔ ابرار کے مطابق پاکستانی اور انڈین علاقے میں کم و بیش پندرہ افراد انہوں نے معمولی وجوہات پر قتل کئے۔

ابرار صدیقی سے بات چیت کے بعد میں اور عمران دوسرے کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ ابرار کی باتوں میں رتناگری کا ذکر آیا تھا۔ اس سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کو بھی کہیں رتناگری کے آس پاس ہی لے جایا گیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ خبر نہیں تھی کہ رتناگری کا وہ کون سا معبد ہوگا جہاں ڈاکٹر مہناز پائی جائے گی۔ اب ایک نام ہمارے سامنے آ گیا تھا۔ اور وہ تھا دواری پگوڈا کا۔ اس بات کی امید کی جاسکتی تھی کہ ڈاکٹر مہناز بھی اسی پگوڈا میں لے جائی گئی ہوگی۔

عمران نے کہا۔ ”دیکھا، راستوں سے کیسے راستے نکلتے ہیں۔ ہم نے سویٹی کی مدد کرنے کی کوشش کی اور قدرت نے ہماری مدد کر دی۔ ہم رتناگری جا کر زیادہ خجل خوار ہونے سے بچ گئے۔ اب ہمارے پاس دواری پگوڈا کا نام ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ نام ہمیں بڑا فائدہ پہنچائے گا۔“

”تم ایک دم جینئس ہو بلکہ جینئس بھی تمہارے لئے چھوٹا لفظ ہے۔“ میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔

”تم مذاق کر رہے ہو لیکن یار! تمہیں تمہارے باروندا جیکی کی قسم...... سچ بتاؤ جب میں پینٹ کوٹ پہنتا ہوں اور اس طرح ایک دم گھوم کر دیکھتا ہوں تو سین کونری نہیں لگتا، جیمز بانڈ والا۔“

”اچھا بکواس بند کرو۔“

”یار! تم اسے بکواس کہہ رہے ہو، مجھے فکر پڑی ہوئی ہے۔ یہ ممبئی ہے۔ یہاں بڑی بڑی شکاری آنکھوں والے ڈائریکٹر اور فلمساز ہیں۔ کھٹاک سے بندے کو کاسٹ کر لیتے ہیں فلم میں۔ اگر کسی نے مجھے کاجل یا پریتی زنٹا وغیرہ کے ساتھ کاسٹ کر لیا تو وہ بے چاری شاہین تو بے موت ماری جائے گی۔“

”نہیں ماری جائے گی۔ وہاں وہ دو بے وقوف خواتین ریما اور نرگس بھی تو تمہارے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔“

”یار! ان کی اور بات ہے، یہ بالی وڈ ہے۔ یہاں کی ہیروئنیں بڑی تیز طرار ہوتی ہیں۔

اکثر اپنے ساتھی ہیرو کی عزت لوٹ لیتی ہیں۔ مجھے تو بڑی شرم آئے گی یار! میرا تو کوئی تجربہ ہی نہیں ہے ایسی بے عزتی کا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ کیا منہ دکھاؤں گا شاہین کو۔ میرے کردار کو داغ لگ گیا تو کون قبول کرے گا مجھے؟ ساری عمر ماں باپ کی دہلیز پر پڑا رہوں گا۔“

”دوراندیشی یہی ہے کہ ابھی خودکشی کر لو۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

”ویسے ایک حل اور بھی ہے۔ میں کوٹ پینٹ ہی نہیں پہنتا۔“

”بہت بڑا احسان ہوگا یہ فلمی دنیا پر اور برصغیر کی ہیروئنوں پر۔“

اسی دوران میں جیلانی اندر داخل ہوگیا۔ وہ عمران کے بلاوے پر ہی آیا تھا۔ عمران فوراً سنجیدہ ہوگیا۔ ”یا شیخ! مجھے ایک جگہ کے بارے میں ارجنٹ رپورٹ چاہئے۔ بس دس پندرہ گھنٹے کے اندر اندر۔“

”بتایئے جی۔“

”دواری پگوڈا یا دواری بودھ مندر۔“ عمران نے کہا۔

”یہ کس علاقے میں ہے؟“

”رتناگری اور اس کے آس پاس کہیں۔“

”ٹھیک ہے عمران بھائی۔“

”تفصیل مکمل ہونی چاہئے پیارے۔ جگہ کا جغرافیہ، تاریخ اور حساب وغیرہ۔ نصیر احمد کو اپنے ساتھ لے لو اور ابھی کام شروع کر دو۔“

رات بخیریت گزری۔ اگلے روز بارہ بجے کے قریب جیلانی نے تفصیلی رپورٹ ہمیں دے دی۔ اس وقت جگت سنگھ بھی ہمارے پاس ہی بیٹھا تھا۔ رتناگری سے آگے بالکل سنسان علاقے میں دواری نام کا ایک پرانا پگوڈا واقع تھا۔ یہ بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن بڑا مضبوط سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دیواریں پتھریلی تھیں اور ایک سائیڈ گھاٹ کی طرف تھی۔ یہ دراصل سمندر ہی کا پانی تھا جو جھیل کی صورت میں کافی آگے تک آیا ہوا تھا۔ دواری پگوڈا کی خاص بات یہ تھی کہ یہ بودھوں کے ایک تندمزاج فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ عام طور پر بودھ مت کو ماننے والوں کو امن پسند اور رقیق القلب سمجھا جاتا ہے لیکن یہ فرقہ خاصا مختلف تھا۔ ان لوگوں کا یقین تھا کہ حد سے بڑھی ہوئی نرمی اور منکسر المزاجی ان کو دھیرے دھیرے ختم کر دے گی اور دوسرے مذاہب ان پر غالب آجائیں گے۔ جیسے بنگال اور بہار میں پال سلطنت کے خاتمے سے بودھ برباد ہوگئے تھے۔ یہ لوگ تشدد اور خوں ریزی سے پرہیز نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں سے کئی تو ایسے تھے جو

اپنے مزاج کے اعتبار سے خونی قاتل کہلائے جاسکتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس فرقے کا بانی کوئی ہندو تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کی کچھ رسوم میں ہندوانہ جھلک بھی پائی جاتی تھی۔ اس فرقے کو خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی تھی اور یہ محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ لیکن جتنا محدود ہوا تھا، اتنا ہی کٹر اور جنونی ہوگیا تھا۔ دواری بودھ مندر ان لوگوں کا ہی ٹھکانا تھا۔ یہ پُراسرار جگہ تھی۔ عام لوگ اس طرف جاتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔

عمران نے کہا۔ ''اگر وہاں گھسنا ہوتو کیا کرنا ہوگا؟''

''یہ بڑا مشکل کام ہے۔'' جیلانی نے لمبی سانس لی۔ ''وہاں یہ لوگ بڑا سخت پہرا رکھتے ہیں اور یہ پہرا ایک جگہ نہیں، کم از کم تین جگہ ہے۔ اندرونی عمارت کے گرد پتھروں کی ایک اونچی فصیل ہے۔ یہاں صرف ایک پھاٹک ہے اور وہ بھی سخت نگرانی میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ......''

''یار! تم ہماری طرف ہو یا ان کی طرف؟'' عمران نے جیلانی کی بات کاٹی۔ ''کوئی ایسی بات بتاؤ جس سے ہمیں آگے بڑھنے کی راہ ملے۔''

''اب وہی بتانے جارہا ہوں۔'' جیلانی مسکرایا۔ ''آپ کی توقع سے زیادہ بھاگ دوڑ کی ہے ہم نے۔'' اس نے ذرا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہاں ایک بندہ ہے جسے ممبئی کا چور بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا نام موہن بجلی ہے۔ لڑکپن میں، یہ ہاکی کا زبردست کھلاڑی تھا پھر چور اور ڈکیت بن گیا۔ اب جیل میں لمبی قید بھگت رہا ہے۔''

''ہاں، اس بندے کا نام تو میں نے بھی سنا ہوا ہے۔'' جگت سنگھ بولا۔

''اس کے بارے میں ہمیں ایک خاص بات کا پتا چلا ہے۔'' جیلانی نے کہا۔ ''یہ شخص چھ سات سال پہلے اسی بودھ مندر میں ایک زبردست واردات کرچکا ہے۔ یہ پانی والی طرف سے بودھ مندر کی ایک سرنگ میں داخل ہوگیا تھا۔ یہ سرنگ پرانے وقتوں میں پانی کے نکاس کے لئے استعمال ہوتی تھی لیکن پھر پانی چڑھ جانے کی وجہ سے بند ہوگئی۔ موہن بجلی نے یہی راستہ استعمال کیا اور مندر کے بالکل اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے تقریباً بیس کلو سونا چرایا جو مورتیوں اور مقدس باکسز کی شکل میں تھا۔ بعد میں وہ پکڑا بھی گیا اور اس سے تھوڑی بہت چیزیں واپس بھی حاصل کرلی گئیں۔ پھر وہ بھاگ بھی گیا۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ موہن نامی بندہ بودھ مندر میں گھسنے کا خفیہ راستہ جانتا ہے۔''

''تو کیا یہ راستہ اب تک ویسے ہی کھلا پڑا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... واردات کے بعد وہاں لوہے کی جالیاں لگا دی گئی تھیں لیکن وہ جالیاں

برسوں سے پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یقیناً خستہ ہو چکی ہوں گی۔ ان دو تین جالیوں کو کاٹنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ مشکل صرف یہ بات ہے کہ سمندری پانی کے نیچے اس خفیہ راستے کی لوکیشن معلوم ہو اور یہ کام صرف اور صرف موہن کرسکتا ہے۔''

''اور وہ جیل میں ہے۔'' عمران نے کہا۔

''کوئی طاقتور بندہ ہوتو اسے پیرول پر یا کسی اور طریقے سے عارضی رہائی بھی دلا سکتا ہے......مثلاً جاوا۔'' جیلانی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

عمران نے چونک کر جیلانی کو دیکھا پھر تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ جاوا نے اس ''مشن'' کے دوران میں ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے ہمیں دو تین فون نمبرز بھی دے رکھے تھے جن کے ذریعے ہم جاوا اور اس کے قریبی ساتھیوں سے رابطہ کرسکتے تھے۔ خطرہ بس یہی تھا کہ کہیں فون کرنے سے ہماری لوکیشن کا پتا نہ چل جائے۔

اس مسئلے کا حل یہ نکلا کہ عمران اور جیلانی ہائی روف میں سوار ہوکر نکلے اور انہوں نے ڈھائی تین کلومیٹر دور جاکر جاوا سے رابطہ کیا۔ جاوا کے ساتھ عمران کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ عمران نے جاوا کو اپنی ڈیمانڈ بتائی۔ جاوا نے کسی خاص تردد کے بغیر ہامی بھرلی۔ ہاں، یہ کہا کہ اس کام میں تین چار روز لگ سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی زیادہ جلدی نہیں تھی۔ ہم اس دوران میں تیاری کرسکتے تھے اور مزید معلومات بھی جمع ہوسکتی تھیں۔

O......❖......O

جگت سنگھ بالکل آگ بگولا تھا۔ اس کے سینے میں انتقام کے انگارے دہک رہے تھے۔ وہ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جاوا بہت بڑا ڈان ہے مگر اس کے اندر وہی دیوانگی تھی جو شیشے کو پتھر سے ٹکراتی ہے اور چیونٹی کو ہاتھی سے لڑا دیتی ہے۔ اسے پتا تھا کہ اس کی محبوبہ آشا کور کو کس طرح مارا گیا اور اس کے لاڈلے بھائی کے جوان جسم سے زندگی کس طرح چھینی گئی۔ جگت سنگھ پنجاب کا نڈر منچلا تھا۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر اس کے بازوؤں میں بجلیاں کوند جاتی تھیں۔ اب یہ بجلیاں کسی کو بھسم کرنے کے لئے بے تاب تھیں۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ اندھا دھند شراب پیتا تھا اور اپنی کرپان کی دھار پر انگلی پھیرتا رہتا تھا۔ جاوا کے لوگوں نے چند روز پہلے اسے لنگڑی پورہ گاؤں کے نواح سے پکڑا تھا۔ اسے فرید کوٹ لائے، وہاں بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کے منہ پر گوبر باندھ کر اسے الٹا لٹکائے رکھا۔ پھر ممبئی لے آئے۔ جاوا کے دست راست پریم چوپڑا نے اسے تیواری لال کے حوالے کیا جس نے اسے گولڈن بلڈنگ کے بندی خانے میں پہنچا دیا۔ یہاں اس کی اکڑ توڑنے کی بھرپور کوشش

کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ تلملا کر یہ لوگ اسے مردانہ صفات سے محروم کرنے کا سوچ رہے تھے جب ہم وہاں پہنچے اور اسے رہائی دلائی۔

جاوا نے تین چار دن کا وقت مانگا تھا لیکن غیر متوقع طور پر دوسرے ہی روز رات گیارہ بجے کے قریب مطلوبہ شخص ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اسے لانے کے لئے میں، عمران اور جیلانی کا دوست نصیر احمد ساحل پر گئے اور ایک نائٹ کلب کے سامنے پریم چوپڑا نے اس بندے کو ہمارے حوالے کیا۔ اس کی عمر تیس بتیس سال رہی ہوگی۔ شکل سے ہی پرلے درجے کا خرانٹ اور موقع پرست لگتا تھا۔ اسے نہلا دھلا کر لایا گیا تھا پھر بھی اس کے جسم سے بو اٹھ رہی تھی۔

پریم چوپڑا نے اسے ہماری گاڑی میں دھکیلا اور بولا۔ ''اب یہ تم لوگوں کی ذمے داری ہے۔''

''بالکل بےفکر رہو۔'' عمران نے کہا۔

ہم ہائی روف گاڑی میں واپس روانہ ہوئے۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ جعلی تھی...... ہم اپنے عقب سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ بہرحال خیریت گزری، ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا۔ لیکن نئے آنے والے شخص کی طرف سے خیریت نہیں گزری۔ وہ واقعی بلا کا پھرتیلا اور عیار تھا۔ ایک سنسان سڑک پر موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی ذرا آہستہ ہوئی تو اس نے اچانک کام دکھایا۔ ہائی روف کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اس نے اسے تیزی سے سلائیڈ کیا اور اسے پورا کھول دیا۔ عمران کو ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو وہ کسی چھلاوے کی طرح باہر چھلانگ لگا چکا ہوتا۔ عمران کے ہاتھ میں اس کی ڈبی دار شرٹ کا کالر ہی آیا۔ عمران نے جھٹکے سے اسے پیچھے کی طرف کھینچا۔ اس نے عمران کے سینے پر ٹکر رسید کی اور مچھلی کی طرح تڑپ کر عمران کی گرفت سے نکلا۔ میں سب سے پچھلی نشست پر تھا۔ میں نے اسے باہر چھلانگ لگاتے دیکھا۔ عمران نے بھی اس کے پیچھے ہی جست لگائی۔ اس دفعہ عمران نے اس کی کمر پر ہاتھ ڈالا۔ دونوں اوپر نیچے سڑک کے کنارے کچی زمین پر گرے۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر بھاگنا چاہ رہا تھا۔ چند سیکنڈ تک دونوں میں زبردست کشمکش ہوئی۔ پھر عمران نے اپنا پستول نکال کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ عمران کے تیور دیکھ کر اس نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اس دوران میں، مَیں اور نصیر احمد بھی گاڑی سے باہر نکل آئے تھے۔ عمران اسے گھسیٹتا ہوا واپس گاڑی میں لے آیا۔ اکا دکا موٹر سائیکل سوار اس منظر کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے گزرے۔ غالباً یہی سمجھا گیا ہوگا کہ کوئی واردات ہو رہی ہے۔ کسی نے رکنے یا اپنی رفتار دھیمی کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دو منٹ بعد ہم پھر اپنے اس مہمان موہن بجلی کے ساتھ اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔ ابھی تک تو وہ واقعی ''بجلی'' ثابت ہوا تھا۔ اس کے چھریرے بدن میں قابلِ ذکر تیزی تھی

مگر اس کا واسطہ بھی کسی کم پھرتیلے شخص سے نہیں پڑا تھا۔ عمران نے اسے گریبان سے دبوچے دبوچے ایک زوردار جھانپڑ اس کے سر پر لگایا۔ ''ماں کے شکم میں کیسے ٹکا رہا تو؟''

اس نے خونی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بولا۔ ''یہ تو ناہیں، تیرا یہ کتا پستول بولت ہے۔ اگر ماتا کا دودھ پیا ہے تو اس کے بغیر بات کر۔''

عمران نے ایک اور جھانپڑ لگایا۔ ''اس کے بغیر بھی بات کر لیں گے لیکن پہلے کسی ٹھکانے پر تو پہنچنے دے۔''

اس نے اپنے منہ میں جمع ہونے والا خون غصیلے انداز میں گاڑی کے فرش پر تھوک دیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم نصیر احمد کے گھر پر تھے۔ موہن بدستور غصیلے موڈ میں تھا۔ عمران کا ایک گھونسا اس کے منہ پر پڑا تھا جس کی وجہ سے اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد عمران نے موہن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہاں اب بتاؤ، کیا ارادے ہیں؟''

وہ خاموش رہا۔ بس گھورنے پر اکتفا کیا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے اسے اپنی تیزی پھرتی پر مان ہے۔ ہاکی شاکی اور باکسنگ بھی کھیلتا رہا ہے نا۔ سنا ہے کئی بار پولیس کی حراست سے بھی بھاگا ہے۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' عمران نے کہا پھر قمیص کے نیچے سے اپنا پستول نکال کر دراز میں رکھ دیا۔ موہن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''لو بھیا! پستول نہیں ہے میرے پاس۔ اب اپنی کوئی حسرت نکالنی ہے تو نکال لو۔''

موہن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ''کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا۔

''چل اٹھ، تجھے مطلب بتاتا ہوں۔'' عمران نے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم گھر کے عقبی لان میں تھے۔ ایک گیٹ اس طرف بھی موجود تھا۔ یہ گراسی لان کوئی پچاس فٹ چوڑا اور ساٹھ ستر فٹ لمبا ہوگا۔ ایک ٹیوب لائٹ یہاں مدھم روشنی بکھیر رہی تھی۔ عمران نے گیٹ کا کھٹکا ہٹا دیا اور موہن سے بولا۔ ''لو بھیا! اب بھاگ سکتے ہو تو بھاگ لو۔''

موہن کمار، عمران کا اشارہ سمجھ گیا۔ عمران اسے بزور بازو بھاگ جانے کی دعوت دے رہا تھا۔ ہم یعنی میں، جگت سنگھ، جیلانی اور نصیر احمد وغیرہ تماشائی کی حیثیت سے یہاں موجود تھے۔

''اپنی زبان پر قائم رہو گے یا پھر پستول نکال لو گے؟'' موہن نے پوچھا۔

''نہیں...... پستول نہیں نکالوں گا...... بلکہ یہ وچن بھی دیتا ہوں، گیٹ سے آگے نکل

جاؤ گے تو تیرا پیچھا بھی نہیں کروں گا...... بلکہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں کرے گا۔"

موہن کی سیاہ آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کا سانولا چہرہ تمتما سا گیا۔ اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے ہمارے چہرے دیکھے جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ ہم کسی طرح کا مذاق تو نہیں کر رہے۔

وہ بہت تیز طرار تھا اور عیار بھی لیکن میں جانتا تھا کہ عمران اسے سنبھال لے گا۔ بالکل اچانک ہی ممبئی کے اس چور نے دوڑ لگا دی۔ اس کا رخ سیدھا گیٹ کی طرف تھا۔ عمران پہلے سے تیار تھا۔ وہ اس کے راستے میں آیا۔ ممبئی کے چور یعنی موہن نے بڑی تیزی سے اسے چکما دیا۔ وہ جھکائی دے کر بائیں طرف سے نکلا۔ عمران نے جست لگا کر اس کی کمر پکڑ لی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ انسان نہ ہو کوئی چکنی مچھلی ہو۔ جس طرح مگرمچھ تیزی سے پانی کے اندر پلٹنیاں کھاتا ہے، موہن نے بھی کھائیں اور نکل گیا۔ مگر اس کا ٹخنہ پھر بھی عمران کے ہاتھ میں رہا۔ ٹخنہ چھڑانے کے لئے موہن نے دوسری ٹانگ سے عمران کے چہرے پر ضرب لگانا چاہی۔ عمران کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس برق رفتار وار سے خود کو نہ بچا سکتا۔ عمران نے جھک کر خود کو بچایا اور موہن کی دوسری ٹانگ بھی تھام لی۔ تب عمران نے گھما کر اسے دور پھینکا اور پھر جست لگا کر اس پر چڑھ گیا۔ موہن نے عمران سمیت خود کو گیٹ کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت عمران کی گرفت سے نکل جائے گا۔ اس کے جسم میں بے پناہ لچک تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود کو چھڑانے اور بھاگ جانے کی خصوصی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر واسطہ عمران سے تھا۔ اس نے موہن کو فرشی لاک لگایا اور بے بس کر دیا۔ اس نے عمران کو گھونسا جڑا تو عمران نے جوابی طور پر تین گھونسے جڑے اور اس کی گردن پکڑ کر اس کا سر زمین سے لگا دیا۔ وہ اب بالکل شکنجے میں تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے ہار مان لی۔

عمران اس کے اوپر سے اٹھ گیا۔ "دیکھ لو، پستول کے بغیر ہی تمہیں 'لائن حاضر' کیا ہے۔"

وہ شکست خوردہ نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے گھاس کی ہریالی پکڑ چکے تھے۔ قمیص سامنے سے دو ٹکڑے ہو گئی تھی۔

عمران نے کہا۔ "چلو ایک اور چانس دیتا ہوں اور یہ بھی پستول کے بغیر۔ ایک دفعہ اور زور مار کر دیکھ لو۔"

وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا، فوراً لپک پڑا۔ اس مرتبہ اس نے اتنی تیزی سے عمران کے سینے پر ٹکر ماری کہ عمران لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپا اور گیٹ کی طرف بھاگا۔ عمران اس کے پیچھے گیا۔ یہ مختصر سی دوڑ عمران نے ہی جیتی۔ اس نے بھاگتے بھاگتے جست کی

اور گیٹ سے فقط آٹھ دس فٹ کی دوری پر موہن کو چھاپ لیا۔ پندرہ بیس سیکنڈ تک زبردست کشمکش ہوئی۔ آخر عمران نے اس کی پشت کی طرف آ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے ہوا میں اٹھا لیا۔ اب وہ ہاتھ پاؤں چلانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ عمران اسے اسی طرح اٹھائے اٹھائے برآمدے کی طرف لے آیا اور پھر پختہ فرش پر پٹخ دیا۔

"بند کر دو گیٹ۔" عمران نے پھنکار کر کہا۔

موہن اسی طرح فرش پر پڑا ہانپتا رہا۔ عمران کا پارا چڑھا ہوا تھا۔ اس نے موہن کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "اب بھاگو گے تو پستول سے روکوں گا اور سیدھی تیرے ناریل میں گولی ماروں گا۔"

O......❖......O

اگلے دس بارہ گھنٹے میں یہ موہن نامی شخص غیر متوقع طور پر نارمل نظر آنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے ذہنی طور پر اپنی ہار مان لی ہے اور اب مزید کوئی چکما نہیں دے گا۔ ناشتے کے بعد اس نے عمران سے طویل مشورہ بھی کیا۔ یہ مشورہ دواری مندر کے اندر جانے کے حوالے سے ہی تھا۔ بعد میں، مَیں اور جیلانی بھی اس مشورے میں شریک ہو گئے۔ موہن نے تصدیق کی کہ اس بودھ مندر کے اندر گھسنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے پانی کے راستے سے۔ اس نے کہا کہ اس کے لئے پانی میں اترنے والوں کو ایک طویل ڈبکی لگانا ہو گی۔ اس کے لئے غوطہ خوری والا سلنڈر اور ماسک ضروری ہے۔ اس کے علاوہ واٹر پروف تھیلے جن میں اسلحہ اور ایمونیشن وغیرہ محفوظ رہ سکے۔ مندر کا اندرونی نقشہ موہن کے ذہن میں کسی فوٹو اسٹیٹ کی طرح محفوظ تھا۔ ہم نے اس حوالے سے بھی تفصیلی بات کی اور پلان ترتیب دیا۔

آخر میں موہن کمار بولا۔ "یہ خطرناک کام ہے۔ اس میں ہم مارے بھی جا سکتے ہیں۔ تم لوگوں کا تو اپنا لوبھ (لالچ) ہے۔ میرا اس میں کیا فائدہ ہے؟"

"جن لوگوں نے تمہیں جیل سے نکالا ہے، انہوں نے کچھ نہ کچھ فائدہ تو بتایا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"صرف اتنا کہ اگر میں مدد کروں گا تو میری قید میں سے دو چار سال کم کر دیئے جاویں گے۔ لیکن مجھے اس سے کچھ زیادہ فائدہ ہونے والا ناہیں۔ میری قید تیس سال سے چند مہینے زیادہ ہی ہے۔"

عمران بولا۔ "تمہارے لئے مزید کوشش کریں گے۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ جیل میں تمہاری مشقت ختم کرا دیں یا تمہیں بی کلاس وغیرہ دے دی جائے اور اس سے زیادہ بھی

کچھ ہوسکتا ہے۔"

"مثلاً کیا؟"

"تم یہ کام ختم ہونے دو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں، تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے لیکن فی الحال مجھے کیا مل سکتا ہے؟ میں کم از کم چوبیس گھنٹے اچھی طرح آرام کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اگر تمہاری ڈیمانڈ ہے تو اس کا انتظام ہو جاتا ہے۔" جیلانی نے کہا۔

زیادہ تر جرائم پیشہ لوگوں کی طرح موہن کمار بھی شراب اور عورت کا رسیا تھا۔ جیلانی کے مقامی دوست نصیر احمد نے اس کے لئے یہ سہولتیں فراہم کر دیں۔ گھر کی بالائی منزل کا ایک کمرا اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ وہ ایک نوخیز پارسی طوائف اور شراب کباب کے ساتھ وہاں موجود رہا۔ تاہم ہم اس کی طرف سے ذرا سی بھی غفلت نہیں برت سکتے تھے۔ میں خود بھی بالائی منزل پر رہا اور مسلسل اس کی نگرانی کی۔

○......❖......○

اگلے روز دوپہر کے وقت ہم رتناگری جانے کے لئے تیار تھے۔ عمران، میں، جگت سنگھ اور موہن کمار عرف موہن بجلی۔ جیلانی اور اس کے دوست نصیر احمد نے ہمارے لئے پانی میں ایک مختصر غوطہ مارنے کا انتظام کر دیا تھا۔ اس مختصر غوطے کے لئے ہمیں کسی خاص ٹریننگ کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم اچھی طرح تیراکی جانتے تھے حتیٰ کہ جگت سنگھ بھی اپنے گاؤں کی نہر میں لمبی ڈبکیاں لگاتا رہا تھا۔ وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ اس کی پشت پر سلنڈر نہ باندھا جائے۔ وہ پانچ چھ منٹ آسانی سے پانی کے نیچے گزار سکتا ہے لیکن یہ خطرہ مول لینا درست نہیں تھا۔

روانگی سے دس پندرہ منٹ پہلے میں نے اپنا سیل فون آن کیا اور ثروت کو کال کی۔ حسبِ سابق پہلے میڈم صفورا ہی بولی۔ وہ بڑے مزے میں تھی۔ شاید امپورٹڈ سگریٹ پھونک رہی تھی اور اس کا ہلکا سا سرور اس کی آواز میں موجود تھا۔ اس نے اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ کوڈیاک ریچھوں کی آوازیں اکثر رات کو پریشان کرتی ہیں۔ "وہ جوکر کدھر ہے؟" اس نے پوچھا۔ اشارہ یقیناً عمران کی طرف ہی تھا۔

"ہم ممبئی سے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ سامان وغیرہ باندھ رہا ہے۔" میں نے بہانہ بنایا۔

"تم دونوں ایک نمبر کے جھوٹے ہو، ایک دم لائرز۔"

"ایک نمبر کا جھوٹا تو ایک ہی ہو سکتا ہے میڈم اور وہ عمران ہی ہوگا۔"

"یعنی تم دو نمبر بھی ہو اور جھوٹے بھی۔" میڈم نے فقرہ چست کیا۔ "چلو اس ایک نمبریے

کو بتانا کہ اب دس نمبریا نہ بنے۔ اس نے مجھ سے فون پر بات کرتے رہنے کا پرامس کیا تھا۔"

"او کے، میں کہہ دوں گا۔"

"لو بات کرو، ثروت سے۔" اس نے کہا۔

چند سیکنڈ بعد ثروت کی مدھم پریشان آواز ابھری۔ "ہیلو تابش! کیسے ہیں آپ؟ اتنی دیر بعد فون کیوں کیا؟"

"بس ایک مجبوری آڑے آئی ہوئی ہے۔ میں آ کر تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"تو کب آ رہے ہیں؟"

"ابھی تو جا رہے ہیں ثروت! بس دعا کرنا۔"

وہ گم صم سی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ "تابش! نصرت کا فون آیا تھا...... اسے آج کل ہلکا بخار ہو رہا ہے۔ اسی کے فون سے...... یوسف نے بھی بات کی۔" وہ ذرا اٹک کر بولی۔

میرے سینے پر گھونسا سا لگا۔ مجھے پہلے ہی لگتا تھا کہ وہ ضرور ثروت کو منانے کی کوشش کرے گا۔ "اب کیا کہہ رہے ہیں یوسف صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، وہ اس بات پر بڑے شرمندہ ہیں کہ انہوں نے نصرت کے ساتھ سخت لہجے میں بات کی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ...... انہوں نے معافی مانگی ہے نصرت سے۔ وہ...... مجھ سے بھی...... معافی مانگ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ اپنے حواس میں نہیں تھے۔ پتا نہیں غصے میں کیا کیا کہہ دیا۔ آپ پر...... گولی چلانے کا پچھتاوا بھی ہر وقت ان کے دماغ میں رہتا ہے۔"

"چلو کسی بات پر تو پچھتاوا ہوا اس کو۔" میں نے کہا۔

جواب میں ثروت بالکل خاموش رہی۔ میں نے کہا۔ "یہاں سے اچانک چلے جانے کے بارے میں وہ کیا کہتا ہے؟" میرے لہجے میں چبھن تھی۔

"وہ کہتے ہیں، میں اس لئے گیا تھا کہ پاکستان جا کر زیادہ اچھے طریقے سے تم دونوں کے لئے کچھ کر سکوں۔"

"تم دونوں...... کون؟"

"میں اور آپ...... وہ وہاں ایمبیسی کے ذریعے کوشش کر رہے ہیں۔ انٹرپول کا ایک بڑا جرمن افسر بھی ان کا قریبی دوست ہے...... برلن میں ان کا ہمسایہ تھا۔ وہ مسلسل یوسف سے رابطے میں ہے۔ آج کل انڈیا میں ہی موجود ہے۔ اچھا ہوا آپ نے فون کر لیا۔ ایک ضروری بات آپ سے پوچھنا تھی۔"

"پوچھو۔"

''یوسف...... کہہ رہے تھے کہ کسی طرح ہماری لوکیشن کا پتا چل جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے...... میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی میڈم کو کچھ اندازہ ہے لیکن وہ اصرار کر رہے تھے۔''

''نہیں ثروت! یہ غلطی نہ کرنا۔ میں نے شروع میں ہی تاکید کر دی تھی۔ اس میں فائدے کی امید ایک فیصد بھی نہیں۔ نقصان کا خطرہ ایک سو دس فیصد ہے...... جاوا کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ بڑا زہریلا ناگ ہے۔ اس نے جو کہا ہے، کر دکھائے گا۔''

''ٹھیک ہے تابش! آپ جیسا کہتے ہیں...... آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔''

میں نے قریباً پانچ منٹ مزید لگائے اور ثروت کو قائل کیا کہ وہ اس طرح کی سوچ بھی ذہن میں نہ لائے۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ جاوا نے فون کی سہولت دیتے وقت پہلی شرط ہی یہ رکھی تھی کہ صفورا اور ثروت کسی کو اپنی لوکیشن سے آگاہ نہیں کریں گی۔ اگر ایسا ہوا تو ان کی جان کی ضمانت یکسر ختم ہو جائے گی۔

ثروت سے بات ختم کر کے میں دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ یوسف وہی کچھ کر رہا تھا جس کے اندیشے میرے ذہن میں موجود تھے۔ یہاں انڈیا سے اپنے بزدلانہ فرار کا جواز پیش کرنے کے لئے اس نے ثروت کے سامنے بہانہ گھڑا تھا کہ وہ وہاں لاہور میں بیٹھ کر اپنی ڈوریاں ہلا رہا ہے اور ثروت کو بہ حفاظت پاکستان لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر رہا اور اگر کچھ تھوڑا بہت کر بھی رہا تھا تو اس کا نقصان ہی ہونا تھا، فائدہ نہیں۔

عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''اٹھ جا جگر! وہ کیا کہتے ہیں شیکسپیئر صاحب اپنے پنجابی شعر میں...... اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔''

ہم ممبئی سے نکلے اور ہائی روف گاڑی کے ذریعے بذریعہ سڑک رتنا گری کی طرف روانہ ہوئے۔ گاڑی کے پچھلے شیشوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ نصیر احمد کر رہا تھا۔ ہمارے پاس وہ اسلحہ موجود تھا جو گولڈن بلڈنگ سے حاصل ہوا تھا۔ ان میں رائفلوں کے علاوہ دستی بم بھی موجود تھے۔ جگت سنگھ انہیں کالے انار کہتا تھا اور ان کالے اناروں سے اسے خاصی رغبت تھی۔ جگت سنگھ پہلے بھی ایک نڈر شخص ہی تھا لیکن اب اپنی محبوبہ اور چھوٹے بھائی کے قتل کے بعد وہ شعلہ جوالا بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک آگ سی دہکی رہتی تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ہم جاوا کی شان اور دہشت کے سامنے جھکیں گے نہیں اور اس سے بدلہ چکانے کی اپنی سی پوری کوشش کریں گے اور میں نے صدقِ دل سے یہ وعدہ کیا تھا۔

راستے میں جے گڑھ کے قریب ایک جگہ ہمیں روکا گیا۔ یہ پولیس ناکا تھا۔ گاڑی کے

کاغذات پورے تھے۔ تلاشی میں کچھ برآمد نہیں ہوا کیونکہ اسلحہ سیٹوں کے نیچے محفوظ خانے میں تھا۔ کہیں، بریٹا پسٹل کی ایک گولی سیٹوں کے نیچے پڑی رہ گئی تھی۔ ناکے والوں نے سوال جواب شروع کر دیئے اور ہم سے شناختی کارڈز طلب کئے۔ نصیر اور جگت سنگھ کے پاس تو شناختی کارڈ تھے لیکن میرے، عمران اور موہن کے پاس نہیں۔ یہاں پر جاوا کے دیئے ہوئے فون نمبرز میں سے ایک نمبر کام آیا۔ میں نے فون کیا۔ کسی نامعلوم شخص نے ریسیو کیا اور فون بند کرنے کو کہا۔ دو تین منٹ بعد میرے فون پر بارعب آواز والا کوئی شخص بولا اور ناکے کے انچارج انسپکٹر سے بات کرانے کو کہا۔ انچارج نے بات کی اور اس کے طوطے اُڑ گئے۔ اس نے فوراً ہم سے معذرت کی اور بڑی عاجزی کے ساتھ جانے کی اجازت بھی دی۔

''راستے میں، مَیں نے عمران سے کہا۔'' جاوا کو اب کم از کم یہ پتا تو چل ہی گیا ہوگا کہ ہم رتنا گری یا اس کے قریب کہیں جا رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ انڈیا دل کے لحاظ سے چھوٹا لیکن رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔ اس رخ پر ہم سیکڑوں میل آگے تک سفر کر سکتے ہیں۔''

''پھر بھی تعاقب کی طرف سے مسلسل ہوشیار رہنا ہوگا۔''

''تو ہوشیار رہو نا تم۔ میں ذرا شاہین سے لڑائی کر لوں۔'' اس نے آنکھیں بند کیں اور سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

''یہ لڑائی کا کون سا طریقہ ہے؟''

''اس کو تصوراتی طریقہ کہتے ہیں اور اس طریقے سے لڑ کر میں ہمیشہ کامیاب ہوتا ہوں۔ ہر منگیتر اور شوہر وغیرہ کو اسی طرح لڑنا چاہئے۔''

O......❖......O

وہ رتنا گری اور اس کے آس پاس کہیں ایک ویران علاقہ تھا۔ سمندر یہاں سے کچھ فاصلے پر تھا لیکن سمندری پانی ایک چھوٹی کھاڑی کی شکل میں کافی آگے تک آ چکا تھا۔ چاروں طرف کھجور، پام اور دیگر خودرو درخت تھے۔ درختوں کے نیچے زرد جنگلی گھاس حدِ نگاہ تک نظر آتی تھی۔ اس گھاس کے درمیان ایک نیم پختہ راستہ کسی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا آگے تک جاتا تھا۔ اس راستے کے آخری سرے پر اونچے پیڑوں کے درمیان ایک پرانا بودھ مندر سر اٹھائے کھڑا تھا۔ مندر کو حصار میں لینے والی بلند پتھریلی دیوار بہت دور سے بھی صاف نظر آتی تھی۔ عمران نے اپنا بیگ کھولا اور طاقتور ٹیلی اسکوپ نکال لی۔ اس ٹیلی اسکوپ نے ہمیں مندر کے مناظر وضاحت سے دکھائے۔ بلند پتھریلی دیوار کے اوپر زرد کپڑوں والے بھکشو

چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ مندر کے اکلوتے دروازے کا کچھ حصہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہاں یقیناً کڑا پہرا تھا۔ یہ جگہ مندر سے زیادہ ایک چھوٹے قلعے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

اپنے پلان کے مطابق ہم نے قرب و جوار کا جائزہ لیا اور درختوں کے ایک جھنڈ میں اپنا فالتو سامان چھپا دیا۔ ہم کل چار افراد تھے۔ موہن کے سوا ہم تینوں کے پاس چھوٹی نال کی رائفلیں تھیں۔ موہن کے پاس شکاری چاقو تھا۔ بوقتِ ضرورت اسے پستول بھی مہیا کیا جا سکتا تھا۔ میرے پاس بھی ایک چاقو تھا جس کی پشت پر آری کی طرح دندانے تھے۔ عمران کے پاس سائلنسر لگا پستول بھی موجود تھا۔ راشن کے طور پر ہمارے تھیلوں میں بسکٹ، چنے اور پانی موجود تھا۔

اپنا اپنا ایمونیشن پلاسٹک کے تھیلوں میں ہمارے پاس تھا۔ اس کے علاوہ آٹھ دستی بم تھے۔ چار جگت سنگھ کے پاس اور دو دو میرے اور عمران کے پاس۔ موہن کے پاس ریگزین کا ایک لمبوترا بیگ تھا۔ اس میں پانی کے اندر کام دینے والی واٹر لائٹ، لوہا کاٹنے والا مشینی کٹر، چند چھوٹے اوزار اور تالا کھولنے کے لئے دو مڑے تڑے تار موجود تھے۔ ہمیں تاریکی پھیلنے کا انتظار تھا۔ جونہی تاریکی گہری ہوئی اور درختوں کی بلند شاخوں سے اوپر تاریک آسمان پر تارے اپنی چمک دکھانے لگے، ہم اپنی جگہ سے حرکت میں آ گئے۔ ہم نے مکمل ریہرسل پہلے ہی کر رکھی تھی۔ پشت پر سلنڈر باندھ کر ہم نے ماسک چہروں پر چڑھائے اور کھاڑے کے پانی کے ساتھ ساتھ بودھ مندر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا...... سانپ کی طرح بل کھاتے راستے پر چلنے کے بجائے ہم نے درختوں کے نیچے چلنا مناسب سمجھا۔ یہاں زمین کیچڑ زدہ تھی۔ ہم سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ میرے پاس ایک بڑی ٹارچ موجود تھی لیکن ٹارچ کا استعمال خطرے سے خالی نہیں تھا۔ عمران کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا اور ہم سب کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ قریباً دو کلو میٹر سے زائد فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم بودھ مندر کے کافی قریب پہنچ گئے۔ اب ہمیں پانی کی دوسری جانب بودھ مندر کی زرد روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی اندر سے ڈھول بجنے کی مدھم صدا بھی سنائی دے جاتی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں سے مندر کی بیرونی دیوار کا فاصلہ سو فٹ سے زائد نہیں تھا۔ درمیان میں کھاڑی کا تاریک پانی تھا جس میں نباتات کی موجودگی بھی نظر آتی تھی۔

موہن کمار نے سرگوشی کی۔ ”شروع میں پانی اتھلا ہے، ہم چل کر جا سکتے ہیں۔ آخری بیس تیس فٹ ایک دم گہرا پانی ہووے گا۔ ہم کو ایک دوجے کا ہاتھ پکڑ کر ڈبکی لگانا ہووے گی

اور ہم دیوار کی طرف بڑھیں گے۔“

ہم نے اثبات میں سر ہلائے۔ بہت آہستہ سے ہم پانی میں داخل ہوئے اور بغیر آواز پیدا کئے آگے بڑھنے لگے۔ پانی سرد اور بے حرکت تھا۔ کہیں کہیں کوئی زیرِ آب پودا بھی ٹانگوں سے ٹکراتا تھا۔ پہلے پانی پنڈلیوں تک تھا پھر گھٹنوں تک آیا اور دھیرے دھیرے اونچا ہونے لگا۔ ہم نے گیس ماسک چڑھا لئے۔ عمران نے اپنا پستول واٹر پروف تھیلی میں ڈال لیا۔ موہن نے لمبوترے تھیلے میں سے اسپیشل واٹر لائٹ نکال لی۔ اس کی روشنی کسی سرچ لائٹ کی طرح تھی۔ پتھریلی دیوار اب ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ اس کے اوپر گھومنے پھرنے والوں کی مدھم آواز بھی ہم تک پہنچتی تھی۔ یہ نازک صورتِ حال تھی۔ کوئی نیچے جھانک لیتا اور ہمیں دیکھ لیتا تو تہلکہ مچ جاتا۔ ہم اس وقت نہتے تھے۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہوتا کہ خود کو پانی میں چھپانے کی کوشش کرتے۔ بہرحال خیریت گزری۔ ہم اس مقام تک پہنچ گئے جہاں ہمیں ڈبکی لگانا تھی۔ اب پانی ہماری ٹھوڑیوں کو چھو رہا تھا۔ ڈبکی لگانا بالکل مشکل نہیں تھا۔ سلنڈرز کا وزن ہمیں بہ آسانی نیچے لے جا سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ ہم گہرے تاریک پانی میں اترتے چلے گئے۔ ہمارے جسموں پر عام لباس تھے اس لئے پانی کی ٹھنڈک پوری شدت سے محسوس ہوئی۔ شروع میں ہم نے سانس باہر نکال دیئے تھے، سلنڈرز کا وزن ہمیں بتدریج نیچے لیتا چلا گیا۔ موہن سب سے آگے تھا۔ عمران نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ عمران کا ہاتھ میں نے اور میرا ہاتھ جگت نے پکڑا ہوا تھا۔ واٹر لائٹ کی تیز روشنی راہنمائی کر رہی تھی۔ اچانک مجھے لگا کہ جگت کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ میں نے عمران کے ہاتھ کو جھٹکا۔ اس نے موہن کو روکا۔ ہم پلٹے، جگت سنگھ کی ایک ٹانگ بری طرح ایک بیل میں الجھی ہوئی تھی۔ میں نے شکاری چاقو کی مدد سے یہ بیل کاٹی اور جگت کی ٹانگ آزاد کی۔ اگلے تین چار منٹ خاصے دشوار تھے۔ موہن کمار پتھریلی دیوار کے ساتھ ساتھ سرک رہا تھا اور اس راستے کو تلاش کر رہا تھا جو چند برس قبل اسے اس بودھ مندر کے اندر لے گیا تھا۔ آخر وہ کامیاب ہوا۔ یہاں تقریباً تین فٹ قطر کا ایک سرنگ نما راستہ موجود تھا۔ راستے پر ایک زنگ آلود گول جالی تھی۔ یہ گرل نما جالی کئی جگہ سے زنگ آلود تھی۔ موہن نے پھرتی سے وہ کٹر نکالا جو طاقتور بیٹری سے کام کرتا تھا۔ کٹر آن ہوتے ہی جالی کٹنا شروع ہو گئی۔ ہمیں کٹر کا بہت زیادہ استعمال نہیں کرنا پڑا۔ کافی کام نمکین سمندری پانی اور زنگ کی وجہ سے ہو چکا تھا۔ صرف دو تین منٹ کے اندر موہن نے گول جالی راستے کے دہانے سے علیحدہ کر دی۔ ہم ترتیب وار اندر داخل ہوئے۔ راستے کی گول دیوار کھردری تھی۔ اسے پکڑ پکڑ کر آگے بڑھنے میں ہمیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ میں سب

سے پیچھے تھا۔ میرے آگے جگت سنگھ تھا۔ اب مندر کا فرش ہمارے اوپر تھا۔ ہم اس مندر میں آراکوئے کی کھوج میں جا رہے تھے اور ڈاکٹر مہناز کی تلاش میں جا رہے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں چیزیں یہاں موجود ہیں یا نہیں...... یا کون سی موجود ہے اور کون سی غیر موجود۔

ہم مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ مزید آگے جا کر ہمیں اندازہ ہوا کہ موہن کا ساتھ کتنا ضروری تھا۔ یہاں سرنگ نما گول راستے میں سے کئی دیگر راستے پھوٹ رہے تھے۔ کچھ تنگ تھے، کچھ اسی قطر کے تھے۔ موہن اپنی یادداشت کے زور پر آگے بڑھتا رہا۔ آخر ہم ایک اور جالی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ جالی ایک قفل کے ذریعے بند تھی۔ قفل کاٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور ہم پانی سے نکل کر ایک ایسی جگہ پر آ گئے جسے چھوٹا سا تہ خانہ کہا جا سکتا تھا۔ یہاں زبردست سیلن تھی۔ مختلف جگہوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور وہی بو تھی جو زیرِ زمین بند رہنے والی جگہوں پر ہوتی ہے۔

موہن کمار نے ماسک اتارتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''اب ہمیں یہ سلنڈر اتارنے ہوویں گے۔''

ہم نے سلنڈر اور ماسک اتار دیئے۔ عمران نے کہا۔ ''کہیں چھپا دینا چاہئے انہیں۔''

''ایک جگہ ہے یہاں۔'' موہن بولا۔

ایک تاریک کونے میں ایک پانچ چھ فٹ اونچا پتھر پڑا تھا۔ اس کے عقب میں خلا سا بن گیا تھا۔ ہم نے سیلنڈر، ماسک، واٹر لائٹ اور کٹر وغیرہ یہاں چھپا دیئے۔ ہمارے کپڑے گیلے تھے۔ ہم نے رائفلیں، واٹر پروف تھیلوں سے نکال لیں اور چھوٹے بیگ کمر کے پیچھے فکس کر لئے۔

موہن کمار نے کہا۔ ''اب ایک پستول مجھے دو۔ ہو سکت ہے کہ اس کی ضرورت پڑ جاوے۔''

''ابھی نہیں پہلے گراؤنڈ فلور پر پہنچ جائیں۔'' عمران نے کہا۔

سامنے ہی ایک پتھریلی سیڑھی کے آٹھ دس زینے تھے جن پر بڑے بڑے سائز کے تین چار مینڈک پھدک رہے تھے۔ زینوں کے آخری سرے پر ایک چوکور آہنی تختہ تھا۔ یہ زنگ آلود تختہ دراصل باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ اس میں ایک ہضمی قفل کا سوراخ تھا...... موہن کے لبوترے بیگ میں موجود مڑے تڑے تار یہاں کام آئے۔ ممبئی کے اس چور نے تار نکالے اور بیس تیس سیکنڈ کی کوشش میں ہی تالا کھول لیا۔

ہم نے فوراً پلان بنایا۔ پلان کے مطابق مجھے اور عمران کو باہر جانا تھا۔ جگت سنگھ کو یہیں

رہنا تھا اور موہن کی نگرانی بھی کرنا تھی۔ موہن کو یہ پلان پسند نہیں آیا لیکن وہ کوئی رکاوٹ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مندر کے اندر کا نقشہ ہم پہلے ہی اس سے اچھی طرح معلوم کر چکے تھے اور سمجھ بھی چکے تھے۔ جگت سنگھ کے ہاتھ میں رائفل تھی اور ہمیں اس کی ہوشیاری پر پورا بھروسا تھا......

سیڑھیاں چڑھ کر عمران نے آہنی ڈھکنے کو ذرا سا اٹھایا۔ یہ پتھریلی دیواروں والا ایک طویل کمرا تھا۔ یہاں لوبان سلگ رہا تھا اور کچھ فاصلے پر ایک بھکشو کے گیروا رنگ کے کپڑے نظر آ رہے تھے۔ اس کی قسمت بری تھی کہ اس نے مڑ کر ہماری طرف رخ کر لیا۔ اس کی نظر ڈھکنے پر پڑی جو ایک دو انچ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ وہ ذرا چونکا اور ہماری طرف آیا۔ ہم بالکل ساکت رہے اور ڈھکنے کو بھی ساکت رہنے دیا۔ وہ نوجوان شخص تھا، تجسس کے عالم میں ہمارے بالکل قریب چلا آیا۔ اس نے جھک کر ڈھکنے کو دیکھا، اس سے پہلے کہ اسے کسی خطرے کا احساس ہوتا اور وہ پکارتا یا شور مچاتا، میں نے تیزی سے ڈھکنا اٹھایا اور پلک جھپکتے میں اس کا بازو پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ وہ ایک ''اوہ'' کے سوا کوئی آواز نہیں نکال پایا اور سر کے بل زینوں پر لڑھکتا ہوا جگت سنگھ کے قدموں میں جا گرا۔ اس کو اندر کھینچتے ہی ہم نے ڈھکن بند کر دیا تھا۔ مضروب بھکشو کو مزید کوئی چوٹ لگانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

''اس کا بھی دھیان رکھو۔'' میں نے جگت سے کہا۔

''آپ فکر ہی نہ کرو بادشاہ زادے۔ یہاں سب کچھ ایک دم بھلا چنگا رہے گا۔''

ہم نے ایک بار پھر ڈھکنا اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل آئے۔ عمران کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا اور میرے ہاتھ میں شکاری چاقو۔ رائفلیں ہمارے کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ ہم کسی بھی صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ بودھ مندر کے اندر کی مخصوص خوشبوؤں نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر ہم مندر کے مرکزی حصے کی طرف جانا چاہ رہے تھے۔ جب بھکشوؤں کی ایک ٹولی دکھائی دی۔ ان میں دو تین عورتیں بھی تھیں۔ وہ بڑے بڑے تھالوں میں کچھ لئے آ رہے تھے۔ ان سے بچنے کے لئے ہم تیزی سے ایک دروازے میں داخل ہو گئے...... یہ بھی ایک لاؤنج نما جگہ تھی۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ مہاتما بدھ کے ایک پتھریلے مجسمے کے سامنے موم بتیاں اور دیے وغیرہ ٹمٹما رہے تھے۔ ہم چند سیکنڈ یہاں رکے۔ یہاں چھپنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی اور اس بات کا امکان موجود تھا کہ بھکشوؤں کی وہ ٹولی اسی جگہ آ جاتی۔ یہاں ایک اور دروازہ بھی نظر آ رہا تھا، ہم نے

اسے کھولا اور ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرا بھی خالی تھا۔ یہ کسی شخص کا بیڈ روم لگتا تھا۔ لکڑی کا چوڑا پلنگ، شیشم کی بہت بڑی الماری، شمع دان...... پتھر کی دو تین مورتیاں، مٹی کا مٹکا جس کے منہ پر باریک کپڑا باندھا گیا تھا اور ایسی بہت سی اشیاء یہاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک ایسی چیز بھی تھی جو عام طور پر بودھوں کے رہن سہن کا حصہ نہیں ہوتی۔ یہ ایک تلوار تھی جو پتھریلی دیوار پر ایک کھونٹی سے لٹک رہی تھی۔ تلوار کے ساتھ ہی خشک لکڑی کا ایک پانچ چھ فٹ چوڑا مجسمہ تھا۔

اس کمرے میں پہنچتے ہی ہمیں کچھ ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے بہت سے لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہوں۔ یہ آوازیں کسی قریبی کمرے سے آ رہی تھیں۔ ہم جس کمرے میں گھسے تھے، اس کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور آوازوں پر کان لگا دیئے۔ گرما گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی وقت بہت سے افراد ایک دم بولنے لگتے تھے۔ تب ایک دو افراد بارعب لہجے میں بول کر انہیں چپ کراتے تھے۔ گفتگو میں تھوڑی دیر دھیما پن رہتا تھا تب ایک بار پھر غصیلی آوازیں بلند ہونے لگتی تھیں۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے پھر یہ آوازیں تھم گئیں۔ اندازہ ہوا کہ بحث کرنے والے اب تتر بتر ہو رہے ہیں۔ قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ ہم دونوں نے خود کو الماری کے ساتھ رکھے گئے چوڑے چکلے چوبی مجسمے کے پیچھے چھپا لیا۔ یہ ایک بالکل تاریک گوشہ تھا۔ جب تک کوئی اس جانب آ کر مجسمے کے پیچھے نہ جھانکتا، ہم محفوظ ہی تھے۔

چند سیکنڈ بعد تیس بتیس سال کا ایک تنومند بھکشو ایک جواں سال لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور صفاچٹ چہرے پر پسینا تھا۔ سر کے بال بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔

بھکشو نے غصیلے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بے وقوف اپالی سب کو لے ڈوبے گا۔ سب کچھ ملیا میٹ ہو جاوے گا۔ اس میں اتنی بدھی ناہیں کہ حالات کو سمجھ سکے اور نہ ہی اتنی شکتی ہے کہ دھرم کو بچا سکے۔ یہ بس ہر مشکل کے سامنے لمبا لیٹ جانا جانت ہے اور دوسروں سے بھی کہوت ہے کہ لمبے لیٹ جاویں۔ آنکھیں بند کر لیں...... بس کیچوے بن جاویں۔ جس کا من چاہے پاؤں کے نیچے مسل دے۔ جس کے جی میں آئے کاٹ کر ٹکڑے کر دے لیکن ہم یہ ناہیں ہونے دیویں گے۔ اگر ان کو دوسروں نے مارنا اور کاٹنا ہے تو پھر ہم اپنے ہاتھوں سے کاٹ دیویں گے......“

جواں سال لڑکی نے بھکشو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ دھیرج رکھیں

سوامی! خوامخواہ اپنا خون نہ جلائیں۔ یہ لوگن بولنے اور بحث کرنے کے سوا اور کچھ ناہیں کر سکتے۔ آخر میں تو وہی ہونا ہے جو ہم چاہیں گے۔ آپ اپنی پوری تیاری رکھیں۔“

بھکشو نے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دوجوں کی تو کوئی پروا ناہیں۔ لیکن یہ اپالی بڑا انچرہ بندہ ہے۔ یہ عین موقع پر بھی کوئی چال چل سکت ہے۔ اس نے چبوترے پر کوئی حرکت کی تو سب کچھ برباد ہو جاوے گا۔“

”ناہیں سوامی! میں ناہیں سمجھتی کہ اپالی یا اس کے ساتھی کوئی ایسی جرأت کر سکت ہیں۔“

بھکشو بھنا کر بولا۔ ”تمہیں ناہیں پتا۔ جرأت آتے آتے آ بھی جاوت ہے۔ یہ تو ہم کو بھی معلوم ہے کہ ان کی گنتی زیادہ ہے۔ گنتی کا زیادہ ہونا بھی جرأت پیدا کر دیوت ہے۔“

”اچھا آپ اس بارے میں سوچنا بند کر دیں۔ پرسوں تک سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ آپ بیٹھ جاویں، میں آپ کے سر پر استرا چلا دوں۔“

سوامی بھکشو ایک گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے گھڑے پر سے کپڑا ہٹا کر پانی کا ایک کٹورا بھرا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تکیے پر ٹیک لگا لی۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ بستر کے نیچے ایک سفید بلی بھی خاموش بیٹھی ہے۔ اس کے سامنے دودھ کی پلیٹ تھی۔ اس دوران میں جواں سال عورت پیتل کے ایک کٹورے میں پانی اور صابن وغیرہ لے کر اس کے قریب بیٹھ چکی تھی۔ سوامی یا گرو بھکشو نے آنکھیں بند کر لیں۔ لڑکی نما عورت نے بے تکلفی سے اس کے چہرے پر صابن ملا اور استرے کی مدد سے اس کی شیو کرنے لگی۔

پتا نہیں دونوں کے درمیان کیا رشتہ تھا۔ یہاں بہت کچھ بھکشوؤں کے عام رہن سہن سے مختلف نظر آ رہا تھا۔ ان میں یہ قبول صورت جوان عورت بھی شامل تھی۔ وہ جس طرح گرو بھکشو کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ چلا رہی تھی، واضح ہو رہا تھا کہ دونوں میں کوئی قریبی تعلق موجود ہے۔ کچھ دیر بعد اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ چہرے کے بعد عورت نے گرو بھکشو کا سر مونڈنا شروع کیا۔ اسی دوران میں بھکشو کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے عورت کو آغوش میں کھینچ لیا۔ اس کے چہرے اور سر پر لگا ہوا کچھ صابن عورت کے چہرے پر بھی لگ گیا۔ بھکشو نے اسے چھوڑا تو وہ مسکرانے لگی۔ اس نے کپڑے سے اپنا منہ صاف کیا اور بولی۔ ”آپ کو ایسا ناہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”کیوں دھرم کے لحاظ سے تم میری پتنی ناہیں ہو؟“

”وہ تو ہوں لیکن...... آپ کے سر پر جیرا آ گیا“ وہ پھر مسکرائی۔

گروبھکشو کا آدھا منڈا ہوا سر ایک طرف سے خون آلود ہو رہا تھا۔ عورت نے اپنی چادر سے اس کا خون صاف کیا پھر لکڑی کی الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے الماری کھولی، ہم اس سے صرف چھ سات فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ ہم نے اپنی سانس تک روک لی۔ عورت نے الماری سے سبز پتھر جیسی ایک چیز نکالی۔ یہ پتھر ایک طرف سے گھسا ہوا اور ملائم تھا۔ اس نے پتھر کو دو تین بار بھکشو کے سر کے کٹ پر رگڑا...... اور پھر واپس الماری میں رکھ دیا۔ بھکشو نے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ خون بالکل بند ہو چکا تھا۔ ''یہ واقعی کمال کی چیز ہے۔'' بھکشو نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''جی ہاں، بالکل چمتکار جیسی۔'' عورت نے کہا اور ایک بار پھر بھکشو کا سر مونڈنے لگی۔

کچھ دیر بعد اس نے سر مونڈ کر استرا ایک طرف رکھ دیا۔

ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے آنکھوں آنکھوں میں حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ عمران نے میرے کان کے اندر مدھم سرگوشی کی۔ ''تم عورت کی طرف جانا، ہو سکتا ہے وہ شور مچا دے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ عمران کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا۔ ''خبردار! آواز نہ نکالنا۔'' عمران پھنکارا۔

بھکشو نے پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ عورت کے چہرے پر بھی ایک دم دہشت نے یلغار کی۔ اس نے چلانے کے لئے منہ کھولا۔ میں عین اس کے عقب میں موجود تھا۔ میں نے اس کا منہ ہاتھ سے ڈھانپ کر اس کو جکڑ لیا۔ اس نے زور مارا لیکن صرف اپنی ٹانگیں ہی چلا سکی۔ بھکشو سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ اسے جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ''آؤٹ سائڈر'' اس طرح اس کے بیڈروم میں آ پہنچے گا۔

عمران نے پستول بھکشو کے تازہ منڈے ہوئے چمک دار سر سے لگا دیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اس میں سے گولی چلے گی اور آواز بھی نہیں آئے گی۔ بس خاموشی سے ایک سوراخ ہو جائے گا تمہارے کھوپڑے میں۔''

بھکشو جو شاید قریب ہی لٹکی ہوئی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا، ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ عمران کے پاس منہ پر چپکانے والی کیمیکل ٹیپ موجود تھی۔ اس نے ٹیپ کا قریباً چھ انچ لمبا پیس بھکشو کے موٹے ہونٹوں پر چپکا کر اس کی بولتی بند کر دی۔

میں نے اپنا ہاتھ بدستور عورت کے منہ پر جمایا ہوا تھا۔ اس کی کمر بھی مکمل طور پر میری گرفت میں تھی۔ اس کی نازک گردن ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔ اچانک مجھے وہ حادثہ یاد آ گیا

جو چودھری انور گنجے کی حویلی میں پیش آیا تھا۔ راجا نے نیتو عرف کرشمہ کپور کو صرف خاموش رکھنے کے لئے اس کا منہ دبایا تھا اور وہ دم گھٹ کر سورگ باشی ہو گئی تھی۔

میں نے ایک فٹ لمبا شکاری چاقو عورت کی گردن پر رکھا اور سرگوشی کی۔ ''اگر آواز نکالی تو یہیں لٹا کر بکری کی طرح کاٹ ڈالوں گا۔'' وہ اب تھر تھر کانپ رہی تھی۔ چہرے سے خون نچڑ کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گی۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹایا۔ عمران پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے پھرتی سے ٹیپ عورت کے ہونٹوں پر چپکا دیا۔

گروبھکشو کے تاثرات اب بھی اچھے نہیں تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت کچھ کر سکتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس کے تکیے کے نیچے ہی کوئی پستول وغیرہ ہوتا۔ میں نے عورت کو گھٹنوں کے بل بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ فوراً بیٹھ گئی۔ عمران نے لکڑی کی دیوہیکل الماری میں سے سوت کی ایک مضبوط ڈوری ڈھونڈ لی۔ اس نے اس ڈوری سے پہلے بھکشو کے ہاتھ پشت پر باندھے پھر عورت کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ اب وہ دونوں مکمل طور پر ہمارے بس میں تھے۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ شمع دان میں موجود چار عدد شمعیں کمرے میں ایک پُراسرار سی روشنی بکھیر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اب بھکشو اور بھکشن کو ڈسٹرب کرنے اس کمرے کی طرف کوئی نہیں آئے گا۔ اگر کوئی آتا بھی تو ہم دروازہ کھولنے کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

ہم دونوں نے بھکشو سے بازپُرس شروع کی۔ عام بھکشوؤں کے برعکس یہ شخص کرخت اور ہٹ کا بڑا پکا تھا۔ اس کا نام وستھا تھا اور یہ اس دواری مندر کے بیس بڑے بھکشوؤں میں سے ایک تھا۔ شروع میں تو اس نے ہمیں کچھ بتا کر نہیں دیا۔ عمران نے دو تین بار اس کے منہ پر ٹیپ لگایا اور اتارا۔ آخر عمران کا پارا چڑھ گیا۔ وہ بولا۔ ''دیکھو وستھا! میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے آراکوئے کا پتا چاہئے اور اس لڑکی کا جو آراکوئے کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ بھی آراکوئے کے ساتھ یہاں موجود ہے۔''

''میں بڑی سے بڑی سوگند کھا سکت ہوں۔ مجھے اس بارے میں کچھ معلوم ناہیں۔''

''یہ بھی معلوم نہیں کہ آراکوئے یہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جھوٹ ناہیں بولوں گا۔ مجھے اتنی سی جانکاری ضرور ہے کہ آراکوئے کو ڈھونڈنے میں کوئی تھوڑی سی سپلتا (کامیابی) ملی ہے لیکن کیسے اور کیا، یہ میں ناہیں جانت اور نہ اوشا کو کچھ معلوم ہے۔'' اوشا، وستھا کی ساتھی عورت کا نام تھا اور وہ اسے پتنی بتا رہا تھا۔

''تو پھر کون جانتا ہے؟''

"مہا پجاری صاحب ہی جانت ہوں گے۔" وہ ڈھیٹ لہجے میں بولا۔

"اور مہا پجاری کون ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"مم...... میں تمہیں سچ بتار ہا ہوں اور میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہاں کسی کو پتا ناہیں کہ مہا پجاری کون ہیں۔ وہ دراصل ہم بیس بڑے بھکشوؤں میں سے ہی کوئی ایک ہیں لیکن وہ سامنے ناہیں آتے۔ بس ہم کو پرچوں پر ان کے حکم لکھے ہوئے ملتے ہیں، ان کی مہر کے ساتھ۔"

"پرچے کون دیتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی بھی ناہیں۔ ہر روز صبح کی پوجا کے بعد ہم سب بیس بڑے بھکشو گیان والے کمرے میں جاوت ہیں اور مقدس چوکی کی لکڑی پر ایک ایک سفید لفافہ دیکھتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک لفافے پر سارے دن کے لئے ہدایتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی مہا پجاری کا لفافہ ہووت ہے۔"

"یہ کون ہوسکتا ہے، تمہیں کچھ اندازہ تو ہوگا؟"

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "میں تو ناہیں ہوں۔ کون ہے؟ یہ مہاتما جانتے ہوں گے یا پھر وہ جو اس سنسار کو چلاوت ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اچھا، یہاں تھوڑی دیر پہلے جو جھگڑا ہو رہا تھا وہ کس بات پر تھا؟"

گرو بھکشو پہلے تو اس موضوع پر بات کرنے سے کترایا، میرے اصرار پر بولا۔ "یہ ہمارا آپس کا ہی تنازعہ تھا۔ بس سمجھو کہ پوجا پاٹ کا طریقہ ہے۔ کچھ ایک طرح سے کرنا چاہت ہیں، کچھ دوسری طرح سے۔ اس سے کوئی فرق ناہیں پڑتا۔ راستہ کوئی بھی ہو منزل تو نروان ہی ہے اور شریر کی شانتی ہی ہے۔"

"تم کسی چبوترے کی بات کر رہے تھے اور کسی ایسے کام کی جو پرسوں یہاں اس پگوڈے میں ہونا ہے۔"

بڑے بھکشو نے ایک بار پھر آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی لیکن جب عمران کا لب و لہجہ سخت ہوا تو اس نے بتایا کہ پرسوں چاند کی چودھویں رات ہے۔ خاص پرارتھنا ہوگی جس میں باہر کے کچھ لوگ بھی حصہ لیں گے۔ اب پتا نہیں کہ وہ درست کہہ رہا تھا یا غلط۔ اس کی بات کی تصدیق فی الحال ممکن نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں میرے ساتھ ساتھ عمران کو بھی یہ شک ہو رہا تھا کہ یہ خرانٹ بھکشو بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اسے آرا کوئے اور ڈاکٹر مہناز کے بارے میں بھی معلوم ہو۔ لیکن وہ سارا وزن مہا پجاری پر ڈال رہا تھا...... اور مہا پجاری کے بارے میں اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ ان کے درمیان رہتا ہے لیکن اس کے بارے

میں کوئی جانتا نہیں۔

اس کی ہٹ دھرمی دیکھتے ہوئے عمران نے تازہ ٹیپ اس کے ہونٹوں پر چپکا دی اور وہی استرا تھام لیا جس سے تھوڑی دیر پہلے جواں سال اوشا اس کی شیو بنا رہی تھی۔ عمران نے استرا بھکشو وستھا کے بائیں کان پر رکھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ شاید کسی کو نہیں تھی۔ عمران نے ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے بھکشو وستھا کا کان اس کی کنپٹی سے علیحدہ کر دیا۔ وستھا کربناک آواز میں چلّایا لیکن ہونٹوں پر ٹیپ تھی۔ آواز اس کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ یقیناً اوشا بھی چلّانے میں پیچھے نہیں رہی ہوگی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی کیمیکل ٹیپ تھی۔ وہ بری طرح مچلی۔ وستھا بھی پھڑک رہا تھا۔ کان والی جگہ خون سے بھر گئی تھی۔ اس کے ہاتھ بندھے نہ ہوتے تو وہ پتا نہیں کیا کر گزرتا۔ عمران نے بڑی بے رحمی سے کٹا ہوا خون آلود کان پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ کونے میں بیٹھی ہوئی سفید بلی حرکت میں آئی۔ چند سیکنڈ تک خون آلود کان کو سونگھتی رہی پھر اسے منہ میں دبا کر پلنگ کے نیچے تاریکی میں گم ہوگئی۔ یہ بڑا لرزہ خیز منظر تھا۔ وستھا کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ کرب کے عالم میں بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ عمران نے بلا تردد تیز دھار استرا اس کے دوسرے کان پر رکھ دیا۔ "ہاں، کچھ بتاؤ گے یا تمہارے تھوبڑے کی دونوں سائڈیں ایک جیسی کر دوں۔"

گرو بھکشو نے منہ سے غوں غاں کی زوردار آوازیں نکالیں۔ یوں لگا کہ وہ کچھ بتانا چاہتا ہے۔ عمران نے استرا پیچھے ہٹا لیا۔ الماری سے وہی سبز رنگ کا ملائم پتھر نکالا۔ یہ واقعی خاص قسم کی چیز تھی۔ پتھر کے بجائے اسے سخت قسم کی مٹی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ میں نے ایک صاف کپڑے سے وستھا کے زخم کا خون صاف کیا۔ عمران نے یہ سبزی مائل ڈلی کچھ دیر تک زخم پر رگڑی۔ ایک چپکیلی تہہ سی بن گئی۔ حیرت انگیز طور پر اس کاری زخم سے خون کا اخراج فوراً ہی رک گیا۔

عمران نے وستھا کے منہ سے ٹیپ اتار دی۔ عمران کا سوال وہی تھا۔ "آرا کوئے کہاں ہے اور ڈاکٹر مہناز سے کیسے ملا جا سکتا ہے؟"

اندازہ ہوا کہ شدید جسمانی نقصان اٹھانے کے باوجود اس "گرو" کی ڈھٹائی ختم نہیں ہوئی۔ وہ ایک بار پھر وہی رام کہانی دہرانے لگا۔ ہمیں یوں لگا جیسے وہ زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید اسے یہ امید تھی کہ کوئی اس کی مدد کو آ جائے گا یا پھر کوئی اور کرشمہ رُونما ہو جائے گا۔ اس کی بے پناہ ڈھٹائی پر عمران کو ایک بار پھر تاؤ آ گیا۔ اس نے گرو کو ایک آخری وارننگ دی اور ایک بار پھر اس کے منہ پر ٹیپ چڑھا دی۔ وہ عجیب انداز سے اپنے سر کو ہلانے لگا اور بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے ہمیں قدرت کے عذاب سے ڈرا رہا ہو۔

وہ ہندو نہیں تھا کیونکہ اس نے گیروا کپڑے پہن رکھے تھے اور پگوڈا میں بیٹھا تھا......
اور وہ پورا بودھی بھکشو بھی نہیں تھا کیونکہ اس نے کمرے میں تلوار لٹکا رکھی تھی اور ایک کٹار جیسی عورت اس کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھی۔ آفت کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے دھرم یاد آ گیا تھا۔ عمران نے پھر استرا تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں سفاک چمک بتا رہی تھی کہ دواری مندر کا یہ گرو بھکشو اپنے دوسرے کان سے بھی محروم ہونے والا ہے۔ عمران کے اشارے پر میں ایک دو لمحے تو تذبذب میں رہا پھر میں نے وستھا کا سر اور گردن کا بالائی حصہ اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ وستھا اب اپنے سر کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ لیکن اس حال میں بھی اس کے چہرے پر طیش دلانے والی ضد تھی۔ عمران کے استرے نے پھر حرکت کی اور کان وستھا کی کنپٹی سے علیحدہ ہو گیا۔ خون تیزی سے اُمڈا اور وستھا کی گردن کو بھگونے لگا۔ وستھا مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ عمران نے انگلیوں میں دبے ہوئے زرد کان کو دیکھا۔ یہ کچھ ہی دیر پہلے گرو بھکشو کے جسم کا حصہ تھا۔ بے پروائی سے عمران نے پھر یہ کان پلنگ کی طرف پھینک دیا۔ اس مرتبہ سفید بلی نے بھی کوئی جھجک نہیں دکھائی اور خون آلود کان منہ میں دبا کر پلنگ کے نیچے لپک گئی۔ اوشا جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

سبزی مائل ڈلی ایک بار پھر وستھا کے کاری زخم پر رگڑی گئی۔ یہ جادوئی خاصیت رکھتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وستھا کے زخم سے بہنے والا خون بس معمولی رساؤ میں بدل گیا......

اپنے دونوں کانوں سے محروم ہونے کے بعد وستھا کی حالت دیدنی تھی۔ کبھی اس کی آنکھوں سے طیش کی چنگاریاں چھوٹنے لگتیں، کبھی دہشت اور اذیت سے اس کا صفا چٹ چہرہ زرد رنگ اوڑھ لیتا۔ گرو وستھا کے چہرے پر سب سے نمایاں تاثر ڈھٹائی کا ہی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بندہ ہٹ کا چمپئن ہے اور بنا ہی "ڈھیٹ پنے" کے لئے ہے۔ اس کے چہرے کا یہی تاثر مجھے اور عمران کو مشتعل بھی کر رہا تھا۔

عمران نے اس کے ہونٹوں کے ایک حصے سے ٹیپ ہٹائی تو وہ کچھ بتانے کے بجائے گالی گلوچ کرنے لگا۔ عمران نے فوراً ٹیپ چڑھا کر اس کی بولتی بند کی اور اسے فرش پر گرا کر اپنا گھٹنا اس کی چربی دار گردن پر رکھا اور استرا ناک پر رکھ دیا۔ "تمہاری بلی کو آج کافی گوشت ملنے والا ہے۔" وہ پھنکارا۔

اوشا نے زور زور سے سر ہلایا۔ ایسے لگا کہ وہ کچھ بتانا چاہ رہی ہے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی سوال جواب کئے تھے لیکن اپنے گرو کی طرح وہ بھی بس گول مول جواب ہی دیتی رہی تھی۔ لیکن اب لگتا تھا کہ صورتِ حال کی سنگینی دیکھ کر اس نے اپنے رویے پر نظرِ ثانی کی ہے۔

عمران کے اشارے پر میں نے اس کے ہونٹوں سے ٹیپ اتار دی۔ اس کے دودھیا رخساروں پر ٹیپ نے گہرا نشان چھوڑا تھا۔ اس کے نازک ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔ میں نے اپنا شکاری چاقو اس کی ملائم گردن پر رکھ دیا تھا تاکہ وہ اچانک شور مچانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "آپ وچن دیں کہ مجھے اور گرو کو کچھ ناہیں کہیں گے......مم میں......آپ کے سوال کا جواب دوں گی۔"

زخمی گرو ایک بار پھر مچلنے لگا۔ وہ منہ سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اوشا کو لب کشائی سے روکنا چاہتا ہے۔ اوشا اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ یقیناً وہ جنونی گرو وستھا کی نسبت عقل مندی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ "ہاں بتاؤ، آرا کوئے کہاں ہے؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "میں ساکھیہ منی کی سوگند کھاوت ہوں، ہمیں اس بارے میں کچھ جانکاری ناہیں ہے۔ اس کی جانکاری اگر ہووے گی تو صرف مہا پجاری کو ہووے گی۔"

"اور مہا پجاری کون ہے؟"

"میں سوگند کھاوت ہوں، وہ بیس گروؤں میں سے ہی کوئی ایک ہے۔"

"اور تمہیں اس کا پتا نہیں؟" عمران کا لہجہ پھر سفاک ہو گیا۔

"میں جھوٹ ناہیں بول رہی۔" وہ پوری جان سے لرز گئی۔

"اچھا بتاؤ وہ ڈاکٹر کہاں ہے جو آرا کوئے کے ساتھ یہاں لائی گئی ہے؟" میں نے اوشا سے پوچھا۔

"ہاں......میں اس کے بارے میں آپ کو بتا سکت ہوں۔ وہ یہیں اس مندر میں ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔"

"کیا تم اس سے ملا سکتی ہو؟"

وہ ذرا جھجکی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میں آپ کو دکھا سکت ہوں لیکن اس سے ملنا خطرے سے خالی نہیں ہووے گا۔ آپ کسی کی نظر میں آ گئے تو بہت خون خرابا ہو جاوے یہاں۔"

"چلو، تم اس سے ملواؤ پھر ہم دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ہم نے ہاتھوں کے علاوہ گرو وستھا کے پاؤں بھی اچھی طرح باندھ دیئے۔ اسے صاف بتا دیا کہ اس نے کوئی بھی حرکت کی تو مزید کوئی موقع دیئے بغیر اسے فوراً گولی مار دیں گے۔ کن کٹے گرو کی حالت پتلی تھی۔ وہ کسی مزاحمت کے قابلِ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس آنکھیں بند

کر کے ناک کے راستے کراہتا رہا۔

عمران اور میں اوشا کے ساتھ چل دیئے۔ تیز دھار چاقو میری جیکٹ کی جیب میں تھا اور میں نے اوشا کو سمجھا دیا تھا کہ اگر اس نے کوئی چالاکی دکھائی تو یہ چاقو اس کے پہلو میں گھس جائے گا۔ وہ ہمیں لے کر کمرے سے باہر آئی۔ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر ہم ایک اور کمرے میں آ گئے۔ راہداری کی طرح یہ کمرا بھی خالی تھا۔ فرش پر آہنی چادر کا ایک ڈھکنا سا تھا۔ اوشا کی گہری گلابی چادر کے پلو سے دو تین چابیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک چابی کی مدد سے ڈھکنے کا وزنی قفل کھولا اور ڈھکنا جو زیادہ وزنی نہیں تھا، اوپر اٹھا دیا۔ نیچے لکڑی کے خوب صورت زینے تھے۔ ہم زینے اتر کر ایک تہ خانے میں پہنچے۔ یہاں اگربتیوں کی ہلکی مہک تھی اور قالین بچھا ہوا تھا۔ تاہم روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اوشا ہمیں ایک روشن کھڑکی کے سامنے لے گئی۔ کھڑکی کے اندر پردہ سرکا ہوا تھا۔ ہم اندر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ ایک نہایت آرام دہ کمرا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کو دیکھا۔ وہ ایک گلابی گاؤن پہنے ایک پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ خوش نظر آتی تھی۔ بودھ مندر کی تین داسیاں بھی یہاں موجود تھیں۔ انہوں نے گہری گیروا ساڑھیاں پہن رکھی تھیں۔ ایک داسی ڈاکٹر مہناز کے بالوں میں کنگھی کرنے میں مصروف تھی۔ دوسری اس کے پاؤں پر کسی ہربل آئل کی مالش کر رہی تھی۔ قریب ہی ایک تپائی پر تر و تازہ موسمی پھل رکھے تھے۔ ظاہر ہوتا تھا کہ مہناز یہاں بہت عیش آرام سے ہے۔ ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی میں وہ معمول سے زیادہ دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

ڈاکٹر مہناز کو کہاں کہاں تلاش نہیں کیا گیا تھا۔ اب بھی جلالی صاحب اور دیگر لوگ مہناز کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور وہ یہاں لاہور اور شیخوپورہ سے سیکڑوں میل دور بحرِ ہند کے کنارے اس بودھ مندر کے کمرے میں موجود تھی۔

مہناز کو دیکھنے کے بعد ہم زینے طے کر کے اوپر آئے اور پھر اسی کمرے میں پہنچ گئے جہاں گرو بھکشو نیم بسمل پڑا تھا۔ کانوں کے بغیر اس کی شکل عجیب ہولناک ہو چکی تھی۔ میرا ذہن الجھا ہوا تھا اور یقیناً عمران بھی میری ہی طرح سوچ رہا تھا۔ ہم نے مہناز کو یہاں خوش و خرم دیکھا تھا۔ اس کی صحت بھی پہلے سے بہتر نظر آ رہی تھی۔ اگر وہ ان لوگوں کی حبس بے جا میں تھی تو ایسا کیوں تھا؟ کہیں وہی افواہیں تو درست نہیں تھیں کہ ڈاکٹر مہناز خود چاہتی تھی کہ وہ آراکوئے سمیت کہیں غائب ہو جائے...... اور اس نے جلالی صاحب کو بھی دھوکے میں رکھا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن پھر فوراً یہ بات ذہن میں آئی کہ اگر ایسا ہی تھا تو پھر پروفیسر اولیس کو نوٹنگھم میں ڈاکٹر مہناز کی فون کال کیوں موصول ہوئی؟ وہ فون کال غالباً ڈاکٹر مہناز نے اسی

بودھ مندر کے اندر سے کی تھی۔ اس نے انہیں اور جلالی صاحب کو مدد کے لئے بلایا تھا۔

اگلے آٹھ دس منٹ میں اوشا کے ساتھ کافی محنت کرنا پڑی۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ جو کچھ بتا رہی ہے، اس سے کہیں زیادہ چھپا رہی ہے۔ جب گرو وستھا کی طرح تیز دھار استرا اوشا کے اپنے کان پر آیا تو اس کا پتا پانی ہو گیا۔ وہ سر تا پا لرزنے لگی۔ وہ گھگیائی۔

"میرے لوگن مجھے زندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ میری ہتھیا بڑی دردناک ہووے گی۔"

عمران نے کہا۔ "خود ان لوگوں کے ساتھ بہت کچھ دردناک ہونے والا ہے۔ تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہمارے سوالوں کے جواب دو یا اگلے دس پندرہ منٹ کے اندر کن کٹی اور نک کٹی کہلانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"مم...... میں نے سب کچھ تو بتا دیا۔ اب کیا رہ گیا ہے؟" وہ ہکلائی۔

"سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر مہناز کو یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟" عمران نے دریافت کیا۔

وہ سسک کر بولی۔ "اس کو...... مار دیا جاوے گا...... اس کی بلی دے دی جاوے گی۔"

"کب؟"

"پرسوں......"

"اچھا تو تم لوگ پرسوں کی جس پوجا پاٹ کی بات کر رہے ہو وہ یہی خون خرابا ہے؟"

اوشا نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "کیسے دی جائے گی بلی؟" عمران نے پوچھا۔

"اس کے ہاتھوں اور پاؤں کی ساری انگلیاں کاٹ دی جاویں گی۔ اس کا خون آراکوئے پر چھڑکا جاوے گا۔ ہمارا دھرم کہوت ہے کہ آراکوئے کو چرانے والے کا خون اگر اس پر چھڑک دیا جاوے تو وہ ہمیشہ کے لئے سلکھشت (محفوظ) ہو جاوے گا۔"

"لیکن پانچ سال پہلے بھانڈیل اسٹیٹ والے واقعے میں تو ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ مورتی چرانے والوں کو صرف بندی بنایا گیا تھا اور انہیں پگوڈے میں مشقت کی سزا دی گئی تھی؟" میں نے کہا۔

"گرو کہوت ہیں اسی لئے تو مورتی (آراکوئے) دوبارہ چوری ہوئی۔ اگر تب من کڑا کر کے یہ سزا دے دی جاتی تو یہ آفت نہ پڑتی۔"

"کیا یہاں سب لوگ اس سزا پر...... میرا مطلب ہے اس بلی پر اتفاق کر رہے ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

وہ چند لمحے چپ رہ کر بولی۔ "ناہیں...... یہاں یہی تو جھگڑا پڑا ہوا ہے۔ دوسرے سنگھ

(گروہ) کے کھیا گرواپالی ہیں۔ یہ لوگن ناہیں چاہتے کہ آراکوئے کی حفاظت کے لئے کسی کی ہتھیا کر دی جاوے۔ ان لوگوں کا وچار ہے کہ لڑکی کی ہتھیا ضروری ناہیں۔ اس کے لہو کی بس دو تین بوندیں ہی آراکوئے پر ڈال دی جاویں اور خاص پوجا کر لی جاوے تو مطلب پورا ہو سکت ہے۔"

"پھر ان لوگوں کی بات مانی جائے گی یا تمہاری؟" عمران نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو وہ لوگن اپنی بات ناہیں منوا سکیں گے۔ وہ گنتی میں تو زیادہ ضرور ہیں لیکن بیس گروؤں کے پاس شکتی زیادہ ہے۔ بیس گرو اور ان کے دھرمی ساتھی اپنے زور سے سب کچھ کر سکت ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ پرسوں جو پوجا ہوگی، اس میں ڈاکٹر کی انگلیاں کاٹ کر اس کا خون آراکوئے پر بہایا جائے گا اور ڈاکٹر کو مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا؟"

"ایسا ہی ہووے گا۔" اوشا نے کہا اور سر جھکا لیا۔

میں نے کہا۔ "لیکن ابھی ہم نے دیکھا تھا کہ ڈاکٹر کو بڑے آرام اور سکون سے رکھا گیا ہے اور وہ خوش بھی بہت ہے۔"

"وہ انجان ہے۔ اس کو جانکاری ناہیں۔ اس کو یہی بتایا گیا ہے کہ پرسوں اس کو مکتی مل جاوے گی۔ اسے رہا کر دیا جاوے گا۔ وہ آج اپنی رہائی کے خیال سے خوش ہے ورنہ تو اس کا حال اچھا ناہیں تھا۔"

"پوجا پرسوں کس وقت ہوگی؟" میں نے دریافت کیا۔

"پرسوں سے مطلب یہ ہے کہ آدھی رات کے فوراً بعد۔ ہم یہ کہہ سکت ہیں کہ کل رات۔"

"کیا گرو وستھا کا پوجا میں شریک ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں جی، یہ ضروری ہے۔ رسم کے مطابق بلیدان دینے والے کی بیس انگلیاں کاٹی جاوت ہیں۔ بیسوں گرو ایک ایک انگلی کو پوتر اگنی کے اوپر رکھتے ہیں جلنے کے لئے۔"

"اگر کسی وجہ سے کوئی گرو رسم میں شامل نہ ہو سکے تو پھر؟"

"مم...... مجھے اس کے بارے میں جانکاری ناہیں۔ میں کسی سے پوچھ کر بتا سکت ہوں۔"

ہم نے اندازہ لگایا کہ وہ پھر چالاکی دکھا رہی ہے۔ عمران نے شکاری چاقو پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اوشا پر کچھ اور دباؤ ڈالا گیا تو وہ پھر سے رونے لگی اور سچ بولنے لگی۔

اس نے بتایا۔ "اگر کوئی گرو کسی رسم کے سمے بیمار ہو جاوے یا اسے کوئی بہت ضروری کام ہووے تو اس کی جگہ اس کی ماتا یا دھرم پتنی رسم میں حصہ لے سکت ہے۔"

"یعنی کل رات، تم اس کن کٹے گرو کی خالی جگہ پُر کر سکتی ہو؟" عمران نے کہا۔

"لیکن یہ تو تب ہو سکت ہے جب یہ بہت بیمار ہوں یا کہیں گئے ہوں۔"

"تم سمجھو کہ یہ کہیں گیا ہوا ہے۔ چار پانچ دن سے پہلے نہیں آ سکتا۔" عمران نے سکون سے کہا۔

اگلے ایک گھنٹے میں عمران نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اوشا کو اپنے ڈھب پر کر لیا۔ اب وہ پوری طرح تعاون پر آمادہ تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ گرو کی جان وہ ایک ہی صورت میں بچا سکتی ہے۔ ہماری بات مانے اور ہماری مدد کرے۔

گرو بڑا ڈھیٹ تھا لیکن اوشا کسی نہ کسی طرح اسے بھی سمجھانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے گرو سے ایک خط لکھوایا۔ اس خط میں گرو نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اسے سنگھ (جماعت) کے ہی ایک خاص کام سے مندر سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ اگر وہ فوری طور پر نہ جاتا تو اپالی اور اس کے ساتھیوں کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو جاتی۔ وہ فی الحال تفصیل نہیں بتا سکتا۔ اسے پوری آشا ہے کہ وہ چار پانچ دن تک لوٹ آئے گا۔ اس دوران میں بلیدان کی رسم ادا کر لی جائے۔ اس کی جگہ اس کی دھرم پتنی اوشا رسم میں حصہ لے گی۔ خط کے نیچے گرو وستھا نے اپنی چھوٹی سی گول مہر بھی لگائی۔

ہم گرو کو مارنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے لیکن عمران نے چونکہ اوشا سے گرو کی جان بخشی کا وعدہ کیا تھا، اس لئے گرو کے واسطے سوچنا پڑ رہا تھا۔ رات کو تو خیریت تھی، کسی نے اس طرف آنا نہیں تھا لیکن صبح کی عبادت میں گرو کی غیر حاضری محسوس کی جا سکتی تھی۔ ہم نے زخمی گرو کے ہاتھ پاؤں بڑی اچھی طرح باندھے۔ اس کے دونوں زخموں کی مرہم پٹی کا سامان کمرے کے اندر سے ہی مل گیا۔ مرہم پٹی کے بعد اس کو شوربا پلایا گیا اور خاص طرح کی مقامی کھیر کھلائی گئی۔ افیم کی گولیاں جن میں کوئی کشتہ وغیرہ بھی ملایا گیا تھا الماری میں موجود تھیں۔ ہم نے یہ گولیاں اتنی مقدار میں گرو کو کھلا دیں کہ وہ سات آٹھ پہر کے لئے مکمل سکون میں رہے اور سو جائے۔ اس کے بعد اس کے منہ پر اچھی طرح ٹیپ لگائی گئی اور الماری کے ایک بڑے خانے میں اس طرح ٹھونس دیا گیا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکتا تھا۔ عمران نے اسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا کہ کل آدھی رات تک کوئی بھی گڑبڑ ہوئی تو اس کا خمیازہ سب سے پہلے اسی کو بھگتنا پڑے گا۔ اس کی جان چلی جائے گی۔

بری طرح زخمی ہونے کے بعد گرو کا ابال اب کافی کم ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم جو کہہ رہے ہیں، وہ کر بھی سکتے ہیں۔ اسے یہیں پر لٹا کر ذبح بھی کیا جا سکتا ہے۔ آنکھوں میں چنگاریاں رکھنے کے باوجود اب وہ ہماری بات مان رہا تھا۔ گرو کو جہازی سائز کے خانے میں پیک کرنے کے بعد الماری کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ بلی بڑی محبت سے عمران کے اردگرد گھوم رہی تھی۔

ہم دونوں نے مشورہ کیا۔ عمران واپس، جگت اور موہن کے پاس چلا گیا۔ میں اس کشادہ کمرے میں جواں سال اوشا کے ساتھ موجود رہا۔ بے پناہ خوف نے اسے ہمارے ساتھ مکمل تعاون پر آمادہ کر دیا تھا۔

میں نے اوشا سے کہا۔ ''تم کہہ رہی ہو کہ صبح کی عبادت کے فوراً بعد کوئی نہ کوئی شخص یہاں آئے گا اور پوچھے گا کہ گرو عبادت میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟''

''ہاں، ایسا تو ہوگا ہی۔''

''تم کیا جواب دو گی؟''

''میں وہی کروں گی جو تم کہو گے اور تم نے وچن دیا ہے کہ تم میری اور گرو کی جان نہیں لو گے۔'' وہ اپنی سیاہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہیں دوبارہ وچن دے رہا ہوں۔ تمہیں ہماری طرف سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ ''میں پوجا کے بڑے کمرے میں جاؤں گی اور گرو جی کا یہ پتر (خط) چھوٹے پجاری کو دوں گی۔ وہ باقی گروؤں تک پہنچا دیں گے۔ میں انہیں بتاؤں گی کہ گرو وستھا مجھے بھی بتا کر ناہیں گئے۔ میں سوئی ہوئی تھی، وہ اٹھ کر چلے گئے اور جاتے جاتے پتر میرے سرہانے رکھ گئے۔ مجھے وشواس ہے کہ کسی کو شک ناہیں ہووے گا۔ اس طرح رات کے سمے اپنے گھر والوں کے پاس سے اچانک اٹھ کر کسی دھرمی کام سے چلے جانا ہمارے ہاں برا ناہیں سمجھا جاوت۔ اور یہ سمجھا جاوت ہے کہ اس طرح جانے سے ساکھیہ منی (مہاتما بدھ) کی آشیرباد، جانے والے کا ہاتھ تھام لیوت ہے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ کوئی اس کمرے میں آ کر چھان بین کرے۔''

''ناہیں، ایسا تو تب ہوسکت ہے جب کسی کو شک ہو۔ اور مجھے ناہیں لگتا کہ ایسا ہووے گا۔ ہاں، وہ لوگن حیران ضرور ہوں گے کہ ایسا کیا ضروری کام آن پڑا تھا۔''

وہ بڑی دھیمی آواز میں بات کرتی تھی۔ چہرے کی طرح اس کی آواز میں بھی کشش تھی۔

ہمارے حساب سے وہ اپنے گرو شوہر سے زیادہ عقل مند اور معاملہ فہم تھی۔ اسی کی وجہ سے گرو ابھی تک زندہ تھا۔ رات بخیریت گزر گئی۔ اوشا نے مجھے کھانا کھلایا اور آرام کرنے کے لئے پلنگ پیش کیا۔ لیکن میں نے رات کا باقی حصہ چٹائی پر گزارنا مناسب سمجھا۔ اوشا کو میں نے پلنگ پر لٹا دیا۔ آج اس ریشمی رات کا آغاز اوشا اور اس کے گرو پتی نے بڑے محبت بھرے انداز میں کیا تھا۔ محبت کی یہ گرما گرمی ابھی کافی آگے بڑھنا تھی لیکن بیچ میں ہم کود پڑے تھے اور اب اوشا پلنگ پر اور پتی دیوالماری میں تھے۔

میں لیٹا رہا اور حالات کی ستم ظریفی پر غور کرتا رہا۔ گولڈن بلڈنگ کے واقعات بار بار نگاہوں میں آ رہے تھے۔ سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے کا انجام کم از کم میرے لئے تو بہت تسلی بخش ہوا تھا۔ درحقیقت چند ماہ پہلے بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلنے کے فوراً بعد ہی میں نے سیٹھ کو ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ سیٹھ کے ایک دو پرانے گرگوں سے ہماری مڈبھیڑ بھی ہوئی تھی۔ تاہم سیٹھ کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک ماڈل گرل کے ہمراہ کراچی میں دیکھا گیا ہے۔ جاننے والوں نے بتایا تھا کہ وہ پاکستان سے باہر ہے اور کبھی کبھار ہی یہاں آتا ہے۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیٹھ سراج انڈیا میں ہے اور انڈیا کے دل ممبئی میں اس سے ایک طوفانی ملاقات ہوگی۔ اس ملاقات کے اختتام پر ایک لہورنگ کلہاڑی ہوگی ایک اونچی منڈیر ہوگی، اور ان دونوں چیزوں کے درمیان سیٹھ سراج ہوگا...... اسے دو ہلاکتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

اوشا پلنگ پر لیٹی رہی اور میں چٹائی پر۔ گرو الماری میں مدہوش پڑا رہا...... اپنے جسمانی درد اور اپنے حالات کے کرب سے بے خبر۔ ثروت کا خیال بار بار میرے ذہن میں آنے لگا۔ کیا وہ پھر مجھ سے دور جا رہی تھی؟ کیا میرے اور اس کے درمیان سے یوسف کی دیوار کو ہٹانا ناممکن تھا؟ بظاہر تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ یوسف سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن اس کے اثر سے آزاد بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ فرسودہ روایتوں کی بلند دیوار کو توڑ نہیں پائے گی۔ یہ بڑا تکلیف دہ احساس تھا...... بودھ مندروں میں صبح بڑی جلدی ہو جاتی ہے۔ اجالا پھیلنے سے بہت پہلے ڈھول بجنے لگتا ہے۔ صبح سب کچھ ہماری پلاننگ کے مطابق ہوا۔ اوشا کمرے سے نکل کر مندر کے مرکزی حصے کی طرف گئی۔ گرو کی مہر شدہ تحریر بھی اس کے پاس تھی۔ اس دوران میں، میں رائفل بدست چوڑے چکلے چوبی مجسمے کے عقب میں موجود رہا۔ ایسی امید تو نہیں تھی لیکن اگر اوشا کوئی حرکت کرتی تو میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کم از کم گرو وستھا کو تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری چلائی ہوئی گولیاں بند الماری کے اندر ہی اسے چھلنی کر سکتی تھیں۔

اوشا تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئی۔ اس نے کمرا اندر سے بند کیا اور مجھے بتایا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ لوگ حیران ضرور ہیں مگر کسی کو شک نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ''ہاں ایک اور مسئلہ ضرور ہے۔ ادھر برآمدے والے کمروں کی طرف سے ایک چوب دار غائب ہے...... اس کو ڈھونڈا جا رہا ہے لیکن ابھی تک پتا نا ہیں چلا۔ اس کے پاس تلوار تھی، وہ بھی برآمدے میں ہی پڑی ہے۔ شک کیا جا رہا ہے کہ کوئی باہر کا بندہ مندر میں گھسا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ اسی چوب دار کی بات ہے جسے ہم نے لوہے کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر اندر کھینچ لیا تھا۔ اوشا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''وہ چوب دار ہمارے پاس ہی ہے...... تم یہ بتاؤ کہ پوجا کا پروگرام تو آگے پیچھے نہیں ہوا؟''

''نا ہیں...... ابھی تک تو نا ہیں ہوا۔ باہر سے جو مہمان آنا تھے، وہ بھی آنا شروع ہو گئے ہیں۔ پچیس تیس پجاری تو ضرور آویں گے۔''

سیل فون کے سگنل رات کو نہیں آ رہے تھے لیکن اب آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے عمران کو کال کی۔ رابطہ ہو گیا۔ وہ دبی آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے بتایا۔ ''یہاں سب خیریت ہے۔ ہم تمہارے فون کا انتظار ہی کر رہے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں بھی خیریت ہے۔ پروگرام کے مطابق اوشا نے گرو کا رقعہ متعلقہ بندوں تک پہنچا دیا ہے۔ پوجا بھی آدھی رات کے فوراً بعد پروگرام کے مطابق ہی ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے ہم بھی تیار ہیں۔ رات کو پوجا شروع ہونے سے پہلے ہم بھی یہاں سے نکلیں گے۔ پروگرام کے مطابق ہم میں سے کسی ایک کو گرو والی الماری کے سامنے ہی رہنا ہو گا۔ یہی ایک طریقہ ہے اوشا پر دباؤ برقرار رکھنے کا۔''

''اور تم چاہتے ہو کہ میں یہاں رہوں؟''

''صورتِ حال کے مطابق تو یہ تمہاری ذمے داری ہی بن رہی ہے۔''

''بالکل نہیں، میں بارہویں کھلاڑی کی طرح باہر نہیں بیٹھوں گا۔ ہم یہ کام جگت سنگھ کو سونپ دیتے ہیں۔''

ہم دونوں میں تھوڑی سی بات ہوئی پھر یہ طے ہو گیا کہ پوجا کے وقت جب ہم کارروائی شروع کریں گے تو میری جگہ جگت سنگھ گرو کی نگرانی کرے گا۔

''موہن کو پستول دے دیا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''ہاں...... بلکہ رائفل ہی دے دی ہے۔ کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' عمران

نے کہا۔

میرا اندازہ تھا کہ عمران نے اسے شیشے میں اتار لیا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس سے مکمل رہائی کا وعدہ بھی کیا ہو یا پھر مندر میں موجود سونے چاندی کی جھلک دکھائی ہو۔ وہ بندے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس سے کام لینے کا ہنر جانتا تھا۔

اب ہمیں رات کا انتظار تھا۔ ہمیں یہ تو پتا چل گیا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کہاں ہے لیکن یہ پتا نہیں چلا تھا کہ آراکوئے کہاں ہے۔ اس شخص کا بھی کچھ علم نہیں ہو سکا تھا جس نے آراکوئے کو اپنی تحویل میں رکھا ہوا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق ان بیس عدد گروؤں میں سے ہی کوئی مہا پجاری تھا اور آراکوئے اس کے پاس تھا۔ شاید ہم خود آراکوئے کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے تو یہ ایک دشوار کام ثابت ہوتا لیکن یہاں صورتِ حال کچھ ایسی بنی تھی کہ آراکوئے کا مجسمہ از خود سامنے آ رہا تھا۔ رسم کے موقع پر اس کو پجاریوں کے سامنے آنا ہی تھا اور یہ سنہری موقع تھا اس پر ہاتھ ڈالنے کا۔ اندیشہ صرف ایک ہی تھا کہ کہیں مخالف گروپ کی وجہ سے آج آدھی رات کو ہونے والی رسم ملتوی نہ ہو جائے۔

یہاں ہم نے جو اندازہ لگایا تھا اور جو کچھ اوشا سے معلوم ہوا، اس سے پتا چلتا تھا کہ بیس گروؤں والا گروہ بھکشوؤں کا سب سے خطرناک گروہ ہے۔ یہ ایک ایسا خونی فرقہ ہے جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے آخری حد تک جاتا ہے۔ اغوا، قتل، خوں ریزی، ایذا رسانی یہ سب کچھ ان کے نزدیک جائز ہے۔ ابرار صدیقی کی حالتِ زار گواہ تھی۔ اس فرقے کے لوگ عام بودھ بھکشوؤں کو ناکارہ اور کمزور قرار دیتے تھے اور ہر جگہ ان پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس فرقے پر ہندوازم کے نمایاں اثرات بھی موجود تھے۔ بے شک یہ بھی سر منڈواتے تھے اور گیروا کپڑے پہنتے تھے لیکن ان میں سے اکثر اپنے سر کے پیچھے بالوں کی ایک چھوٹی سی لکیر چھوڑ دیتے تھے۔ ان کے کپڑوں کا رنگ بھی عام بھکشوؤں کے رنگ سے کچھ گہرا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر تارک الدنیا بھی نہیں تھے۔ یہ لوگ آج کل اس بات پر بہت برہم تھے کہ آراکوئے بار بار چوراُچکوں کے ہتھے کیوں چڑھ رہا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر آراکوئے کے لئے ''حفاظت کی رسم'' ادا کر دی جائے تو یہ طویل عرصے کے لئے محفوظ و مامون ہو جائے گا...... ہاں، اب ہمیں رات کا انتظار تھا۔

وہ ایک سرد رات تھی۔ اوشا کی زبانی مجھے پتا چلا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ اوشا ایک پتنی کی حیثیت سے یقیناً گرو سے محبت کرتی تھی۔ اس کی جان بچانے کے لئے وہ مکمل تعاون کر رہی تھی۔ اس نے نہ صرف مجھے کھانا کھلایا تھا بلکہ عمران اور جگت وغیرہ کو بھی کھانا پہنچانے کی پیشکش کی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اس میں خطرہ ہے۔ ویسے بھی وہ تینوں، چنے اور بسکٹ کھا کر گزارہ کر چکے تھے۔

ہم نے الماری کھول کر گرو کو چیک کر لیا تھا۔ وہ مدہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کی سانس کی آمدورفت بالکل درست تھی۔ پچھلے سترہ اٹھارہ گھنٹوں میں اوشا کے کمرے میں صرف دو بار ملازمہ آئی تھی۔ دونوں بار وہ دروازے کی دہلیز سے ہی واپس چلی گئی تھی۔ میں اس دوران میں بڑے مجسمے کی اوٹ میں رہا تھا۔

اب رات اپنے نصف کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اوشا، اپنے پتی کی جگہ پوجا پر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی ایک سوتی ساڑھی پہن لی تھی۔ اس سادہ سی ساڑھی پر سامنے سینے کی طرف سنسکرت کے کچھ باریک الفاظ لکھے تھے۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ہمارے تین مامن ہیں۔ یہ ہمارے دھرم کا سب سے اٹوٹ انگ ہیں۔ پہلا مامن ہے...... میں بدھ میں پناہ لیوت ہوں، دوسرا مامن، میں قانون میں پناہ لیوت ہوں...... تیسرا میں سنگھ میں پناہ لیوت ہوں۔''

وہ تفصیل بتانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ تیار بھی ہو رہی تھی۔ بدھ مت میں سونے چاندی کے زیورات کا استعمال ممنوع ہے لیکن میں نے دیکھا کہ اوشا نے کانوں میں خاص طرز کی چھوٹی چھوٹی بالیاں پہنیں اور گلے میں موٹے منکوں کی ایک مالا ڈال لی۔ وہ خوب صورت

تھی۔ اپنے پتی گرو وستھا کے لئے اس کی محبت بھی واضح ہو چکی تھی۔ گرو کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ اس کے لئے بہت دکھی تھی۔ تاہم وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ سب کچھ گرو کی ہٹ دھرمی کے کارن ہوا ہے۔ اب وہ گرو کی جان بچانے کے لئے ہر کوشش کر رہی تھی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ اوشا پوجا پاٹ پر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر روہانسی آواز میں بولی۔ ''اپنا وچن یاد رکھئے گا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ جانے سے پہلے اس نے دیوہیکل الماری کھول کر اس میں پھر گرو وستھا کو دیکھا۔ وہ خانے میں یوں پڑا تھا جیسے بچہ ماں کی گود میں ہوتا ہے۔ وہ صحت مند اور سرخ و سپید رنگ کا مالک تھا۔ اس پر افیم کی گولیوں کا اثر پوری طرح موجود تھا۔ اس کے چہرے کو ہاتھ سے چھو کر اوشا جلدی سے باہر نکل گئی۔

پروگرام کے مطابق دس پندرہ منٹ بعد عمران جگت سنگھ اور موہن بجلی، گرو وستھا کے کمرے میں آن موجود ہوئے۔ جگت کی ایک آستین پر خون کے تازہ چھینٹے تھے۔ معلوم ہوا کہ راستے میں انہیں ایک خطرناک چیلے کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے ہیں۔ وہ نہ صرف ان کے راستے میں حائل ہوا بلکہ اس نے شور مچا کر مدد طلب کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ جگت نے اس کے دل کے مقام پر کرپان پیوست کی۔ پھر جگت اور عمران نے اس کی لاش گھسیٹ کر ایک اسٹور کے کاٹھ کباڑ کے نیچے ڈال دی تھی۔ مقتول کا خون فرش پر گرنے ہی نہیں دیا گیا۔

میں نے وسیع الماری کھول کر جگت سنگھ کو کن کٹے گرو کا دیدار کرایا اور اسے ساری صورتِ حال سمجھا دی۔ وہ بولا۔ ''فکر ہی نہ کرو بادشاہ زادے۔ آپاں تے نوکر ہیں آپ کے۔ جہاں کھڑا کر دو گے، لوہے پتھر کی طرح کھڑے رہیں گے۔'' اس نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور تیار ہو گیا۔

میں، عمران اور موہن کمرے سے نکل آئے۔ ہم میں سے ہر ایک کی پشت پر رگزین کا بیگ تھا اور رائفل ہاتھ میں تھی۔ عمران کے پاس رائفل کی جگہ سائلنسر لگا پستول تھا۔ اوشا نے اس خاص راستے کی نشاندہی کل ہی کر دی تھی جس پر سے گزر کر ہم سیدھے پوجا والے بڑے ہال کے نزدیک پہنچ سکتے تھے۔ عام بھکشو یہ راستہ بہت کم استعمال کرتے تھے اور اس کی چابی اوشا اور اس کے پتی گرو وستھا کے پاس ہی ہوتی تھی۔ ہم اس راستے میں داخل ہوئے۔ یہ پتھریلی دیواروں والی ایک طویل راہداری تھی۔ یہاں ہمیں کچھ ایسے مناظر نظر آئے جن سے بھکشوؤں کے اس فرقے کی بے رحمی واضح ہوتی تھی۔ جگہ جگہ ہمیں ہڈیوں کے ہار نظر آئے۔ دراصل انسانی انگلیوں کی ہڈیاں تھیں جنہیں سوت کی باریک ڈوری میں پرویا گیا تھا۔ کہیں

کہیں کسی جانور کی ہڈی بھی آویزاں نظر آتی تھی۔ یقیناً یہ سب کچھ سفلی اعمال اور دیگر شعبدہ بازیوں کا حصہ تھا۔ ایک جگہ تانبے کے بہت بڑے تختے پر ایک ایسی تصویر کندہ نظر آئی جس میں کسی قدیم روایت کی منظر کشی تھی۔ دلائی لاما کے ایک محل کا منظر تھا۔ ایک تنومند بھکشو دو خوب صورت کنیزوں کے ساتھ کھل کھیلنے میں مصروف تھا۔ یہ کیسا بدھ مت تھا؟ یقیناً یہاں جو کچھ دکھائی دے رہا تھا، بدھ مت کی بگڑی ہوئی بدترین شکل تھی۔ ابرار صدیقی کے دل میں بیٹھی ہوئی دہشت بجا ہی تھی۔

ہم راہداری سے تو بخیریت گزرے لیکن جب آگے نکلے تو فوراً مزاحمت کا سامنا ہوا۔ یہ نیچی چھت والا ایک چیمبر تھا۔ یہاں گہرے گیروا کپڑوں والے تین بھکشو موجود تھے۔ یہ چوب دار بھکشو تھے۔ ان میں سے دو کے پاس چمک دار تلواریں تھیں اور ایک کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر چونکے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتے، عمران کے سائلنسر لگے پستول نے تین بار شعلہ اگلا۔ دو بھکشو سر میں گولی کھا کر ڈھیر ہوئے، تیسرے کو میں نے دبوچ لیا۔ شکاری چاقو نے اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ پستول کی آواز بہت مدھم تھی، اس کے باوجود وہ باہر تک گئی۔ ایک حیران شخص نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اسے موہن نے جھپٹ لیا اور اپنا چاقو دستے تک اس کے دل کے مقام پر اتار دیا۔ موہن اور میں نے اپنے اپنے مضروب کو تھوڑی دیر تھامے رکھا پھر فرش پر ڈال دیا۔

دروازہ کھول کر ہم نے باہر جھانکا اور چونک گئے۔ ہم پوجا والے وسیع ہال کے عین سامنے پہنچ چکے تھے۔ یہاں بہت سے افراد جمع تھے اور باتوں کی بھنبھناہٹ گونج کی طرح سنائی دیتی تھی۔ عمران نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ بھنبھناہٹ معدوم ہو گئی۔ ہم نے اس کمرے کے دونوں دروازوں کو اندر سے مقفل کر دیا۔ اب ہم چاروں لاشوں سمیت اس کمرے میں بند تھے۔ ایک جالی دار محرابی کھڑکی ہمیں ہال میں دیکھنے کا راستہ فراہم کر رہی تھی۔ اندر کا منظر دیدنی تھا۔ اس منظر نے ہمیں نل پانی کے مندر میں ہونے والے ہنگامے کی یاد دلا دی۔ ڈیڑھ دو سو بھکشو یہاں موجود تھے۔ ان میں گیروا اور گہرے گیروا کپڑوں والے بھکشو تھے۔ سامنے سرخ پتھروں کے ایک چبوترے پر انیس عدد گرو ایک قطار میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے، بیسویں اوشا تھی۔ اوشا کی طرح تمام گروؤں کے گلے میں موٹے منکوں والی مالائیں تھیں۔ ان کے کپڑوں پر سامنے کی طرف بدھ مت کے تین مامن درج تھے۔ ۱۲ سب مرد و زن ساکت و جامد تھے۔ ان کے رُوبرو ساگوان کی پالش شدہ لکڑی کا ایک خوب صورت بکس پڑا تھا۔ اس بکس کو دیکھ کر میرا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ یقیناً عمران کی کیفیت

بھی یہی رہی ہو گی۔ اس بکس کی لمبائی چوڑائی اشارہ دے رہی تھی کہ اس کے اندر وہی موجود ہے جس نے ایک خلقت کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ جاوا اور ریان ولیم جیسے نہ جانے کتنے دبنگ لوگ اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ اس کے لئے لڑائیاں ہو رہی تھیں اور جانیں لی جا رہی تھیں۔ لاہور، شیخوپورہ، ممبئی، دہلی، کھٹمنڈو نہ جانے کہاں کہاں اس کے متلاشی سرگرم تھے۔ اور یہ یہاں اس غیر معروف قدیم بودھ مندر کے اندر اس سرخ پتھریلے چبوترے پر اس ساگوانی بکس کے اندر موجود تھی۔ جلالی صاحب نے اسے اپنی جواں سال بیوی ڈاکٹر مہناز کے سپرد کیا تھا...... اور وہ اس امانت کی ذمے داری کو نبھاتے نبھاتے آج یہاں ان بے رحم قاتلوں تک آن پہنچی تھی۔ وہ آرا کوئے چرانے کی مجرم ٹھہری تھی اور اب آرا کوئے کو اس کے جسم کے تازہ خون سے اشنان دیا جانا تھا اور خود جواں سال ڈاکٹر مہناز کو لہو سے خالی ہو کر موت کی وادی میں اتر جانا تھا۔ یہی ''حفاظت کی رسم'' تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ کمپیوٹر، میزائل اور سیل فون کے اس جدید دور میں، انہی جدتوں کے درمیان رہتے ہوئے کچھ لوگ ایسی دقیانوسیت اور توہم پرستی کے اسیر ہو سکتے ہیں۔

ایک طرف ایک بڑی انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ اس آگ کے قریب جونگ دھڑنگ بھکشو بیٹھا تھا، وہ یقیناً چھوٹا پجاری ہی تھا۔ اوشا نے بتایا تھا کہ آگ میں کٹی ہوئی انگلیاں ڈالی جاتی ہیں۔ یقیناً یہ وہی آگ تھی۔ مخروطی کھڑکیوں کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی ہے۔ انیس گرو چبوترے پر موجود تھے۔ وہ سب تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ منڈے ہوئے سر، صحت مند جسم، گہرے گیروا کپڑے، گلے میں لکڑی کے منکوں کی طویل مالائیں، ان میں سے ہی کوئی مہا پجاری تھا۔ اس کا علم ان گروؤں کو تو شاید تھا لیکن اور کسی کو نہیں تھا۔ بہرحال، ہمیں اب اس سے غرض نہیں تھی کہ مہا پجاری کون ہے۔ مورتی آرا کوئے ہمارے سامنے آ چکی تھی اور یہی ہمارا ٹارگٹ تھی۔

بہت بڑے بڑے ڈھول بجنا شروع ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ بہت سے بھکشو ایک نیم دائرے کی شکل میں چکرانے لگے۔ ان کے گلوں میں نمائشی کشکول لٹک رہے تھے اور ہاتھوں میں عصا تھے جن پر چمک دار میخیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ان عصا نما لاٹھیوں کو بار بار ہوا میں لہراتے تھے اور نعرہ زنی کرتے تھے۔ جیسے کسی نادیدہ دشمن کو للکار رہے ہوں۔ دھیرے دھیرے ان کی آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں اور انداز میں جارحانہ پن آ گیا۔ باقی حاضرین یکسر خاموش تھے اور آنکھیں بند کر کے پرارتھنا کر رہے تھے۔ ہال کے دروازوں پر گہرے گیروا لباس والوں کا چوکس پہرا تھا، اس کی وجہ غالباً تھ

سے مندر میں سے چند افراد غائب ہوئے تھے۔ چند منٹ بعد ہم نے ایک دیکھا۔ مشعل بردار بھکشوؤں کی دو طویل قطاریں تھیں۔ دونوں قطاروں کے آخر افراد نے لکڑی کا ایک بڑا تختہ اٹھا رکھا تھا۔ اس تختے پر ایک جسم رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ ہمیں یہ جاننے میں مطلق دشواری نہیں ہوئی کہ یہ ڈاکٹر مہناز تھی۔ اسے اتنی مضبوطی کے ساتھ باندھا گیا تھا کہ وہ اپنے سر سمیت جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتی تھی۔ اس کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس کے منہ میں ایک سفید سوتی کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ صلیب کے سے انداز میں اس کے دونوں بازو اطراف میں کھول کر سن کی مضبوط رسی سے باندھ دیئے گئے تھے۔ اس کے دونوں پاؤں کے درمیان بھی کافی جگہ تھی۔ مہناز کے بال جُوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور اس جُوڑے میں رجنی گندھا کے پھول مہک رہے تھے۔

کل رات ہم نے اس بودھ مندر کے تہ خانے میں ڈاکٹر مہناز کو بڑی آسائش میں اور بہت خوش و خرم دیکھا تھا لیکن آج اس کی وہ ساری کیفیت یقیناً اندوہناک تکلیف اور دہشت میں ڈھل چکی تھی۔ اسے مکتی ملنے والی تھی لیکن کسی اور طریقے سے...... اس کی بیسوں انگلیاں کاٹ کر اسے کسی تاریک کمرے میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔ جہاں یقیناً دو تین گھنٹوں میں اس کی موت واقع ہو جاتی۔

اسٹریچر نما تختے کو چبوترے کے درمیان لا کر رکھ دیا گیا۔ ہم جس کمرے میں لاشوں سمیت مقفل تھے، اس کا عقبی دروازہ دھڑا دھڑ بجایا جا رہا تھا۔ ہم خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد یہ دستک تھم گئی۔ شاید دستک دینے والے تھک ہار کر کسی اور راستے سے پوجا والے ہال کی طرف چلے گئے تھے۔ انہوں نے اسے ''معمولی واقعہ'' سمجھا ہوگا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس بند کمرے میں چار لاشوں کے ساتھ تین مسلح دشمن بھی موجود ہیں۔

اُنیس گروؤں کی قطار میں اوشا سب سے بائیں جانب بیٹھی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس نے کوئی غلط حرکت کی تو الماری میں بند بے ہوش گرو وستھا کی جان چلی جائے گی۔ میں اور عمران اس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ گروؤں کی قطار میں سب سے دائیں جانب بیٹھا ہوا شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے لکڑی کا بکس کھول کر مورتی نکال لی۔ یہ آرا کوئے تھی۔ وہی نادر فاسٹنگ بدھا جس کے ساتھ زمانے سے اَن گنت کہانیاں منسوب تھیں اور جو نوادارات کی دنیا میں ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ گندھاری مجسمہ ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی میں دمک رہا تھا۔ اس کی دید نے حاضرین پر ایک وجد آمیز ہیبت طاری

کر دی۔ نقاروں کے فلک شگاف شور میں وہ آرا کوئے کے سامنے جھک گئے۔ ان کی مناجات سے بام و در گونج اٹھے۔ گہرے گیروا کپڑوں والے بھکشو دوسرے بھکشوؤں سے زیادہ پُر جوش دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ آج یہاں جو کچھ ہو رہا تھا، ان کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ ایک انسانی جان لے کر وہ اس نادر مجسمے کو ہمیشہ کے لئے ''محفوظ'' بنانے والے تھے۔

لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ انسانی جان لینا ان کے لئے اتنا آسان نہیں ہوگا۔ کوئی ان کے حصار توڑ کر ان کے قلب میں گھس چکا تھا۔ ان کی شہ رگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ان تین عدد آتشیں ہتھیاروں سے بے خبر تھے جو ان پر آگ برسانے کے لئے بالکل تیار تھے۔

نادر مجسمے کی دید، پذیرائی اور عبادت کا مرحلہ گزرا تو ڈاکٹر مہناز والا تختہ اٹھا کر مجسمے کے بالکل قریب کر دیا گیا۔ پتھر کا ایک بڑا پیالہ، ایک بڑا گول طشت جو غالباً لکڑی کا ہی بنا ہوا تھا اور ایک تیز دھار کٹار نما خنجر چبوترے پر لایا گیا۔ یقیناً ڈاکٹر مہناز کی مصیبت کا آغاز ہونے والا تھا۔

پروگرام کے مطابق مجھے اور عمران کو دوڑتے ہوئے ہال میں داخل ہونا تھا۔ سب سے پہلے ہمیں ان تین مسلح افراد (چوب داروں) کو نشانہ بنانا تھا جو آرا کوئے کے بالکل قریب موجود تھے۔ اس کے بعد آرا کوئے کو حاصل کرنا اور بڑے گروؤں میں سے کچھ کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے بغلی دروازے کی طرف بڑھنا ہمارے پلان میں شامل تھا۔

لیکن جو کچھ ہوا، وہ ہمارے پلان سے خاصا مختلف تھا۔ ایک دم ہال کی ساری روشنیاں گل ہو گئیں۔ گہری تاریکی چھا گئی۔ زبردست شور بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنے پشتی تھیلوں سے ٹارچیں نکالیں اور ان کے روشن دائرے چبوترے کی طرف پھینکے۔ وہاں اژدھام تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر پل پڑے تھے۔ تلواریں چمک رہی تھیں پھر گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ ہم نے دروازہ کھولا اور تیزی سے چبوترے کی طرف لپکے۔ میں اور عمران آگے تھے۔ موہن عقب میں تھا۔ لوگوں سے ٹکراتے، راستہ بناتے، ہم چبوترے پر پہنچے۔ حسبِ اندیشہ آرا کوئے والی جگہ خالی تھی۔ وہاں سرخ اور گہرے سرخ کپڑوں والے بہت سے بھکشو گتھم گتھا تھے۔ تیز دھار آلے استعمال ہو رہے تھے۔ رائفلوں کے شعلے چمک رہے تھے...... جہاں ڈاکٹر مہناز والا تختہ پڑا تھا وہ جگہ بھی اب خالی تھی۔ کیا آرا کوئے کی طرح مہناز بھی منظر سے غائب کر دی گئی ہے؟ یہ سوال تیر کی طرح دماغ میں پیوست ہو گیا۔

خود پر تلوار سے حملہ کرنے والے ایک خونخوار ''بھکشو'' کے سینے پر میں نے رائفل کا فائر

کیا اور اندھا دھند چلنے والی گولیوں سے بچنے کے لئے زمین پر لیٹ گیا۔ عمران اور موہن نے بھی ایسا ہی کیا تھا ہم فرش پر پیچھے کی طرف رینگتے چلے گئے تا کہ گولیوں کی بارش سے بچ سکیں۔ آخر ہمیں دو جڑے ہوئے بڑے بڑے ستونوں کی آڑ میسر آ گئی۔ ہم نے وہاں پوزیشن لے لی۔

کچھ ہی دیر پہلے جہاں اُنیس گرو بیٹھے تھے، وہاں اب دو گروؤں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اوشا سمیت اور کسی گرو کا پتا نہیں تھا۔ کھڑکیوں سے باہر زور سے بجلی چمکی۔ روشنی کے جھماکے میں ہال کا منظر تہلکہ خیز دکھائی دیا۔ یہاں کئی لاشیں اور زخمی موجود تھے۔ دونوں طرف کے گن مینوں نے مختلف جگہوں پر پوزیشن لے لی تھی اور دیوانہ وار فائرنگ کر رہے تھے...... شیشہ، لکڑی، دھات، سب کچھ چھلنی ہو رہا تھا۔ اور تب ہماری نگاہ مہناز پر پڑی۔ اس کا اسٹریچر نما تختہ چبوترے کی سیڑھیوں کے پاس اوندھا پڑا تھا۔ مہناز تختے کے نیچے تھی اور گولیوں کی بارش میں تھی۔ غالباً ہنگامہ شروع ہونے کے بعد اسے بچانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن پھر راستے میں ہی چھوڑ کر اپنی جان بچائی گئی تھی۔

مہناز کو کسی بھی وقت گولی چاٹ سکتی تھی۔ اس کی زندگی تیز ترین ہوا میں پھڑ پھڑاتے چراغ کی طرح تھی۔ اسے اس کی جگہ سے ہٹانا موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جیسا تھا...... لیکن ایسی چھلانگیں ہم پہلے بھی لگاتے رہے تھے۔ ایسی سر بکف دیوانگی ہمیں پہلے بھی بھاتی رہی تھی۔ جب موت پھنکارتی ہے، دھاڑتی ہے، سینے شق کرتی ہے اور جگر پھاڑ ڈالتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا اور اس کے سامنے خم ٹھونکنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے...... جدا ہی نشہ ہوتا ہے۔ میں اور عمران کندھے سے کندھا ملا کر پہلے بھی کئی بار ایسے جاں گسل مرحلوں سے گزر چکے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... ایک ساتھ اٹھے اور ایک ساتھ ڈاکٹر مہناز کی طرف دوڑے۔ ہم رکوع کے بل جھکے ہوئے تھے۔ پگھلا ہوا سیسہ موت بن کر ہر طرف لپک رہا تھا...... کئی گولیاں ہمارے بہت پاس سے گزریں۔ سچ کہتے ہیں، جب بے خوفی سے موت کا سامنا کیا جاتا ہے تو وہ دھند کی طرح تحلیل ہونے لگتی ہے۔ ہم نے مہناز والا تختہ سیدھا کیا، اسے اٹھایا اور لاشوں کو پھلانگتے ہوئے ایک بغلی دروازے سے ٹکرائے اور اسے توڑتے ہوئے ایک تاریک برآمدے میں نکل آئے۔ یہاں بھی کئی افراد گتھم گتھا تھے۔ بارش کی بوچھاڑیں پڑ رہی تھیں۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ مہناز کے چہرے پر پھینکا۔ وہ زندہ تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں دہشت منجمد تھی۔

گہرے گیروا اور ہلکے گیروا کپڑوں والی دو ٹولیاں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھیں۔ ہم

ان کے قریب سے گزرتے ہوئے گول ستونوں والے برآمدے کی طرف بڑھے۔ جگت سنگھ کو یہیں پر ملنا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ موہن بجلی کہیں نہیں تھا۔

''لگتا ہے موہن نکل گیا ہے۔'' میں نے چلاّ کر کہا۔

''وہ کمینہ کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کا انتظام کیا ہوا ہے۔'' عمران نے بھی چلاّ کر جواب دیا۔

کسی طرف سے ہم پر آٹو میٹک رائفل کا برسٹ چلایا گیا۔ ہم بھاگتے بھاگتے اسٹریچر نما تختے سمیت گر گئے......

گولیاں ہمارے سروں پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھیں۔ ہم نے ایک بار پھر مہناز والا اسٹریچر نما تختہ اٹھایا اور گول ستونوں والے برآمدے کی طرف بڑھے۔ ہر طرف شعلے چمک رہے تھے اور فائرنگ کی گونج دار آوازیں تھیں۔ بائیں طرف سے برآمد ہونے والے ایک تنومند بھکشو نے عمران پر تلوار کا وار کرنا چاہا۔ میں نے اس کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ مارا اور عمران تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر کر دیا۔

ہم گول ستونوں والے برآمدے میں پہنچے۔ جگت سنگھ اپنی مقررہ جگہ پر موجود نہیں تھا۔

''کہاں دفع ہو گیا؟'' عمران نے بلند آواز سے کہا۔

ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ عمران نے اسٹریچر نما تختے کو ایک تاریک گوشے میں رکھا اور بولا۔ ''میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔''

میں اسے روکتا ہی رہ گیا لیکن وہ کسی کی کب سنتا تھا۔ وہ اس کمرے کی طرف لپک گیا جہاں زخمی گرو دستا ایک الماری کے خانے میں بند تھا اور جگت کو اس کا پہرا دینا تھا۔

عمران کی واپسی دو منٹ کے اندر ہی ہو گئی۔ ''ملا؟'' میں نے چلاّ کر پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے بھی چلاّ کر جواب دیا...... اور اسٹریچر نما تختہ اٹھا لیا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے ہوئے ایک دھواں دھواں راہداری میں گھس گئے۔ عمران آگے تھا، میں پیچھے اور ہمارے درمیان تختے پر بندھی ہوئی ڈاکٹر مہناز تھی۔ کبھی کبھی ہمیں فائر کرنے کے لئے اپنا ایک ہاتھ تختے سے الگ بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ ہمارا رخ پگوڈا یعنی اس بودھ مندر کے بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ عمران صرف جگت سنگھ کو دیکھنے گرو دستا کے کمرے کی طرف نہیں گیا تھا، اس کا کچھ اور مقصد بھی تھا۔ لیکن کیا؟ اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

مندر کے وسیع احاطے میں بھی گھمسان کا رَن پڑا ہوا تھا۔ دونوں فرقوں کے بھکشو آمنے

سامنے تھے۔تلواروں اور کلہاڑیوں کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔آرا کوئے کی ملکیت کا جھگڑا اس عبادت گاہ کو خوں رنگ کر رہا تھا۔ہمیں ایک لوڈر نما گاڑی نظر آئی۔اس پر ''سیوا دواری مندر'' لکھا ہوا تھا۔یعنی یہ مندر میں خدمت انجام دینے والی گاڑی تھی۔گاڑی اسٹارٹ تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور انجن ریس میں تھا۔اس کے بھکشو ڈرائیور کے سر میں گولی لگی تھی اور وہ مر چکا تھا۔مرتے وقت ڈرائیور کا پاؤں چونکہ ایکسلریٹر پر تھا، اس لئے انجن نے زبردست شور مچایا ہوا تھا۔

عمران نے فائر مار کر لوڈر کے عقبی دروازے کا لاک توڑا۔ہم نے پھرتی سے مہناز والا تختہ لوڈر میں پہنچا دیا۔میں نے لوڈر کا اگلا دروازہ کھول کر مردہ ڈرائیور کو نیچے پھینکا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی عمران بائیں طرف والا دروازہ کھول کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔یہ سارا عمل بمشکل ایک منٹ کے اندر مکمل ہو گیا میں نے لوڈر کو گیئر میں ڈال کر آگے بڑھایا تو گہرے گیروا کپڑوں والے دو جنونی بھکشو سامنے آئے۔درحقیقت ان کی موت ہی انہیں لوڈر کے سامنے لائی تھی عمران بڑے خطرناک موڈ میں تھا اس نے رائفل کا طویل برسٹ مارا اور دونوں کو ڈھیر کر دیا۔ان میں سے ایک کی لاش لوڈر کے نیچے آئی لوڈر اسے کچلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔یہ دواری مندر بڑے سخت حفاظتی حصار کے اندر تھا مگر اس وقت سارے حصار ٹوٹے ہوئے تھے۔ہر طرف افراتفری تھی۔

لوڈر کو تیزی سے آتے دیکھ کر کچھ افراد نے آہنی گیٹ بند کرنے کی کوشش کی۔مجھے ایک یا دو سیکنڈ کی تاخیر ہو جاتی تو گیٹ بند ہو جاتا اور شاید یہ لوڈر اسے توڑ نہ سکتا۔مگر گیٹ بند نہیں ہوا اور لوڈر اسے دھکیلتا ہوا باہر آ گیا۔گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور دو عقبی کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔مجھے لگا جیسے ڈاکٹر مہناز کو گولی لگ گئی ہے لیکن اس کی آواز نہیں آئی۔آواز آ بھی نہیں سکتی تھیں اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔میں نے مڑ کر دیکھا۔کچھ نظر نہیں آیا۔وہ عقبی حصے میں بے حرکت لیٹی تھی۔

''کدھر جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جدھر منہ ہے۔بس بھگاتے چلے جاؤ۔'' عمران نے کہا۔

اور میں واقعی بھگاتا چلا گیا۔یہ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔سڑک کے دونوں طرف تھوڑی بہت آبادی تھی۔پام کے پیڑوں کے درمیان کہیں کہیں دو تین منزلہ گھر بھی نظر آ رہے تھے لیکن انسان کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔عقب میں سڑک پر مدھم روشنیاں تو نظر آ رہی تھیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی عام گاڑی کی روشنی ہے یا

کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔

میں نے کہا۔''مہناز کو دیکھو یار! کہیں وہ زخمی نہ ہو گئی ہو؟''

''ابھی بھگاتے جاؤ۔آگے کوئی مناسب جگہ نظر آتی ہے تو روکتے ہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

قریباً چھ سات میل تک ہم سمندر کے ساتھ ساتھ اسی طرح لوڈر بھگاتے گئے۔پھر سڑک سے ذرا ہٹ کر درختوں کا ایک بڑا جھنڈ نظر آیا۔موسلا دھار بارش میں کھجور، پام اور تاڑ وغیرہ کے بہت سے درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔عمران نے کہا۔''اس کے اندر گھسا دو۔'' میں نے یہی کیا۔گاڑی کو سڑک سے اتارا اور جھنڈ میں گھستا چلا گیا۔انجن بند کر کے میں نے ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔عمران نے اپنی پشت پر لٹکے بیگ میں سے بڑے سائز کی ٹارچ نکال لی۔ہم گھوم کر لوڈر کے عقب میں آئے۔ٹارچ کی روشنی مہناز پر ڈالی۔وہ بے سُدھ پڑی تھی۔یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ زندہ ہے۔شیشے کی کرچیاں لگنے سے اس کا بازو معمولی زخمی ہوا تھا۔اس کے چہرے پر بھی نیل نظر آ رہے تھے۔یقیناً یہ چوٹیں اسے تب لگی تھیں، جب مندر میں بھگدڑ مچنے کے بعد اس کا یہ اسٹریچر نما تختہ سیڑھیوں کے قریب الٹ گیا تھا۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔وہ اب تک ہمیں بڑی اچھی طرح پہچان چکی تھی۔میں نے اس کے منہ میں سے سوتی کپڑا نکالا۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔میں نے اور عمران نے اسے بمشکل چپ کرایا۔یہ دکھ سکھ بیان کرنے کا وقت نہیں تھا۔میری خاکی پتلون خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔یہ دراصل اس بدقسمت ڈرائیور کا خون تھا جو لوڈر کی ڈرائیونگ سیٹ پر کسی اندھی گولی کا شکار ہوا تھا۔

عمران نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔''سب سے پہلے ہمیں اس لوڈر سے جان چھڑانا ہو گی۔''

''لیکن کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' عمران بولا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔کچھ ہی دیر بعد وہ شیکھر نامی شخص سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔یہ وہی مقامی شخص تھا جو رتنا گری میں رہائش رکھتا تھا اور عمران نے ممبئی کے ہوٹل سے بھی اس سے رابطہ کیا تھا۔مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس مشن میں شریک نہ ہونے کے باوجود ہمارے آس پاس موجود رہا ہے۔

فقط دس منٹ کے اندر شیکھر ایک ایمبولینس گاڑی میں آن موجود ہوا۔عمران نے ٹارچ کے روشن دائرے سے اس کی راہنمائی کی اور وہ ایمبولینس کو سیدھا درختوں کے جھنڈ میں لے

آیا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ میں اور عمران بھاگ کر ایمبولینس میں سوار ہو گئے۔ شیکھر نامی اس نوجوان کی عمر پچیس چھبیس سال ہو گی۔ اس کے ساتھ اس کی عمر اور حلیے والا ایک اور نوجوان بھی تھا۔ اس کا نام پورب معلوم ہوا۔ وہ شکل اور لباس سے نچلی ذات کا ہندو نظر آتا تھا۔

''جی سر! کیا پروگرام ہے؟'' شیکھر نے عمران سے پوچھا۔

''یہاں سے نکلنا ہے فوراً۔ فیول وغیرہ ہے نا گاڑی میں؟''

''بالکل جی، ٹینکی فل ہے۔ لیکن آپ کے باقی دونوں ساتھی نظر نہیں آ رہے؟''

''ایک بھاگ گیا ہے، ایک گم ہو گیا ہے۔'' عمران نے کہا۔ بھاگنے والے سے اس کی مراد موہن بجلی اور گم ہونے والے سے جگت سنگھ تھی۔

''لوڈر کے اندر کون ہے جی؟'' پورب کمار نے پوچھا۔

''وہی ڈاکٹر ہے...... اب تم لوگوں نے فوراً ایک کام کرنا ہے، اس بھگوڑے موہن بجلی کو پکڑنا ہے۔'' عمران نے کہا اور جیب سے ایک موبائل فون نما چیز نکال کر پورب کو تھما دی۔ یہ دراصل سگنل وصول کرنے والی ایک الیکٹرانک ڈیوائس تھی۔

عمران نے ڈیوائس کو آن کیا۔ اسکرین پر ایک روڈ میپ سا ابھرا اور سبز رنگ کا ایک نقطہ اسپارک کرنے لگا۔ پورب کمار نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ عمران بولا۔ ''موہن کے پاس چھوٹی نال کی روسی رائفل ہے۔ ٹرانسمیٹر اسی کے اندر ''انسٹال'' ہے۔ وہ رائفل ہاتھ سے کھونا پسند نہیں کرے گا۔ امید ہے تم ایک دو گھنٹوں میں ہی اسے ڈھونڈ لو گے۔''

پورب کمار نے اثبات میں سر ہلایا...... اور ایمبولینس سے اتر کر درختوں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اب مجھ پر یہ واضح ہوا کہ عمران نے موہن کو پستول کے بجائے رائفل کیوں دی تھی۔

عمران نے شیکھر سے کہا۔ ''مجھے دواری مندر کے اندر کی رپورٹ بھی چاہئے ہو گی اور اگر جگت سنگھ کے بارے میں کچھ پتا چل سکے تو اور اچھی بات ہے۔''

''میں ابھی انتظام کرتا ہوں جی۔'' شیکھر نے کہا اور موبائل فون پر کسی کا نمبر پریس کرنے میں مصروف ہو گیا۔

میں اور عمران ایمبولینس سے نکلے اور لوڈر کی طرف بڑھے۔ اب ہمیں مہناز کو تختے سے علیحدہ کرنا تھا اور ایمبولینس میں پہنچانا تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! تم بالکل جلیبی کی طرح گول ہو۔ مجھے تم نے یہی بتایا تھا کہ اس کارروائی میں ہمارے ساتھ صرف جگت سنگھ اور موہن

ہی شریک ہو رہے ہیں۔ لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ تمہارے کچھ اور مؤکل بھی آس پاس موجود ہیں۔''

''یار! یہ کارروائی میں شریک تھوڑے تھے۔ یہ تو میرے بلاوے پر آ گئے ہیں۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ یہ مقامی دوست ہیں۔ میں ان کے کام آتا ہوں، یہ میرے کام آتے ہیں۔''

''یہ بھی بتا دو کہ تم کہاں کہاں، کب کب اور کس کس کے کام آتے ہو؟''

''ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔ دادا جی فرمایا کرتے تھے، نیکی کر کنوئیں میں ڈال۔''

میں خاموش ہو گیا۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کی مضبوط بندشیں کھولیں۔ بے چاری کی کلائیوں اور پنڈلیوں پر سن کی رسّی نے گہرے نشان ڈال دیئے تھے۔ وہ سر گھٹنوں میں دے کر سسکنے لگی۔ ''میں کہاں ہوں تابش؟ کہیں وہ لوگ پھر تو نہیں آ جائیں گے۔ پلیز مجھے یہاں سے جلدی لے چلو۔'' اس نے اپنا لرزاں ہاتھ میری کلائی پر رکھ دیا۔

''اب کچھ نہیں ہو گا مہناز۔ ہم یہاں ہیں تمہارے پاس۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ بھکشو نہیں ہیں۔ یہ تو جانور، درندے ہیں۔ درندوں سے بھی برے...... انہوں نے...... انہوں نے جلالی صاحب کو تو کچھ نہیں کہا؟ پلیز مجھے سچ بتائیں۔ جلالی صاحب تو ٹھیک ہیں نا؟''

''بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کہیں گی تو ان سے بات بھی کرا دیں گے۔''

''کب......؟ پلیز...... میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں وہ نہیں کر سکی جو وہ چاہتے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اس امانت کی حفاظت نہیں کر سکی۔'' وہ سسکتی چلی گئی۔

امانت سے اس کی مراد یقیناً آرا کوئے ہی تھا۔ آج وہ سارے خیال بالکل غلط ثابت ہو گئے تھے جو جلالی فارم سے ڈاکٹر مہناز کے غائب ہونے کے بعد لوگوں کے ذہن میں آئے تھے۔ بابے طفیل جیسے گھریلو ملازموں اور دیگر لوگوں نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ ڈاکٹر نے جلالی صاحب کو دھوکا دیا ہے اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اسے اور اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام کو مورتی سمیت غائب ہو جانے کا ذمے دار ٹھہرایا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''مہناز...... آپ کے ساتھ ڈاکٹر رسام بھی تو تھا؟''

وہ ہچکیوں سے رو دی۔ ''انہوں نے اسے مار دیا۔ بڑی تکلیف دے کر مارا۔ اس کے سارے جسم کو لوہے سے داغ داغ کر سیاہ کر دیا۔''

ہم نے غلط موضوع چھیڑ دیا تھا۔ فی الوقت ضرورت اس امر کی تھی کہ جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس پر ایک پولی تھین ڈالا اور اسے بارش میں چلا کر ایمبولینس کے اندر لے آئے۔ ہمارے کہنے پر اس نے جُوڑا کھول دیا۔ رجنی گندھا کے پھول اتار کر پھینک دیئے اور پیشانی پر سے ایک تلک نما نشانی مٹا دی۔ عمران نے اسے ایمبولینس کے اسٹریچر پر لٹا دیا اور ایک سفید چادر ٹھوڑی تک اس کے اوپر کھینچ دی۔ اپنے چہرے کی چوٹوں اور نیلوں کی وجہ سے وہ کوئی زخمی مریضہ ہی نظر آتی تھی۔ ہماری پشت پر موجود تھیلوں میں فالتو جوڑے موجود تھے۔ ہم نے لوڈر میں جا کر لباس تبدیل کر لیا۔ مجھے بھی خون آلود پتلون سے نجات مل گئی۔ شیکھر کے پاس اپنے اور گاڑی کے مکمل کاغذات موجود تھے۔ ہمیں امید تھی کہ ہمیں طویل سفر میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

ہماری امید درست ثابت ہوئی۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہائی وے سنسان تھی۔ تیز بارش نے اس سنسانی کو مزید بڑھایا تھا۔ ہمیں دن چڑھے تک کہیں بھی روکا نہیں گیا۔ ڈرائیونگ شیکھر کر رہا تھا۔ وہ خاصی رفتار سے جا رہا تھا۔ جب ہم کسی آبادی یا قصبے کے اندر سے گزرتے تو وہ ایمبولنس کا ہوٹر بھی آن کر دیتا۔ اگر ہمیں کسی ناکے وغیرہ پر روکا جاتا تو ہمیں یہی بتانا تھا کہ ہم روڈ ایکسیڈنٹ میں گھائل ہونے والی ایک عزیزہ کو رتناگری کے اسپتال لے جا رہے ہیں۔ بہر حال، اس طرح کی کوئی صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی۔ راستے میں ہم نے کئی بار جگت سنگھ کے موبائل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس کے بارے میں ہماری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش میں سفر کرتے ہوئے ہم صبح نو بجے کے لگ بھگ ایک بار پھر ممبئی پہنچ گئے۔ بارش میں بھیگا ہوا ممبئی قدرے خاموش نظر آ رہا تھا۔ ویسے بھی یہ چھٹی کا دن تھا۔ ہم سیدھے نصیر احمد کے گھر پہنچے۔ ایمبولینس کو گیراج میں کھڑا کرنے کے بعد ہم نے ڈاکٹر مہناز کو نکال کر آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا۔ ایشو ریا رائے سمیت تینوں لڑکیاں یہیں موجود تھیں۔ وہ ہمیں واپس دیکھ کر خوش ہوئیں...... اور ڈاکٹر مہناز کو دیکھ کر حیران۔

جیلانی اور نصیر سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً جاننا چاہتے تھے کہ ہمیں آرا کوئے کے حوالے سے کامیابی ہوئی ہے یا نہیں؟ ان کے سوال کا جواب نفی میں تھا۔ ہماری خاموشی سے انہوں نے بھانپ لیا کہ جواب کیا ہے۔

اسی دوران میں عمران کے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ دوسری طرف وہی پورب کمار تھا جس فون کی بیل ہونے لگی۔ دوسری طرف وہی پورب کمار تھا جس کے ذمے عمران اور شیکھر

نے موہن بجلی کو ''ٹریس'' کرنے کا کام لگایا تھا۔

پورب کی آواز موبائل کے اسپیکر پر ابھری۔ ''جی جناب! اچھی سماچار ہے۔ ہم نے موہن کو دھر لیا ہے۔ پہلے تو اس کے سگنل ہی نا ہیں مل رہے تھے پھر اس کے سگنل ملنے شروع ہوئے لیکن وہ کسی جگہ ٹک ہی نا ہیں رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسٹیشن کے قریب سے پکڑا ہے اسے۔''

''کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟'' عمران نے پوچھا۔

''نا ہیں جی، اپن کا ایک بندہ معمولی گھائل ہوا ہے۔ بازو پر گولی لگی ہے۔ اب آپ بتائیں اس کا کیا کرنا ہے۔ اپن نے اسے ایک اسٹیشن وین میں ڈالا ہوا ہے اور وین تھانے کے قریب کھڑی ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے تھانے میں ہی جمع کرانا ہے لیکن کسی عام افسر کو نہیں دینا۔ اس خبیث کے لئے اسپیشل پروٹوکول ہوگا۔ کوئی بڑا افسر اسے وصول کرے گا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔''

''سر! یہ بڑی بک بک کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے اسے وچن دیا گیا تھا۔ مندر میں سے جو مال لوٹا گیا ہے، اس میں سے اسے حصہ ملنا چاہئے۔''

عمران بولا۔ ''اس سے کہو حصے کی جگہ تمہاری تشریف پر چار پانچ لاتیں مار کر تمہیں کسی چکی میں بند کر دینا چاہئے۔ تم نے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔''

''سر! وہ کہہ رہا ہے...... میں بھاگا نا ہیں ہوں۔ خود کو بھکشوؤں سے چھپا رہا تھا۔''

''اس کمزور دلیل کی پاداش میں اس کی مزید چھترول ہونی چاہئے۔ بہر حال، اس سے کہو کہ اس سے شروع میں جو وعدہ کیا گیا تھا، وہ ضرور پورا ہوگا۔ اس کی قید میں زیادہ نہیں تو تین چار سال کی رعایت ضرور ہوگی۔''

اس کے فوراً بعد عمران نے جیلانی کو ساتھ لیا اور نیلی اسٹیٹ کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ ڈیڑھ دو میل آگے جا کر گاڑی رکوا لے گا اور جادا سے رابطہ کرے گا۔ ہم اس مکان سے جادا کو کال نہیں کرتے تھے کہیں لوکیشن ٹریس نہ ہو۔

عمران کی واپسی آدھ گھنٹے کے اندر ہوگئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''جادا سے تو رابطہ نہیں ہوا لیکن چوپڑا سے بات ہوگئی ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ موہن رتناگری میں ہے اور وہ اسے وصول کرنے کا انتظام کرے۔''

''جادا خود کدھر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

"چوپڑا نے بتایا نہیں۔ بس گول مول بات کی ہے۔"

"آرا کوئے کے بارے میں بھی نہیں پوچھا؟"

"چوپڑا نے تو نہیں پوچھا۔"

میں نے گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "عمران! ہم پھر وہیں کھڑے ہیں جہاں کل رات سے پہلے تھے...... بلکہ شاید اس سے بھی کچھ پیچھے چلے گئے ہیں۔"

"جگر! وقتی طور پر مایوسی تو ہوئی ہے لیکن مجھے پوری امید ہے کہ اگلے ایک دو دن میں پھر کوئی سراغ مل جائے گا۔ مورتی اپنی جگہ سے ہل چکی ہے اور اسے تلاش کرنے والے ہر طرف موجود ہیں۔"

"ان تلاش کرنے والوں میں تمہارے بندے...... میرا مطلب ہے تمہارے مؤکل بھی شامل ہیں؟" میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار! اتنے زیادہ مؤکل نہیں ہیں میرے...... کوئی بابا جنوں والا نہیں ہوں میں۔ بس تمہاری طرح کے دو چار خیر خواہ دوست ہیں۔ ان میں سے کچھ تو تمہارے سامنے ہی ہیں۔"

"تم بہت کچھ چھپاتے ہو عمران......"

میری بات ادھوری رہ گئی۔ نصیر احمد کے فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ جگت سنگھ تھا۔ ہمارے درمیان یہ بات کل ہی طے ہو گئی تھی کہ اگر ہم نے آپس میں رابطہ کرنا ہوگا تو نصیر احمد کے ذریعے کریں گے۔

اسکرین پر جگت سنگھ کا نمبر دیکھ کر ہم بری طرح چونکے۔ میں نے ہی فون ریسیو کیا۔

"ہیلو بادشاہ زادے! کہاں ہو؟" جگت نے مجھ سے پوچھا۔ وہ ہانپا ہوا سا تھا۔

"تم بتاؤ کہاں ہو؟ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہوئے ہو۔"

"ایویں ہی غائب نہیں ہوا بادشاہ زادے۔ بڑی زبردست سما چار ہے آپ سب کے لئے۔"

اس سے پہلے کہ جگت سنگھ کچھ اور بتاتا، رابطہ منقطع ہو گیا۔ یہ کمزور سگنلز کی وجہ سے ہوا تھا۔ ہم نصیر کے فون سے بار بار جگت سنگھ کو کال ملانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکامی ہوئی۔ امید تھی کہ جگت سنگھ خود ہی دوبارہ کال کرے گا۔

اب پتا نہیں کہ اس کے پاس کیا زبردست خبر تھی۔ ہمارے لئے تو اس وقت اہم ترین خبر آرا کوئے کے حوالے سے ہی ہو سکتی تھی۔

جاوا نے ثروت کی رہائی اور محفوظ واپسی کے بدلے صرف ایک ہی شرط رکھی تھی اور وہ تھی آرا کوئے کی حوالگی، یقینی بات تھی کہ وہ اس شرط کے سوا کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں ہو گا۔ ڈاکٹر مہناز والے سراغ کے ذریعے ہم آرا کوئے کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے لیکن پھر اچانک وہ سب کچھ ہو گیا جس نے آرا کوئے کو بڑے ڈرامائی انداز میں اوجھل کر دیا تھا۔ اب ہم پھر مکمل اندھیرے میں کھڑے تھے۔

اسی دوران میں جگت سنگھ کی کال پھر آ گئی۔ میں نے ہی کال ریسیو کی۔ جگت نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہ بولا۔ "آپ کو پتا ہے، میں اس ویلے کہاں ہوں؟"

"میں کیسے اندازہ لگا سکتا ہوں؟"

"میں اس ویلے ممبئی میں ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟"

"ہم بھی ممبئی میں ہیں۔"

"یہ تو پھر بڑی چنگی بات ہو گئی۔ آپ کے لئے زبردست سما چار یہ ہے کہ آپاں (ہم) جس مورتی کے پیچھے رتنا گری گئے تھے، وہ اس ویلے میرے بالکل پاس ہے۔ بس یوں سمجھو بادشاہ زادے کہ پندرہ وی فٹ کی دوری پر۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ عمران کی آنکھوں میں بھی چمک نمودار ہو گئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو...... کہیں مذاق تو نہیں کر رہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"مذاق کا تو یہ موقع ہی نہیں ہے بادشاہ زادے! میں نے جان خطرے میں ڈالی ہے اور بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ مندر میں جب ہا ہا کار مچی اور لوگوں نے دوڑنا شروع کیا تو میں گرو کے کمرے میں تھا، الماری کے پاس۔ مجھے چار بھکشو نظر آئے۔ وہ مورتی لے کر دوڑے جا رہے تھے۔ میں نے گرو پر لعنت بھیجی اور ان کا پچھا کیا۔ وہ سامنے والے برآنڈے کی طرف آ گئے۔ برآنڈے میں ان میں سے ایک کو گولی لگ گئی اور وہ گر پڑا، باقی تینوں احاطے میں آئے اور ایک ٹرک میں وڑ گئے۔ ان کے وڑتے ہی ٹرک فوراً چل پڑا۔ میں ٹرک کے پچھے لٹک گیا۔ ٹرک میں کھمبی کی جڑیں لدی ہوئی تھیں۔ کھمبی کا پتا ہے نا آپ کو، ترکاری کی طرح ہوتی ہے۔ یہ بودھ شوق سے کھاندے ہیں۔ میں کھمبی کی جڑوں میں وڑ کر بیٹھ گیا۔" جگت نے ایک لحظہ توقف کیا اور بولا۔

"بادشاہ زادے! میرا خیال ہے کہ یہ گل کافی لمبی ہو جائے گی۔ اس ویلے تو لوڑ اس گل کی ہے کہ آپ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔"

"میں بھی یہی کہنے لگا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب بتاؤ کہ تم ہو کہاں؟"

"یہاں کا مشہور علاقہ کا جو پاڑا ہے۔ وہاں سے ہرے کرشنا کی طرف جاتے ہوئے بڑے چوک پر پہنچیں تو دائیں طرف سفید رنگ کا ایک ہوٹل ہے۔ اسے بودھ ہوٹل کہتے ہیں۔ تین منزلہ بلڈنگ ہے۔ کھمبی والا ٹرک اس ویلے ہوٹل کی پارکنگ وچ ہے۔ خود تینوں بھکشو پہلی منزل کے کمرے وچ ہیں۔ مورتی بھی ان کے پاس ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ بڑی چھیتی یہاں سے نکلنے والے ہیں۔ ہوسکدا ہے کہ انہوں نے یہاں سے ہوائی اڈے کی طرف ہی جانا ہو۔"

"ان تینوں کے علاوہ کوئی اور بندہ بھی ہے کمرے میں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں......ایک بندہ ہور ہے۔ دراصل ایک کار بھی ٹرک کے نال نال ہی رتنا گری سے یہاں پہنچی ہے۔ اس کار میں بھی تین چار بندے سوار تھے۔ یہ کار بھی اس ویلے پارکنگ میں کھڑی ہے۔"

"اسلحہ وغیرہ کیا ہے ان لوگوں کے پاس؟"

"آپاں کو تو کوئی اسلحہ شسلحہ نظر نہیں آیا سجن جی......میری سمجھ کے مطابق یہ بھکشوؤں کا وہ دوسرا ٹولہ ہے جو مارا ماری کو بڑا وڈا پاپ سمجھتا ہے۔ مندر کے اندر بھی ان لوگوں نے کوئی گولی شولی نہیں چلائی۔ باقی دل کا حال تو واہگرو ہی جانتا ہے۔"

"ٹھیک ہے جگت سنگھ! تم چوکس رہو۔ ہم جلد سے جلد پہنچ رہے ہیں۔"

"میں ہوٹل کے کاؤنٹر کے پاس ہی صوفے پر بکل مار کر بیٹھا ہوا ہوں۔"

"رائفل پاس ہی ہے نا؟"

"اوآہو یار! رائفل اور کرپان کے بغیر خالصہ بھلا کس کام کا؟"

میں نے سلسلہ منقطع کیا۔ عمران نے نصیر سے بودھ ہوٹل اور کا جو پاڑا وغیرہ کا حدود اربعہ پوچھا۔ ہم نے اپنا اسلحہ چیک کیا۔ ڈاکٹر مہناز بھی سب کچھ سن چکی تھی۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اس نے بھی وہی کچھ کہا جو دو دن پہلے اسی کمرے میں ابرار صدیقی نے کہا تھا......

وہ عمران اور مجھ سے مشترکہ طور پر مخاطب ہو کر بولی۔ "کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ دونوں اس برے چکر سے نکل جائیں؟ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ بالکل جنونی......اور کٹر۔ یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "ڈاکٹر! آپ ہمارے لئے پریشان نہ ہوں۔ بس اپنا دھیان رکھیں۔ ہم ان لوگوں سے نمٹ لیں گے۔ ویسے بھی یہ وہ خونی ٹولہ نہیں ہے۔ یہ دوسرے لوگ ہیں۔"

ڈاکٹر مہناز شاید اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ اسے تسلی دیتے ہوئے ہم باہر نکلے اور نصیر احمد کے ساتھ دوڑتے ہوئے نیلی گاڑی میں آ بیٹھے۔ اب دن کے قریباً گیارہ بج چکے تھے، تاہم تعطیل کے سبب سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا۔ نصیر احمد اچھا ڈرائیور تھا۔ وہ بیس پچیس منٹ میں ہمیں کا جو پاڑا کے علاقے میں لے آیا۔ دور ہی سے ہمیں تین منزلہ ہوٹل کی سفید اور گیروا عمارت نظر آ گئی لیکن اس کے ساتھ ہی کسی گڑبڑ کا احساس بھی ہوا۔ پولیس کی دو موبائلز اپنے ہوٹر بجاتی ہوئی بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے پاس سے گزریں۔ ان کا رخ بودھ ہوٹل کی طرف ہی تھا۔ ہمیں کچھ ایسی گاڑیاں نظر آئیں جو یوٹرن لے کر واپس آ رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک گاڑی کے سوار نے بتایا۔ "آگے گڑبڑ ہے۔ گولی چل رہی ہے۔ دوسرے رستے سے جائیں۔"

ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ہمیں اسی رخ پر آگے بڑھنا تھا۔ ہم پولیس موبائلز کے پیچھے پیچھے ہی ہوٹل کی طرف بڑھے۔ ہوٹل میں ایک بڑا ہنگامہ ہو چکا تھا۔ پارکنگ کے سامنے مین دروازے کے آس پاس بہت سے شیشے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک ہلمین کار تیزی سے موڑ کاٹنے کی کوشش میں ایک دیوار کے اندر ٹھکی ہوئی تھی۔ اس کا بونٹ مڑ تڑ چکا تھا۔ کھڑکیاں چکنا چور تھیں اور گاڑی کی ایک سائیڈ مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی۔ اس گاڑی کو جیسے کسی دھماکے سے تباہ کیا گیا تھا۔ گاڑی کے پنجر میں دو لاشیں ابھی تک پھنسی ہوئی تھیں۔

نصیر کو ہوٹل کے مین گیٹ کے قریب ہی اپنی پہچان والا ایک شخص نظر آ گیا۔ یہاں اور بھی بہت سے تماشائی ہراساں چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

"یہ کیا ہوا ہے عبداللہ؟" نصیر نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ بودھوں کا ہوٹل ہے۔ اندر ایک پگوڈا بھی ہے۔ یہاں کبھی ایسا ہنگامہ نہیں ہوا۔"

ہم نے ایک بار پھر دھیان سے تباہ شدہ کار کو دیکھا۔ اس کے اندر موجود لاشیں ممبئی کے سکہ بند بدمعاشوں کی لگتی تھیں۔ سانولے رنگ، شرابی چہرے، دھاری دار شرٹیں، جگت سنگھ اردگرد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں اس کار کو تباہ کرنے والا دستی بم جگت سنگھ نے تو نہیں پھینکا تھا؟ اس کے پاس دستی بم موجود تھے اور وہ انہیں استعمال کرنے کے لئے بے قرار بھی بہت تھا۔ لیکن اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ یہاں ہوا کیا ہے کیا مارے جانے والے وہی بھکشو ہیں جن کے پاس مورتی تھی......اور مارنے والے کون تھے؟

اچانک نصیر کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ اس کا رنگ بدل گیا۔ فون بند کر کے نصیر نے کہا۔ ”آ جائیں عمران صاحب! یہ جگت کی کال تھی۔ ہمیں یہاں سے واپس جانا ہے۔“

یہ سوال جواب کا وقت نہیں تھا۔ ہم نصیر کے ساتھ واپس نیلی کار میں جا بیٹھے۔ کار تیزی سے روانہ ہوئی۔ ”کہاں ہے جگت؟“ میں نے نصیر سے پوچھا۔

”یہاں آس پاس ہی ہے جی۔“ نصیر نے کہا۔ وہ ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

کچھ آگے جا کر ایک بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے اس نے کار روک دی۔ ایک طرف سے چادر کی بکل میں لپٹا ہوا ایک شخص برآمد ہوا اور کار میں آ بیٹھا۔ ”ست سری اکال جی۔“ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ یہ جگت سنگھ ہی تھا۔

”یہ کیا ہوا ہے جگت؟“ میں نے کار کے روانہ ہوتے ہی پوچھا۔

”رتنا گری والے تینوں بھکشو مارے گئے ہیں۔ مورتی نکل گئی ہے۔ اسے وہ کتا جاوا نکال کر لے گیا ہے۔“ جگت نے پورے وثوق سے کہا۔

”جاوا؟ کیا تم نے دیکھا ہے اسے؟“ عمران حیرت سے بولا۔

”نہیں، جاوا کو تو نہیں دیکھا...... پر اس کے ایک کمینے کارندے کو ضرور پہچان لیا ہے۔ وہی جسے آپ پریم چوپڑا کہتے ہیں۔ وہ کتے دا پتر...... چوڑی نک والا۔“

”پر یہ سب ہوا کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”بادشاہ زادے! تمہیں کال کرنے کے بعد میں نے چائے کا آدھا کوپ ہی پیا تھا کہ ایک دم پانچ چھ لڑکے فراٹے بھرتے اندر وڑ آئے۔ وہ سیدھے اس کمرے میں گئے جہاں تینوں بھکشو اپنے ساتھی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک دم ہی کڑاکے کی فائرنگ شروع ہو گئی۔ مجھے لگتا ہے کہ بس پانچ چھ سیکنڈ کے اندر جاوا کے لڑکوں نے تینوں بھکشو مار دیئے۔ ان کا چوتھا ساتھی سخت زخمی ہے۔ ان تینوں چاروں نے بڑے آرام سے خود کو مروایا ہے۔ میں بھاگتا ہوا کمرے تک پہنچا تو لڑکے بھکشوؤں کو مارنے اور مورتی چھیننے کے بعد کھڑکی توڑ کر باہر نکل رہے تھے۔ میں نے ان پر گولی چلائی...... پر وہ نکل گئے۔ اس ویلے مجھے ان میں وہ پریم چوپڑا بھی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں...... فلالین کے گلابی کپڑے میں لپٹی ہوئی مورتی تھی۔ میں ان کے پیچھے دوڑا۔ ابھی کھڑکی سے کودا ہی تھا کہ مجھ پر گولیاں چلیں۔ یہ پارکنگ کی طرف سے آئی تھیں۔ میں سڑک پر لیٹ گیا...... اور ایک چھوٹی گڈی کے پیچھے چلا گیا۔ مجھ پر یہ گولیاں ایک لال کار سے چلائی گئی تھیں......“

”وہی لال ہلمین جو مین گیٹ کے پاس دیوار میں لگی ہے؟“ نصیر نے پوچھا۔

”ہاں وہی...... میں نے بھی اس پر گولیاں چلائیں۔ دو تین منٹ فائرنگ ہوئی پھر کار نے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی۔ یہ جاوا کے بندے تھے۔ میرے من میں ان کے لئے ورودھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے ان پر کالا انار پھینک دیا...... مر گئے کتے دے پلے......“

جگت سنگھ کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور اس کی آنکھوں ء میں غضب کی چنگاریاں تھیں۔

میں اور عمران سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سب کچھ گڑبڑ ہو رہا تھا۔ ساری پلاننگ، ساری سوچ بچار دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اب اگر جگت سنگھ کے بیان کے مطابق آرا کوئے واقعی جاوا کے پاس پہنچ چکی تھی تو پھر ہم تو اس کے لئے بے مصرف ہو گئے تھے۔ آرا کوئے کا کھوج لگانے والے اور اسے دواری مندر سے ہلانے والے ہم ہی تھے لیکن یہاں ستم یہ ہوا تھا کہ دواری مندر سے ہلنے کے بعد وہ خود ہی جاوا گروپ کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس بودھ ہوٹل میں جاوا کے مخبر ہوں۔ انہوں نے تینوں خوف زدہ بھکشوؤں کو اور ان کے کھمبیوں والے ٹرک کو دیکھا ہو اور چونک گئے ہوں۔ اس کے بعد انہیں آرا کوئے کی موجودگی کا پتا بھی چل گیا ہو۔

ہم پندرہ بیس منٹ کے اندر واپس نصیر کے مکان پر پہنچ گئے۔ جو ہوا تھا، بہت برا ہوا تھا۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں ہم دوسری بار آرا کوئے کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد اسے حاصل نہیں کر سکے تھے۔ جگت سنگھ بھی بہت پریشان تھا۔ وہ ثروت کو بڑے پیار سے ”چھوٹی“ کہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جاوا جیسے کنگ ڈان سے ”چھوٹی“ کی بحفاظت واپسی کے لئے آرا کوئے کا حصول ہمارے لئے کتنا ضروری تھا۔

بودھ ہوٹل سے واپسی کے وقت نصیر احمد اپنے ایک ساتھی کو موقعہ واردات پر چھوڑ آیا تھا تاکہ وہاں کی صورتِ حال کا تفصیلی پتا چل سکے۔ دس پندرہ منٹ بعد ہی اس بندے کی کال نصیر کے فون پر آ گئی۔ اس کا نام توفیق احمد تھا۔

توفیق نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”نصیر بھائی! زخمی ہونے والا چوتھا بھکشو بھی قریبی اسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ چار پانچ بندے زخمی بھی ہیں۔ یہاں بڑی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ کئی بڑی بڑی گاڑیاں موقع پر پہنچی ہیں۔ کئی سرکاری افسر اور عہدے دار بھی ہیں۔ کہاں جا رہا ہے کہ نہتے بھکشوؤں کو بیدردی سے قتل کرنے والے لوگ یہاں سے کوئی بہت قیمتی چیز چھین کر

لے گئے ہیں۔"

"مثلاً کیا؟"

"اس حوالے سے کوئی بات سامنے نہیں آ رہی۔ ہاں، کچھ لوگ یہ ضرور کہہ رہے ہیں کہ کل رات رتنا گری کی طرف ایک پرانے بودھ مندر میں بھی زوردار ہنگامہ ہوا ہے اور کچھ لوگوں کی ہتھیا ہوئی ہے۔"

عمران نے نصیر کے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔ "توفیق احمد! اس حملے کے لئے کسی پر شک کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے؟"

"بالکل کیا جا رہا ہے جی۔" توفیق احمد نے جواب دیا۔ "دبے لفظوں میں جاوا گروپ کی بات کی جا رہی ہے۔ موقع پر موجود ایک دو لوگوں نے جاوا کے بندوں کو پہچانا ہے لیکن گواہی کے طور پر پولیس کے سامنے آنے کو کوئی تیار نہیں اور یقینی بات ہے کہ کوئی آئے گا بھی نہیں۔"

"جوابی فائرنگ اور دستی بم کے دھماکے کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ بھکشو نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ کوئی سردار تھا جس نے اپنا چہرہ نیلی پگڑی کے پلو میں چھپا رکھا تھا اور چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے ہوٹل میں دیکھا گیا تھا۔ پولیس اسے بھی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کچھ لوگوں کو شک ہے کہ شاید یہ بندہ ابھی ہوٹل میں ہی چھپا ہوا ہے۔"

توفیق سے بات چیت ختم ہوئی تو میں اور عمران علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ "یہ تو سب کچھ چوپٹ ہو گیا عمران! اس سے تو اچھا تھا کہ یہ منحوس آرا کوئے گمشدہ ہی رہتا۔"

"جاوا کو کچھ نہ کچھ کریڈٹ تو ہمیں دینا ہی پڑے گا۔ ہم مورتی تک پہنچ گئے تھے اور مسلسل اس کے پیچھے تھے۔ اگر ہم دس منٹ پہلے پہنچ جاتے تو مورتی ہمارے پاس ہوتی۔"

"کیا خیال ہے...... ہم کہیں گے اور وہ ہماری بات مان لے گا؟ ثروت کو ہمارے حوالے کر دے گا؟" عمران خاموش رہا۔ میں نے کہا۔ "جاوا جتنا بڑا شیطان ہے، وہ میں جانتا ہوں اور تم مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہو۔ اگر واقعی آرا کوئے اس کے پاس پہنچ چکا ہے تو اب وہ اپنی من مانی کے لئے آزاد ہے۔ وہ...... ثروت کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے عمران...... ثروت کے ذریعے وہ ہمیں بڑی سے بڑی مجبوری کے نیچے دبا سکتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا...... تم فکر نہ کرو۔" عمران نے گھم...

سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا وہ بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

ہم ایک بار پھر کلرڈ شیشوں والی نیلی اسٹیٹ کار میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں۔ بس گھر سے تھوڑی دور جا کر جاوا سے فون پر رابطہ کرنا ہے۔"

نصیر کے گھر سے دو ڈھائی کلومیٹر آگے آ کر عمران نے ایک جگہ کار روک لی۔ یہ دو بجے کا وقت تھا۔ عمران نے جاوا کے ذاتی فون پر رابطہ کیا...... لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ مایوس ہو کر عمران نے ان نمبروں کو ٹرائی کیا جو جاوا نے ہمیں لاجسٹک سہولتوں کے لئے دیئے تھے۔ ایک موبائل پر کال ریسیو ہو گئی۔ "کون ہے؟" کھردرے لہجے میں پوچھا گیا۔

عمران نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ "میں جاوا صاحب یا چوپڑا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

چند لمحے کے لئے دوسری طرف مائیک پر ہاتھ رکھ دیا گیا۔ بولنے والا شاید کسی سے ہدایات طلب کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز اسپیکر پر ابھری۔ "بھیا صاحب (جاوا) اس وقت شہر سے باہر ہیں...... چوپڑا صاحب بھی رابطے میں نہیں ہیں۔ بعد میں فون کر لو۔"

"لیکن......" عمران کی بات پوری نہیں ہوئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

عمران نے دوبارہ کال ملائی...... تینوں نمبروں پر سات آٹھ دفعہ کوشش کی مگر کہیں رابطہ نہیں ہوا۔

وہی ہو رہا تھا جس کا بدترین اندیشہ ہمارے ذہنوں میں موجود تھا۔ جاوا جیسے لوگ کسی کے دوست ہوتے ہیں اور نہ ان میں اخلاق مروت نام کی کوئی شے ہوتی ہے۔ ان کے ہر فیصلے اور اصول کے پیچھے زبردست قسم کے ذاتی اور گروہی مقاصد ہوتے ہیں۔ ثروت کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ کر جاوا نے ایک زبردست پوائنٹ اسکور کر لیا تھا۔ اب ثروت کو بحفاظت چھڑانے کے لئے ہمیں بھی ایک زبردست پوائنٹ اسکور کرنے کی ضرورت تھی اور وہ پوائنٹ یہ تھا کہ ہم آرا کوئے ڈھونڈ کر اسے جاوا کے حوالے کر دیتے۔ یہاں بدقسمتی یہ ہوئی تھی کہ آرا کوئے ایک غیر معمولی اتفاق کے تحت خود بخود جاوا کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب جاوا کے ساتھ ہمارا "ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو" والا معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب اس کی طرف سے زبردست قسم کی سرد مہری سامنے آ رہی تھی۔

میری آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ میں نے کہا۔ ''عمران! میں جانتا ہوں، یہ بہت بڑا ڈان ہے اور شاید یہ بھی سچ ہے کہ ہم یہاں ممبئی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے......لیکن اگر اس نے ثروت کے معاملے میں کوئی حرامزدگی دکھائی تو میں اس کے گلے لگ کر مر جاؤں گا۔ مجھے ثروت واپس چاہئے۔ بس......آج رات سے پہلے پہلے۔'' جذبات کی شدت سے میرا سارا وجود لرزنے لگا۔

عمران نے بڑے اطمینان سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''میرے جگر پارے! میں ہوں نا یہاں......سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ثروت کو چھوڑے گا......ضرور چھوڑے گا۔''

''پر کیسے؟''

''گھبراؤ نہ۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا۔''

ہم وہیں موجود رہے۔ عمران بار بار سیل فون کے ذریعے جاوا یا چوپڑا سے رابطے کی کوشش کرتا رہا۔ بات چیت دور کی بات تھی، کسی ذمے دار بندے سے رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ وہ لوگ جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر رہے ہیں اور ان کی نیت میں فتور آ چکا ہے۔

دو دن پہلے نصیر احمد نے مجھے بتایا تھا......جاوا کے ممبئی میں بے شمار ہاتھ ہیں اور شاید بہت سے سر بھی۔ اسے بے شمار ہاتھوں اور بہت سے سروں والی ایک ایسی بلا کہا جا سکتا ہے جس نے شہر کے بیشتر حصے کو جکڑ رکھا ہے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔

ایک سنگین ترین اتفاق کے تحت میں اور عمران اس ''بلا'' کے رُوبرو آ گئے تھے اور میری وہ عزیز ترین ہستی داؤ پر لگ گئی تھی جس کے لئے میں ایک بار نہیں، کئی بار اپنی جان لٹا سکتا تھا۔ ثروت اپنی تمام تر دلکشی اور محبوبیت سمیت میرے تصور میں آ گئی۔ بے شک اس نے میرے بغیر زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ بے شک وہ اپنے ازدواجی رشتے کے خاردار حصار کو توڑنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی......لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں اسے زندہ سلامت اور خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اپنی جان پر ہر بڑی سے بڑی مصیبت جھیل سکتا تھا۔ محبت میں شرطیں نہیں ہوتیں۔ یہ نفع نقصان نہیں دیکھتی۔ یہ بس ہوتی ہے......یا نہیں ہوتی۔

جاوا سے رابطہ کرنے میں ناکام ہونے کے بعد ہم نے میڈم صفورا اور ثروت سے بات کرنے کی کوشش کی۔ میڈم صفورا کا فون بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میڈم صفورا سے فون کی سہولت واپس لے لی گئی ہے۔

عمران نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو آؤ......عالی جناب جاوا صاحب سے بنفسِ نفیس ملتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''کسی بھی اچھی سی جگہ پر یار! یہاں ممبئی میں درجنوں ''لواسپاٹ'' ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ جو ہمارا فون سننا بھی گوارا نہیں کر رہا، وہ ہمارے بلانے پر کسی جگہ چلا آئے گا۔''

''آئے گا جگر......سر کے بل آئے گا۔'' عمران کی آنکھوں میں تپش تھی۔

یہ اس کا وہی روپ تھا جو اسے اس کے کھلنڈرے روپ سے بالکل جدا کرتا تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے ہم دواری مندر سے نکلے تھے، مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ عمران مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ ہنگامے کے دوران میں جب ہمیں جگت سنگھ مقررہ جگہ پر نہیں ملا تھا تو عمران نے کہا تھا کہ وہ ابھی اسے دیکھ کر آتا ہے۔ واپسی میں اس نے تھوڑی سی تاخیر کر دی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟

اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال جواب کرتا، عمران نے موبائل فون پر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے جاوا اور اس کے اہلکاروں کے نمبرز پر کوئی ایس ایم ایس کیا ہے۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''جاوا کو بلا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی پانچ دس منٹ کے اندر جاوا یا چوپڑا کا فون آ جائے گا۔''

''کوئی منتر شنتر پڑھا ہے؟''

''منتر ہی سمجھو۔ بس دعا کرو یہ منتر سیدھا پڑ جائے۔''

''تم ہر وقت سسپنس میں کیوں رکھتے ہو؟''

''ہم میڈیا والوں کا کام ہی یہی ہے جگر! یورپ میں تو میڈیا والے پیدائشی طور پر سسپنس اور تھرل کے رسیا ہوتے ہیں۔ پہلا شکار اپنی والدہ کو ہی بناتے ہیں۔ اس بے چاری کو پتا ہی نہیں چلتا کہ نومولود کو کب پیدا ہونا ہے۔ وہ تین تین بار اسپتال کے چکر لگاتی ہے۔ ڈاکٹروں کے اندازے بھی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ایک بار سسپنس کا یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے تو زندگی بھر رکنے کا نام نہیں لیتا۔ ازدواجی حیثیت سسپنس......بیوی اور شوہر کی وفاداری سسپنس، سلسلۂ نسب سسپنس، یہاں تک کہ موت بھی سسپنس......اسپتالوں

میں نالیاں لگا لگا کر مہینوں تک مُردے کو زندہ رکھتے ہیں۔ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے......"

وہ اپنی زبان کو مسلسل حرکت دیتا چلا گیا۔ میں بری طرح چونکا جب میں نے دیکھا کہ عمران کے سیل فون پر کال موصول ہوئی۔ اسکرین پر ممبئی کے خطرناک ترین شخص کا نمبر چمک رہا تھا۔ یہ جاوا کا نمبر تھا۔ عمران کا کہا سچ ثابت ہوا تھا۔ "ہیلو، کون؟ کیا عمران ہیرو بول رہا ہے؟"

"ہاں، میں ہی ہوں۔" عمران نے جواب دیا۔

"ابھی تمہارا ایک میسج ملا ہے لیکن مجھے اس کی کوئی سمجھ نہیں آئی۔ یہ کیا ہے؟"

"جاوا صاحب! سمجھ آپ کو آ گئی ہے۔ اسی لئے آپ نے فون بھی کیا ہے۔ ورنہ آپ تو ہماری کال کا جواب ہی نہیں دے رہے تھے۔"

"تم...... کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ میں تو تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا...... کہ تم آرا کوئے کے بارے میں کوئی اچھی سماچار سناؤ گے۔"

"اچھی سماچار آپ جناب کو سنا تو دی ہے میں نے...... وہ آپ کے پاس پہنچ گئی ہے۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے آپ کے منحوس گرگوں نے بودھ ہوٹل میں چار بھکشو مارے ہیں اور آرا کوئے کو اُڑا کر آپ کی خدمت میں پہنچا دیا ہے۔ لیکن میں ایک بات آپ کو بتا دوں اور وہ آپ اپنی سمجھ دانی میں بڑی اچھی طرح بٹھا لیں۔ بات وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ بات وہی ہے جو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ آپ کے پاس کافی کاریگر بندے ہوں گے۔ خود آپ کا کھوپڑا بھی کافی بڑا ہے۔ آپ اچھی طرح تصدیق کر لیں...... یا کسی کاریگر سے کروا لیں۔ اس کے بعد مجھے فون کریں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو...... سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور...... تم اس سمے ہو کس جگہ؟"

"اس چکر میں نہ پڑیں جاوا جی۔ آپ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ فی الحال ہمارا رابطہ بس فون کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور فون کی لوکیشن ڈھونڈنا بھی بالکل بیکار ہو گا۔ میں اگلی کال کا انتظار کر رہا ہوں...... گڈ بائے۔"

عمران نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پتا نہیں کیا پلٹی ماری تھی کہ جاوا جو ہمیں یکسر نظرانداز کر رہا تھا، چند منٹ کے اندر اندر فون کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور لگتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں وہ پھر کال کرے گا۔

عمران نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔ "اب کہاں جانا ہے؟" میں نے کہا۔

"فی الحال تو کہیں نہیں جانا۔ بس اپنی جگہ ہی تبدیل کرنی ہے۔" اس نے کہا۔ اس نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر گہری سنجیدگی تیر رہی تھی۔ بے حد گہری اور سرد۔

ہم نے ساؤتھ ممبئی کا ایک طویل چکر کاٹا اور قریباً پانچ چھ کلومیٹر دور ایک بلند و بالا سینما کی وسیع پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دی۔ اس دوران میں ہم نے اپنے تعاقب کا بھی خاص خیال رکھا تھا۔ "ناریل پانی پیو گے؟" عمران نے پوچھا۔

"یار! مجھے بھی کچھ بتاؤ۔ یہ ہو کیا رہا ہے؟" میں نے اس کی آفر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"وہی جو جاوا جیسے بندے کے ساتھ ہونا چاہئے۔" اس نے نشست کو اسٹریچ کیا اور ٹیک لگا کر سگریٹ سلگا لی۔

"تمہارا خیال ہے، وہ دوبارہ فون کرے گا؟"

"اس کا باپ بھی کرے گا اور سو بار بھی کرنا پڑا تو کرے گا۔"

"لیکن کیوں؟ تم نے کوئی دھمکی دی ہے اسے؟"

"ممبئی کے اس خونی سانڈ کو دھمکی کون دے سکتا ہے۔ بس ایک حقیقت بتائی ہے اسے۔"

"حقیقت کیا ہے؟"

"ضرور پوچھنی ہے؟" اس نے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"اگر بتانے میں تمہارا کوئی بڑا نقصان ہو جائے گا تو نہ بتاؤ۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"ناراض ہو گئے ہو۔" وہ ہولے سے مسکرایا پھر سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر چھوڑ کر بولا۔ "انڈیا کی اس فلم نگری کے اندر بڑی فلمی سے صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ اس آرا کوئے نے سب کو گھما کر رکھ دیا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کل رات دواری کے مندر میں بڑی "ٹینشن" تھی۔ تمہیں پتا ہی ہے، وہاں دو گروپ تھے۔ ایک وہ لوگ تھے جو ڈاکٹر مہناز کی جان لے کر "حفاظت کی رسم" ادا کرنا چاہتے تھے...... دوسرا گروپ اصل بھکشوؤں کا تھا۔ وہ دھرم کے نام پر اس خون ریزی کو سخت گناہ سمجھ رہے تھے

اور چاہتے تھے کہ آرا کوئے کی ''حفاظت کی رسم'' کسی کی جان لئے بغیر ادا کی جائے۔ جنوبی گروپ جانتا تھا کہ رسم کے وقت کوئی بھی غیر متوقع صورتِ حال پیش آ جائے گی۔ انہیں کچھ پکی اطلاعات بھی مل چکی تھیں۔ انہوں نے اس کا توڑ کیا......''

''کیسا توڑ؟''

''تم خود سوچو۔ انہوں نے کیا کیا ہوگا؟ آرا کوئے ان کے لئے بہت قیمتی ہے۔''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ عمران۔'' اس کی باتوں سے میں زچ ہو چکا تھا۔

عمران نے ایک گہرا کش لیا اور نتھنوں سے دھواں چھوڑ کر بولا۔ ''کل رات رسم کے وقت چبوترے پر اصل مورتی نہیں تھی۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں جگر! وہ اصل کی ہو بہو نقل تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ بھکشو جو مورتی لے کر بھاگے اور جو کچھ دیر پہلے جاوا کے پاس پہنچی ہے، وہ اصل نہیں ہے۔'' عمران نے بڑے یقین کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ ''تو اصل کہاں ہے؟''

''اصل آرا کوئے مہا پجاری کے پاس تھی اور مہا پجاری ان بیس گروؤں میں سے ہی کوئی ایک تھا۔''

''تمہیں اس کا پتا ہے؟''

''تم سب کچھ آج ہی پوچھنے کا ارادہ رکھتے ہو...... کیا کل کا دن نہیں چڑھے گا؟''

''میرا خیال ہے کہ آج کا دن بہت زیادہ اہم ہے۔'' میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ پھر مسکرایا اور نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''جگر پارے! یہ بڑا زبردست اتفاق ہے کہ کل رات ہم نے جس گرو وستھا کے کان کاٹے، اصل میں وہی مہا پجاری یعنی بڑا گرو تھا۔ مجھے اس بات کا پتا اس وقت چلا جب وستھا نے ہمارے مجبور کرنے پر تحریر لکھی اور پھر اس پر اپنی گول مہر لگائی۔ اس نے یہ مہر اپنی دیوہیکل الماری کی دراز سے نکالی تھی۔ اس دراز میں ایک اور مہر پڑی ہوئی تھی۔ میری نظر اس مہر پر پڑ گئی۔ یہ مہا پجاری کی مہر تھی۔''

میں سوچنے لگا۔ اگر عمران کے بیان کے مطابق مہا پجاری گرو وستھا ہی تھا تو پھر یقینی بات تھی کہ اصل مورتی بھی گرو وستھا کے پاس ہی ہوگی۔ مجھے پھر یاد آیا کہ ہنگامے کے وقت جب ہم دواری مندر سے نکل رہے تھے تو عمران مجھے اور مہناز کو چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے گرو

وستھا کے کمرے کی طرف لپک گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جگت سنگھ کو دیکھنے جا رہا ہے۔ کہیں وہ مورتی کے لئے تو نہیں گیا تھا؟ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ بات ایسی ہی تھی...... وہ آرا کوئے کے لئے گیا تھا۔

میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمران! اصل آرا کوئے تمہارے پاس ہے نا؟''

مجھے حیرت ہوئی جب عمران نے فوراً اقرار کر لیا۔ شاید وہ مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بولا۔ ''تابی! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آج کا دن بڑا اہم ہے ہمارے لئے...... اور جاوا کے لئے بھی۔ آرا کوئے ہمارے پاس ہے اور ثروت جاوا کے پاس۔ آرا کوئے کے ساتھ ثروت کا تبادلہ ہوگا اور یہ سب کچھ ہمیں بہت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ جاوا جیسا زہریلا سانپ کسی بھی وقت ڈنک مار سکتا ہے۔''

''کہاں ہے آرا کوئے؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''اس پشتی بیگ میں جس میں، مَیں، اسے دواری مندر سے لے کر آیا ہوں۔'' عمران نے انکشاف کیا۔

عمران کا پشتی بیگ اس وقت نصیر احمد کے گھر پڑا تھا۔ عمران نے اسے تالے میں رکھا تھا۔ مجھ سمیت کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس عام سے ریگزین کے تھیلے میں وہ نادر ''پیس آف آرٹ'' موجود ہے جس نے ایک خلقت کو دیوانہ کر رکھا ہے۔ جس کی تلاش میں کروڑوں روپے خرچ ہوئے ہیں...... بہترین دماغ استعمال ہوئے ہیں اور قتل و غارت سمیت ہر طرح کی قانون شکنی کی گئی ہے۔ وہ دو فٹ لمبا دھات کا قدیم مجسمہ اس وقت نصیر احمد کے گھر میں موجود تھا۔

گھڑی کی سوئیاں اب سہ پہر چار بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا جاوا کو پتا چل جائے گا کہ اس کے پاس نقلی آرا کوئے ہے؟''

''کیوں نہیں چلے گا...... وہ ممبئی کے تین چار کھوچل ترین بدمعاشوں میں سے ایک ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس ہر صورتِ حال سے نمٹنے والے ''کاریگر'' بندے موجود ہوتے ہیں۔ تم دیکھنا، دس پندرہ منٹ کے اندر اس کا فون آئے گا۔''

میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ رسم کے موقع پر نقلی آرا کوئے رکھا جائے گا اور اصلی کہاں ہے؟ اس کا پتا کیسے چلا تمہیں؟''

''جس بھکشو کو ہم نے بالکل شروع میں آبدوز سرنگ سے نکلتے ہی پکڑا تھا، وہ گرو وستھا کا

خاص الخاص آدمی نکلا۔ وہ پتھر کے کلیجے والا ہے۔ اس نے ہمیں کچھ بتا کر نہیں دینا تھا لیکن جب میں نے اسے چکما دیا کہ مہا پجاری کے بارے میں ہم سب کچھ جان چکے ہیں اور مہا پجاری یعنی گرو وستھا نے ہمیں از خود بہت سی باتیں بتا دی ہیں تو وہ چکر میں آ گیا۔ ویسے بھی اندرونی چوٹوں کی وجہ سے اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں بہت سی باتیں بتا دیں۔"

عمران نے مجھے اس بارے میں تفصیل بتائی۔ اندازہ ہوا کہ وہ اس بارے میں کافی حد تک سچ بیانی کر رہا ہے۔ عمران کا پندرہ منٹ والا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ آٹھ دس منٹ بعد ہی اس کے فون کی بیل ہوگئی۔ یہ جاوا ہی تھا۔ اس کی گھمبیر آواز فون کے ننھے منے اسپیکر پر ابھری...... "میں جاوا بول رہا ہوں۔"

"آپ کے علاوہ اور کون بول سکتا ہے اس وقت۔" عمران نے اطمینان سے جواب دیا۔

وہ بولا۔ "مجھے ابھی ابھی جانکاری ملی ہے کہ میرے بندے کسی بودھ ہوٹل سے ایک مجسمہ لے کر آئے ہیں۔ وہ اسے آرا کوئے سمجھ رہے ہیں لیکن وہ نقلی ہے۔ تم نے جو اطلاع دی، وہ درست تھی۔"

عمران نے اطمینان سے کہا۔ "آپ بہت بڑے لعنتی ہو جاوا۔ آپ کو ابھی ابھی جانکاری نہیں ملی۔ اصلی نقلی کی بات تو اب معلوم ہوئی ہے لیکن باقی آپ کو سب کچھ بہت پہلے سے معلوم تھا اور بودھ ہوٹل میں بھی سب کچھ آپ کے حکم سے ہی ہوا۔ نقلی آرا کوئے کو بغل میں دبا کر آپ پہاڑ پر چڑھ گئے تھے۔ میری کالیں سن کر بھی نہیں سن رہے تھے۔"

"تم منہ سنبھال کر بات کرو ہیرو۔ مجھ سے اس طرح بات کرنے والے موت کی بھیک مانگا کرتے ہیں۔ پورا ممبئی جانتا ہے ایسے بدقسمت بھکاریوں کو۔"

"آپ جناب نے اپنی عزت کو اپنے ہاتھوں سے غارت کیا ہے۔ آپ پرلے درجے کے کمینے ہیں جاوا صاحب! آپ نے سوچا کہ آرا کوئے اب آپ کے ہاتھ آ گیا ہے۔ لہٰذا آپ نے ہمارے منہ پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کیا۔ آپ نے اپنے کمینے لونڈوں کو بھی ہدایت فرما دی کہ کوئی ہم سے رابطہ کرے اور نہ ہماری کال اٹھائی جائے۔ پیشہ کرنے والیوں کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ مجھے تو آپ اس سے بھی گئے گزرے لگے ہو۔"

"بکواس نہیں۔" جاوا اتنے زور سے چلایا کہ لگا، فون کے اسپیکر میں سے باہر نکل پڑے گا۔ اس نے عمران پر غلیظ گالیوں اور بدترین دھمکیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ آخر میں وہ دہاڑا۔

"میں دیکھ لیتا ہوں تجھے۔ کتے! میں دیکھ لیتا ہوں۔ تیرے لئے آج قیامت نہ لے آؤں تو سمجھ لینا جاوا اپنے باپ کا نہیں تھا...... نہیں تھا باپ کا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

اس شخص کے غصے سے ممبئی پناہ مانگتا تھا۔ اس کی دھمکی کو فرشتۂ اجل کی دھمکی سمجھا جاتا تھا۔ یہ دھمکی پتھر کو پگھلاتی تھی اور لوہے کو پانی کرتی تھی۔ شوبز کے بڑے بڑے جن اور سلور اسکرین کی کسی کو خاطر میں نہ لانے والی پریاں...... جاوا کے ایک بلاوے پر سر کے بل دوڑے چلے آتے تھے۔ وہ غضب کا دیوتا تھا۔ عمران نے جان بوجھ کر اس کے غضب کو زبردست اچھال دیا تھا اور ایسا کرنے کے باوجود عمران کے چہرے پر اطمینان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سجا کر بولا۔

"پریشانی کی بات نہیں جگر! یہ ابھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ موٹی سوئی والا ٹیکا لگا ہے نا اس لئے "اوئی اوئی" کر رہا ہے۔"

میں حیرت سے عمران کی صورت دیکھ رہا تھا۔

بمشکل آٹھ دس منٹ بعد پھر فون آ گیا۔ جاوا کا نمبر ہی تھا لیکن جاوا خود نہیں بول رہا تھا۔ اسپیکر پر جاوا کے قریبی ساتھی پریم چوپڑا کی منحوس آواز ابھری۔ اس بندے کی شکل تو مشہور فلمی ولن سے ملتی ہی تھی، اس نے اپنی آواز کو بھی مشہور ولن کی آواز کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہوئی تھی۔ پریم چوپڑا نے نہایت گھمبیر لہجے میں عمران کو بتایا کہ عمران نے اپنی غیر محتاط گفتگو سے جاوا صاحب کو سخت برہم کر دیا ہے اور ایسا کر کے اس نے اپنی مشکلات میں جو اضافہ کیا ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔

عمران نے کہا۔ "بس کیا یہی خوش خبری سنانے کے لئے تم نے فون کیا ہے؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی تب چوپڑا بھاری آواز میں بولا۔ "اس معاملے کا حل اگر لڑائی نکالو گے تو اتنا خون خرابا ہوگا کہ تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کر لو۔"

"اب بیٹھ کر نہیں، کھڑے ہو کر بات ہوگی اور درمیان میں کافی ساری رائفلیں بھی ہوں گی۔ تمہارے مالک نے اپنا ظرف دکھا دیا ہے۔ اب دوسری بار اس کم ظرف سے دھوکا نہیں کھائیں گے۔ اور اگر اس کی طرف سے کوشش ہوئی تو واقعی بڑا خون خرابا ہوگا...... انڈیا کی بڑی سے بڑی ایکشن فلم بھی اس خون خرابے کے سامنے مکی ماؤس کا کارٹون نظر آئے گی۔"

"کس طرح کی گارنٹی چاہتے ہو؟" چوپڑا نے پوچھا۔

"اب کوئی گارنٹی نہیں چلے گی۔ صرف کھلا میدان ہوگا اور اسلحے کی گارنٹی ہوگی۔ لیکن یہ تمہارا ملک ہے...... تمہارا شہر ہے...... ہمیں یہاں سے حفاظت کے ساتھ واپس نکلنے کے لئے ایک گارنٹی ضرور چاہئے ہوگی۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک یرغمالی...... لیکن تم کرائے کے ٹٹو ہو۔ میں تم سے تفصیلی بات کر کے اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے "باپ" سے کہو، اگر وہ کوئی ڈیل چاہتا ہے تو خود بات کرے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

عمران نے فون بند کر دیا۔

وہ جاوا اور چوپڑا سے جس طرح کا رویہ روا رکھے ہوئے تھا، وہ مجھے اندر سے لرزا رہا تھا۔ مجھے ہر گھڑی یہی دھڑکا تھا کہ کہیں جاوا مشتعل ہو کر ثروت کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ کوئی ایسی بات ہو جاتی تو میرے زندہ رہنے کا ہر جواز ختم ہو جاتا لیکن عمران بالکل اطمینان سے تھا۔ اسے یقین تھا کہ ثروت کو کچھ نہیں ہوگا۔ جاوا اس کا بال بھی بیکا نہیں کرے گا۔ وہ مجھے بھی پورے اعتماد سے یہ تسلی دے رہا تھا کہ ثروت، جاوا کے پاس بالکل محفوظ ہے۔

میں نے کہا۔ "تم کسی یرغمالی کی بات کر رہے تھے۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"بس ہے ایک چکر۔ وقت آنے پر بتا دوں گا۔" اس نے کہا اور کسی کا بھیجا ہوا ایس ایم ایس پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ جاوا کے فون کے انتظار میں گزرنے والا ہر پل ایک صدی کی طرح تھا۔ ابھی تک ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ثروت اور صفورا ہیں کہاں؟ ہم نے انہیں فرید کوٹ میں چھوڑا تھا اور اب ہم ممبئی میں تھے۔ آٹھ دس منٹ مزید گزر گئے تو میں نے عمران سے کہا۔ "یار! کہیں بات بگڑ نہ جائے۔ تم خود فون کر لو۔"

"وہی کتا کرے گا...... یہ اعصاب کی لڑائی ہے۔ دل مضبوط رکھو۔" ابھی عمران کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جاوا کی کال تھی۔ عمران نے کال ریسیو کی اور بات کرتا ہوا گاڑی سے باہر نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے اعصابی تناؤ سے بچانا چاہتا تھا۔ میری بے چینی اس پر بھی اثر انداز ہوتی تھی اور وہ اطمینان سے بات نہیں کر سکتا تھا۔

جاوا اور عمران کے درمیان قریباً بیس منٹ تک دھواں دھار گفتگو ہوئی۔ گفتگو کی سنگینی عمران کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ پارکنگ کے ایک خالی گوشے میں املی کے درخت سے

ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ آخر مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ کچھ باتیں طے ہو گئی ہیں۔ کچھ دیر بعد عمران فون بند کر کے گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں جارحانہ چمک تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

عمران نے رسٹ واچ دیکھی۔ "رات گیارہ بجے۔"

"کیا، رات گیارہ بجے؟"

"ثروت اور آرا کوئے کا ایکسچینج ہوگا۔ ثروت اور صفورا یہاں ممبئی میں پہنچ چکی ہیں۔ اب یہ ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو والا معاملہ ہے۔ ہرادیوی ساحل کے پاس کوئی کالی جھاڑ جگہ ہے۔ جاوا اپنے بندوں کے ساتھ آئے گا۔ ہم بھی اپنے بندوں کے ساتھ جائیں گے۔"

"کتنے بندے ہوں گے؟"

"چار چار گاڑیاں ہوں گی۔ سمجھو بیس بائیس بندے ہمارے...... بیس بائیس ان کے۔"

"اور اگر کچھ ہو گیا تو؟ جو ایسے موقعوں پر ہو جاتا ہے۔"

"یار تابی! اس طرح کیوں سوچ رہا ہے؟ تو بزدل تو نہیں ہے۔ میں چنگی طرح جانتا ہوں، پھر یہ سب باتیں؟"

"یار! مجھے اس نے بزدل بنا دیا ہے۔ وہ بیچ میں نہ ہوتی تو میں تم سے دو قدم آگے نظر آتا۔ تم نے مجھے موت کے آگے بھاگنے کے بجائے موت کے پیچھے بھاگنا سکھا دیا ہے اور موت سے ڈرنا بھی۔ مر تو شاید میں اسی دن جاتا...... جب پانچ سال پہلے مجھے سیٹھ سراج نے فرار کیا تھا اور میں نے خودکشی کرنا چاہی تھی۔ اب یہ ساری زندگی تو بونس کی طرح ہی لگتی ہے عمران۔ مجھے صرف ثروت کا خیال آتا ہے۔ میں چاہتا ہوں...... وہ...... کسی بھی طرح حفاظت سے واپس پاکستان پہنچ جائے۔ اپنی بہن کے پاس، اپنے شوہر کے پاس...... وہ زندہ رہے...... اور خوش رہے۔"

"وہ زندہ رہے گی...... خوش رہے گی...... اور رہے گی بھی تمہارے ساتھ۔" تم اس طرح کی باتیں کرتے ہو تو میرا دل چاہتا ہے تمہارا تھوبڑا توڑ دوں یا کوئی وزنی شے مار کر اپنا سر ٹکڑے کر لوں...... خدا کے لئے...... یار خدا کے لئے...... وہ کمزور عورت ہے۔ دنیا سے لڑنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ یہ ہمت اسے تم نے ہی دینی ہے، تمہاری محبت نے ہی دینی ہے۔ جتنی ہمت دکھاؤ گے، اتنا صلہ پاؤ گے۔ وہ کیا کہہ گئے ہیں مولانا سرسیّد۔ "عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی......"

اس نے حسبِ عادت جان بوجھ کر اقبال کے شعر کو...... سرسیّد سے جوڑ دیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے جھپٹ کر میرا منہ ہاتھ سے بند کر دیا۔ ''بس اب چپ ہو جاؤ۔ خدا کے لئے...... تمہیں پیر احمد تھانوی صاحب کا واسطہ۔ نہیں تو میں ریوالور کا کھیل شروع کر دوں گا۔ سارے خانوں میں گولی رکھ کر خود پر ٹریگر دبا دوں گا۔ ہنڈرڈ پرسنٹ ڈیتھ۔''

اسی دوران میں اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ ایک بار پھر گہری سنجیدگی نے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف رتنا گری والا شیکھر تھا۔ لیکن اب وہ ممبئی سے بول رہا تھا۔ ''ہمارے لئے کیا آرڈر ہے جناب؟'' اس نے پوچھا۔

''آرڈر بہت تگڑا ہے۔ اپنے بندوں کو تیار کر دو۔ پورب وغیرہ کو بھی خبر کرو۔ رات گیارہ بجے جاوا کے ساتھ ڈیل فائنل ہو رہی ہے۔ ''ہرا دیوی'' بیچ پر کالی جھاڑ نامی جگہ کا طے ہوا ہے۔ ہمیں بھی پاور سے جانا ہوگا۔ پچیس کے قریب بندے ہونے چاہئیں۔ دس میرے پاس ہیں۔ چودہ پندرہ تم نے کرنے ہیں لیکن ایک بھی کچا بندہ نہیں ہونا چاہئے، میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب! پورے پکے بندے ہیں، چنے ہوئے شوٹرز۔ آپ تقریباً سب کو جانتے ہیں۔ ایک انچ پیچھے ہٹنے والے ناہیں...... بلکہ اگر آپ چاہیں تو زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔''

''نہیں، زیادہ نہیں۔ بس چوبیس پچیس کافی ہیں۔ گاڑیاں اور اسلحہ بھی بالکل فٹ ہونا چاہئے۔ کسی ہیلپ کی ضرورت ہو تو نصیر سے رابطہ کرو۔''

''دو گھنٹے کے اندر سب تیار ہوگا جی۔ اگر آپ کہیں تو کچھ بندوں کو اسٹینڈ بائی بھی رکھ لوں۔''

''ضرورت تو نہیں پڑے گی قربان علی۔ لیکن اگر چاہتے ہو تو رکھ لو۔''

عمران نے فون بند کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''یہ آواز تو شیکھر کی تھی اور تم اسے قربان علی کہہ رہے تھے؟''

''قربان علی کہہ رہا تھا؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''شاید پریشانی میں پتا ہی نہیں چلا۔''

''عمران! تم سیدھی بات کیوں نہیں کرتے؟ یہ بھی تمہارا ہرکارہ ہے اور شیکھر کے روپ میں کوئی قربان علی ہے۔''

''ہرکارہ کا لفظ تم غلط استعمال کر رہے ہو۔ تم اسے دوست کہہ سکتے ہو۔''

''نہیں عمران! تم بہت کچھ چھپاتے ہو مجھ سے...... دوسری طرف اپنا سب سے قریبی

دوست بھی کہتے ہو۔ قریبی دوستیاں اس طرح پردے رکھنے سے آگے نہیں چلتیں۔ کبھی کبھی میں اپنے آپ کو تمہارے لئے بالکل غیر سمجھنے لگتا ہوں۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ یہ کون لوگ ہیں جو تمہارے لئے کام کرتے ہیں؟ یہ خاص طور پر انڈیا میں تمہارے اردگرد موجود ہیں۔ سلطان چٹا اور ندیم جیسے بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ تم وہ نہیں ہو جو اوپر سے نظر آتے ہو۔''

عمران نے ایک گہری سانس لی اور ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''کیا سننا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''یہی کہ یہ سب تمہارے حکم مانتے ہیں اور سر دھڑ کی بازی بھی لگاتے ہیں؟''

''تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے؟'' عمران نے آنکھیں بند کئے کئے پوچھا۔

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ گہرے پانیوں کی طرح خاموش تھا۔ میں نے کہا۔

''کیا یہ کوئی آرگنائزیشن ہے؟''

عمران نے اپنی نیم سرخ آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر بولا۔ ''تم نوے فیصد درست نتیجے پر پہنچے ہو۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی تسلیم کر لے گا۔

''کس طرح کی آرگنائزیشن؟ سرکاری یا پرائیویٹ؟'' میں نے پوچھا۔

''پرائیویٹ۔''

''کیا کام کرتی ہے؟''

''وہی جو اب کر رہی ہے۔ وہی جو دو سال پہلے بھانڈیل میں کیا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''دوسرے ملکوں، خاص طور سے انڈیا میں پھنسے ہوئے بے گناہ پاکستانیوں کو حبس بے جا اور قید و بند سے نجات دلانا۔ قانونی طریقے سے یا پھر کسی بھی طریقے سے۔''

عمران بے حد سنجیدہ تھا۔ میں اس کا یہ موڈ پہچانتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اس وقت وہ جو کہہ رہا ہے، درست کہہ رہا ہے۔ میں بہت پیچھے تک سوچنے لگا۔ عمران مجھے آج بتا رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں بہت پہلے سے مجھے لگتا تھا کہ عمران کسی خاص نظم کے ساتھ کام کرتا ہے اور کچھ خاص لوگوں کے ساتھ اس کی ورکنگ ریلیشن شپ موجود ہے۔ چند ماہ پہلے بھانڈیل سے نکلنے کے بعد جب ہم الٰہ آباد پہنچے تھے تو وہاں بھی کچھ مقامی لوگوں سے عمران کا واسطہ پڑا تھا۔ دیگر لوگوں کے علاوہ یہ پتا بھی چلا تھا کہ عمران اپنی سرکس کمپنی کے ساتھ انڈیا آیا تھا جہاں وہ ایک بڑے جھگڑے میں ملوث ہو گیا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران اپنے سرکس والے کا کو بھی

خاص مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ میرے اور عمران کے درمیان اس موضوع پر چند منٹ گفتگو ہوئی۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔ ''اس کا مطلب ہے عمران، جب تم مجھے ڈھونڈتے ہوئے بھانڈیل اسٹیٹ پہنچے تو وہ بھی صرف میری دوستی کے لئے نہیں تھا بلکہ تمہارے کام کا ایک حصہ تھا۔ تمہیں میرے علاوہ میڈم صفورا اور ابرار وغیرہ کو بھی ڈھونڈنا تھا اور آج تم سویٹی عرف ایشوریا اور دوسری لڑکیوں کو واپس پاکستان لے جانے کے لئے میرے ساتھ ہو۔''

اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مدہم مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مجھے نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ ''جگر! جب کام کے ساتھ محبت بھی شامل ہو جائے تو ہر چوٹی سر ہو جاتی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں تمہاری محبت پہلے تھی، کام اس کے بعد تھا۔''

''اور اب؟''

''اب بھی تمہاری محبت اور دوستی پہلے ہے، کام بعد میں۔ اگر تمہارے اور ثروت کے ساتھ ساتھ میں سویٹی، فاخرہ، مہناز وغیرہ کو بھی پاکستان واپس لے جانے میں کامیاب ہو گیا تو یہ میرے لئے بونس ہوگا۔''

''جیلانی، اقبال، امتیاز اور صفورا وغیرہ بھی سب جانتے ہیں؟''

''صرف جیلانی، اقبال اور امتیاز...... ہم بہت عرصے سے اکٹھے کام کر رہے ہیں۔ ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں۔''

''یہ آرگنائزیشن یا جو کچھ بھی یہ ہے، تم چلاتے ہو؟''

''نہیں یار! میں تو بس اس کا ایک حصہ ہوں۔ یہ ایک بڑا ادارہ ہے۔''

''کون چلا رہا ہے؟''

''سمجھو اوپر والا ہی چلا رہا ہے۔ تم سمجھ ہی گئے ہو گے، یہ کتنا خطرناک کام ہے۔''

''تم بات پھر گول کر رہے ہو۔''

''تم سے کچھ بھی چھپانا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔''

''لیکن تم چھپا رہے ہو عمران۔ اب تو کسی وقت مجھے یہ بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ تم نے مجھے اپنی جوانی اور لڑکپن کی جو رُوداد سنا رکھی ہے، شاید اس میں بھی کچھ ہیر پھیر ہو۔''

''نہیں تابش۔'' عمران نے بڑی متانت سے کہا۔ ''وہ سب کچھ سچ ہے۔ تمہارے سر کی قسم۔'' اس نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''اس رُوداد میں کچھ بھی جھوٹ نہیں۔ ہاں

صرف...... صرف ایک بات ایسی ہے جس کی میں نے تم سے پوری وضاحت نہیں کی۔ اس کا تعلق والدہ سے ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''بھانڈیل اسٹیٹ سے آنے کے بعد تم نے کئی بار مجھ سے پوچھا ہے کہ میں والدہ کو ڈھونڈ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے کہا ہے، ہاں میں کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے تابی کہ میں نے والدہ کو ڈھونڈنا ترک کر دیا ہے۔ قریباً تین سال پہلے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پھر بھی اس بات کو اپنی زبان سے کہنے کی ہمت مجھے کبھی نہیں ہوئی۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کیا تمہیں کچھ پتا چلا تھا؟''

اس نے آنکھیں بند کئے کئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''انڈیا سے رہا ہو کر آنے والے ایک پاکستانی کاشت کار کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ اس نے میری والدہ کو چندی گڑھ کی زنانہ جیل میں دیکھا تھا۔ والدہ نے اسے میرا ایڈریس دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ کسی طرح مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اس شریف بندے نے اپنا وعدہ نبھایا اور کسی نہ کسی طرح مجھے ڈھونڈ لیا۔ اس کی زبانی پتا چلا کہ بیمار والدہ کو میری تلاش نے نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں کہاں ماری ماری پھرا کرتی تھیں۔ کسی ایسی ہی کیفیت میں وہ سرحدی علاقے کی طرف چلی گئیں اور وہاں بی ایس ایف والوں نے انہیں پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ایسے بدنصیب لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ مہینوں اور سالوں تک بغیر کسی مقدمے کے جیلوں میں سڑتے رہتے ہیں۔ کاشت کار عباس علی نے انہیں چندی گڑھ جیل میں دیکھا تھا اور اسے پتا چلا تھا کہ انہیں چند ہفتوں بعد امرتسر جیل منتقل کیا جا رہا ہے۔ ان دنوں تک سرکس میں میری اچھی جگہ بن چکی تھی۔ مالک جان محمد صاحب نے میرا ویزا لگوایا اور میں انڈیا پہنچ گیا۔ میں نے امرتسر اور چندی گڑھ وغیرہ میں ایک مہینہ زبردست تخجل خرابی جھیلی لیکن والدہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ جیل والوں کے پاس بھی کوئی ریکارڈ نہ تھا۔ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کا رویہ سخت حوصلہ شکنی کا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک سرحد پار سے آنے والا ہر شخص دہشت گرد یا خطرناک جاسوس ٹھہرتا ہے۔

''اگلے ایک برس میں، مَیں نے قریباً چھ دفعہ انڈیا کا سفر کیا۔ جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ مجھے انڈیا کی سیکیورٹی ایجنسیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کا اصل چہرہ دیکھنے کو ملا۔ مجھے اس اندرونی نفرت اور عداوت کا اندازہ ہوا جو یہ لوگ مصیبت زدہ غیر ملکیوں اور خصوصاً

پاکستانیوں سے رکھتے ہیں۔ اپنی والدہ کا سراغ لگاتے لگاتے میں راجستھان میں بیکانیر کی ایک دور دراز جیل میں پہنچا۔ لیکن میرے وہاں پہنچنے سے چار پانچ دن پہلے ہی وہاں ایک بڑا سانحہ رُونما ہو چکا تھا۔ جیل کے زنانہ حصے میں ایک بڑی آگ لگی تھی جس میں چالیس پچاس قیدی عورتیں اور زنانہ عملے کی بہت سی ارکان جل کر خاکستر ہو گئی تھیں۔''

عمران کی آنکھوں میں، مَیں نے پہلی بار نمی دیکھی۔ اس نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندیں تو دو بوندیں اس کے ابھرے ہوئے رخساروں پر لڑھک گئیں۔

''میری ماں مر چکی ہے تابی! لیکن وہ اَن گنت لوگ ابھی زندہ ہیں جو بدقسمتی سے بھارتی جیلوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ غلطی سے سرحد پار کر جانے والے چرواہے، ماہی گیر، سیاحت کے لئے جانے والے اور غائب ہو جانے والے بے گناہ...... اور اس قسم کے اور بہت سے لوگ۔ چند سال پہلے ہی میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں ایسے لوگوں کے لئے کام کروں گا۔ ان کا کھوج لگاؤں گا، ان کے پیاروں تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ والدہ کی تلاش کے دوران میں کچھ لوگوں کے لئے میرے اندر بڑی نفرت نے جنم لیا تھا۔ اس کا نتیجہ انڈین سرکار کے تین چار اہلکاروں کی موت کی صورت میں نکلا۔ انڈین پولیس میرے پیچھے پڑ گئی۔ اسی دوران میں مجھے ایک پرائیویٹ تنظیم کا پتا چلا۔ اسے ایک سابق پاکستانی فوجی افسر چلا رہا تھا۔ اس تنظیم کے مقاصد وہی تھے جو میرے دل و دماغ میں بھی جگہ بنا چکے تھے۔ میں اس میں شامل ہو گیا۔ اب میں اس کا ایک حصہ ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم اس بارے میں مجھ سے مزید سوالات نہیں کرو گے۔ پلیز! میری مجبوری سمجھنا۔ میں نے کچھ چیزوں کا حلف اٹھایا ہوا ہے۔''

میں حیران تھا۔ عمران کی زندگی کا یہ پہلو اب تک میری نظر سے بالکل اوجھل رہا تھا۔ اس بات کا علم تو مجھے بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلتے ہی ہو گیا تھا کہ عمران کا انڈیا میں آنا جانا ہے اور یہاں اس کے دوست اور دشمن موجود ہیں۔ سجاد موہل جیسے خوں خوار پولیس آفیسر نے ہمیں گرفتار کیا تھا اور پھر مجھے پتا چلا تھا کہ اس گرفتاری کی وجہ منوج نامی ایک آوارہ شخص ہے جو کچھ عرصہ پہلے عمران کی فائرنگ سے شدید زخمی اور پھر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس طرح کے کئی معاملات عمران کے ساتھ نتھی تھے۔

اس سے پہلے کہ سینما کی پارکنگ میں ہماری گفتگو مزید آگے بڑھتی، ایک طرف سے ایک سانولا سا بندہ نمودار ہوا۔ اس نے گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک پرچی عمران کی گود میں پھینک دی۔ انگلش میں ایک دو جملے لکھے تھے۔ عمران نے پرچی پر نظر دوڑائی اور

سگریٹ بجھا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''کیا بات ہے؟''

''خطرہ ہے، ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔'' اس نے کہا۔

وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا مین روڈ پر آیا۔ گاہے بگاہے اس کی نگاہیں عقب نما آئینے میں بھی اٹھ رہی تھیں۔ بہرطور خیریت گزری۔ ہم دس پندرہ منٹ کے اندر نصیر احمد کے گھر تک پہنچ گئے۔ راستے میں عمران نے کوئی بات کی اور نہ میں نے کچھ پوچھا۔ پتا نہیں وہ ایک دم سے کچھ غیر سا لگنے لگا تھا۔

یوں تو میری اور عمران کی پہلی ملاقات کو پانچ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن حقیقت میں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت زیادہ وقت نہیں گزارا تھا۔ مجھے تقریباً چار سال بھانڈیل اسٹیٹ میں کاٹنا پڑے تھے۔ بھانڈیل میں کچھ عرصہ عمران بھی میرے ساتھ رہا تھا لیکن وہاں اس کا یہ پُراسرار روپ میرے سامنے نہیں آ سکا تھا۔ اب ہم جب سے انڈیا آئے تھے، میں اس کے حوالے سے مسلسل الجھن کا شکار تھا۔ وہ کئی رفاعی کام کرتا تھا لیکن آج مجھے اس کے خاص الخاص رفاعی کام کا پتا چلا تھا۔

رات ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ پچھلے چھتیس گھنٹے میں واقعات بڑی تیزی سے رُونما ہوئے تھے۔ ہم، موہن بجلی کی مدد سے دواری مندر میں آرا کوئے تک پہنچے۔ ہم نے اسے کھویا۔ ہم مہناز کو بچا کر ممبئی لائے۔ پھر ہمیں پتا چلا کہ آرا کوئے جاوا گروپ کے پاس پہنچ چکا ہے اور اب تازہ ترین و حیرت انگیز انکشاف یہ تھا کہ آرا کوئے عمران کے پاس ہے اور ہم آج رات گیارہ بجے ثروت اور صفورا سے آرا کوئے کا تبادلہ کر رہے ہیں۔

اس حوالے سے عمران کسی ضامن یعنی یرغمالی کا ذکر بھی کر رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ جاوا جیسا ڈان اس کی بات مانے گا اور ثروت، صفورا کے علاوہ یہ ضامن بھی اس کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ مجھے صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں کوئی کھچڑی سی پک رہی ہے۔ لیکن کیا؟ میں ابھی پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔

میں آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ عمران نے اپنی والدہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ ان سے بس غائبانہ تعارف تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے کوئی اپنا بچھڑ گیا ہے۔ کبھی دوبارہ نہ ملنے کے لئے...... پھر ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ڈاکٹر رسام کا خیال ذہن میں آیا۔ وہ اس مورتی کے سفر میں بے موت مارا گیا تھا...... عمران کمرے سے جا چکا تھا۔ شاید اس

نے سوچا تھا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے سو گیا ہوں لیکن میں جاگ رہا تھا اور میری ساری حسیات بھی بیدار تھیں۔ کچھ دیر بعد مجھے چھت پر قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ اس چاپ کے انداز نے گواہی دی کہ یہ عمران ہے۔ وہ چھت پر کیا کرنے گیا تھا؟ میں تجسس سے مجبور ہو کر اٹھا اور چپل پہن کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ کامن روم میں ڈاکٹر مہناز خود ہی اپنے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف تھی۔ سویٹی عرف ایشوریا اس کی مدد کر رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں ڈاکٹر مہناز کے قریب رکا تو وہ پھر وہی سوال کرے گی کہ جلالی صاحب سے اس کا رابطہ کب ممکن ہو سکے گا۔ میں مہناز سے پہلو بچاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور بہ آہستگی اوپر چھت پر پہنچ گیا۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ ممبئی میں ہزاروں لاکھوں قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ یہ وسیع وعریض سلسلہ مغرب میں سمندر تک پھیلا ہوا تھا۔ سمندر کے تاریک سینے پر بھی اَن گنت روشن نکتے ٹمٹمارہے تھے۔ ایک طویل برآمدے سے گزر کر میں دو روشن کمروں کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے پتا تھا کہ عمران کی حسیات بڑی تیز ہیں۔ میں نے چپل اتار دی اور ننگے پاؤں بے آواز چلتا ہوا کمروں کی عقبی سمت میں چلا گیا۔ یہاں جنریٹر کے لئے تیل کا ایک ڈرم رکھا تھا۔ فی الوقت یہ ڈرم خالی تھا۔ میں نے اسے بے آواز طریقے سے گھما کر دیوار کے پاس رکھ دیا۔ اس ڈرم پر کھڑے ہو کر میں ایک روزن سے کمرے کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ جیلانی آنسوؤں سے بھیگے چہرے کے ساتھ عمران کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی مدھم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''نہیں جناب! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ ایسا نہ کریں۔ ہم آپ کی توقع سے بڑھ کر کام کریں گے۔ کوئی بندہ ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ جانیں دے دیں گے۔ وہی کریں گے جو آپ نے کرنا ہے لیکن آپ سامنے نہ آئیں۔ معاملہ بہت بگڑ چکا ہے۔ وہ لوگ موقع ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''نہیں شیخ! کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں سوچ لیتا۔ لیکن یہاں تابی کا اور اس کی عزیزہ کا معاملہ ہے۔ وہ دونوں میری ذمے داری ہیں۔ میں یہ ذمے داری کسی اور پر نہیں ڈال سکتا۔ جو کچھ بھی ہے، وہاں مجھے ہی جانا ہوگا۔ جہاں اتنی بار رسک لیا ہے، ایک بار اور سہی۔''

''آپ پہلے بھی اس طرح کی بات کر چکے ہیں جناب! آپ نے یہاں آتے ہوئے کہا تھا کہ چار پانچ دن سے زیادہ نہیں رکیں گے انڈیا میں۔ اب دیکھیں، تین ہفتے ہو چکے ہیں۔ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا وہاں ہمارے بعد۔ اب آپ خود کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈالتے جا رہے ہیں۔''

''میں نے کہا ہے نا، یہ آخری رسک ہمیں لینا ہی ہوگا۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم کامیاب ہوں گے۔''

''وہ بہت کمینہ ہے عمران صاحب! اب تو ثبوت مل چکا ہے کہ وہ سب کچھ جان چکا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اطلاع دے سکتا ہے۔ پولیس، بی ایس ایف، فوج، سب بھوکے جانوروں کی طرح آپ کی طرف لپک آئیں گے۔ وہ بس اتنا کرے گا کہ......''

''وہ کچھ نہیں کرے گا۔'' عمران نے ٹھوس لہجے میں جیلانی کی بات کاٹی۔ ''میری بات یاد رکھنا، جب تک آرا کوئے ہمارے پاس ہے وہ کسی کو اطلاع دینے کی حماقت نہیں کرے گا۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ آرا کوئے کے اور دعوے دار پیدا ہو جائیں۔ وہ کوئی بھی حرکت تب کرے گا، جب آرا کوئے اس کے ہاتھ آ چکا ہوگا لیکن آرا کوئے تب اس کے ہاتھ آئے گا جب یرغمالی ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔ اور تم جانتے ہو اس یرغمالی کے ہوتے ہوئے جاوا کو اپنی زبان پر تالا لگانا پڑے گا۔ یہ تالا اس وقت کھلے گا جب یرغمالی اسے واپس ملے گا اور ہم پاکستان میں ہوں گے۔''

''وہ کیسے اسے یرغمالی کے طور پر ہمارے حوالے کرے گا؟ یہ اس کے لئے بڑا مشکل کام ہوگا عمران صاحب۔''

''ہم نے بھی تو مشکل کام کئے ہیں۔ ثروت اور صفورا کو اس کے پاس بطور ضمانت نہیں رکھا؟ اسے بھی کرنا پڑے گا۔ آرا کوئے والا کھیل اتنا بڑا ہے کہ اسے یہ داؤ لگانا ہی پڑے گا۔ ہمارے درمیان فون پر بڑی لمبی بحث ہوئی ہے۔ آخر اسے آمادہ ہونا پڑا ہے۔ ایسا گولڈن چانس اسے پوری زندگی میں پھر نہیں مل سکتا۔ اس نے سب کچھ ناپ تول لیا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں شیخ! یہ بات طے ہے کہ مجھے خود وہاں جانا ہے۔ تم بس تیاری کرو۔ تم دیکھنا، ہم جاوا کو اس کی ساری عیاریوں سمیت جکڑ کر رکھ دیں گے۔ مدتوں تک زخم چاٹے گا۔ ہم ایک بار ثروت کو اس کے چنگل سے نکال لیں پھر سارے حساب برابر کر دیں گے۔''

اب وہ لوگ باہر نکلنے والے تھے۔ میں جلدی سے ڈرم پر سے اترا اور دبے پاؤں چلتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں نے آج پہلی بار جیلانی جیسے مضبوط شخص کو آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ یقیناً یہ کوئی نہایت سیریس معاملہ تھا۔ میری توقع سے کہیں زیادہ گھمبیر۔ وہ پتا نہیں کس حوالے سے بات کر رہے تھے۔ وہ کیا خاص بات تھی جس کا پتا ڈان کو چل چکا تھا اور اب اس کے توڑ کے لئے عمران اس سے کوئی خاص ضامن یعنی

یرغمالی مانگ رہا تھا؟ اور وہ مانگ ہی نہیں رہا تھا، ڈان جاوا دینے کے لئے تیار بھی ہو گیا تھا۔ اس سے آراکوئے کی بے پناہ قدر و قیمت کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ بین الاقوامی سطح پر لاکھوں نہیں، کروڑوں ڈالرز کی ''چیز'' ہے۔

میں پہلے کی طرح بستر پر خاموش لیٹا رہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عمران کمرے میں آیا۔ کچھ دیر مجھے دیکھا پھر باہر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نصیر کے ساتھ نیلی کار پر کہیں گیا ہے۔ یہ میرے لئے اچھا موقع تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اوپر چھت والے کمرے کی ایک ''ڈپلی کیٹ'' چابی بھی موجود ہے۔ یہ چابی نصیر احمد کے کمرے میں تھی اور نصیر بھی عمران کے ساتھ گیا تھا۔ میں نصیر کے کمرے میں پہنچا۔ دو تین منٹ کی کوشش سے میں نے مطلوبہ چابی ایک دراز میں سے ڈھونڈ لی۔ اس چابی کے ساتھ میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ راستے میں جیلانی ملا۔ اس سے ایک دو باتیں ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ عمران ذرا سپر مارکیٹ تک گیا ہے۔ جیلانی بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آنکھوں کی سرخی کچھ اور بتا رہی تھی۔ جیلانی نے ایک فون سننا شروع کیا تو میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت والے کمرے کی طرف آ گیا۔ اس کمرے میں نصیر کا کمپیوٹر پڑا رہتا تھا اور لینڈ لائن فون بھی یہیں تھا۔ میں نے عمران کو دو تین بار اس کمرے میں گھسے ہوئے پایا تھا۔ منگل کی رات بھی وہ کافی دیر اس کمرے میں رہا تھا۔

میں نے تالا کھولا اور کمرے میں پہنچا لیکن لائٹ آن نہیں کی۔ میرے پاس ایک پنسل ٹارچ موجود تھی۔ میں نے کھڑکیوں کے پردے اچھی طرح برابر کئے اور کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ نیٹ آن تھا۔ میں نے سی پی یو آن کیا۔ مانیٹر پر تفصیلات ظاہر ہونے لگیں۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نصیر کے ای میل باکس میں پہنچ گیا، پاس ورڈ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ یہاں ایک ای میل نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ دو روز پہلے آئی تھی۔ میں دم بخود دیکھتا رہ گیا۔

اس ای میل میں عمران اور جیلانی کو بتایا گیا تھا کہ اقبال کی لاش مل گئی ہے۔ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ درندگی کی انتہا کر دی گئی ہے۔ لاش کے سینے پر پرچہ رکھا ہوا ملا ہے۔ اس پر لکھا ہے۔ ''نادر ٹی ٹی کے دوستوں کی طرف سے بڑی عید کا تحفہ۔'' اندازہ ہو رہا ہے کہ ان لوگوں نے اقبال کو خاص قسم کے نشہ آور انجکشن دیئے ہیں اور ان انجکشنوں کے زیر اثر اس سے بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ عین ممکن ہے بلکہ یقینی بات ہے کہ اب انڈیا میں آپ لوگوں کی شناخت راز نہیں رہی۔ صاف پتا چلتا ہے کہ یہ جاوا گروپ کی کارروائی ہے۔ انہوں نے اس طرح نادر ٹی ٹی کے قتل، لالہ زار ہوٹل اور انڈسٹریل ایریا والی کارروائی کا بدلہ لیا ہے۔ ہم وقتی طور پر روپوش ہیں۔ آپ کی ہدایات کا انتظار ہے۔

میں یہ ای میل پڑھ کر سکتے میں رہ گیا۔ عمران نے مجھے مکمل اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ اقبال کی موت والا سنگین ترین واقعہ رُونما ہو چکا تھا اور اس نے مجھے بھنک تک نہیں پڑنے دی تھی حوادث کو جھیلنے اور مسائل کا سامنا کرنے کا اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ صدمات کو اپنے تک محدود رکھنے میں فخر محسوس کرتا تھا لیکن یہ تو کوئی بات نہیں تھی کہ وہ اتنی سنگین اطلاعات بھی مجھ سے چھپا کر رکھتا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ اقبال کا چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا۔ ہم سب ایک خاندان کی طرح ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کی کمی کو بری طرح محسوس کرتے تھے۔ اقبال ہمارے ساتھ انڈیا نہیں آ سکا تھا لیکن اس کا خیال تو ساتھ ساتھ ہی چلتا تھا۔ اور اب مجھے پتا چل رہا تھا کہ وہ لاہور کے کسی قبرستان میں منوں مٹی کے نیچے سو رہا ہے۔ غالباً یہی وہ اہم واقعہ تھا جس کا ذکر جیلانی نے عمران کے ساتھ گفتگو میں بڑے درد سے کیا تھا۔

تب ایک اور ای میل نے میری نگاہوں کو پکڑ لیا۔ یہ ای میل چار پانچ روز پہلے کی تھی اور اقبال نے خود کی تھی۔ اس میں اقبال نے سلطان چٹا کی پُراسرار سرگرمیوں کی بات کرنے کے بعد ثروت کی چھوٹی بہن نصرت کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ ایک طویل ای میل تھی۔ اس کے اندراجات سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ لاہور میں نصرت کی حالت بہت زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ اسے پھر سے آسٹریا منتقل کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اب جگر کی پیوند کاری کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اور یہ پیوند کاری دو چار ہفتوں کے اندر ہو جانی چاہئے ورنہ نصرت کی زندگی ختم ہو سکتی ہے۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ عمران کو یہ سب کچھ معلوم تھا اور وہ خود ہی ان معاملوں کو ہینڈل کر رہا تھا۔ ایک دوسری ایک میل کے اندراجات سے پتا چلا کہ عمران نے آسٹریا میں کسی ایسے ادارے سے رابطہ کیا ہے جو ضرورت مند لوگوں کے لئے گردوں اور جگر وغیرہ کے عطیات فراہم کرتا ہے۔ عمران کا ایک سرجن دوست بھی اس میں کردار ادا کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ عمران ایک دو ہفتوں میں اس ادارے کے لئے ایک بڑے ڈونیشن کا انتظام بھی کرنے والا ہے۔

نصرت کی تشویش ناک حالت کا جان کر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھے عمران پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اس بندے نے جیسے ہر مصیبت اپنے سر پر لینے کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ بعض اوقات مشورے کی حد تک بھی کسی کو شریک نہیں کرتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ کبھی کبھی اس بے جا رازداری کی وجہ سے نقصان بھی ہوتا ہو گا۔ میرا دل چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو اور میں اس کا گریبان پکڑ لوں۔ اسے جھنجھوڑوں اور اس رویے کی وجہ پوچھوں۔

میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا تھا۔ میں نے نیٹ بند کیا اور اپنی آمد کی نشانیاں ختم کر کے کمرے سے نکل آیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے چند درازوں کی تلاشی بھی لی۔ ایک دو کاغذات میں مجھے کسی میجر صاحب کا تذکرہ بھی ملا۔ شاید یہ وہی سابق فوجی آفیسر تھا جس کا ذکر عمران نے کیا تھا۔ ایک جگہ حمزہ احسان کے نام کی ایک رسید بھی ملی۔ یہ حمزہ صاحب وہی پولیس آفیسر تھے جو پاکستان میں گاہے بگاہے عمران کی مدد کرتے رہتے تھے۔

میں نیچے آیا۔ اب رات نے اپنے تاریک پَر پھیلا لئے تھے۔ قریباً ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ عمران تاحال واپس نہیں آیا تھا۔ جیلانی اور نصیر مختلف تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان تیاریوں کو ابرار صدیقی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے تابش! مجھے لگتا ہے کہ تم لوگ ایک اور خطرناک کھیل کھیلنے جا رہے ہو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ ایسا مت کرو...... یہ منحوس مورتی ہے۔ سب کو برباد کر کے رکھ دے گی۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن ابرار صاحب! لوگ تو کہتے ہیں اس سے بڑی برکت والی چیز ہی اور کوئی نہیں۔ یہ اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور ان لوگوں کو بھی ہر بلا سے محفوظ کر دیتی ہے جن کے پاس ہوتی ہے۔''

''سب کچھ اس کے الٹ ہے۔'' ابرار کراہا۔ ''یہ اپنی حفاظت نہیں کرتی اور ان لوگوں کو بھی برباد کر رہی ہے جو اس کے آس پاس ہیں۔ کم از کم ہمارے لئے تو یہ ایسی ہی ثابت ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے۔''

میرے فون کی بیل ہوئی۔ یہ عمران تھا۔ ''کہاں ہو؟'' میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بس یار! تھوڑی سی ریہرسل کرنا تھی، رات گیارہ بجے کے لئے بس آدھ پون گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں تمہارے پاس۔''

''جلدی آؤ، کچھ باتیں کرنی ہیں مجھے بھی۔'' میں نے گھمبیر آواز میں کہا۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ نو بج چکے تھے۔ اب صرف دو گھنٹے باقی تھے۔ اس شہر خوں رنگ کے ایک ساحل پر چند نہایت خطرناک لوگوں میں ملاقات ہونے والی تھی۔ قربان علی عرف شیکھر نے عمران کو بتایا تھا کہ وہ انڈیا کے چنے ہوئے شوٹرز کو لے کر آ رہا ہے......

دوسری طرف جاوا گروپ کے پاس بھی یقیناً خوں خوار ترین قسم کے قاتل موجود تھے۔ قریباً پچاس عدد خطرناک ترین لوگوں کے سائے میں ایک ڈیل فائنل ہونا تھی۔ اسی دوران میں پورچ کے سامنے دو ڈبل کیبن گاڑیاں رکیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اترے۔ یہ سب کے سب مسلح تھے اور ان کے چہرے ہی بتا رہے تھے کہ وہ زبردست قسم کے فائٹر اور اسلحہ شناس بندے ہیں۔ ان میں چھریرے بدن کا ایک دراز قد نوجوان سب سے نمایاں تھا۔

جیلانی نے کہا۔ ''قربان علی آ گیا ہے۔'' فضا میں سنسنی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ فیصلہ کن گھڑیاں قریب آ رہی تھیں۔

گاڑیوں سے اترنے والوں میں بس ایک بندہ قدرے مختلف نظر آیا۔ یہ شکل سے مار دھاڑ کرنے والا شخص نہیں لگتا تھا۔ اس جواں سال شخص نے ماتھے پہ سفید قشقہ کھینچا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور ہندو پجاریوں کی طرح سادہ سا دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ خاموش طبع تھا اور اس سارے ماحول کو جیسے ڈری ہوئی سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''یہ کون ہے؟'' میں نے جیلانی سے پوچھا۔

''ماسٹر جواہر۔ ڈھائی تین سال پہلے تک یہ جاوا کا ملازم تھا۔ ملازم بھی کیا تھا، بس اس کی کوٹھی میں اس کے بھتیجے کو ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا۔ وہیں سے بے چارے کی بدقسمتی کا آغاز ہوا۔''

''کیا ہوا؟''

''دردناک قصہ ہے۔ جواہر کی بیوی سریتا خاصی خوب صورت تھی۔ دو سالہ بچی کی ماں بھی تھی۔ کسی ٹی وی چینل پر انگریزی کی خبریں بھی پڑھتی تھی۔ بری قسمت کہ کہیں جاوا کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ جاوا جیسا بندہ کسی کو حاصل کرنا چاہے اور نہ کر سکے، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اس نے پہلے پیار محبت اور حیلے سے کوشش کی پھر زبردستی سریتا کو اپنے گھر میں ڈال لیا۔ ساتھ میں بچی بھی رکھ لی۔ کچھ کہتے ہیں کہ جاوا نے سریتا سے شادی کی ہوئی ہے، کچھ کے خیال میں ویسے ہی رکھا ہوا ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ وہ اب بھی اس پر فدا ہے۔''

''اور یہ جواہر؟''

''یہ رو پیٹ کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ کوئی ایک سال بعد دوبارہ نظر آیا لیکن اب یہ بالکل بدل چکا ہے۔ پوجا پاٹ اور مندر تیرتھ کا ہو کر رہ گیا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے جوگ لیا ہوا ہے۔''

"لیکن یہ یہاں کیوں آیا ہے؟"

"پتا نہیں، عمران صاحب نے ہی بلایا ہوگا۔"

میں عمران سے بہت کچھ کہنا اور سننا چاہتا تھا لیکن وہ ایسے وقت آیا جب روانگی بالکل قریب تھی۔ سوا دس بج چکے تھے اور کالی جھاڑ تک چالیس پینتالیس منٹ کا راستہ ہی تھا۔ عمران بڑے جارحانہ موڈ میں تھا۔ اس کی شوخی نہ جانے کن پردوں میں جا چھپی تھی۔ وہ اپنے بندوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا اور ان کی تیاری وغیرہ پر بھی نگاہ ڈال رہا تھا۔ میں اور جگت سنگھ بھی تیار تھے۔ جگت سنگھ نڈر اور جی دار بندہ تھا۔ یہ جان کر کہ ہمارا سامنا جاوا سے ہونے والا ہے، جگت سنگھ کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔ اس نے عمران سے اصرار کر کے چار پانچ دستی بم بھی ساتھ رکھ لئے تھے۔ بہرحال، عمران نے اسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ یہ نہایت نازک معاملہ ہے اور کسی ہدایت کے بغیر وہ کسی طرح کی کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ اس حوالے سے میں نے بھی جگت سنگھ کو پابند کر دیا تھا۔

میں عمران کے چہرے پر اقبال کی موت کا غم ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ دل فگار غم شاید کہیں گہرائی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ ویسے بھی عمران کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا۔

ہم چار گاڑیوں میں بڑی برق رفتاری سے روانہ ہوئے۔ میں عمران کے ساتھ دو ہزار آٹھ ماڈل کی ایک لینڈ روور جیپ میں تھا۔ جگت سنگھ اور جیلانی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ نصیر احمد، قربان علی کے ساتھ دوسری گاڑی میں تھا۔ پون گھنٹے کے اندر ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ یہ ایک تاروں بھری رات تھی۔ آٹھویں نویں رات کا چاند بھی موجود تھا۔ سمندر پُرسکون اور خاموش تھا۔ ہوا اور لہروں کی مدھم سرگوشیاں جاری تھیں۔

ہم نے مقررہ جگہ پر گاڑیاں روکیں۔ تقریباً یہی وقت تھا جب ممبئی کا خوں خوار جانور جاوا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ موقع پر پہنچا۔ ان کی گاڑیاں ہماری گاڑیوں سے تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر رک گئیں۔ عمران کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف حسبِ توقع جاوا ہی تھا۔

"ہیرو! میں جاوا ہوں۔ سامان لے آئے ہو؟"

"لے آیا ہوں جناب عالی...... اور آپ؟"

"میں بھی لے آیا ہوں۔"

"اور ضامن؟"

"وہ بھی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، ان کو روانہ کرو۔ میں ادھر سے مورتی بھیجتا ہوں۔"

"لیکن پہلے میں چیک کرنا چاہوں گا۔"

"ٹھیک ہے، بندہ بھیج دو۔"

قریباً تین منٹ بعد دو بندے ہمیں اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک تو جاوا کا کوئی گھاگ شوٹر تھا، دوسرا ایک کھچڑی بالوں والا ادھیڑ عمر بندہ تھا۔ قریب پہنچنے پر اندازہ ہوا کہ اس نے عینک لگا رکھی ہے۔ یقیناً یہ کوئی ماہر نوادرات تھا اور آرا کوئے کی صحت جانچنے کے لئے آیا تھا۔ عمران نے لینڈ روور کے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر آرا کوئے نکالا۔ اسے بڑی احتیاط سے فوم کی باریک تہ میں لپیٹا گیا تھا۔ اس کے اوپر ریگزین کا کور تھا۔ شوٹر اور ادھیڑ عمر شخص لینڈ روور کے اندر ہی آ گئے۔ ان کے چہروں کو گہری سنجیدگی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کس قدر گھمبیر صورتِ حال ہے۔ چاروں طرف آتشیں ہتھیار بالکل تیار حالت میں موجود تھے۔

عمران نے آرا کوئے کو اس کے کورز میں سے نکالا۔ دو فٹ کا دھاتی مجسمہ جیپ کی اندرونی روشنیوں میں چمکنے لگا۔ اس کی دید متاثر کن تھی۔ ادھیڑ عمر شخص کے پاس نیلگوں روشنی والی ایک خاص قسم کی ٹارچ موجود تھی۔ اس نے ایک آنکھ پر محدب شیشہ چڑھایا...... ٹارچ جلائی اور آرا کوئے کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے آرا کوئے کی پشت پر کندہ برمی زبان کے چند قدیم حروف کا بھی معائنہ کیا۔ اس کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں مطمئن ہوں۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ جیب سے مارکر نکالا اور آرا کوئے کی پشت پر سرخ مارکر سے اپنے سائن کر دیئے۔ اس کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

عمران نے سرد آنکھوں والے شوٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جاوا سے کہو کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔"

دونوں افراد واپس چلے گئے۔ قریباً پانچ منٹ بعد عمران کے فون پر جاوا کی آواز ابھری۔ "کیا کہنا ہے؟"

"آواز سننا چاہتا ہوں میڈم صفورا اور ثروت کی اور ضامن کی بھی۔"

"او کے...... دو منٹ ہولڈ کرو۔"

کچھ دیر بعد فون کے اسپیکر پر میڈم صفورا کی آواز ابھری۔ "ہیلو عمران!"

"ہیلو میڈم! کہاں ہیں آپ؟"

"سامنے سرخ ہائی روف گاڑی میں۔ ثروت بھی میرے ساتھ ہے۔"

"ٹھیک ہے، ثروت سے بات کرائیں۔"

چند سیکنڈ بعد ثروت کی دبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

عمران نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ "ہیلو ثروت! تم کیسی ہو؟"

"مم...... میں بالکل ٹھیک ہوں تابش۔" وہ رو دینے کے قریب تھی۔ "لیکن یہاں ہو کیا رہا ہے؟ یہاں بہت سے رائفلوں والے ہیں۔ آپ کہاں ہیں؟"

"پاس ہی ہیں۔ تمہیں لینے آئے ہیں۔ سمجھو پریشانی ختم ہو گئی ہے ثروت۔"

وہ سسک پڑی۔ کسی نے موبائل اس سے لے لیا۔ پھر جاوا کی منحوس آواز سنائی دی۔

"بس یا کچھ اور؟"

عمران نے کڑے لہجے میں کہا۔ "ضامن سے بات کروائیے جاوا صاحب۔"

"یہ شرط تم بڑی کڑی رکھ رہے ہو ہیرو بچے! کیا اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا؟"

"نہیں ہو سکتا جاوا حضور! اگر ہم ثروت کے سلسلے میں آپ پر اعتماد کر سکتے ہیں اور آپ اس اعتماد پر پورے بھی اتر سکتے ہیں تو پھر اس سلسلے میں بے اعتمادی کیوں؟ ضامن...... ضامن ہے۔ جس حالت میں لیں گے، اسی حالت میں واپس کریں گے...... پوری حفاظت کے ساتھ۔"

چند سیکنڈ بعد جاوا کی گھمبیر آواز ابھری۔ "لو سریتا سے بات کرو۔"

سریتا کا نام سن کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ یہ تو وہ جاوا کی رکھیل تھی جس پر وہ بری طرح فدا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ...... آرا کوئے کے لئے وہ اپنی بہت پیاری شے عارضی طور پر عمران کے حوالے کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک ٹھہری ہوئی سی باریک آواز سنائی دی۔ "میں سریتا بول رہی ہوں۔"

"کہاں ہیں آپ؟" عمران نے پوچھا۔

"سامنے گرے گاڑی کے اندر۔"

یہ گرے گاڑی وہی شاندار بلٹ پروف اور دھماکا پروف جیپ نما کار تھی جو لنگڑی پورہ سے فرید کوٹ آتے ہوئے جاوا کے پاس تھی۔ لڑائی کے دوران میں اس جیپ پر شدید فائرنگ کے علاوہ جگت سنگھ کے پھینکے ہوئے "کالے اناروں" کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

وہ مجہول سا جوگی نما شخص ہماری گاڑی سے باہر کھڑا تھا جس کا نام جیلانی نے جواہر بتایا

تھا اور جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ سریتا کا سابق پتی ہے۔ وہ ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

عمران نے جیلانی سے کہا۔ "اسے اندر لاؤ۔"

ڈرا سہما جواہر ہماری گاڑی کے اندر آ گیا۔ عمران نے سریتا سے ایک دو سوال مزید پوچھے پھر موبائل فون کے مائیک کو انگلی سے ڈھانپ کر جواہر سے پوچھا۔ "یہ سریتا ہی کی آواز ہے؟"

جواہر کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب دونوں طرف سے پوری تسلی کر لی گئی تھی، اس لئے تبادلے کا عمل شروع ہوا۔ ممبئی کے ماہر ترین گن مینوں نے گاڑیوں کے پیچھے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ قریباً چار سو فٹ دور یقیناً جاوا کے لوگ بھی پوزیشنیں سنبھال چکے تھے۔ ہماری طرف سے عمران کا ساتھی قربان علی عرف شیکھر آرا کوئے کے ساتھ آگے بڑھا۔ دوسری طرف سے ثروت اور میڈم صفورا نمودار ہوئیں۔ ان کے ساتھ ایک تیسری عورت بھی تھی جو یقیناً جاوا کی رکھیل سریتا تھی۔ مدھم چاندنی میں تینوں ہیولے آگے بڑھنے لگے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سے جائزہ لیا۔ ثروت کی دید نے دل و دماغ میں ہلچل سی مچا دی۔ ہوا کی وجہ سے اس کے ریشمی بال بار بار چہرے پر منتشر ہو رہے تھے، وہ انہیں پیچھے ہٹا رہی تھی۔ میڈم صفورا نے تسلی بخش انداز میں ثروت کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میڈم صفورا کی بائیں جانب متناسب جسم والی وہ جواں سال لڑکی تھی جسے جاوا کی قربت کا شرف حاصل تھا اور جس کا نام سریتا بتایا جا رہا تھا۔ اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ ناک میں کوکے کی چمک تھی۔ کندھے پر شولڈر بیگ تھا۔ اس کے لمبے بال کسی فلمی سین کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ثروت کی طرح وہ بھی ڈری سہمی نظر آتی تھی۔ ان تینوں کے پیچھے جاوا کا قریبی ساتھی پریم چوپڑا تھا اور کھچڑی بالوں والا تھا۔

عمران دوسری ٹیلی اسکوپ سے جائزہ لینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے مطمئن ہو کر ٹیلی اسکوپ رکھ دی اور رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ہم نے ایک جیپ کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی۔ جگت سنگھ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرپل ٹو رائفل تھی اور وہ جوش سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے دائیں بائیں شوٹر بالکل چوکس تھے۔ انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لی گئی تھیں اور فضا میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ قربان علی آرا کوئے کے ساتھ وسط میں پہنچا تو پریم چوپڑا بھی تینوں عورتوں کے ساتھ وسط میں پہنچ گیا۔ قربان علی نے آرا کوئے پریم چوپڑا کو تھمایا۔ ٹارچ کی روشنی چمکی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا۔ کھچڑی بالوں والے نے

آگے بڑھ کر آرا کوئے کی پشت پر اپنے دستخط دیکھے اور آرا کوئے وصول کر لیا۔

قربان علی نے ثروت، صفورا اور ضامن سریتا کو وصول کر لیا۔ اب آگے کا مرحلہ شروع ہوا۔ آرا کوئے جاوا کی طرف بڑھا اور ثروت وغیرہ ہماری طرف۔ یہ نازک لمحے تھے۔ کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ دل دھڑک رہے تھے۔ عقابی نگاہیں گردش کر رہی تھیں...... بہر طور خیریت گزری۔ قربان علی تینوں خواتین کے ساتھ ہمارے پاس پہنچ گیا اور پریم چوپڑا آرا کوئے کے ساتھ جاوا گروپ کے پاس۔ ثروت لپک کر میرے بازو سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ جگت سنگھ نے اسے پچکار کر کہا۔ ''اب کیوں روتی ہے چھوٹی! اب تو سب کچھ چنگا ہو گیا، واہگرو کی کرپا سے۔''

عمران نے بھی پیار سے ثروت کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میڈم صفورا نے سریتا کو عمران کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو بھئی سنبھالو اپنی ''گارنٹی'' کو۔''

سریتا ایک بھرپور جواں سال عورت تھی۔ وہ خوب صورت بھی تھی۔ اس کی عمر چھبیس ستائیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔

میں نے دیکھا کہ جواہر نے اس پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دوسری نگاہ نہیں ڈالی...... وہ بالکل لاتعلق سا ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ کبھی اس کی پتنی تھی، اس کی بچی کی ماں تھی۔ جواہر کے کانوں میں جوگ کی بالیاں چمک رہی تھیں اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

جیلانی نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور تصویر سے موازنہ کر کے تصدیق کی کہ یہ سریتا ہی ہے۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم وعدے کی پوری پابندی کریں گے۔ اگلے چند گھنٹوں میں تم اپنی بچی کے پاس واپس پہنچ جاؤ گی۔''

پروگرام کے مطابق ہم تیزی سے روانہ ہو گئے۔ اب ہمیں ممبئی واپس نہیں جانا تھا بلکہ ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے صوبہ گجرات کی حدود میں داخل ہونا تھا اور پھر بھڑوچ اور احمد آباد سے ہوتے ہوئے تھر پار کر کے سرحدی علاقے کی طرف جانا تھا۔ یہ ایک لمبا سفر تھا لیکن امید تھی کہ ہم صبح دس بجے تک منزل کے قریب پہنچ چکے ہوں گے۔

تینوں گاڑیاں ہمارے ساتھ رہیں۔ سب سے آگے ایک ڈبل کیبن تھی جسے قربان علی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ پورب کمار اور جیلانی بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد ہماری جیپ تھی۔ اس میں سب سے پچھلی نشست پر میں، ثروت اور میڈم صفورا بیٹھے تھے...... لیکن پھر میڈم صفورا اٹھ کر درمیانی نشست پر سریتا کے پاس چلی گئی کیونکہ سریتا کچھ گھبرا رہی تھی۔

عمران، سریتا کی بائیں جانب بیٹھا تھا۔ سائیلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بالکل چوکس تھا۔ تاہم اس خیال سے کہ پستول کی دید سریتا کو ٹینشن میں مبتلا نہ رکھے، عمران نے اس پر ایک چھوٹا تولیا ڈال دیا تھا۔ جگت سنگھ اگلی نشست پر نصیر احمد کے ساتھ موجود تھا۔ ڈرائیونگ نصیر احمد کے ذمے تھی۔ جگت سنگھ کی عقابی نگاہیں ہر طرف گردش کر رہی تھیں۔ عمران نے موبائل فون پر پچھلی گاڑیوں سے مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ ہم سے پیچھے جو گاڑی آ رہی تھی، اس میں غمزدہ آنکھوں والا، جوگی نما جواہر بھی موجود تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے ہم نے احمد آباد کے قریب اپنے قافلے سے علیحدہ کر دینا تھا۔ وہ وہاں کے ایک تیرتھ میں جانا چاہتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ سریتا سمیت ہر چیز سے لاتعلق ہو چکا ہے...... لاتعلق اور خوف زدہ...... وہ ہماری رائفلوں وغیرہ کو دیکھتا تھا تو اس کے چہرے پر ہلدی سی بکھر جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ ماضی قریب میں وہ بہت مشکل مراحل سے گزر چکا ہے۔ سریتا کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی نظر آتی تھی۔

آگے بھی جو کچھ ہوا، ہمارے پروگرام کے مطابق ہوا۔ ہم ایک چوراہے پر پہنچے تو بائیں طرف سے ایک ٹیوٹا جیپ نمودار ہوئی اور ہمارے قافلے میں شامل ہو گئی۔ اس جیپ میں زخمی ابرار صدیقی کے علاوہ ڈاکٹر مہناز، آہو چشم ایشوریا اور دونوں پاکستانی لڑکیاں موجود تھیں۔ ان لوگوں کو نصیر احمد کے گھر سے لانے والے قربان علی کے ساتھی ہی تھے۔ یہ وہی بندے تھے جنہیں اس نے ''اسٹینڈ بائی'' رکھا ہوا تھا۔ اس جیپ کے قافلے میں شامل ہوتے ہی ایک جیپ قافلے سے علیحدہ ہو گئی...... یوں گاڑیوں کی کل تعداد چار ہی رہی۔

اب ہم تیزی سے ہائی وے پر رواں تھے...... ہمارا رخ سورت شہر کی طرف تھا۔ رات نیم روشن اور خنک تھی۔ ثروت مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی۔ اس کا قرب اور قرب کی خوشبو مجھے بھولی بسری باتیں یاد دلا رہی تھیں۔ پچھلی گاڑی میں سے کسی نے عمران کے فون پر اطلاع دی۔ ''ایک گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی ہے جناب! گرے رنگ کی جیپ ہے۔ جاوا کی گاڑیوں میں سے ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' عمران نے کہا۔ ''یہ پروگرام کے مطابق ہی ہے۔'' چند سیکنڈ بعد آواز دوبارہ ابھری۔ ''لیکن جناب! شک بڑھ رہا ہے کہ اس کے پیچھے بھی ایک یا دو گاڑیاں آ رہی ہیں۔''

''غلط فہمی ہوئی ہو گی تمہیں۔ بس ایک گاڑی کی بات ہوئی تھی۔''

''ٹھیک ہے جی۔ میں چیک کرتا ہوں'' میں نے رفتار آہستہ کر دی

"او کے۔" عمران نے کہا اور پھر ایک دوسرا نمبر پریس کیا۔ یہ جاوا ہی کا تھا۔ بیل ہوتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ دوسری کوشش میں بھی یہی ہوا۔ اس دوران میں پچھلی گاڑی والے بندے کی کال پھر آ گئی۔ اس نے کہا۔ "کم از کم تین گاڑیاں مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی ہیں جی۔ دو جیپیں ہیں، ایک ہاسین کار۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ تینوں میں مسلح بندے ٹھنسے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم لوگ چوکس رہو۔ مسلسل رابطہ رکھو۔" عمران نے کہا اور فون بند کر کے دوبارہ جاوا سے رابطے کی کوشش کی۔ رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس نے پریم چوپڑا کا نمبر پریس کیا۔ کال مل گئی لیکن ابھی پریم چوپڑا نے ہیلو ہی کہا تھا کہ رابطہ منقطع ہو گیا۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

عمران کے بجائے نصیر احمد نے جواب دیا۔ "گڑبڑ کیوں ہونی ہے جی۔ جب تک یہ بی بی سریتا ہمارے پاس ہے، کچھ نہیں ہو گا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔"

سریتا سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

عمران نے قربان علی کو فون پر ہدایت کی کہ وہ اپنی گاڑی کو ذرا آہستہ کر کے پیچھے لے جائے اور دیکھے کہ کیا صورتِ حال ہے۔

قربان علی نے اس ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ ہم قربان علی اور پورب کمار والی گاڑی کو اوورٹیک کر کے آگے نکل گئے۔ دو تین منٹ بعد قربان علی کی کال آ گئی۔ اس کی آواز سے پریشانی مترشح تھی۔ "عمران صاحب! لگتا ہے جاوا کے ساتھی معاہدہ توڑ رہے ہیں۔ صرف ایک گاڑی کی بات ہوئی تھی لیکن تین چار گاڑیاں اپن کے پیچھے ہیں۔ یہ لوگ نزدیک آ رہے ہیں۔ ان کے ارادے ٹھیک ناہیں لگتے۔"

عمران جبڑے بھینچ کر رہ گیا۔ اس نے پستول کا سائیلنسر اتار کر پستول کو اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا اور گن نکال لی۔ ہم بھی چوکس ہو گئے۔ سریتا کا چہرہ اب خوف و ہراس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو سب سے پہلے اس کی ہی زندگی داؤ پہ لگے گی۔

نصیر احمد نے سریتا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مجھے نہیں لگتا عمران صاحب کہ اس بی بی کے ہوتے ہوئے جاوا کسی حماقت کا سوچ بھی سکتا ہے۔ کہیں یہ کوئی اور گروپ تو نہیں؟"

"قربان علی پورے یقین سے کہہ رہا ہے کہ یہ جاوا کی گاڑیاں ہیں اور اس کے بندے۔" عمران نے جواب دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اس بی بی سریتا والا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا۔" پھر وہ سریتا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم کیا کہتی ہو...... یہ کیا ہے سب؟"

"مجھے کوئی جانکاری نہیں...... کوئی نہیں۔" وہ گردن جھکا کر سسک پڑی۔

اس دوران میں قربان علی کی چلاتی ہوئی سی آواز موبائل فون پر ابھری۔ "سر! یہ لوگ کوئی کارروائی کرنے والے ہیں۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں میں مجھے بی ایس ایف کی ایک گاڑی بھی دکھائی دے رہی ہے۔"

"او گاڈ!" نصیر احمد نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

عمران نے جبڑے بھینچ رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر بلا کی سختی ابھر آئی تھی۔

"یہ بی ایس ایف والا کیا معاملہ ہے؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے نصیر سے مخاطب ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں کہیں رک کر دیکھ لینا چاہئے کہ مسئلہ ہے؟"

"رکنے کے لئے ایک بڑی مناسب سی جگہ تو ہے یہاں،" نصیر احمد نے کہا۔

اب ہم سورت کے قریب پہنچنے والے تھے۔ دور سے شہر کی ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم ایک مضافات سے گزر رہے تھے۔ نصیر احمد نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی تیز ہو گئیں۔ عمران نے فون پر قربان علی وغیرہ کو ہدایت دی۔ "ہم آگے جا کر کچھ دیر کے لئے رک رہے ہیں۔ تم سب نے بھی ہمارے ساتھ ہی رک جانا ہے۔ ہمیں فالو کرتے رہو۔"

"جی سر!" قربان علی نے کہا۔

"لڑکیوں والی جیپ کا خاص دھیان رکھو۔" عمران نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر۔" قربان نے جواب دیا۔

نصیر احمد بڑی برق رفتاری سے ایک بغلی سڑک پر مڑا اور پھر قریباً ایک کلومیٹر آگے جا کر ایک پارک نما جگہ پر رک گیا۔ یہاں کافی درخت تھے۔ یہ جگہ قدرے اونچائی پر تھی۔ اسٹریٹ لائٹس میں سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی ایک عمارت نظر آ رہی تھی۔ کوئی اسپورٹ کمپلیکس قسم کی شے تھی لیکن فی الوقت بالکل ویران پڑی تھی۔ کچھ فاصلے پر سورت شہر کی روشنیاں بھی یہاں سے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ نصیر احمد اس جگہ کا محل وقوع بڑی اچھی طرح سے جانتا ہے۔ وہ جیپ کو فراٹے سے ایک ڈرائیو وے پر لے گیا اور پھر ایک ادھ کھلے گیٹ سے گزر کر ایک احاطے میں رک گیا۔ ہماری باقی گاڑیاں بھی تیز رفتاری سے احاطے

میں پہنچ گئیں۔ ہماری آخری گاڑی وہ تھی جس میں قربان علی تھا۔ قربان علی نے اپنی گاڑی احاطے میں داخل نہیں کی بلکہ کچھ فاصلے پر ہی روک لی۔ یقیناً وہ بلندی سے عقب کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ عمران سے مسلسل رابطے میں تھا اور گاہے بگاہے رننگ کمنٹری کے انداز میں بول رہا تھا۔ ''جی سر! گاڑیاں پہنچ گئی ہیں...... یہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ او گاڈ...... یہ چھ سات کے قریب ہیں۔ یہ پھیل کر آگے آ رہے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے جی...... کہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

''ہاں ہاں قربان...... کھل کر بتاؤ۔''

''مجھے لگ رہا ہے جی کہ وہ گھیر رہے ہیں ہم کو۔ شاید آپ بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ دو گاڑیاں بائیں طرف سے گھوم کر آ رہی ہیں۔''

''ہاں...... مجھے نظر آ رہا ہے۔'' عمران نے تائید کی۔

''یہ لیں جی...... نئی خبر۔'' قربان کی سنسناتی آواز ابھری۔ ''ان دو گاڑیوں میں ایک وہی جاوا کی گرے جیپ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ان کی نیت میں فتور آ چکا ہے۔ تم لوگ پوزیشنیں لے لو۔ ہم بھی لے رہے ہیں۔''

''اس چھوکری سریتا کا خاص دھیان رکھیں سر! اس وقت ہمارے ہاتھ میں وہی سب سے اہم پتا ہے۔''

''بے فکر رہو۔'' عمران نے کہا۔

رابطہ منقطع کرنے کے بعد عمران نے ایک بار پھر جاوا اور پریم چوپڑا کو فون کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اب صاف ظاہر تھا کہ وہ جان بوجھ کر رابطہ نہیں کر رہے۔ یہ وہی صورتِ حال ہوگئی تھی جو ممبئی میں سامنے آئی تھی۔ لیکن تب تو ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا، اب تو سریتا تھی۔

''اب یہ کیوں ہو رہا ہے عمران؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بات تو کنفرم ہے کہ یہ کتا جاوا اس سریتا کے ہوتے ہوئے کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔''

''ہوسکتا ہے، بی ایف ایس والوں نے اسے مجبور کر دیا ہو۔'' میں نے کہا۔

''لیکن بی ایف ایس کو خبر کس نے کی؟ جاوا کے سوا اور کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ ہم ہائی وے پر ہیں اور سورت کی طرف جا رہے ہیں۔''

سرخ اینٹوں والی عمارت میں بس ایک سرکاری چوکیدار موجود تھا۔ وہ نیند سے جاگا تھا اور یہ ہنگامہ دیکھ کر ہکا بکا ہوگیا تھا۔ اس نے کسی کو فون کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اس سے فون چھین کر اسے ایک باتھ روم میں بند کر دیا۔ ہم نے مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جگت سنگھ میرے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ یہ صورتِ حال اس کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ وہ جاوا گروپ سے ٹکرانے کی شدید خواہش رکھتا تھا...... اسے جاوا کی طرف سے آشا اور گوبندر سنگھ کی موت کی صورت میں دو کاری زخم لگے تھے۔ وہ ان زخموں کا مداوا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مجھ سے بھی بہت متاثر تھا۔ اس نے بارڈر ایریا میں میرے ہاتھوں انور گنجے کے پانچ خوں خوار کارندوں کو ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ اس لڑائی نے اسے میرا گرویدا بنا دیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ آج اسے میرے کندھے سے کندھا ملا کر مشترکہ دشمن سے لڑنے کا موقع مل رہا ہے۔

عمران نے سریتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''تابی! تم اس حرامزادی کے سر پر کھڑے ہو جاؤ۔ ہمارے ساتھ کچھ ہوا تو پہلے اس کے ساتھ ہوگا۔''

''بے فکر رہو۔'' میں نے کہا اور سریتا کو چوٹی سے پکڑ کر نیچے فرش پر گرا دیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں چلّا کر رہ گئی۔

اس کی آواز سن کر کچھ دور بیٹھا ماسٹر جواہر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں جتنے لوگ موجود تھے، ان میں سب سے خوف زدہ وہی تھا۔ وہ جیسے موت کے فرشتے کو اپنے رُوبرو دیکھ رہا تھا۔ سریتا کبھی اس کی بیوی تھی، اس کی محبوب ہستی تھی لیکن آج وہ اس کی طرف سے بھی لاتعلق ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑتا تھا اور منہ میں کچھ پڑھنے لگتا تھا۔

ہم سرخ اینٹوں والی عمارت کی دوسری منزل پر تھے۔ یہ بیڈمنٹن کا ایک ہال تھا۔ ہم اس ہال میں سے فاصلے تک دیکھ سکتے تھے۔ جاوا اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں تین اطراف سے گھیر لیا تھا اور اب چوتھی طرف بھی ان کی موجودگی ظاہر ہو رہی تھی۔ نصیر احمد پھر بڑبڑایا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ اس پر جان دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں اس بات کو۔''

قربان علی نے تائید کی۔ ''یہ واقعی انہونی ہو رہی ہے۔''

یکا یک مین گیٹ کی طرف سے چند فائر ہوئے۔ یہ فائر یقیناً جاوا کے لوگوں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ جواب میں پورب کمار اور جگت سنگھ نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ دھماکوں اور شعلوں سے رات کا سناٹا چکنا چُور ہوگیا۔ ہم نے جبھی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ دو

تین منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ دائیں طرف سے جاوا کے ساتھی مختلف چیزوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے آ گئے۔ اب ہمارے گرد ان کا گھیرا اور خطرناک ہو گیا تھا۔

کچھ دیر کے لئے فائرنگ تھم گئی۔ مجھے ماسٹر جواہر کے رونے کی آواز آئی۔ وہ ایک آہنی الماری کے پیچھے دبکا ہوا تھا۔

میں لپک کر اس کے پاس گیا۔ ”جواہر! کیا ہوا ہے تمہیں؟“

وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ دل فگار آواز میں بولا۔ ”یہ ماردیں گے۔ تم سب کو ماردیں گے۔ ایک بھی نہیں بچے گا۔ ہم سب کی ہتھیا ہو جائے گی۔ یہ لڑکی کسی کو نہیں بچا سکتی۔“

”کون لڑکی؟“

”یہی جسے تم...... جسے تم...... سریتا...... سمجھ رہے ہو۔“

”سریتا سمجھ رہے ہو؟ یہ سریتا نہیں ہے؟“

”نہیں ہے...... یہ نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مم...... میں...... تم سب کا دوشی ہوں...... مم...... میں نے جھوٹ بولا۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہ کر سکا کہ تمہیں سچ بتاتا۔“

”تمہارا مطلب ہے، یہ تمہاری پتنی سریتا نہیں ہے؟“

”نہیں ہے، مجھے اسی سے پتا چل گیا تھا جب تم لوگوں نے مجھے فون پر اس کی آواز سنائی تھی مگر میں چپ رہا۔ میں سریتا کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔“

عمران بھی اب ہمارے پاس پہنچ چکا تھا اور ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے جیب سے سریتا کی وہی تصویر نکالی اور اسے دھیان سے دیکھنے لگا۔ لڑکی سے موازنہ کرنے لگا۔

جواہر کراہا۔ ”تم لوگوں سے دھوکا ہوا ہے۔ جاوا نے دھوکا کیا ہے۔ اس کی شکل سریتا سے ملتی ہے لیکن یہ سریتا نہیں ہے۔“

میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ عمران کی آنکھوں میں بھی حیرت کی یلغار ہوئی۔ مجھے لگا جیسے اردگرد کی ہر شے نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ ہم ایک بات بالکل فراموش کر گئے تھے۔ جاوا ڈان ہی نہیں تھا۔ شوبز سے بھی گہرا تعلق رکھتا تھا۔ وہ بہت سے کام کرتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ملتے جلتے چہروں کا بیوپاری بھی تھا۔

تو کیا اس نے اپنی رکھیل معروف نیوز کاسٹر سے ملتا جلتا چہرہ بھی ڈھونڈ رکھا تھا؟

عمران گم صم تھا۔ غلطی انسان سے ہوتی ہے اور عمران بھی انسان تھا۔ ہم سب اسی

زمرے میں آتے تھے...... کیا واقعی ہم سے غلطی ہو چکی تھی؟

یکا یک پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ ہم پر چلنے والی گولیوں کا زاویہ زیادہ خطرناک تھا۔ چند گولیاں عین اس دیوار پر لگیں جس کی اوٹ میں ہم موجود تھے۔ ایک گولی پورب کمار کے کندھے پر لگی اور دوسری گردن میں پیوست ہو گئی۔ وہ پشت کے بل بیڈمنٹن کی کورٹ میں گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کی رائفل دور لڑھک گئی تھی۔

ہم نے پوزیشنیں سنبھال لیں اور فائرنگ کا بھرپور جواب دینے لگے۔ دوسری منزل کی بیشتر کھڑکیاں چکنا چور ہو گئیں۔ ہر طرف شیشے کی کرچیاں بکھر گئیں۔ نصیر کے ایک جواں سال ساتھی کے سینے پر پورا برسٹ لگا اور وہ کھڑکی میں سے تیرہ چودہ فٹ نیچے پختہ فرش پر جا گرا۔

میگا فون پر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔ ”تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ بھاگ نہیں سکتے ہو۔ قانون ہاتھ میں مت لو۔ بہتر ہے کہ ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ۔ یہ بی ایس ایف ہے۔ میں اعلان دہراتا ہوں......“ پُرتحکم آواز نے اعلان دہرایا۔ لب و لہجے سے یہ بارڈر فورس کا اہلکار ہی لگتا تھا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوتی جا رہی تھی اور اس سنگینی کی وجہ بھی اب ہماری سمجھ میں آ رہی تھی۔ جن پتوں پر تکیہ تھا، وہی ہوا دینے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد فائرنگ میں وقفہ آ گیا۔ یہ وقفہ پھر ایک اناؤنسمنٹ کے لئے تھا۔ اس مرتبہ اناؤنسمنٹ سورت کے کسی ڈی ایس پی کی طرف سے کی گئی۔ اس نے بھی تقریباً وہی الفاظ دہرائے جو اس سے پہلے بی ایس ایف کے کمانڈر نے کہے تھے۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ ہم بہت جلد اپنی جانیں بچانے کا سوچیں گے اور ہتھیار ڈال کر باہر آ جائیں گے۔

پورب کمار کی موت کے بعد قربان علی کا پارا ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس نے ماسٹر جواہر کا گریبان پکڑ لیا اور اس پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ وہ پھنکار رہا تھا۔ ”حرامزادے! ہم تجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر لائے تھے لیکن تُو آستین کا سانپ نکلا۔ جاوا سے بڑھ کر دھوکا دیا تُو نے ہمیں۔ کیوں کیا...... کیوں کیا ایسا؟“

عمران نے آگے بڑھ کر قربان علی کو بمشکل جواہر سے علیحدہ کیا۔ ماسٹر جواہر کے ناک منہ سے خون رِسنے لگا تھا۔ وہ...... کیچوے کی طرح فرش پر پڑا تھا۔

عمران اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھایا۔ اس کے ہونٹوں سے خون پونچھنے کے لئے عمران نے اپنا رومال والا ہاتھ آگے بڑھایا تو جواہر بدک گیا۔ وہ سمجھا کہ شاید عمران بھی اسے مارنے لگا ہے۔

عمران نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''جواہر! تیری وجہ سے ہم سب پھنس گئے ہیں۔ تُو نے کیوں کیا ایسا؟''

وہ بس ہچکیوں سے روتا چلا جا رہا تھا۔ عمران کے اصرار پر اس نے ٹکڑوں میں جو کچھ بتایا اور جو کچھ ہم نے اخذ کیا، وہ اس طرح تھا۔ جواہر اپنی بیوی اور بچی کو کھو چکا تھا...... لیکن اس کے دل میں اب بھی ان کی محبت موجزن تھی۔ سریتا جہاں بھی تھی، وہ اسے زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ عمران اور نصیر...... جواہر کو اس لئے لے کر آئے تھے کہ وہ فون پر سریتا کی آواز پہچان کر تصدیق کرے گا کہ جس لڑکی کو ضامن کے طور پر ہماری طرف بھیجا جانے والا ہے، وہ سریتا ہی ہے۔ دوسری طرف جواہر کے دل و دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ یہاں دو نہایت خطرناک گروہوں کے درمیان خوفناک قسم کے حالات پیدا ہونے والے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ سریتا یرغمالی کے طور پر اس معاملے میں شامل ہو۔ اس لئے جب اس نے فون پر سریتا کے بجائے اس لڑکی کی آواز سنی تو فوراً ''تصدیق'' کر دی کہ یہی سریتا ہے۔ جواہر کو یقین تھا کہ جاوا جیسے شخص سے کچھ بھی بعید نہیں۔ بے شک وہ سریتا کے بجائے کسی اور لڑکی کو ضامن کے طور پر بھیج رہا تھا لیکن اگر اس کی یہ چال ناکام ہو جاتی تو وہ اپنے لالچ کی خاطر اصل سریتا کو بھی داؤ پر لگا سکتا تھا۔ لالچ کا جذبہ جاوا کے دیگر سارے کمزور اور قوی جذبوں پر حاوی تھا۔ یہی سبب تھا کہ جواہر نے فون پر سریتا کے بجائے کسی اور کی آواز سننے کے باوجود یہ کہہ دیا کہ یہ سریتا ہی کی آواز ہے۔ بعد میں شکلوں کی مماثلت نے کام دکھایا۔

پورب کمار کا خون فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ ہم نے اس کی لاش اٹھا کر آڑ میں کر دی اور جگت سنگھ نے اپنی چادر اس پر ڈال دی۔ پولیس کی طرف سے ہونے والی اناؤنسمنٹ میں ہمیں پانچ منٹ کا وقت دیا گیا تھا۔ اس وقت کے ختم ہوتے ہی ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہم نے پانچوں لڑکیوں کو میڈم صفورا سمیت ایک محفوظ کمرے میں پہنچا دیا اور خود سینہ سپر ہو گئے۔ مخالفین کا پلڑا واضح طور پر بھاری تھا۔ ہماری تعداد بیس کے قریب تھی جبکہ وہ دگنا سے بھی زیادہ تھے۔ پھر ان کو ایمونیشن کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

ابرار صدیقی ایک چوڑے ستون کی اوٹ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسے گاہے بگاہے شدید کھانسی ہونے لگتی تھی۔ وہ کھانستے کھانستے ہی بولا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا، یہ منحوس مورتی ہے۔ یہ خون خرابے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یہ ماسٹر جواہر ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ سب کو مار دیں گے۔''

''تو کیا کریں پھر؟'' میں نے چڑ کر کہا۔

جواہر بولا۔ ''یہ لوگ جو کہتے ہیں مان لو۔ کم از کم جیون تو بچ جائے گا۔ تمہارے ساتھ نردوش عورتیں ہیں۔ وہ مفت میں ماری جائیں گی۔''

ابرار صدیقی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''یہ نہ ہو کہ یہ وقت بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ میں سمجھتا ہوں، جواہر ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

ابھی ابرار کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ عمران کے شوٹر بھی بھرپور جواب دینے لگے۔ چند گولیوں نے اس ستون کے پلاسٹر کو ادھیڑ دیا جس کے عقب میں ابرار صدیقی موجود تھا۔ وہ مزید خوف زدہ ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ ستون کی محفوظ آڑ چھوڑ کر کسی اور طرف جانا چاہ رہا ہے۔

میں نے چلّا کر کہا۔ ''نہیں صدیقی صاحب! پیچھے ہی رہو۔''

وہ رک گیا۔

لیکن جب دوسرا برسٹ ستون پر اسی جگہ لگا تو وہ ایک دم ٹوٹ گیا۔ اس نے پچھلے کمرے کی طرف جانا چاہا جہاں لڑکیاں موجود تھیں...... کم از کم چار گولیاں اس کی پشت پر کندھوں کے درمیان لگیں اور وہ پٹ سے پختہ فرش پر گرا۔ اس کے گرنے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ پھر بھی جیلانی نے اس تک پہنچنے کی کوشش کی، وہ اس کے ساکت جسم کو کھینچ کر کسی اوٹ میں لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر ایک برسٹ آیا، جیلانی کے بازو میں دو گولیاں لگیں اور وہ تڑپ کر واپس اپنی پوزیشن پر چلا گیا۔ اگلے چند سیکنڈ میں گولیوں کی ایک باڑ نے ابرار صدیقی کو بھون کر رکھ دیا۔ اس کا جسم کئی بار فرش پر سے اچھل کر ساکت ہو گیا۔ نوادرات کے اس پاکستانی بیوپاری کی رُوداد کئی موڑ مڑنے کے بعد ایک دم اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

ہم پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جاوا کے خطرناک شوٹر اور سرکاری اہلکار گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں اچانک میرے پردۂ تصور پر اسی نوجوان ملنگ کا چہرہ ابھر آیا جس سے ہماری ملاقات ہارون آباد کے ہوٹل میں ہوئی تھی۔ اس کا احمق چہرہ، اس کا چربی دار برہنہ جسم، اس کی چمکیلی آنکھیں...... سب کچھ میرے ذہن میں آیا۔ اس کے پُراندیش الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا۔ ''تم مرنے جا رہے ہو...... واپس چلے جاؤ تو تمہارے لئے بڑا چنگا ہے۔ یہ لڑکی مصیبت میں ہے۔ تم سب مصیبت میں آ جاؤ گے۔ تمہارے پیچھے کالے پر چھانوے ہیں۔ یہ تم کو مار دیں گے۔ تمہاری قبریں بنیں گی اور پتا نہیں قبریں بھی بنیں گی یا نہیں......'' اس نے اسی طرح کی بے سر و پا

باتیں کی تھیں۔

مجھے جھرجھری آ گئی۔ میرا دل چاہا، میں ثروت کو اپنے بازوؤں میں چھپاؤں اور اپنی جان پر کھیل کر اسے ہر آفت سے دور لے جاؤں۔ اگر مجھے موت بھی آئے تو اس اطمینان کے ساتھ آئے کہ ثروت محفوظ ہے اور اپنوں میں ہے۔

گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ عمران اور اس کے ساتھی بھرپور جواب دے رہے تھے۔ زخمی جیلانی سمیت یہ سب کے سب بے حد تربیت یافتہ اور نڈر لوگ تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے، عمران جیسا بندہ ان کو کمانڈ کر رہا تھا۔ وہ تو مردہ دلوں میں جان ڈال دیتا تھا، یہ تو پھر جوش سے بھرے ہوئے ٹرینڈ شوٹرز تھے۔

دائیں طرف سے وہ لوگ خاصے قریب آ گئے تھے۔ ایک ٹولی ہم سے صرف پندرہ بیس میٹر کی دوری پر تھی۔ ان لوگوں کی چلائی ہوئی گولیوں سے ہی ابرار صدیقی ''ہٹ'' ہوا تھا۔ دفعتاً ایک زوردار دھماکا ہوا۔ مختلف اشیاء کے پرخچے ہوا میں اڑتے نظر آئے۔

یہ جگت سنگھ نے اپنا ''کالا انار'' استعمال کیا تھا۔ اب وہ دوسرے کالے انار یعنی دستی بم کی پن کھینچ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے روکوں یا اس کی حوصلہ افزائی کروں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ یہ بم بھی نشیب میں پھینک دیا۔ ساعت شکن دھماکے سے شعلہ نکلا اور ایک انسانی جسم ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ جگت سنگھ جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے آٹومیٹک رائفل مضبوطی سے تھامی اور اٹھنا چاہا۔ وہ سارے اندیشے ایک طرف رکھ کر حملہ آوروں کی طرف لپکنا چاہ رہا تھا۔ یہ دلیری نہیں حماقت تھی...... دیوانہ پن تھا۔ میں نے جگت کا بازو جکڑ لیا۔ ''نہیں جگت! نیچے بیٹھو...... نیچے بیٹھو۔'' میں دہاڑا۔

ایک گولی آئی اور جگت کے سر کے پاس سے گزر گئی۔ میں نے کھینچ کر جگت کو نیچے بٹھا دیا۔ وہ سینے کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا، للکار رہا تھا۔ ''ماردوں گا...... فنا کر دوں گا...... فنا کر دوں گا۔''

اس کا جوش دیدنی تھا۔ پھر اس غیر معمولی جوش کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ جگت کے پھینکے ہوئے دوسرے دستی بم کے دھماکے میں، مَیں نے جس انسانی جسم کو ہوا میں اچھلتے دیکھا، وہ اب ایک لاش کی صورت ہم سے دس بارہ میٹر کی دوری پر پڑا تھا۔ اس لاش کی گردن پر سے کوئی آدھ کلو گوشت غائب تھا۔ انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے اس کی غیر معمولی چوڑی ناک سے پہچانا۔ یہ پریم چوپڑا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے لنگڑی پورہ میں آشا کور کو کمرے میں لے جا کر بے آبرو کیا تھا۔ نشے میں دھت ہو کر وہ اس کی مجبوری سے کھیلا تھا

اور بعد ازاں رہ جاوا کی فائرنگ سے جان کی بازی ہار گئی تھی۔

اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ جگت سنگھ نے اچانک اوپر تلے دو دستی بم کیوں پھینک دیئے تھے۔ اس نے آشا کی عزت اور جان کے ہتھیارے کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ برداشت نہیں کر پایا تھا۔ ابھی تو میں نے اسے پکڑ کر روک لیا تھا ورنہ وہ پتا نہیں مزید کیا کر گزرتا۔

''اچھا کیا جگت سنگھ۔'' میں نے رائفل سے نیا میگزین اٹیچ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب ذرا تحمل سے کام لو۔ ممکن ہے کہ کچھ دیر بعد ان دستی بموں کی اور زیادہ ضرورت ہو۔''

میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور ہمیں اپنی پوزیشنوں پر دبکنا پڑا۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ فائرنگ کا زاویہ اب بدل گیا ہے اور پہلے کی طرح ہمارے لئے زیادہ خطرناک نہیں رہا۔ اس کی وجہ جگت کے پھینکے ہوئے دو دستی بم ہی تھے۔ ان دو دھماکوں کے بعد آگے بڑھ آنے والے مدِمقابلوں کو اب کافی پیچھے ہٹنا پڑ گیا تھا۔ تاہم انہوں نے ہمارے گرد اپنا گھیرا ٹوٹنے نہیں دیا۔ انہوں نے اردگرد کی سب روشنیاں آن کر دی تھیں اور اپنی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس سے بھی مدد لے رہے تھے......

یقیناً دو تین منٹ بعد یہ لوگ نئی صف بندی کے ساتھ پھر زوردار حملہ کرنے والے تھے۔ اپنے قریبی ساتھی کی موت نے یقیناً جاوا کو بھی شعلہ جوالا بنا دیا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' عمران نے سوالیہ نظروں سے نصیر احمد کی طرف دیکھا۔

''ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں جی۔ ہم نکل جائیں گے۔''

''کیسے؟''

''ایک راستہ ہے یہاں۔ یہ پیچھے آپ جو پیالا سا دیکھ رہے ہیں نا، یہ سائیکل ریس کا اسٹیڈیم ہے۔ میں کالج کے زمانے سے جانتا ہوں اس جگہ کو۔ اس اسٹیڈیم میں داخل ہونے کے لئے ''سائیکلسٹ'' ایک سرنگ میں سے گزر کر آتے ہیں۔ یہ سرنگ آج کل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور بند پڑی ہے۔ یہ ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع دے سکتی ہے۔''

''کتنی لمبی ہے؟ میرا مطلب ہے گھیرے سے نکل سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ضرور نکال دے گی جی۔ لیکن ایک مسئلہ ہو گا۔ ہماری گاڑیاں تو یہاں احاطے میں ہیں۔''

ہم بڑی پلاننگ سے پیچھے ہٹے۔ تین چار رائفل بردار پوزیشن بدل بدل کر زوردار فائرنگ کرتے رہے۔ ہم نیچے آ گئے۔ پورب کمار اور ابرار صدیقی کی لاشوں کو وہیں پر چھوڑنا

دل و دماغ پر بہت گراں گزرا لیکن اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ عورتوں کو اپنے درمیان رکھتے ہوئے ہم اسٹیڈیم کی سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ عمران کے ساتھ اپنی گاڑیوں میں سے کچھ ایمونیشن نکالنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔

عمران نے موبائل پر جگت سنگھ کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ''دو گرینیڈ پھینکو اور پوزیشنیں چھوڑ کر نیچے بھاگ آؤ۔''

''جو حکم سرکار۔'' جگت سنگھ کی آواز ابھری۔

چند ہی سیکنڈ بعد دو کے بجائے تین زوردار دھماکے ہوئے جنہوں نے گھیرا ڈالنے والوں میں کھلبلی سی مچا دی۔ جگت سنگھ نے ایک بم اضافی پھینکا تھا۔ دستی بم تو اس کے ہاتھ میں آ کر جیسے خود ہی بلاسٹ کے لئے مچلنے لگتا تھا۔ میں نے اسپورٹ کمپلکس کی ایک کھڑکی میں سے دیکھا، جاوا گروپ کی ایک جیپ کو آگ لگی ہوئی تھی۔ جگت سنگھ اور باقی شوٹر سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے اور ہمارے ساتھ اس تاریک زمین دوز راستے میں داخل ہو گئے۔ اس راستے کو ڈھلوان بنایا گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ سائیکلسٹ اسٹیڈیم میں داخل ہوتے وقت رفتار پکڑ سکیں۔ راستے کی چھت کئی جگہ سے بیٹھ چکی تھی۔ یہاں جھاڑ جھنکار تھا اور آوارہ جانوروں کی غلاظت تھی۔ عمران کے پشتی تھیلے میں سے ایک بڑی ٹارچ نکل آئی تھی۔ ایک ٹارچ قربان علی کے پاس بھی تھی۔ ہم ان کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔

میڈم صفورا کو عمران نے ایک پستول دے دیا تھا۔ خواتین میں وہ سب سے زیادہ حوصلے میں تھی۔ وہ بار بار ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ آخر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''صدیقی کہاں ہے تابش؟''

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ زخمی ہو گیا ہے میڈم...... اسے ہم نے پہلے ہی یہاں سے نکال دیا ہے۔''

''کہاں؟''

''قربان کے بندے لے گئے ہیں۔'' عمران نے بات گول کی۔

میڈم صفورا جہاندیدہ عورت تھی۔ سمجھ گئی کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بہرحال، اس نازک موقع پر اس نے عمران سے یا مجھ سے سوال جواب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شدید تناؤ کی کیفیت تھی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ جب ہم اس زمین دوز راستے سے باہر نکلیں گے تو صورتِ حال کیا ہو گی۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں بالکل تیار حالت میں موجود تھیں۔ ہمارا واسطہ ممبئی کے ظالم ترین لوگوں سے تھا۔

ہم اس زمین دوز راستے سے باہر نکلے تو قربان علی کی فہم و فراست پر یقین کرنا پڑا۔ ہم

گھیرے سے باہر ایک محفوظ جگہ پر تھے۔ غالباً اس زمین دوز راستے والا آپشن قربان علی کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ اسی لئے یہاں رکتے وقت اس نے کہا تھا کہ رکنے کے لئے ایک بہت مناسب جگہ اس کے ذہن میں ہے۔

درختوں کے درمیان سے سامنے ایک سڑک کے آثار نظر آ رہے تھے۔ قربان علی اور نصیر کی راہنمائی میں ہم اس سڑک کی طرف بڑھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم یہاں سے گزرنے والی ایک دو گاڑیوں کو روکیں گے۔ مگر اس سے پہلے ہی میری نظر ایک بس پر پڑ گئی۔ یہ بس سڑک کے کنارے درختوں میں کھڑی تھی۔ اس اسٹائلش بس پر ایک بینر لگا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ یہ احمد آباد یونیورسٹی کے کچھ لوگوں کو تفریحی دورے پر لے کر سورت آئی ہوئی ہے۔

میں نے عمران کو بتایا۔ ہم نے فوری مشورہ کیا۔ ہم سب درختوں میں دبکے رہے۔ میڈم صفورا اس بس کی طرف گئی۔ اس کی شال کے نیچے پستول موجود تھا۔

اس نے بس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر موجود افراد سے کچھ بات کی۔ دروازہ کھلا تو میڈم نے پستول نکال لیا۔ میں اور نصیر احمد بھی جھپٹ کر موقع پر پہنچ گئے۔ بس میں صرف ڈرائیور اور کنڈیکٹر موجود تھے۔ دونوں نیند سے جاگے تھے اور ہکا بکا ہو کر ہمارے آتشیں ہتھیاروں کو دیکھ رہے تھے۔ فربہ اندام ڈرائیور کا تعلق یقیناً ممبئی سے تھا اور لگتا تھا کہ اس نے چرس کا سوٹا وغیرہ بھی لگا رکھا ہے۔ ہم نے سب سے پہلے ان کی تلاشی لی پھر ان کی مشکیں کس دیں۔ اس دوران میں لڑکیوں سمیت سب اندر داخل ہو چکے تھے۔ نصیر احمد نے ڈرائیور سے چابی لے کر بس کا انجن اسٹارٹ کر دیا لیکن لائٹس آن نہیں کیں۔ اسپورٹس کمپلیکس کی طرف تباہ ہونے والی کار کے شعلے نظر آ رہے تھے اور فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اب اسپورٹس کمپلیکس کے اندر گھس گئے ہیں۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ وہ کسی بھی وقت ہماری جانب آ سکتے تھے۔ نصیر نے ماہرانہ انداز میں بس کو حرکت دی اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

○......❖......○

بس برق رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں ہو چکی تھی۔ یہ ایک اچھی ''رشیئن'' بس تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ، آرام دہ اور پاورفل۔

اچانک عمران کے فون پر سگنل آئے۔ اسکرین پر جاوا کا ذاتی نمبر چمکا۔ یہ الٹی گنگا بہنا شروع ہوئی تھی۔ پہلے ہم جاوا کو فون کر رہے تھے اور وہ ہمیں گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔

عمران نے کال ریسیو کی۔ جاوا بغیر کسی تمہید کے چنگھاڑا۔ ''ہیرو کے بچے! کہاں ہے

تُو؟''

''تیرا کیا خیال ہے...... مجھے کہاں ہونا چاہئے؟''

وہ دہاڑا۔ ''ایک بات میں تجھے بتا دوں۔ زمین کی ساتویں تہ میں بھی چلے جاؤ گے نا حرامزادو تو وہاں سے بھی کھینچ لوں گا تم سب کو۔ تمہارے لئے بڑا اچھا ہے کہ اپنے ہاتھ سے خود کو گولیاں مار لو۔ ختم کر لو جیون اپنا...... ختم کر لو...... نہیں تو موت کی بھیک مانگنا پڑے گی اور وہ ملے گی نہیں تمہیں۔'' طیش کی شدت سے اس کی آواز پھٹ گئی۔

عمران نے کہا۔ ''ہم آتما ہتھیا کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ تُو اپنی خیر منا جاوا۔ تیرا سورج غروب ہونے والا ہے۔ اگر پیچھے نہیں ہٹے گا تو پریم چوپڑے سے بری موت آئے گی تیرے حصے میں۔''

اس کے ساتھ ہی عمران نے فون بند کر دیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ جاوا اسے باتوں میں لگائے اور اس طرح ہماری لوکیشن کے بارے میں کوئی اشارہ اسے ملے۔

یہ تو یقینی بات تھی کہ وہ لوگ بوگیر کتوں کی طرح چاروں طرف پھیل گئے ہیں اور ہماری تلاش پوری شدت سے شروع ہو گئی ہے۔ ہمارے حق میں صرف ایک ہی بات جاتی تھی، ہم پہلے والی گاڑیاں چھوڑ چکے تھے...... اور جس نئی گاڑی میں ہم تھے، اس کے بارے میں ابھی تک جاوا اور اس کے حواریوں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ دن چڑھ جاتا تو یقیناً وہ قدموں کے نشان ڈھونڈتے اور اس وقت تک شاید کسی کو یہ پتا بھی چلتا کہ یونیورسٹی کی بس یہاں درختوں میں کھڑی تھی اور اب وہ اپنی جگہ موجود نہیں ہے۔ سورت شہر سے تین بڑی سڑکیں مختلف اطراف میں نکلتی تھیں۔ ابھی تو جاوا وغیرہ کو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ہم کس رخ پر گئے ہیں۔ پندرہ بیس کلو میٹر مزید آگے جا کر ہم نے ایک اور کام کیا اور وہ یہ کہ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو نکالنے کے لئے بس روکی۔ ان دونوں کی مشکیں بڑی اچھی طرح کسی ہوئی تھیں اور منہ میں کپڑے ٹھسے تھے۔ ہم نے سڑک سے کافی ہٹ کر انہیں درختوں کے ایک جھنڈ میں پھینک دیا۔ قوی امید تھی کہ وہ صبح تک یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔

سب سے پہلے ہمیں بھڑوچ کے قریب ایک پولیس ناکے پر روکا گیا۔ یہاں نصیر احمد نے گاڑی کے کاغذات دکھائے۔ روٹ پرمٹ وغیرہ چیک کرایا اور بتایا کہ وہ روٹین کے مطابق سواریاں لے کر احمد آباد جا رہا ہے۔ ہمیں آگے جانے دیا گیا۔ تاہم ناکے پر غیر معمولی نفری دیکھ کر ہمیں اندازہ ہو گیا کہ چاروں طرف گھنٹیاں کھڑک چکی ہیں اور پولیس ہائی الرٹ ہے۔

ہم تیز رفتاری سے آگے بڑھتے رہے۔ نصیر احمد کی ڈرائیونگ زبردست تھی۔ ثروت میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ بالکل چپ تھی اور اداسی کی تصویر نظر آتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ کوئی بات کرے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جب بھی کچھ کہے گی، نصرت یا پھر یوسف کے بارے میں ہی کہے گی۔ اس کے دل میں جو کچھ بھی تھا، وہ مجھ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ مجھے سے یہی لگتا تھا کہ وہ مجھ سے اور میرے پیار سے لاتعلق ہو چکی ہے۔ اسے کوئی گناہ سمجھنے لگی ہے......

کچھ دیر بعد وہ بولی۔ میرے اندازے کے عین مطابق اس نے نصرت کے بارے میں ہی پوچھا۔

''تابش! نصرت کی طبیعت اب کیسی ہے؟ کچھ پتا چلا آپ کو؟''

''نہیں ثروت! تمہیں آخری فون کب آیا تھا؟''

''آپ کے جانے کے دوسرے دن۔ اس کے بعد ان لوگوں نے ہم سے فون ہی واپس لے لیا۔''

''شاید عمران کو کچھ پتا ہو۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر عمران کے پاس آ گیا۔

وہ پورب کمار کی موت پر قربان علی کو تسلی دے رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ''کیا بات ہے تابی؟'' اس نے میرے تاثرات دیکھ کر پوچھا۔

''کیا کیا چھپاؤ گے عمران؟'' میں نے گھمبیر آواز میں کہا۔

''کیوں، کیا ہوا؟''

میں نے قربان علی کی طرف دیکھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اٹھ کر اگلی نشستوں پر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! نصرت کے بارے میں کیا اطلاع ہے تمہارے پاس؟''

''وہی جو تمہارے پاس ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''بے وقوف بنا رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ ساری دنیا کی عقل سمٹ کر تمہارے ہی دماغ میں آ گئی ہے...... ہر چیز کے ٹھیکیدار بن جاتے ہو تم...... تم نے بتایا کیوں نہیں کہ نصرت کی حالت اتنی خراب ہے۔ کہاں ہے وہ؟ پاکستان میں یا آسٹریا میں؟''

اس نے پلکیں جھپکا کر ذرا تعجب سے مجھے دیکھا پھر گہری سانس لی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم نے نصیر کے کمپیوٹر سے چھیڑ چھاڑ کی ہے یا پھر......''

''کچھ بھی ہے۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''کہاں ہے نصرت؟''

"ابھی لاہور میں ہی ہے۔ پرسوں اسے آسٹریا شفٹ کیا جائے گا۔"

"تم نے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟"

"تم پہلے ہی ثروت کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ میں تمہیں مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر تم کر بھی کیا سکتے تھے۔ میرے ذہن تھا کہ نصرت آسٹریا پہنچ جائے اور اس کی ٹریٹ منٹ شروع ہو جائے تو پھر تم دونوں کو بتاؤں۔"

"دیکھو، اتنی بڑی بات ہوگئی۔ اس کے جگر کی ٹرانسپلانٹیشن تک نوبت آ گئی ہے اور تم نے مجھے اور ثروت کو بالکل بے خبر رکھا ہوا ہے؟"

"بے خبر نہیں رکھا ہوا...... باخبر کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ تم دیکھ ہی رہے ہو جب سے رتنا گری کے لئے روانہ ہوئے ہیں، کہیں ایک پل کی فرصت نہیں ملی۔"

"اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ یہ بتا دیتے...... اقبال اب ہم میں نہیں ہے۔" میری آواز بھرا گئی۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر سنبھل کر بولا۔ "ویری سوری تابی!...... مجھے پتا ہے...... تمہیں بھی اس کا اتنا ہی خیال تھا جتنا مجھے...... بس اس کا اور ہمارا ساتھ اتنا ہی تھا۔"

عمران نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ بہت گہری سنجیدگی نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

مجھے کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہم دونوں چند سیکنڈ تک بالکل گم صم بیٹھے رہے۔ اندر سے خالی اور ویران۔ آخر میں نے کہا۔ "ایک طرف دوست بھی کہتے ہو...... دوسری طرف اتنی اہم باتیں چھپاتے ہو۔ پتا نہیں کیا مجبوریاں ہیں تمہاری یا پھر مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتے ہو۔"

"نہیں تابی! بس سمجھو کہ ٹائمنگ کی تھوڑی سی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"یہ گڑبڑ تو اب بھی ہو رہی ہے۔ تم اب بھی مجھے اندھیرے میں رکھ رہے ہو۔"

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری وہ کون سی بات ہے جس کا پتا جاوا کو چلا ہے...... اور جس کے بعد...... وہ ہاتھ دھو کر تمہارے بھی پیچھے پڑ گیا ہے... اور جاوا کے ساتھ پولیس اور بی ایس ایف بھی۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہو گی؟"

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، پولیس موبائل کا ہوٹر سنائی دیا۔ ہم نے مڑ کر

دیکھا۔ ریوالونگ لائٹ والی ایک موبائل برق رفتاری سے ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ ہوٹر کا مطلب یہی تھا کہ ہمیں رکنے کے لئے کہا جا رہا تھا۔

"ہاں جی، کیا کرنا ہے؟" نصیر احمد نے ڈرائیونگ کرتے کرتے عمران سے پوچھا۔

"رکنا پڑے گا۔ ورنہ یہ لوگ مزید پیٹی بھائیوں کو بلا لیں گے۔" عمران نے کہا۔

پولیس موبائل ہمارے پہلو میں آ چکی تھی۔ بائیں طرف بیٹھا ہوا باوردی آفیسر رکنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ عمران کے کہنے پر نصیر نے بس کی رفتار آہستہ کر دی اور اسے کنارے کی طرف لے آیا۔ جیلانی نے اپنا زخمی بازو چادر میں چھپا لیا۔ اسلحہ نشستوں کے نیچے اور دیگر محفوظ جگہوں پر چھپا دیا گیا۔ عمران نے اپنے سینے پر اخبار پھیلا لیا اور سائیلنسر لگا پسٹل اس کے نیچے رکھ لیا۔ دو مزید رائفلیں بھی پولیس والوں کا استقبال کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھیں لیکن وہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔

بس رک گئی۔ نصیر احمد نے نیچے اتر کر پولیس والوں کو کاغذات چیک کرائے...... اور ان کے سوالوں کے جواب دیئے۔ یہ کل تین اہلکار تھے۔ انسپکٹر ابھی تک موبائل کی اگلی نشست پر براجمان تھا۔ یہ رات کے ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ سڑک پر ٹریفک بہت کم تھی، پولیس موبائل کی اندرونی روشنی میں انسپکٹر کے کندھے کے تین پھول دمک رہے تھے۔

پلاننگ کے مطابق نصیر نے پولیس والوں کے سوالوں کے جواب دیئے اور انہیں بتایا کہ وہ سورت سے روٹین کی سواریاں لے کر براستہ بھڑوچ، احمد آباد جا رہا ہے۔

سواریوں والا دروازہ کھلوا کر دونوں پولیس والے اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے ہی پیچھے فربہ اندام انسپکٹر بھی چلا آیا۔ وہ بس کی تلاشی لینے لگے۔ ان کے حکم پر نصیر نے بس کی اندرونی روشنیاں جلا دیں۔ وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہے تھے اور سوال پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے جگت سنگھ پر خصوصی توجہ دی۔ "کہاں سے آئے ہو؟" انسپکٹر نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"سورت سے۔ میں مزدوری کردا ہوں جی۔ وہاں احمد آباد میں میرا چھوٹا بھرا کرشنا گڈیوں کی مرمت شرمت کرتا ہے۔ اس کے گھر کا کا ہوا ہے۔ ودھائی دینے جا رہا ہوں......"

"شناختی کارڈ"

"شناختی کارڈ تو نہیں ہے جی اس ویلے۔ لائسنس ہے۔" جگت سنگھ نے ایک پھٹا پرانا لائسنس دکھایا۔ یہ ڈرائیونگ لائسنس تھا اور یقیناً جگت کا اپنا نہیں تھا۔ پولیس والا پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوا، بہرحال اس نے جامہ تلاشی کے بعد جگت کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میڈم صفورا سے بھی سوال جواب کئے گئے۔ باقی لڑکیاں اپنے منہ، لپیٹے بیٹھی تھیں۔ ان

کے چہروں کا بہت تھوڑا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایشوریا رائے کی تو بس آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ تلاشی اور پوچھ گچھ کے بعد پولیس والے گاڑی سے اتر گئے لیکن انسپکٹر اترتے اترتے رک گیا۔ اسے عمران پر کچھ شک ہوا تھا۔ وہ واپس آیا۔ عمران نے اخبار گود میں رکھ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''تمہارا شبھ نام؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''وجے کمار۔''

انسپکٹر نے مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے اپنا موبائل فون نکالا اور ذرا رخ پھیر کر اس میں کچھ دیکھنے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کیمرے کے آپشن میں جا کر فوٹو البم چیک کر رہا ہے۔ شاید اس البم میں عمران کی تصویر موجود تھی۔ چند سیکنڈ بعد انسپکٹر نے پلٹ کر عمران کو دیکھا...... تب پھر سے موبائل فون کی اسکرین کو گھورا۔ خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ میں نے دیکھا، انسپکٹر نے اپنا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھایا ہے......

ایک سیکنڈ بعد سرکاری پستول اس کے ہاتھ میں آنے والا تھا...... لیکن یہ سیکنڈ انسپکٹر کے لئے بہت طویل ثابت ہوا۔ اخبار کے نیچے سے عمران کے سائیلنسر لگے پسٹل نے ٹھک سے گولی اگلی اور انسپکٹر اپنے دل کو تھامتا ہوا زخمی جیلانی کے اوپر گرا۔ عمران کی چلائی ہوئی دوسری گولی نے اے ایس آئی کی پیشانی پر موت کی سرخ بندیا لگا دی۔ دوسرا شخص جو رائفل مین تھا اور بالکل نوجوان تھا، بس کے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے پھرتی سے نیچے اترنے کی کوشش کی۔ صفورا نے اس کے راستے میں ٹانگ اڑائی اور وہ اوندھے منہ نشستوں کے درمیانی راستے میں گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ عمران نے اس کی طرف پستول سیدھا کیا۔ ''بھگوان کے لئے نہیں...... مجھے مت مارو۔'' وہ ہکلایا۔

''تم جھوٹے پولیس مقابلوں میں بے گناہوں کو مار دیتے ہو، یہ تو سچا مقابلہ ہے۔'' عمران نے بے رحم لہجے میں کہا اور دو دفعہ ٹریگر دبا کر اس تیسرے اہلکار کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔

ثروت قتل و غارت کی اس صورتِ حال پر ششدر تھی۔ اس کا چہرہ نقاب میں تھا لیکن آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سرتاپا خوف کے نرغے میں ہے۔ ایشوریا سمیت تینوں لڑکیوں کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

''کیا خیال ہے عمران! ان کی لاشیں ان کی گاڑی میں ہی نہ ڈال دی جائیں؟'' میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

''مناسب خیال ہے۔'' وہ بولا۔ اس نے نصیر سے کہا کہ وہ بس چلا کر چالیس پچاس میٹر آگے درختوں میں لے جائے۔

نصیر نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ میں بس سے نیچے اترا اور پولیس موبائل کو اسٹارٹ کر کے بس کے قریب لے گیا۔ تاریکی ہماری مدد کر رہی تھی۔ ہم نے تینوں لاشیں بس سے نکال کر پولیس کار میں رکھ دیں۔ ہم نے انہیں نشستوں پر اس طرح بٹھا دیا کہ وہ کار کے اندر ہی آرام کرتے نظر آ رہے تھے۔ عموماً پیٹرولنگ پولیس اسی طرح گاڑی کسی کنارے پر لگا کر ستا لیا کرتی ہے۔ خاص طور سے انسپکٹر کو دیکھ کر تو بعین یہی لگ رہا تھا کہ اخبار پڑھتے پڑھتے اسے چہرے پر پھیلا کر سو گیا ہے۔

بس آگے روانہ ہو گئی۔ عمران کے ساتھیوں نے بڑی تیزی کے ساتھ بس کے فرش کو خونی آلائشوں سے صاف کر دیا۔ انسپکٹر کا موبائل فون اور سب انسپکٹر کا وائرلیس سیٹ ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ وائرلیس پر مسلسل پیغامات نشر ہو رہے تھے۔ ان پیغامات سے ہمیں کچھ مدد بھی ملی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ احمد آباد کے قریب مین روڈ پر ایک دو سخت ناکے لگے ہوئے ہیں۔ نصیر احمد اور قربان علی نے مشورہ کیا اور فیصلہ ہوا کہ ہم ایک دوسرا راستہ استعمال کریں گے۔ یہ سڑک ذرا طویل تھی لیکن یہاں خطرہ کم تھا۔ اس راستے پر پہنچنے کے بعد ہم نے پولیس والوں کا وائرلیس اور موبائل سیٹ دونوں بند کر دیئے۔

میں قریب سے گزرا تو ثروت نے میری کلائی پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''نصرت کا کچھ پتا چلا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے پھر آسٹریلیا لے جانا پڑے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ثروت! عمران بتا رہا ہے کہ وہ کھا پی رہی ہے اور خود چل کر واش روم تک جاتی ہے...... اور......''

''او گاڈ۔'' ثروت نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ ''میرا دل کہتا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر اسے آسٹریلیا لے جا رہے ہیں تو پھر...... وہ ٹھیک تو نہ ہوئی۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں خود پوچھتی ہوں عمران صاحب سے۔''

عمران، قربان علی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ مشورے میں مصروف تھا۔ میں نے ثروت کو کھینچ کر واپس بٹھا لیا۔ ''پلیز ثروت! ذرا حوصلے سے کام لو۔ ہمیں سب سے پہلے تو خود موت کے اس گھیرے سے نکلنا ہے، تب ہی نصرت یا کسی دوسرے کے لئے کچھ کر پائیں گے۔''

ایک بار پھر پولیس کی موبائل کاروں کے منحوس ہوٹر سنائی دیئے۔ ہم سب چونک کر عقب میں دیکھنے لگے۔ نیلے اور سرخ رنگ کی ریوالونگ لائٹس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ دو

کاریں ہیں۔

''لگتا ہے، کار میں پولیس والوں کی لاشیں دیکھ لی گئی ہیں۔'' جیلانی نے خیال ظاہر کیا۔

''ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہرحال، اب رکنا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر یہ لوگ فائرنگ کر کے ہمیں روکنا چاہیں تو فوراً جوابی فائرنگ کی جائے۔'' عمران نے کہا۔

''اور بڑی کڑاکے کی فائرنگ ہونی چاہئے۔'' جگت سنگھ نے لقمہ دیا۔ ''چھانٹی کردوان کتوں کی گڈیاں۔''

''جگت ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بس کا ٹائر برسٹ ہوگیا تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' عمران نے تائید کی۔

لڑکیاں سہم گئی تھیں۔ صرف میڈم صفورا اور ڈاکٹر مہناز کچھ حوصلے میں تھیں۔ عمران نے انہیں ہدایت کی کہ اگر فائرنگ شروع ہوجائے تو وہ نشستوں پر نہ رہیں بلکہ بس کے فرش پر بیٹھ جائیں یا لیٹ جائیں۔ ثروت نے مضبوطی سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ناخن جیسے میرے بازو کے گوشت میں پیوست ہوتے چلے جارہے تھے۔ میں نے اسے دلاسا دے کر خود سے جدا کیا اور بس کے عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔ یہاں عمران کے شوٹر ہر صورتِ حال کے لئے بالکل تیار تھے۔ یہ زبردست پروفیشنل لوگ تھے۔ ان کے چہرے چٹانوں کی طرح سخت نظر آ رہے تھے۔ پولیس کی گاڑیاں شور مچاتی ہوئی بالکل قریب پہنچ گئیں۔ جگت سنگھ فائرنگ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے اسے روکا۔ غالباً عمران بھی یہی چاہتا تھا کہ فائرنگ میں پہل نہ کی جائے۔ ہم نے تحمل سے کام لیا۔ ہمارا یہ تحمل سودمند رہا۔ گاڑیاں شور مچاتی بس کے پہلو میں پہنچ چکی تھیں۔ ہم نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں اور نگاہیں گاڑیوں پر مرکوز تھیں۔ دفعتاً ہمیں اندازہ ہوا کہ پولیس کی یہ گاڑیاں ہمیں اوورٹیک کر کے آگے جارہی ہیں...... اور ہم سے انہیں کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔

اگلے دس پندرہ سیکنڈ میں صورتِ حال مزید واضح ہوگئی۔ پولیس کی گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئیں۔ جگت سنگھ نے بلند آواز میں کہا۔ ''سجن جی! لگتا ہے یہ شکاری کتے تو کسی ہور شکار کے پیچھے ہیں۔''

''چلو بچ گئے بے موت مرنے سے۔'' قربان علی نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

''کبھی کبھی انتظار کرنے میں فائدہ ہوتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

گاڑیاں ہماری نظروں سے اوجھل ہوچکی تھیں۔ میڈم صفورا کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ بار بار ٹشو سے ان کی نیم صاف کرنے لگتی تھی۔ ابرار صدیقی کی موت کا دکھ تو ہم سب کو ہی تھا

لیکن صفورا نے اس دکھ کو زیادہ محسوس کیا تھا۔ ابرار صدیقی سے میڈم کا پرانا تعلق تھا اور وہ اس کا ہم مزاج کاروباری پارٹنر رہا تھا۔ وہ بھانڈیل اسٹیٹ سے چند ماہ پہلے ہماری ہی طرح بچ کر نکل آیا تھا لیکن مورتی کی نحوست اپنے ساتھ لے آیا تھا اور آج رات یہی نحوست اس کی جان لے گئی تھی۔ ہمیں افسوس تھا کہ ہم ابرار اور پورب کمار کی لاشوں کو اسپورٹس کمپلیکس میں چھوڑ آنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

جیلانی درد سے کراہ رہا تھا۔ مہناز تندہی سے اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ وہ ایک ہمدرد لڑکی تھی۔ اپنے مریض کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھنے لگی تھی۔ بابے جلالی کی مثال ہمارے سامنے تھی۔ بابے جلالی جیسے بوڑھے اور غصیلے شخص کے لئے ڈاکٹر مہناز نے بے مثال وفاداری کا مظاہرہ کیا تھا اور اس سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کے لئے بہت سی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ اب پھر اسے امید تھی کہ وہ اپنے شوہر سہراب جلالی سے مل سکے گی۔ اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ گو مطلع گرد آلود تھا اور جھکڑ سے چل رہے تھے۔ ہم گاندھی نگر کی وسیع آبادی کو بائی پاس کرتے ہوئے شمال مغرب کی طرف بڑھتے چلے جارہے تھے۔ ہماری منزل تھرپارکر کا سرحدی علاقہ تھا۔ عمران کا کہنا تھا کہ ہم بارڈر کے ایک خاص پوائنٹ سے بہ آسانی گزر سکتے ہیں اور پاکستانی علاقے میں داخل ہوسکتے ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی اسی طرح کئی مصیبت زدہ پاکستانیوں کو انڈیا کی حدود سے نکال کر حفاظت سے پاکستانی سرزمین تک پہنچا چکا تھا۔ تھرپارکر کا یہ راستہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا دیکھا بھالا تھا۔ عمران نے مجھے وضاحت سے نہیں بتایا تھا لیکن یہاں اس کے کچھ ایسے سورسز موجود تھے جو اس کی مدد کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ میں نے عمران سے جتنی بار پوچھا، اس نے یہی کہا۔ ''ہم بارڈر کے قریب پہنچ گئے تو پھر یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔'' اس کے لہجے میں ہر بار بلا کا اعتماد نظر آیا تھا۔

سڑک زیادہ اچھی نہیں تھی مگر نصیر احمد نے پھر بھی اسپیڈومیٹر کی سوئی ستر اسّی کلومیٹر فی گھنٹا سے نیچے نہیں آنے دی تھی۔ ڈاکٹر مہناز سمیت چاروں لڑکیاں بار بار عمران سے سوال کرتی تھیں کہ بس کب تک پاکستانی علاقے میں پہنچ جائے گی۔ عمران ہر بار بڑی تسلی سے انہیں جواب دیتا تھا اور مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اندرونی طور پر وہ بھی بے حد تناؤ میں ہے۔ جاوا جیسا شیطان ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا اور اسے قانون نافذ کرنے والوں کی پوری آشیرباد بھی حاصل تھی۔ یہ یک طرفہ تماشا تھا۔ انڈیا کا بدنام زمانہ قانون شکن جاوا...... قانون کے محافظوں کے کندھے سے کندھا ملا کر ہمارے پیچھے آرہا تھا۔

ڈاکٹر مہناز اپنے ساتھ کچھ سینڈوچز اور کولڈ ڈرنکس وغیرہ ممبئی سے ہی لے کر آئی تھی......

ظاہر ہے ان اشیاء کا انتظام نصیر احمد نے ہی کیا ہوگا۔ ابرار صدیقی چونکہ سبزی خور ہو گیا تھا اس لئے اس کے واسطے چکن کے بجائے ویجی ٹیبل رول تھے لیکن یہ رول کھانے کے لئے ابرار ہمارے ساتھ موجود نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس وقت اس کی لاش کی نمائش ممبئی کے مختلف ٹی وی چینلز پر کی جا رہی ہو۔

اپنا انرجی لیول برقرار رکھنے کے لئے ہم نے تھوڑا تھوڑا کھایا۔ میڈم صفورا اور ڈاکٹر مہناز کے اصرار پر لڑکیوں نے بھی چند نوالے لئے لیکن ثروت کچھ نہیں لے سکی۔ نصرت کی شدید علالت کی خبر نے اسے بالکل نیم جان کر ڈالا تھا۔ میرے ڈانٹنے پر اس نے بس ایک جوس کے چند گھونٹ لئے۔ میں اسے جوس پلانے میں کامیاب ہوا تو عمران نے ثروت کی نظر بچا کر اپنا انگوٹھا کھڑا کیا اور مجھے ویلڈن کا اشارہ دیا۔

ہم سائل پور کے قریب پہنچنے والے تھے جب ہمیں ایک اور ناکے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کافی بڑا ناکا تھا اور ایک موڑ مڑنے کے بعد اچانک ہی ہمارے سامنے آ گیا تھا۔ اب ہمارے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ بس کا روٹ پرمٹ ہماری موجودہ لوکیشن کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس پرمٹ کے مطابق ہمیں احمد آباد سے آگے نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس ناکے پر باقاعدہ بانس کی رکاوٹ تھی اور ارد گرد پولیس اور بی ایس ایف والوں نے پوزیشن لی ہوئی تھی۔ کسی بھی مفرور کا تعاقب کرنے کے لئے ایک چوکس گاڑی بھی موقع پر موجود تھی۔ اس پر لگی ہوئی M16 ٹائپ مشین گن ہمیں صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا آرڈر ہے جی! رکنا ہے یا نہیں؟" نصیر احمد نے پوچھا۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد عمران نے کہا۔ "روکو۔"

نصیر احمد نے گاڑی روک دی۔ اہلکار عقابی نظروں سے جائزہ لینے لگے۔ کچھ اہلکار ایک دوسری کار کے اندر گھس کر اکھاڑ پچھاڑ کر رہے تھے۔ ایک آفیسر کے اشارے پر نصیر احمد نیچے اترا اور کاغذات چیک کرائے۔ وہی مسئلہ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ آفیسر نے روٹ پرمٹ طلب کیا۔ ظاہر ہے پرمٹ نہیں تھا۔

عمران کے اشارے پر قربان علی نیچے اترا۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ آفیسر سے بات کی اور اس سے اپنا تعارف مہاراشٹر کی ایک معروف سیاسی شخصیت کے سیکرٹری کے طور پر کرایا۔ اس نے آفیسر کو کوئی کارڈ بھی دکھایا۔ آفیسر نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر پوچھا "کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"کھنہ شوگر مل جناب! کھنہ صاحب کو فوری بھرتی چاہئے۔ یہ بندے مل کی ملازمت کے

لئے جا رہے ہیں۔ آج سہ پہر تین بجے انٹرویوز ہیں جی ان کے۔ ان میں سات ناریاں ہیں، باقی مرد ہیں۔ بس ایمرجنسی سمجھیں جی......"

"اچھا، آپ گوپال کھنہ کی بات کر رہے ہیں۔ وہ تو اپنے بھی بڑے اچھے سجن ہیں، ان سے بات کر لیتے ہیں۔ ابھی پرسوں ہی انہوں نے مجھے اپنا سیل نمبر عنایت فرمایا ہے۔"

قربان علی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے کنکھیوں سے نصیر کی طرف دیکھا۔ بی ایس ایف کے آفیسر نے جیب سے سیل فون نکال کر کال ملانا شروع کر دی۔ اب کسی بھی وقت ہمارا پول کھل سکتا تھا۔

کافی دیر بیل جاتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ آفیسر نے دوسری دفعہ ٹرائی کی۔ ہمارے سانس سینے میں اٹکے ہوئے تھے۔ یہ دوسری کوشش بھی ناکام رہی۔ "شاید فون ان کے پاس نہیں ہے۔" آفیسر نے کہا اور اپنا فون یونیفارم کی چیسٹ پاکٹ میں رکھ لیا۔

ہم نے اطمینان کی سانس لی لیکن اس اطمینان کی عمر زیادہ طویل نہیں تھی۔ اچانک آفیسر کی پاکٹ میں رکھا ہوا موبائل بول اٹھا۔ گوپال کھنہ نامی شخص نے "کال بیک" کی تھی۔

"ہیلو کھنہ صاحب! کیا حال ہے...... کہاں تھے جناب؟"

جواب میں کچھ کہا گیا جسے سننے کے بعد آفیسر نے کہا۔ "کچھ مہمان آ رہے ہیں جی آپ کے پاس...... احمد آباد سے۔"

دوسری طرف سے غالباً حیرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اب مزید تاخیر نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ نصیر احمد پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ قربان علی بھی گھوم کر بس کے اندر آ گیا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ نصیر نے کلچ چھوڑ کر ایکسلریٹر دبایا اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ٹائر گھومے اور چرچراہٹ کی بلند آواز پیدا ہوئی۔ فون سننے والا آفیسر چلایا۔ "روکو، ان کو روکو۔"

میں نے دیکھا، سیکیورٹی فورس کے دو اہلکاروں نے بس کے ٹائروں کی طرف رائفلیں سیدھی کیں۔ میں نے اندھا دھند برسٹ چلایا۔ بس کے شیشے چکنا چور ہوئے اور دونوں اہلکار شدید زخمی ہو کر گرے۔ دوسری طرف عمران نے اس کیپٹن کو نشانہ بنایا جو نصیر پر اپنے سروس پسٹل سے فائر کرنا ہی چاہ رہا تھا۔ گولی عین اس کی پیشانی پر لگی اور وہ اپنے سارے کروفر سمیت اپنی جیپ کے بونٹ سے ٹکراتا ہوا زمین پر گرا۔

"فرش پر لیٹ جاؤ۔" میں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر چلایا اور ثروت کو اپنے ہاتھ سے فرش پر گرا دیا۔

ناکے والوں نے بانس نیچے گرا دیا تھا اور بڑی پھرتی سے تین چار تارکول سے بھرے ڈرم بھی آگے کر دیئے تھے۔ نصیر رکنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور اس نے اپنا ارادہ پورا کر دکھایا۔ وہ خود تو نیچے جھک گیا مگر اسٹیئرنگ کو سیدھا رکھ کر رفتار بڑھاتا چلا گیا...... ہم پر رائفلیں سیدھی ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک اور برسٹ چلایا اور پھر خود کو اوندھے منہ بس کے فرش پر گرا دیا۔

بس رکاوٹوں سے ٹکراتی اور انہیں توڑتی ہوئی نکل گئی۔ درجنوں گولیاں اس کی باڈی میں پیوست ہوئیں۔ کئی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے۔ ہم میں سے ایک کے سوا باقی سب فرش پر لیٹ گئے تھے۔ یہ شخص بدستور کھڑا رہا تھا اور اس نے جوابی برسٹ بھی چلائے تھے۔ یہ جگت سنگھ تھا۔ وہ جاوا اور اس کی سات پشتوں کو پنجابی کی چنی ہوئی کلاسیکل گالیاں دے رہا تھا اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس بس میں ہمارے ساتھ خواتین بھی موجود ہیں۔ اس کا جوش اور غیظ وغضب دیدنی تھا۔

بس میں عجیب سی تھرتھراہٹ جاگ گئی تھی۔ ''یہ کیا ہوا ہے؟'' میں نے نصیر سے پوچھا۔

''لگتا ہے کہ پچھلے ٹائر میں گولی لگ گئی ہے۔'' اس نے بری خبر سنائی۔

کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ ٹائروں کے جوڑے میں سے گولی ایک ٹائر میں لگی ہے...... دوسرا محفوظ ہے اور گاڑی کو رواں رکھے ہوئے ہے۔ میں التحیات کے انداز میں فرش پر بیٹھا تھا۔ آٹومیٹک رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ ثروت تعجب سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھی...... آپ کتنے بدل گئے تابش۔ مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوتا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کے ہاتھوں میں پھولوں، نظموں اور تصویروں کے بجائے رائفل ہوگی اور آپ اپنے ہی جیسے انسانوں پر اندھا دھند گولیاں چلائیں گے۔

ہمارے پیچھے دو گاڑیاں لگ چکی تھیں۔ وہ تیزی سے درمیانی فاصلہ کم کر رہی تھیں۔ ان کا نزدیک آنا ٹھیک نہیں تھا۔ بس کی پچھلی اسکرین ٹوٹ چکی تھی۔ عمران نے تین شوٹرز کو وہاں مقرر کر دیا۔ ان میں سے ایک کے پاس اسنیپر گن بھی موجود تھی۔ عمران نے انہیں ہدایت کی۔ ''گاڑیوں کو جتنی دور رکھ سکتے ہو رکھو۔''

شوٹرز نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ وہ مسلسل فائرنگ کرنے لگے۔ اسنیپر گن نے کام دکھایا۔ بی ایس ایف کی اگلی جیپ نشانہ بنی۔ ہم نے اسے سڑک سے اترتے اور پھر کسی درخت سے ٹکرا کر آگ پکڑتے دیکھا۔ یہ منظر ہم نے کافی فاصلے سے دیکھا...... شاید ایک کلو

میٹر دور سے۔ اس دوران میں ہماری بس تک کوئی گولی نہیں پہنچی۔ اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کے پاس فی الوقت کوئی دور مار ہتھیار نہیں ہے۔ اگر انہوں نے اکا دکا فائر کئے بھی تھے تو وہ ہمیں نقصان پہنچانے میں بالکل ناکام رہے تھے۔

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ نصیر احمد بس ڈرائیو کرتے ہوئے ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ میں نشستوں کے درمیان سے گزر کر اس کے پاس پہنچا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نصیر؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ آواز میں تکلیف کا اظہار تھا۔

میں نے آگے جھک کر دیکھا، اس کا دایاں پہلو خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ جس وقت اس نے ناکے کی رکاوٹوں کو توڑا تھا، اسے گولی لگ گئی تھی۔ ''عمران۔'' میں نے پکار کر کہا۔

عمران اور ڈاکٹر مہناز دونوں میری طرف لپک آئے۔ ''نصیر زخمی ہے۔'' میں نے اطلاع دی۔

''کوئی بات نہیں سر! میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔'' وہ بولا۔

وہ کہہ تو رہا تھا لیکن اس کی حالت ایسی ہرگز نہیں تھی۔ دوسری طرف ہم بس روکنے اور ڈرائیور تبدیل کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ ہمارا تعاقب ہو رہا تھا اور تعاقب کرنے والے لحہ بہ لحہ قریب پہنچ رہے تھے۔ انہیں دور رکھنے کے لئے عمران کا شوٹر گاہے بگاہے اسنیپر گن سے فائر کر رہا تھا۔ مگر ایمونیشن محدود تھا، وہ بہت زیادہ فائر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر مہناز سے کہا۔ ''مہناز! آپ نصیر کے پاس ہی بیٹھ جائیں۔ فی الحال اس کا خون روکنے کی کوشش کریں۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔''

مہناز اپنا سامان لے کر نصیر احمد کے پاس بیٹھ گئی اور قینچی سے اس کی قمیص کاٹ کر زخم کو دیکھنے لگی۔ گولی نصیر کے پیٹ میں گئی تھی اور وہ شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

''کتنے راؤنڈ رہ گئے ہیں؟'' عمران نے اسنیپر گن والے سے پوچھا۔

''بس آٹھ جی۔''

''ٹھیک ہے، دھیان سے استعمال کرو۔''

یہ اسنیپر بہت فائدہ دے رہی تھی۔ تعاقب کرنے والے ہم سے فاصلہ رکھنے پر مجبور تھے۔ وہ قریب آجاتے تو بہ آسانی بس کے ٹائروں کو نشانہ بناتے۔ ٹائر نشانہ بنتے تو اتنی رفتار سے چلتی بس کو سنبھالنا ناممکن ہو جاتا۔ وہ یقیناً کسی خوفناک حادثے کا شکار ہوتی۔

گرد آلود جھکڑ چل رہے تھے۔ ہمارے اردگرد جوار اور باجرے کے کھیت تھے۔ کہیں کہیں دور کھیتوں میں بھیڑ بکریوں کے ساتھ کوئی اونٹ بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ ہم بتدریج بارڈر کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ جگت سنگھ بدستور کھڑا تھا۔ جب سے بس روانہ ہوئی تھی، وہ ایک لمحے کے لئے بھی بیٹھا نہیں تھا۔ سامنے دیکھتے ہوئے وہ ایک دم چلا اٹھا۔ ''بادشاہ زادے! آگے دیکھ کتوں نے رستہ بند کیتا ہویا ہے۔''

میں نے دیکھا، تقریباً 300 میٹر دور ایک بیل گاڑی اور ایک جیپ کو سڑک کے درمیان لا کر راستہ بلاک کر دیا گیا تھا۔ اردگرد بی ایس ایف والوں کی وردیاں نظر آ رہی تھیں۔

''جانے دو۔'' عمران نے کہا۔

عمران نہ بھی کہتا تو نصیر رکنے والا نہیں تھا۔ اس نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ ہم نیچے جھک گئے اور مختلف چیزوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ میں نے ثروت کو اپنی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا۔ بس کو زوردار جھٹکا لگا۔ وہ ایک دھماکے کے ساتھ رکاوٹوں سے ٹکرائی۔ ونڈ اسکرین چکنا چور ہو گئی۔ میں نے چارے سے لدی ہوئی بیل گاڑی کو الٹ کر کھیتوں میں گرتے دیکھا...... گاڑی پر فائرنگ ہوئی، جواب میں عمران کے شوٹرز نے بھی بھرپور جواب دیا۔ کوشش کے باوجود نصیر گاڑی کو سڑک پر نہ رکھ سکا۔ وہ کچے میں اتر گئی اور بے تحاشا اچھلنے لگی۔ عمران نے نصیر کی مدد کرتے ہوئے بمشکل گاڑی کو دوبارہ سڑک پر چڑھایا۔ نصیر کا زخم ایک دم کھل گیا اور خون تیزی سے بہنے لگا۔ مہناز نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''قاسم! تم گاڑی ڈرائیو کرو۔'' عمران نے ایک شوٹر کو ہدایت جاری کی۔

''یس سر۔'' وہ سینہ تان کر بولا۔

گاڑی کو روکے بغیر نصیر کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹایا گیا اور قاسم نامی نوجوان کو بٹھا دیا گیا۔ آندھی کے جھکڑ اب آزادانہ گاڑی کے اندر گھس رہے تھے۔ بیشتر کھڑکیوں کے علاوہ ونڈ اسکرین بھی تقریباً ناپید تھی۔

ڈاکٹر مہناز کے کہنے پر زخمی نصیر احمد کو نشستوں کے درمیانی راستے پر لٹا دیا گیا۔ اس کے جسم کا خون نچڑتا چلا جا رہا تھا۔ قربان علی نے آنکھوں سے ٹیلی اسکوپ لگا رکھی تھی۔ وہ بولا۔ ''کم از کم چار گاڑیاں پیچھے آ رہی ہیں۔ دو پولیس کی ہیں، دو بی ایس ایف کی۔''

''اسنیپر گن کی وجہ سے وہ دور ہیں۔ اسنیپر کے کتنے راؤنڈ رہ گئے؟'' عمران نے پوچھا۔

''صرف چار جی۔''

''اب ذرا وقفہ دو۔ ہمیں ان گولیوں کی سخت ضرورت ہے۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن وہ قریب آتے جائیں گے۔'' گن مین نے کہا۔

''یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔''

اگلا آدھ گھنٹا کافی اعصاب شکن تھا۔ تعاقب والی گاڑیاں قریب آ جاتی تھیں تو اسنیپر گن سے راؤنڈ چلانا پڑتا تھا۔ ایسے ہی ایک فائر میں بی ایس ایف کی ایک اور جیپ نشانہ بنی اور سڑک سے اتر کر کپاس کے کھیتوں میں گھس گئی۔ سارے راؤنڈ فائر ہو گئے تو تعاقب کرنے والوں کو زیادہ فاصلے پر رکھنا ناممکن ہو گیا۔ گن مین کے حساب سے ایک راؤنڈ باقی تھا لیکن وہ فائر ہو گیا تھا یا پھر کہیں لڑھک کر نشستوں کے نیچے چلا گیا تھا۔ وہ کہیں نہیں ملا۔ اب ہم نے آٹومیٹک رائفلوں سے فائرنگ شروع کی لیکن یہ فائرنگ بھی کفایت شعاری سے ہی کرنا پڑ رہی تھی۔ دوسری طرف سے اندھا دھند گولیاں چل رہی تھیں۔ اچانک مجھے لگا کہ ہماری بس بری طرح لہرا رہی ہے۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ''تابی! قاسم کو دیکھو۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور قاسم اسٹیئرنگ وہیل پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کی پشت پر کندھوں کے درمیان قمیص سرخ ہو چکی تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ سے زیادہ دور نہیں تھا، میں نے لپک کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میڈم صفورا اور جگت سنگھ میری مدد کو آئے۔ ہم نے بس کو مکمل طور پر روکے بغیر مُردہ قاسم کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹا لیا...... اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ڈرائیونگ سنبھال لوں۔ میں اس خون آلود سیٹ پر بیٹھا اور بس ڈرائیو کرنے لگا۔ اتنی بھاری گاڑی چلانے کا مجھے اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مگر جو حالات تھے، ان میں کسی منصوبہ بندی کے بغیر ہی سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ثروت کا چہرہ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ڈرائیونگ سیٹ ''خونی سیٹ'' بنی ہوئی ہے۔ پہلے نصیر احمد گولی کا شکار ہو کر یہاں سے اٹھا تھا پھر قاسم کی لاش اٹھائی گئی تھی۔ اب میں یہاں بیٹھا تھا۔

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ تعاقب کرنے والی گاڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ کافی نزدیک بھی آ گئے تھے۔ ہم سائل پور کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب رخ بارڈر کی طرف تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ مسلسل ہمیں کچوکے لگا رہا تھا۔ بس کے پچھلے حصے میں گولیوں کی ایک بوچھاڑ لگی۔ پہلے دائیں طرف کے ٹائر دھماکے سے پھٹے۔ اس کے بعد سارا بوجھ بائیں جانب کے اکلوتے ٹائر پر پڑا اور وہ بھی برسٹ ہو گیا۔ ثروت سمیت لڑکیاں چلا اٹھیں۔ اب بس کو بری طرح دھچکے لگ رہے تھے۔ میں بس کو اسی طرح دوڑاتا چلا جا رہا تھا

مگر رفتار بہت کم ہو چکی تھی۔ اس بدترین صورتِ حال میں مثبت پہلو صرف یہی تھا کہ دونوں عقبی ٹائر برسٹ ہوئے تھے اور بس کے الٹنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ بہرحال اس طرح زیادہ دور تک جایا نہیں جا سکتا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''وہ دائیں طرف کچھ نظر آ رہا ہے۔ کیا ہے یہ؟'' عمران نے کہا۔

''جیلانی نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا...... ''کوئی پرانا ڈاک بنگلہ سا ہے...... شاید ریسٹ ہاؤس۔'' جیلانی نے اطلاع دی۔

''ادھر موڑ لو۔'' عمران نے کہا۔

گاڑی کے ٹائر کٹ چکے تھے اور اب وہ لوہے کے رموں پر دوڑ رہی تھی۔ دوڑ بھی کیا رہی تھی، بس اچھل رہی تھی۔ کسی بھی وقت اس کا ٹائی راڈ وغیرہ ٹوٹ سکتا تھا اور اسے فل اسٹاپ لگ سکتا تھا۔ عمران نے سب کو گاڑی کے فرش پر لٹا دیا تھا اور خود بھی لیٹ کر ہی فائرنگ کا جواب دے رہا تھا۔ فقط جگت سنگھ نے یہ ہدایت تسلیم نہیں کی تھی اور بس ایک گھٹنا زمین پر ٹیکنے پر اکتفا کیا تھا۔ اب ہم ریتیلی زمین پر تھے۔ راستہ نیم پختہ تھا۔ عقبی گاڑیاں تیزی سے پاس آ رہی تھیں۔ ہم ان کے پہنچنے سے پہلے اس ریسٹ ہاؤس نما عمارت میں گھس جاتے تو یہ ہماری کامیابی تھی۔ بس کو لگنے والے شدید جھٹکوں کی وجہ سے اسٹیئرنگ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک گولی آئی اور اسٹیئرنگ کے نچلے حصے کو توڑ گئی۔ کرچیوں نے میرے ہاتھوں کو لہولہان کر دیا۔ میں کسی نہ کسی طرح گاڑی کو اس کھنڈر عمارت تک لے آیا۔ لکڑی کا پھاٹک دھماکے سے توڑتی ہوئی بس احاطے میں گھس گئی۔ یہاں لمبی گھاس تھی اور ویرانیوں کے ڈیرے تھے۔

عمران کی ہدایت پر سب گاڑی میں سے نکل آئے۔ میڈم صفورا لڑکیوں کو لے کر اندرونی کمروں کی طرف لپک گئی۔ سریتا کے نام پر ہمیں جو ڈمی لڑکی ملی تھی، وہ بھی ساتھ تھی۔ ہم نے بس کے پیچھے اور اس کے علاوہ مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ قربان علی زخمی نصیر احمد کو لے کر قریبی کمرے کی طرف چلا گیا۔

عقبی گاڑیاں برق رفتاری سے دھول اُڑاتی آئیں اور محفوظ فاصلے پر رک گئیں۔ یہ نصف درجن کے قریب گاڑیاں تھیں۔ کچھ جیپیں اور کچھ کاریں۔ ایک کھلی جیپ پر M16 ٹائپ کی مشین گن صاف دکھائی دے رہی تھی۔

جگت سنگھ کے گلے کی رگیں جوش سے پھولی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بادشاہ زادے! اگر تمہارا آرڈر ہو تو میں ان سامنے والی جھاڑیوں میں جا کر اس بڑی گن

والی جیپ کا کچومر بنا سکدا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''کالا انار پھینکوں گا اس پر۔ پندرہ سو ٹوٹے ہو جائیں گے۔''

''نہیں، ابھی نہیں۔ عمران سے مشورے کے بعد۔'' میں نے کہا۔

ادھر اِکا دُکا فائر آنے شروع ہو گئے تھے۔ عمران کے شوٹر بھی جواب دینے لگے تھے۔ عمران نے انگلی سے اس پھاٹک کی طرف اشارہ کیا جسے ہم نے بس کی ٹکر سے ابھی توڑا تھا۔ پھاٹک کے خستہ حال تختوں کے ساتھ دو بڑی بڑی ہڈیاں بلکہ ہڈ لال ڈوری کے ساتھ جھول رہے تھے۔ نہ جانے کیوں لگا کہ یہ انسانی ہڈیاں ہیں۔

''یہ تو کوئی ٹونا لگتا ہے۔ وہ نیچے کچھ تعویذ وغیرہ بھی بندھے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اسی دوران میں اندر سے ایک دم لڑکیوں کے رونے چلاّنے کی آوازیں آئیں۔ پھر ثروت، ایشوریا اور دیگر لڑکیاں بھرّا مار باہر نکل آئیں۔ میڈم صفورا بھی ساتھ ہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ پھر اس نے ہمت کی اور کمرے کی طرف رخ کر کے گولی چلائی۔ میں دوڑ کر ان کی طرف گیا۔ میں نے دیکھا۔ ٹوٹے پھوٹے کمرے کے فرش پر ایک بڑے خارپشت کا خونچکاں جسم پڑا تھا۔ ایسے ہی دو تین مزید خارپشت پچھلے کمرے کی باہر والی دہلیز پر نظر آ رہے تھے۔ ایک ''جسیم'' کالا بلاّ کمرے کے گوشے میں کھڑا خارپشت کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔

میڈم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہاں اور بھی جانور ہیں۔ ابھی وہاں برآمدے میں دو بڑے ٹرٹلز (کچھوے) بھی دیکھے ہیں میں نے۔ کئی کیٹس بھی ہیں۔''

کالا بلاّ یقیناً جنگلی تھا۔ اس کا انداز خطرناک تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت ہم پر جھپٹ پڑے گا۔ یہ دوطرفہ مصیبت تھی۔ باہر گھیرا ڈال کر فائرنگ شروع کر دی گئی تھی اور اندر یہ کریہہ المنظر جانور تھے۔ اسی دوران میں ایک اور کالے بلے یا بلی نے ایک روشن دان میں سے چھلانگ لگائی اور سیدھا خارپشت کی لاش پر گرا۔ اس بھوکے جنگلی بلّے نے خارپشت کی لاش کو گھسیٹنا چاہا مگر ہمارے دھمکانے پر دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈالی ہوئی تھیں اور انداز خطرناک تھا۔ بہت جارح ہو رہا تھا وہ۔

شاید میں یا میڈم صفورا اس پر بھی گولی چلا دیتے لیکن عمران لپک کر اندر آ گیا۔ ''نہیں نہیں...... ہمارے پاس فالتو گولیاں نہیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔ تم لوگ باہر جاؤ...... بی ایس ایف والے آگے آنے کی کوشش میں ہیں۔ سب سے کہو پوزیشن لے لیں۔'' عمران بولا۔ پھر بلا تردد کالے جنگلی بلّے کی طرف بڑھا۔ اس نے اسے شُشکارا تو وہ

ایک دم خار پشت کی لاش سے دھیان ہٹا کر باہر نکل گیا۔

''یہ کیا چکر ہے تابش؟'' میڈم صفورا نے پوچھا۔

''مجھے تو لگ رہا ہے کہ کسی جادو ٹونے کے سلسلے میں یہاں جان بوجھ کر یہ جانور چھوڑے گئے ہیں۔''

''مم...... میں اندر نہیں جاؤں گی۔'' ثروت نے گھبراتے ہوئے کہا۔

اپنی اس بات کا جواب اسے فوراً ہی مل گیا۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور لڑکیوں کے سروں پر سے گزر گئی۔ ایشوریا رائے کو دو گولیاں لگیں۔ ایک گردن میں دوسری سینے میں۔ وہ پٹ سے ٹوٹے پھوٹے فرش پر گری اور خون تیزی سے اس کی گردن کو سرخ کرنے لگا۔

''اندر جاؤ۔'' میں نے چلاّ کر کہا۔ لڑکیاں میڈم صفورا سمیت ایک تاریک کمرے میں گھس گئیں۔ حسن و نزاکت کا مجسمہ سویٹی عرف ایشوریا رائے جو ایک فلم اسٹار بننے کے لئے گھر سے نکلی تھی، آج اس سرحدی علاقے کے اس خستہ حال کمرے میں فرش پر شدید زخمی پڑی تھی۔ اس نے اپنی دلکش آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ''مجھے بچاؤ، میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ اپنے لاہور...... اپنے بہن بھائیوں کے درمیان...... میں نے اپنے کیے کی کافی سزا پالی ہے......''

میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھایا اور قریبی کمرے میں لے جا کر گرد آلود فرش پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر مہناز شدید فائرنگ کی پرواہ نہ کرتی ہوئی تیزی سے ایشوریا رائے کی طرف لپکی۔ اس نے قینچی کی مدد سے بلاؤز کاٹ کر اس کا دودھیا سینہ عریاں کر دیا اور گولی کا مہلک زخم دیکھنے لگی۔ زخم دل کے مقام سے تھوڑا ہٹ کر آیا تھا لیکن بے حد کاری نظر آتا تھا۔ مہناز اور میڈم صفورا کو ایشوریا رائے کے پاس چھوڑ کر میں احاطے کی طرف بڑھا۔ یہاں دیواروں سے مردہ بیلیں چمٹی ہوئی تھیں اور اونچی خودرو گھاس ویرانی کا عجب نمونہ پیش کر رہی تھی۔ جس شخص کے جھوٹ کی وجہ سے ہم یہاں بری طرح پھنسے تھے (یعنی ماسٹر جواہر) وہ ایک ستون کی اوٹ میں دبکا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ دونوں طرف سے زوردار فائرنگ جاری تھی۔ عمران نے پھاٹک کے پاس سب سے خطرناک جگہ پر پوزیشن لی ہوئی تھی اور ٹرپل ٹو چلا رہا تھا۔ میں اس کے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گیا۔ اس کے کندھے کے لمس نے میرے سینے میں عجیب سا ولولہ بھر دیا۔ مرنے اور مار دینے کا جوش۔ آخری سانس تک لڑنے اور فتح پانے کا جنون۔ ''پیچھے چلا جا تابی۔'' عمران کرخت لہجے میں بولا۔

''بکواس بند کر۔ یہاں کوئی باس نہیں ہے۔''

''لیکن تابی۔''

''میں جھانپڑ مار دوں گا۔ سامنے دھیان رکھ۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے پانچ گولی کا برسٹ چلایا اور ایک پلپیے کو بھون کر رکھ دیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے قریب درختوں میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم تاک تاک کر نشانے لگانے لگے۔ ہم سب پر سب سے زیادہ فائرنگ M16 مشین گن سے ہو رہی تھی۔ فی الحال اس کا کوئی توڑ ہمارے پاس نہیں تھا۔

''کیا خیال ہے...... جاوا بھی ہے ان لوگوں میں؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔ میری نگاہ سامنے تھی۔

''نہیں، ابھی تو وہ نظر نہیں آ رہا۔ لیکن لگتا ہے کہ جلد ہی پہنچ جائے گا۔'' عمران بھی سامنے نگاہ رکھتے ہوئے بولا۔

''بارڈر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''اب بھی پانچ چھ میل سے کم نہیں ہے۔''

''تو کیسے نکل سکیں گے یہاں سے؟ یہ تو سخت سیکیورٹی والا ایریا ہوگا۔''

''امید پر دنیا قائم ہے۔'' عمران نے کہا اور دو سنگل شاٹ چلائے۔ ایک جیپ کی ونڈ اسکرین چور ہو گئی۔ دور فاصلے پر دھول اُڑ رہی تھی۔ یہ اس امر کی نشانی تھی کہ کچھ اور لوگ پہنچ رہے ہیں۔

میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ یہ ریسٹ ہاؤس پرانا تو تھا لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں۔ پھر پتا نہیں کیوں اسے یوں ویران چھوڑ دیا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ماضی قریب میں شکاری اور سرکاری اہلکار اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ پھاٹک سے جھولتی ہوئی ہڈیاں اور رنگ برنگے تعویذ ایک طرح کی پُراسراریت پیدا کر رہے تھے۔

اندر سے لڑکیوں کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے جگت سنگھ سے کہا۔ ''دیکھو، اب کیا ہوا ہے انہیں۔''

جگت سنگھ جھک کر بھاگتا ہوا اندر گیا اور کچھ دیر بعد واپس اپنی پوزیشن پر آ بیٹھا۔ ''بتایا نہیں تم نے...... کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔ ''وہ بی بی...... جسے ہم ایشوریا رائے کہندے ہیں......''

وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا تھا لیکن میں اور عمران سمجھ گئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ایشوریا رائے ختم ہو گئی تھی۔ اس کی حالت ہی بتا رہی تھی کہ اس کا بچنا مشکل ہے۔ دل و دماغ میں دکھ کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

گھیرا ڈالنے والوں کو نئی کمک مل گئی تھی۔ ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ چھوٹے بڑے ہتھیاروں کی گولیاں اب زیادہ خطرناک زاویے سے ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا، میں ایک بار ثروت کو جی بھر کر دیکھوں۔ اسے چھوؤں...... اور اس سے کہوں۔ ''ثروت! میں نے تمہیں دنیا میں ہر چیز سے زیادہ چاہا ہے...... اور چاہتا رہوں گا۔'' میں اِکا دُکا فائر کرتا ہوا پیچھے کی طرف جانے لگا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ثروت کو دیکھا۔ وہ کمرے کے بجائے برآمدے میں تھی۔ گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں...... یہ بڑے نازک لمحے تھے۔

کسی بھی وقت کوئی گولی ثروت کو لگ سکتی تھی۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے میں اس کی طرف جانا چاہ رہا تھا، وہ میری طرف آنا چاہ رہی تھی۔ وہ ایسا کرتی تو اس کے لئے زبردست رسک ہوتا۔ یہ رسک مجھے لینا چاہئے تھا۔ میں ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور جھک کر بھاگتا ہوا برآمدے کی طرف گیا۔ گولیوں کی سنسناہٹ موت کی سرگوشیوں کی طرح تھی اور یہ سرگوشیاں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں۔ میں ثروت کے پاس پہنچا اور اسے کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا۔

گولیوں کی باڑ آئی۔ ہم کچے فرش پر گرے۔ ثروت میری بانہوں میں تھی۔ میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ مجھے لگا اسے گولی لگ گئی ہے۔ میں نے تیزی سے اس کے جسم کو ٹٹولا۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟''

اس نے آنکھیں بند کئے کئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے شفاف رخساروں پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ میں نے بے ساختہ اس کی پیشانی چومی۔ ''حوصلہ کرو ثروت! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''......اگر مجھے کچھ ہو گیا تو آپ نصرت کا خیال رکھیں گے نا؟'' اس نے آنکھیں بند کئے کئے پوچھا۔

''ایسی باتیں مت کرو۔ نصرت کا خیال تم رکھو گی اور دیکھنا وہ ٹھیک بھی ہو گی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا...... لیکن...... اب تم کمرے سے باہر نہیں نکلو گی۔ جب تک میں نہ کہوں۔ تمہیں اندر ہی رہنا ہے میڈم صفورا کے ساتھ۔''

وہ چپ رہی۔ تاہم چہرے سے عیاں تھا کہ وہ آمادگی ظاہر کر رہی ہے۔

ہمارے اردگرد ہونے والی فائرنگ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میرا عمران کے پاس فوراً پہنچنا ضروری تھا۔ میں ثروت سے علیحدہ ہو کر واپس احاطے کی طرف جانے کے لئے

اٹھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور سسک کر بولی۔ ''تابش! آپ اور عمران صاحب میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسے ہیں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، میری نگاہ ثروت کے عقب میں گئی۔ یہاں نیم تاریکی میں اس لڑکی کی لاش پڑی تھی جو جاوا نے دھوکے سے ہمیں سونپی تھی۔ یہ اس کی رکھیل سریتا نہیں تھی مگر ہم نے اسے سریتا سمجھ کر جاوا سے وصول کیا تھا۔ کوئی اندھی گولی اسے چاٹ گئی تھی۔ اس کے سینے پر بائیں طرف زخم تھا۔ ثروت کی نگاہ ابھی تک اس لاش پر نہیں پڑی تھی۔

میں نے ثروت کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیا اور اس طرح اسے کمرے سے دوسرے کمرے میں پہنچایا کہ اس تازہ لاش پر اس کی نظر نہ پڑ سکے۔ اس دوسرے کمرے میں میڈم صفورا لڑکیوں کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے انہیں دیوار کے ساتھ ساتھ ایک محفوظ آڑ میں بٹھایا ہوا تھا۔ وہ خود لوڈڈ پستول کے ساتھ ان کی نگہبانی میں مصروف تھی۔ گولیوں والی ایک بیلٹ اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ سویٹی، ایشوریا رائے کی لاش پر ایک اوڑھنی ڈال دی گئی تھی۔ اوڑھنی پر خون کے دو بڑے دھبے نمودار ہو چکے تھے۔ ثروت کو میڈم کے سپرد کر کے میں واپس احاطے کی طرف بڑا۔ عمران کے شوٹرز میں سے چار پانچ بندے اب تک راستے میں اور یہاں کام آ چکے تھے لیکن سترہ اٹھارہ اب بھی پوری طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے مختلف جگہوں پر بڑی اچھی پوزیشنیں لے لی تھیں۔ کچھ چھت پر چلے گئے تھے۔ ان میں اسنیپر گن والا بھی شامل تھا۔ لیکن اب وہ ایک ایل ایم جی چلا رہا تھا۔ اس کی اسنیپر گن، راؤنڈز ختم ہونے کے سبب بیکار ہو گئی تھی۔

میں عمران کے پاس پہنچا۔ ہم اس ریسٹ ہاؤس کے ایک سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ یہ خالی کوارٹر پھاٹک کے بالکل قریب واقع تھا۔ اس کی خستہ دیوار میں رخنے موجود تھے اور یہ جگہ فائرنگ کرنے کے لئے بالکل ایک مورچے جیسی ہو گئی تھی۔ عمران کے اردگرد گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ اور اس نے ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر آٹومیٹک رائفل کا بٹ اپنے کندھے سے لگایا ہوا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے جن گاڑیوں کی دھول دیکھی تھی، وہ اب قریب پہنچ گئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں جاوا کی دیوہیکل گرے جیپ صاف نظر آ رہی تھی تین چار گاڑیاں مزید تھیں۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے جاوا بھی آ گیا۔''

''دعا کرو کہ واپس نہ جائے۔'' عمران نے ایک سنگل شاٹ فائر کرتے ہوئے کہا۔

"ہم کب تک ان کی فائرنگ کا جواب دے سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ایمونیشن احتیاط سے استعمال ہو تو چوبیس گھنٹے تو بہ آسانی گزر سکتے ہیں۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"جنگ میں یہ نہیں سوچا جاتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہ سوچا جاتا ہے کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن عمران! یہ جنگ لگی کیوں ہے؟ جاوا کے ساتھ ہمارا معاملہ تو صرف گندھارا مورتی کا تھا۔ مورتی اسے مل گئی ہے۔ اب کیوں وہ تمہارے پیچھے ہے؟ پولیس اور بی ایس ایف بھی اس کا پورا ساتھ دے رہی ہے۔"

"تمہیں سب کچھ بتایا تو ہے جان۔ جاوا کا اور ہمارا معاملہ صرف مورتی کا تھا لیکن گڑبڑ یہ ہوئی کہ ادھر پاکستان میں اقبال بدقسمتی سے جاوا گروپ کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے تشدد اور پوچھ گچھ کے جدید طریقے اختیار کر کے یہ معلوم کر لیا کہ ہم انڈیا کے اندر کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ ان کارروائیوں میں پاکستانیوں کو یہاں کی ایجنسیوں سے رہائی دلا کر وطن واپس پہنچایا جاتا رہا ہے۔ ہماری اس نئی شناخت سے جاوا نے ایجنسیوں کو باخبر کر دیا ہے......"

"عمران! تم اب بھی پوری بات نہیں بتا رہے ہو...... تمہیں اچھا لگے یا برا لیکن آج میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے ممبئی میں بند کمرے کے اندر تمہاری اور جیلانی کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔"

عمران نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

میں نے بات جاری رکھی۔ "جیلانی تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے بہت برا ہوا ہے۔ اب کم از کم تمہیں تو کسی صورت جاوا کے سامنے نہیں جانا چاہئے۔ جتنی جلدی ہو سکے انڈیا سے نکل جانا چاہئے۔ اس نے رو رو کر درخواست کی لیکن تم نے اس کی بات نہیں مانی۔"

"بس یہی وجہ تھی جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔ ان لوگوں کو پتا چل چکا ہے کہ میں اور میرے ساتھی یہاں کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔"

بائیں جانب سے گھیرا ڈالنے والی گاڑیاں اب آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھیں۔ ان کے عقب میں مسلح افراد اوٹ لئے ہوئے تھے۔ عمران کے شوٹر انہیں ٹارگٹ کرنے لگے۔ کچھ دیر تک یہ زوردار کشمکش جاری رہی۔ پھر آگے بڑھنے والی گاڑیاں درختوں کے جھنڈ تک پہنچنے میں

کامیاب ہو گئیں۔ اب وہ بہتر طریقے سے ہمیں نشانہ بنا سکتے تھے۔ عمران نے قربان علی سے کہا کہ وہ سیڑھیوں پر اپنی پوزیشن ختم کر کے چھت پر چلا جائے۔ اگر وہ سیڑھیوں میں رہتا تو وہ اور اس کے دو ساتھی بہ آسانی نشانہ بن سکتے تھے۔

کچھ دیر کے لئے فائرنگ میں وقفہ آیا۔ شوٹرز نئے میگزین رائفلوں سے اٹیچ کرنے لگے۔ میں نے دیکھا، میڈم صفورا میگزین بھرنے میں جگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی مدد کر رہی ہے۔

میں نے کہا۔ "عمران! کوئی کمک ملنے کا چانس بھی ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"تمہارے دیگر ساتھی اور...... اور وہ سابق میجر صاحب...... جن کو تم انچارج کہتے ہو، کیا وہ یہاں تک پہنچ سکیں گے؟"

"یہ تو حالات پر ہے تابی! ان کو خبر تو بہرحال ہو چکی ہے۔ اب دیکھیں کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر کرتے ہیں تو کتنی دیر میں؟"

"اگر میجر صاحب یہاں پہنچ جائیں اور اچانک باہر سے حملہ کریں تو ہم اندر سے زور مار کر ان کا گھیرا توڑ سکتے ہیں۔"

"ہوں۔" عمران نے مختصر جواب دیا۔ رائفل پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی اور چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن...... مجھے نہیں لگتا عمران کہ تمہارے وہ میجر صاحب کچھ کر پائیں گے۔"

"اتنی مایوسی کیوں؟"

"شاید میجر کا انتظار بیکار ہی ثابت ہو۔"

"کیوں؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس لئے...... کہ مجھے ایک شک ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ...... تم خود ہی وہ میجر ہو۔"

"میرے آخری الفاظ نے اسے جیسے جھنجوڑ ڈالا۔ وہ متحیر نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "...... عمران! تمہارے ساتھ رہ رہ کر مجھے بھی اندھیرے میں دیکھنا آ گیا ہے۔ تم کچھ بھی کہو میرا دل کہتا ہے کہ تم اب بھی صاف بات نہیں بتا رہے ہو۔ جس آرگنائزیشن کا تم نے ذکر کیا ہے، اگر وہ واقعی ہے تو پھر یہ تمہاری ہی بنائی ہوئی

ہے اور اس کے ہیڈ بھی تم خود ہی ہو۔"

دو گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں۔ ایک عمران کے سر پر سے گزر گئی۔ دوسری نے اس کے کندھے کو بوسہ دیا۔ وہ اس کی قمیص جلاتی ہوئی اور کندھے پر سرخ لکیر ڈالتی ہوئی نکل گئی۔

ہم نیچے جھک گئے اور دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئے۔

میں نے جلدی سے عمران کا کندھا دیکھا۔ اسے صحیح معنوں میں گولی کا بوسہ کہنا چاہئے تھا۔ وہ بس ایک گہری خراش ڈالتی ہوئی گزر گئی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔" عمران مسکرایا۔ "میں بلٹ پروف ہوں۔ سیدھی گولی بھی لگے گی تو اندر نہیں گھس سکے گی۔ ویسے بھی ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ہمیں۔ گھبراؤ مت، آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"

اسی دوران میں جیلانی بھی ہمارے پاس آ گیا۔ اس کا بازو زخمی تھا لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "عمران صاحب! وہ لوگ گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو گاڑیاں درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئی ہیں، وہ نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ان میں موجود بندے بڑے خطرناک زاویے سے گولی چلا رہے ہیں۔"

اگلے ایک گھنٹے تک مسلسل گولیاں چلتی رہیں۔ بہرحال ہم نے ان گاڑیوں کو اس سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

جگت سنگھ نے مجھے اشارے سے پاس بلایا۔ میں اس کی پوزیشن پر پہنچا تو وہ بولا۔

"بادشاہ زادے! مجھے عمران صاحب سے آ گیا (اجازت) لے دو۔ میں اس ماں دی سالی کا بولو رام کرنا چاہندا ہوں۔"

"کون ماں دی سالی؟"

"او یار! یہی مشین گن۔ مجھے آ گیا دو۔ میں ابھی اس کے پندرہ سوٹوٹے نہ کروں تو جگت سنگھ نام نہیں۔ دو کالے اناروں کی مار ہے۔"

"اور تم کتنی گولیوں کی مار ہو؟"

"واہگرو کی سوگند ہے، مجھے اپنی کوئی پروا نہیں۔ اس جاوا نے میرا پتروں جیسا بھرا مارا ہے، آشا کور کی جندگی لی ہے۔ تم لوگ میرے شریر سے بم باندھ دو، میں اپنے پیو کا نہیں اگر اس کتے جاوا کے اندر پہنچ کے خود کو نہ اڑا لوں۔"

"پر یہ لوگ تمہیں جاوا تک پہنچنے دیں گے تو پھر ہے نا؟"

"نہ پہنچنے دیں۔ میں کوشش تو کروں گا نا۔ اگر میں اس کے آس پاس بھی پہنچ گیا اور میں

نے اس ذلیل کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کی ماں بہن ایک کر دی اور خود کو اڑا لیا تو یہ بھی مامولی گل نہیں ہوگی۔ اسے یہ پتا تو چل جائے گا نا کہ موت ہولے ہولے اس کے کول آ رہی ہے۔" جگت سنگھ کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے اور داڑھی کے بال جیسے کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اگر کچھ کرنا ہے تو پھر تم اکیلے نہیں، ہم دونوں کریں گے۔ لیکن ابھی نہیں۔ اندھیرا ہونے دو۔"

"ٹھیک ہے بادشاہ زادے! پر ایک وچن تم ابھی دو۔ اگے جا کر جیپ پر کالے انار میں خود پھینکوں گا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا اور میں نہ پھینک سکا تو پھر تم کوشش کر لینا۔ پر میں تمہیں بتا دوں، مجھے ناکام نہیں ہونا ہے۔ میرے اندر اس بندے کے لئے جتنی آگ ہے، میں مر بھی گیا تو میری لاش تڑپ پھڑک کر اس کی چھاتی تک پہنچ جائے گی۔"

ہم محاصرے میں تھے۔ اس ریسٹ ہاؤس سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ دوسری طرف ہم بھی ان لوگوں کو آگے آنے نہیں دے رہے تھے۔ سہ پہر سے ذرا دیر بعد جھنڈ میں موجود گاڑیوں نے آگے کھسکنے کی کوشش کی۔ سیکیورٹی فورس کے باوردی افراد ان گاڑیوں کو دھکیلتے ہوئے اور ان کی آڑ لیتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ ہم نے بھرپور جواب دیا۔ ریسٹ ہاؤس کی چھت پر موجود ماہر شوٹرز نے بڑی مؤثر فائرنگ کی۔ سیکیورٹی فورس کے کم از کم دو بندے زخمی ہوئے اور وہ لوگ واپس جھنڈ میں گھسنے پر مجبور ہو گئے۔ اب رات کے تاریک سائے پھیل چکے تھے۔ آندھی کے جھکڑ بھی کم ہو گئے تھے لیکن تیز ہوا بدستور موجود تھی۔ ہم نے سویٹی کی لاش کو ریسٹ ہاؤس کے عقبی صحن میں تالاب کے پاس خودرَو گھاس میں امانتاً دفنا دیا۔ ڈرائیونگ کے دوران میں ہلاک ہونے والے شوٹر قاسم کی لاش کو بھی اسی طرح دفنایا گیا۔ نصیر احمد کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ ڈاکٹر مہناز تندہی سے اس کو طبی امداد دے رہی تھی۔ نصیر کے جسم سے ایک گولی تو مہناز نے بس کے اندر ہی نکال دی تھی۔ دوسری گولی پسلی توڑ کر اس کے پھیپھڑے میں لگی تھی۔ نصیر کو اندرونی بلیڈنگ کا سامنا تھا۔

وقتی طور پر فائرنگ بالکل رکی ہوئی تھی۔ تاہم دونوں طرف کے رائفل بردار پوری طرح چوکس تھے۔ بس کے اندر کھلاڑیوں کے اٹیچی کیسز میں سے ہی کھانے کی اشیاء بھی ہمیں مل گئیں۔ ان میں بسکٹ کے ڈبے…… نمکو…… چپس اور دودھ کے پیکٹ بھی تھے۔ کچھ سامان خورد و نوش ڈاکٹر مہناز ممبئی سے ہی لے کر آئی تھی۔ اگر احتیاط سے استعمال کیا جاتا تو یہ راشن

ہمارے لئے تین چار دن کے لئے کافی تھا۔

میں اور عمران ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اپنے حصے کا راشن میں نے زبردستی جگت سنگھ اور قربان علی کو دے دیا تھا۔ دیگر تکالیف کی طرح مجھے بھوک اور پیاس برداشت کرنے کا ہنر بھی آ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ضرورت پڑی تو میں ایک ہفتے تک بغیر کچھ کھائے صرف پانی پر گزارہ کرسکوں گا۔

قربان علی رائفل کندھے سے لٹکائے سرونٹ کوارٹر میں ہمارے پاس آیا۔ اس نے کہا۔ ''عمران صاحب! اب ریسٹ ہاؤس تقریباً صاف ہے۔ شاید ہی ایک آدھ بلی یا دو چار چوہے موجود ہوں......''

''کیا کچھ نکلا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''بہت کچھ جی۔ لگتا ہے پورا چڑیا گھر تھا۔ پکی بات ہے کہ یہ سارے جانور جان بوجھ کر یہاں چھوڑے گئے تھے۔ تین چار جنگلی بلے تھے...... اتنے ہی خار پشت بھی تھے...... کچھ نیولے تھے۔ کچھوے تو آپ نے بھی دیکھے ہیں۔ ایک دو شاید اب بھی وہاں باؤلی (تالاب) میں ہوں۔''

''کچھ پتا چلا کہ یہ چکر ہے کیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ دیکھیں...... یہ پوٹلیاں اندر چوکھٹوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔'' قربان نے رنگ برنگے ریشمی کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں عمران کو دکھائیں۔

یہ دراصل ریشمی رومال تھے۔ ان میں خشک ناریل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، بادام، پتاشے اور اس طرح کی دیگر چیزیں باندھی گئی تھیں۔ کچھ پوٹلیوں میں تعویذ بھی تھے۔ قربان علی نے ایک پوٹلی دکھائی۔ اس میں تعویذ کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ہڈیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ یہ انسانی ہڈیاں تھیں۔ ایک جبڑے کی ہڈی لگتی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ پھاٹک پر جو بڑی ہڈیاں لٹک رہی تھیں، وہ بھی انسانی ہی تھیں۔ یہ ہڈیاں غالباً کسی قبر سے نکالی گئی تھیں۔

قربان علی نے ایک بڑے تعویذ کی تہیں کھولیں۔ ایک سفید موٹے کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر تھی۔ سرکنڈے کے قلم سے لکھی گئی یہ تحریر سنسکرت زبان میں تھی۔

''اب اسے پڑھے گا کون؟'' عمران نے کہا۔

قربان بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ماسٹر جواہر پڑھ لے گا۔''

''اسے بلاؤ۔''

کچھ ہی دیر بعد جاوا کی رکھیل کا سابق پتی، جوگی نما جواہر ہمارے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف نقش ہو چکا تھا اور چہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔ اس وقت جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا تھا، اسی شخص کی وجہ سے تھا۔ سریتا اس کی نہیں رہی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کا تھا۔ وہ اب بھی اس کی بھلائی اور زندگی چاہتا تھا۔ اسے خطرناک حالات سے بچانے کے لئے اس نے ہم سب کو موت کے منہ میں جھونک دیا تھا اور ہمارے ساتھ ساتھ خود کو بھی...... اور اپنے نقطۂ نظر سے اس نے جو کچھ کیا تھا، درست ثابت ہو چکا تھا۔ سریتا کی جگہ جو لڑکی ہمارے حوالے کی گئی تھی، وہ ماری جا چکی تھی۔ بہرحال اس سب کے باوجود پتہ نہیں کیوں مجھے اس پر غصہ نہیں آرہا تھا اور شاید عمران کو بھی نہیں۔ ہم اس کی مجبوری سمجھ رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''ماسٹر جواہر! پڑھو یہ کیا لکھا ہے۔ لیکن اس مرتبہ گمراہ مت کرنا ہمیں۔''

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور پڑھنا شروع کیا۔ یہ تقریباً پندرہ سطریں تھیں۔ خوش خط لکھا گیا تھا۔ ماسٹر جواہر نے دو مرتبہ پڑھا اور پھر ترجمہ کرنا شروع کیا۔

''...... بے شک یہ ثابت ہوا کہ سن 1999ء جولائی کی دس تاریخ کو یہاں راجستھان کے کچھ مہمان آکر ٹھہرے۔ ان کے ساتھ پانچ نہایت خوب صورت چھوٹے رشین کتے تھے۔ یہ کتے انہوں نے اپنی بڑی جیپ میں لادے ہوئے تھے۔ ان کو غلطی لگی اور اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا اپرادھ ان سے ہوگیا۔ وہ گاڑی کو احاطے میں چھایا میں کھڑا کر کے فوراً کار پر نکل گئے۔ وہ بھول گئے کہ چھایا چلی جائے گی اور سورج اوپر آتے ہی دھوپ پھیل جائے گی۔ گاڑی سارا دن دھوپ میں جلتی رہی۔ اس کے اندر گرمی انتہا کو پہنچ گئی۔ کتے سسک سسک کر مر گئے۔ ان کی آتمائیں اب اس جگہ پر قابض ہیں۔ وہ یہاں آنے والے کا جیون چھین لیتی ہیں۔ وہ یہاں سے باہر نکل کر بھی لوگوں کے پران لے سکتی ہیں۔ ان کے من بہلاوے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں جانوروں کو رکھا جائے۔ اس کے سوا اور کوئی حل ناہیں ہے۔ ہو ہی ناہیں سکتا۔ ایسا نہ کیا گیا تو ارد گرد کا علاقہ بھی ان آتماؤں کی زد میں آئے گا۔ ہم بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھوں سے بچائے۔ ہم نیچے لکھے ہوئے اشلوکوں کو اپنی رکھشا کے لئے یہاں لٹکا رہے ہیں۔''

اس کے نیچے کچھ اشلوک تھے اور کچھ دیگر ہدایات وغیرہ تھیں۔

اس تحریر کو مکمل طور پر دیکھنے اور سمجھنے سے اندازہ ہوا کہ چند سال پہلے یہاں کچھ جانوروں کی اذیت ناک موت کا حادثہ ہوا اور اس کے بعد کچھ ایسے واقعات یہاں پیش آئے کہ جس کے بعد اس ریسٹ ہاؤس کو آسیب زدہ قرار دیا گیا۔ علاقے کے لوگوں نے اس

طرف کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ یہاں مختلف جانور پکڑ کر رکھے گئے اور دیگر ٹونے ٹوٹکے کئے گئے۔

ایسے دور دراز علاقوں میں اس قسم کی توہمات کا ہونا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ عمران نے ماسٹر جواہر کو سختی سے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو کچھ تم نے یہاں ہمارے سامنے پڑھا ہے، بس تم تک ہی رہنا چاہئے۔ میں نہیں چاہتا کہ باقی ساتھیوں میں سے کسی میں کسی طرح کا کوئی ڈر پیدا ہو۔ یہ سب کمزور عقیدے والی باتیں ہیں۔ کیا تم ان پر یقین رکھتے ہو؟''

''نہیں جی۔'' ماسٹر جواہر نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں یہ باتیں میرے دھرم کا حصہ نا ہیں ہیں۔ یہ راکھشس کے پیدا کئے ہوئے وچار ہیں جو منش کے ذہن کو بکھیرتے ہیں۔''

''تو پھر یہ وچن دیتے ہو کہ کسی سے ان کا ذکر نہیں کرو گے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، وچن دیتا ہوں...... میں جانتا ہوں میرے کارن پہلے ہی آپ ایک بڑی مصیبت کا شکار ہوئے ہیں۔ اس کے لئے میں جتنی بھی شما چاہوں، وہ کم ہے۔ مم...... میں مجبور تھا۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

عمران نے کہا۔ ''خیر، جو کچھ بھی تھا ہماری قسمت میں لکھا تھا لیکن اب اس میں سے نکلنے کے لئے ہمیں اپنی قسمت کے ساتھ ساتھ اپنی ہمت پر بھی بھروسا کرنا ہوگا۔ میں تم سب سے یہ امید رکھتا ہوں کہ ہمت سے کام لو گے اور ساتھ دو گے۔''

جواب میں وہ بس آنسو بہاتا رہا۔ ماسٹر جواہر اور قربان علی وغیرہ چلے گئے تو ہم پھر سرونٹ کوارٹر میں تنہا رہ گئے۔ سامنے دیوار کے رخنے میں ہم نے فوجیوں کی طرح اپنی آٹومیٹک رائفلیں رکھی ہوئی تھیں اور نگاہیں اندھیرے میں دشمن کی حرکت کو تلاش کر رہی تھیں۔

ہوا تیز تھی لیکن مطلع صاف تھا۔ مدھم چاندنی میں اردگرد کا احوال دکھائی دے رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے باہر جو بھی نقل و حرکت ہوتی، ہمیں نظر آ سکتی تھی۔ ہمیں اپنے سامنے کم از کم سات گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ سیکیورٹی فورس کی چند موٹر سائیکلیں بھی تھیں۔ ہم سے ان کا فاصلہ 300 میٹر کے قریب تھا۔ ان گاڑیوں کے اندر اور عقب میں مسلح لوگ موجود تھے اور کسی بھی وقت ہم پر ہلا بول سکتے تھے۔ کچھ یہی صورتِ حال باقی اطراف میں بھی تھی۔ بہرحال ہمیں دو ایڈوانٹیج حاصل تھے۔ ایک تو ہم کھلی جگہ کے بجائے ریسٹ ہاؤس کے اندر

تھے۔ دوسرے ہم قدرے بلندی پر بھی تھے۔ خاص طور سے جو نشانے باز چھت پر تھے، وہ کافی دور تک دیکھ سکتے تھے اور بڑی کارگر فائرنگ کر سکتے تھے۔

''کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ یہ لوگ کمک کا انتظار کر رہے ہیں؟'' عمران نے کہا۔

''ہو بھی سکتا ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا میرا ذہن دراصل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ آج صبح میرے اور عمران کے درمیان جو چونکا دینے والی گفتگو ہوئی تھی، اس کو شدید فائرنگ کے سبب بریک لگ گئے تھے۔ میں اس گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑنا چاہتا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمران! تو تم تسلیم کرتے ہو؟''

''کیا؟''

''یہی کہ وہ آرمی آفیسر تم ہی ہو...... جو اس آرگنائزیشن کو چلا رہا ہے، وہ جو بھی ہے کیپٹن ہے یا میجر ہے، تم ہی ہو؟''

''اگر میں کہوں ''ہوں'' تو اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو جائے گا اور اگر نہ کہوں تو کیا بگڑ جائے گا؟ ان سوالوں کے جواب بعد میں بھی ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ فی الحال ہمارا فوری مسئلہ تو یہاں موت کے اس گھیرے سے نکلنے کا ہے۔''

''اگر نہ نکل سکے تو میرے سینے میں میرا یہ سوال ایک زہریلے تیر کی طرح اٹکا رہ جائے گا۔ شاید میں مرنے کے بعد بھی اس کی چبھن محسوس کروں۔''

''تمہیں کیوں یہ شبہ ہوا ہے کہ میں اس آرگنائزیشن کو چلا رہا ہوں؟''

''شبہ اب نہیں ہوا، اس وقت ہو گیا تھا جب میں نے تمہاری اور جیلانی کی گفتگو سنی تھی اور تمہارے لئے آئی ہوئی ای میلز پڑھی تھیں۔ مجھے وہاں درازوں سے کچھ ایسے پیپر ملے جن میں بار بار کسی میجر کا ذکر تھا مگر نام کہیں نہیں تھا۔ زیادہ شک بلکہ قوی شک مجھے آج ہوا ہے۔ شاید تم نے غور نہیں کیا۔ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی کسی نے نہیں کیا...... لیکن آج تمہیں تمہارے ایک قریبی بندے نے بے دھیانی میں میجر کہہ کر پکارا...... یہ اس وقت ہوا جب بی ایس ایف کی گاڑیاں جھنڈ میں پہنچ گئیں اور زوردار فائرنگ ہوئی۔ تمہیں پتا ہی ہے، یوں لگ رہا تھا کہ شاید وہ لوگ اندر گھس آئیں گے۔ تمہارے شیخ (جیلانی) نے تمہیں کہا تھا...... شوکت کو گولی لگ گئی میجر! میں اس کی جگہ چھت پر جا رہا ہوں...... اس مار دھاڑ میں اس کا مخاطب تمہارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔''

وہ خاموشی سے سامنے دیکھتا رہا۔ اپنا نچلا ہونٹ ہولے ہولے دانتوں سے دباتا رہا۔

اس کی ٹھوڑی کا گڑھا مدھم روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ذات کی طرح اس کے خدوخال بھی اپنے اندر کی روشنی اور تاریکی باہر نہیں آنے دیتے تھے۔

''میں نے تم سے کہا نا تابی! میں نے کچھ حلف دیئے ہوئے ہیں۔ میں ان کے خلاف نہیں جاسکتا۔''

''لیکن تم ہی تو کہا کرتے ہو، ہم دو نہیں ایک ہیں تو پھر اس ایک کو وہ سب کچھ معلوم ہونا چاہئے جو تمہیں معلوم ہے، مجھے معلوم ہے۔ اور میں جانتا ہوں ... میرا خدا بھی جانتا ہے، میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں چھپایا۔''

''میں نے بھی کچھ نہیں چھپایا لیکن تابی......''

''لیکن کچھ نہیں عمران۔'' میرا لہجہ سخت تھا۔ ''آج تمہارے رویے سے فیصلہ ہو جائے گا کہ ہم واقعی ایک ہیں یا نہیں۔'' میری آواز آخر میں بھرا گئی۔

وہ جیسے اندر سے پگھل گیا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ کچھ دیر خاموش رہا...... پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تابی! میرا تعلق آرمی کی اسپیشل فورسز سے ہے۔ میری شومین کی حیثیت اور دیگر مصروفیات دکھاوے کی تھیں۔ سمجھ لو کہ یہ میرے کام کے حوالے سے میری مجبوریاں تھیں۔ مجھے لیفٹیننٹ سے کیپٹن بننے میں تین سال لگے لیکن میجر تک کا سفر میں نے نسبتاً تیزی سے طے کیا اور اس کی وجہ میری کچھ کارکردگی ٹھہری۔ یہ وہی دن تھے جب میں نے والدہ کی تلاش میں ذاتی حیثیت سے انڈیا کے دو چکر لگائے تھے۔ وہاں کچھ ایسے لوگوں سے میرا ٹکراؤ ہوا جن کو جہنم واصل کرنا میرے لئے ضروری تھا۔ میں نے یہ کیا لیکن اس سے آگے کا سفر مشکل تھا۔ مجھے یوں لگا کہ میری یونیفارم میرے راستے میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ میں ان حرامزادے انڈین ایجنٹس کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا تھا، وہ ایک حاضر سروس فوجی کی حیثیت سے نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے فوج چھوڑ دی اور وہ سب کچھ کیا جو کرسکتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو چن چن کر مارا ہے تابی جنہوں نے میرے اندر نفرت اور عداوت کا پہاڑ کھڑا کیا تھا۔ اپنی والدہ کی تلاش کے دوران میں میرا واسطہ ان کی بے حسی، بے رحمی سے کچھ اس طرح پڑا تھا کہ میرے اندر ان کے خون کی پیاس پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے ممبئی، الٰہ آباد، جودھ پور اور دہلی کے گلی کوچوں میں ان لوگوں کو بے رحمی سے قتل کیا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنی ہٹ لسٹ میں تقریباً تیس نام رکھے تھے۔ ان میں دو جیل سپرنٹنڈنٹ اور دو تین بڑے پولیس آفیسر بھی تھے۔ ان میں سے کم از کم بیس کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارا۔ پانچ اپنی باہمی لڑائیوں میں مارے گئے اور پانچ کے قریب ایسے ہیں جو زیر

زمین چلے گئے۔ یہ لوگ مجھے کبھی پکڑ نہیں سکے۔ میرے ساتھی بھی وفاداری میں اپنی مثال آپ ہیں تابی۔ انہوں نے عہد کر رکھا ہے کہ اگر کبھی کوئی بھارتیوں کی گرفت میں آ جائے تو اپنی زبان کھولنے کے بجائے اپنی جان ختم کر لے گا۔ میرے ایک شہزاد نامی ساتھی نے یہ کر کے بھی دکھایا ہے۔ پچھلے برس اس نے نئی دہلی میں اپنی جان دے دی اور ملک سے وفاداری نبھا کر ہمارے سیٹ اَپ کو بچایا۔ مگر افسوس کہ چند دن پہلے اقبال یہ نہ کر سکا۔ یہ نہیں کہ اس نے حلف کے مطابق کوشش نہیں کی۔ جب انڈین ایجنسی نے سلطان چٹا کے ساتھ مل کر اسے لالہ زار ہوٹل سے پکڑا تو اس نے خود کو شوٹ کرنے کی کوشش کی۔ گولی اس کے سر کے بجائے اس کے جبڑے میں لگی اور پستول اس سے چھین لیا گیا۔ بعدازاں شدید تشدد اور مخصوص نشہ آور انجکشنوں کی مدد سے اس سے بہت سی باتیں اگلوا لی گئیں۔ اب یہ لوگ چاروں طرف سے سمٹ کر مجھ پر جھپٹ پڑے ہیں۔ میری بدقسمتی صرف اور صرف یہ ہے کہ اس وقت تم اور ثروت میرے ساتھ ہو اور وہ بے گناہ لڑکیاں اور میڈم صفورا وغیرہ بھی یہاں ہیں۔ یہ لڑکیاں نہ ہوتیں تو میں اور میرے ساتھی بہتر طریقے سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ سچ پوچھو تابی! میں اس وقت خود کو تم سب کے لئے ذمے دار محسوس کر رہا ہوں۔''

میں سکتے کی سی کیفیت میں یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ آج عمران کا وہ روپ میرے سامنے آ گیا تھا جس کا شبہ ایک عرصے سے میرے دل و دماغ میں موجود تھا۔

میں نے کہا۔ ''عمران...... بلکہ محترم میجر عمران! تم یہ ذمے داری کیوں محسوس کر رہے ہو؟ کیا تم یہ بھول گئے ہو کہ تم میرے بلانے پر میرے اور ثروت کے لئے انڈیا آئے تھے؟ حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہاں تمہارے لئے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ جیلانی وغیرہ نے بھی تمہیں انڈیا آنے سے روکا تھا۔''

''جو کچھ بھی ہے، مجھے یہ نہیں بھولنا چاہئے تھا کہ میں تمہارے لئے کسی بڑی مشکل کا سبب بن سکتا ہوں۔''

''اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔ اس بات کا فیصلہ ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں کہ تم نے ہمیں پھنسایا یا ہم نے تمہیں۔ اس وقت تو حقیقت پر غور کرنا چاہئے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سب پھنسے ہوئے ہیں۔''

وہ خاموش رہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تمہاری اس حقیقت کا پتا شاہین کو بھی ہے؟''

''نہیں، تمہیں بتایا ہے نا کہ جیلانی، اقبال اور امتیاز وغیرہ کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی۔''

"یہ جیلانی، امتیاز وغیرہ بھی کیا فوج کے بندے ہیں؟"

"ہیں نہیں، تھے...... میری وردی کی طرح ان کی وردی بھی کام میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ انہوں نے فوج چھوڑ دی۔ وردی اتار دی۔ ریزائن کر دیا۔"

"ان کے عہدے کیا تھے؟"

"امتیاز لیفٹیننٹ تھا۔ جیلانی اور اقبال کیپٹن۔"

مجھ پر حیرت ناک انکشافات ہو رہے تھے۔

اس دوران میں عمران کے فون پر بیل ہوئی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری جانب سے آنے والی آواز نے ہمیں اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ یہ جلالی صاحب کی بوڑھی لیکن پُر جلال آواز تھی۔ آج ایک عرصے بعد ہم انہیں سن رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ عمران فون بند کر دے گا لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ علیک سلیک کے دو تین فقروں کے بعد جلالی صاحب بجلی کی طرح لپک کر اصل موضوع پر آ گئے۔ "کہاں ہو تم دونوں؟ تم نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ رات دن تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔ آج بڑی مشکل سے اس بی بی سے یہ فون نمبر ملا ہے۔"

عمران نے اطمینان سے کہا۔ "آپ ہمارا انتظار کر رہے ہیں یا ڈاکٹر مہناز صاحبہ کا؟"

"اس کا بھی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ ممبئی سے آگے رتناگری میں کہیں ہے اور تم دونوں بھی وہیں ہو۔ کوئی کھوج ملا ہے اس کا یا نہیں؟ مجھے جو بتانا سچ بتانا۔"

"بس اتنا کھوج ملا ہے...... کہ وہ رتناگری میں ہی کسی پگوڈے میں ہے اور خیر خیریت سے ہے۔ کچھ بھکشوؤں نے اسے اپنے پاس روکا ہوا ہے۔"

"کون بھکشو ہیں؟ وہ کیا بیچتے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں وہ مہناز سے؟" جلالی صاحب کڑکے۔

"آپ پریشان نہ ہوں جناب! آپ جانتے ہی ہیں یہ بھکشو لوگ اکثر بالکل بے ضرر ہوتے ہیں۔ مچھی مکھر تک نہیں مارتے۔ میرا مطلب ہے مکھی مچھر تک۔"

"اوپر سے سارے ہی بے ضرر نظر آتے ہیں۔ تم دونوں بھی تو باورچی بن کر گھسے تھے میرے گھر میں۔ ہانڈی بھونتے بھونتے مجھے ہی بھوننے لگ پڑے۔ لیکن میں ایک بات بتا دوں تمہیں عمران...... میں بڑی سخت ہڈی کا ہوں۔"

"اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جناب! آپ بے فکر رہیں۔ ہم آج بھی آپ کے پوری طرح وفادار ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ڈاکٹر مہناز خیر خیریت سے آپ کے پاس پہنچیں گی اور پھر

سے آپ کا "علاج معالجہ" شروع کریں گی۔" عمران نے علاج معالجے پر زور دیا۔

"بکواس بند کرو۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں بیمار ہوں۔ چل چلاؤ ہے میرا؟" وہ اتنے زور سے بولے کہ کھانسی شروع ہو گئی۔

"توبہ نعوذ باللہ۔ ہم ایسا سوچ سکتے ہیں؟" عمران نے کہا۔

کھانسی ذرا سنبھلی تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "مورتی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"ہمیں لگتا ہے جی کہ مورتی تو ڈاکٹر صاحبہ کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ بہر حال اصل بات تو آپ کو ڈاکٹر صاحبہ ہی آ کر بتائیں گی۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ دو چار دن تک انہیں آپ کی بانہوں...... مم، میرا مطلب ہے نگاہوں میں لے آئیں۔"

"کوئی ڈراما تو نہیں ہو رہا میرے ساتھ؟" وہ گرجے۔

"ہمیں اپنی جانیں پیاری ہیں جناب! ہمیں پاکستان میں رہنا ہے۔ ہماری اگلی نسلوں نے پاکستان میں رہنا ہے۔ آپ کے زیر سایہ زندگی گزارنی ہے۔"

"زیادہ باتیں نہ بناؤ...... اور دیکھو، تم دونوں میرے ساتھ رابطے میں رہو۔ کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بلکہ کہو تو میں خود بھی آ سکتا ہوں۔"

"اللہ نہ کرے جی کہ اتنا برا وقت آئے۔ آپ فارم ہاؤس میں اطمینان سے بیٹھیں۔ آپ کے یہ خادم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ڈاکٹر مہناز کو بہت جلد آپ کے حضور پیش کریں گے۔"

جلالی صاحب نے کہا۔ "اور وہ تابش کہاں ہے؟ اس سے بات کراؤ۔" میں نے انگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔

عمران بولا۔ "وہ لوٹا لے کر نکلا ہے کھیتوں کی طرف۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ بیزاری سے بولے۔ "اچھا یہ اس بی بی سے بات کرو۔" انہوں نے کہا۔

چند سیکنڈ بعد فون پر جو آواز ابھری، وہ بھی ہمارے لئے اجنبی نہیں تھی۔ یہ شاہین تھی۔ اندازہ ہوا کہ جلالی صاحب نے شاہین ہی سے عمران کا یہ فون نمبر حاصل کیا ہے۔

"ہیلو عمران! کہاں ہو؟"

عمران نے کھوپڑی سہلائی۔ "وہاں جہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"پھر تو ضرور ریما یا نرگس میں سے کوئی ایک تمہارے ساتھ ہوگی۔"

"ایک نہیں دونوں۔ ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ باجی ریکھا بھی ایک چھوٹا سا رول کر رہی ہے اس میں۔ لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ جلالی صاحب تمہارے پاس ہیں؟"

"نہیں، ذرا لان تک گئے ہیں، سانسیں درست کرنے۔ تم سے بات کر کے ہانپ رہے تھے۔"

"یہ حضرت تمہارے پاس آئے ہوئے ہیں یا تم ان کے پاس گئی ہو؟"

"یہ خود نازل ہوئے ہیں۔ ایک بہت پرانی مرسیڈیز پر ہیں۔ دو تین ملازم بھی ساتھ ہیں۔ پتا نہیں کہاں سے کھوج لگاتے ہوئے پہنچے ہیں۔ کسی نے ان کے کان میں یہ بے ہودہ پھونک ماری ہے کہ میں تمہاری منگیتر ہوں اور تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ حالانکہ تمہارے بارے میں تو تمہارے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ کہاں ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے جانم! لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اسے بے ہودہ پھونک کیوں کہا؟ کیا تم میری منگیتر نہیں ہو؟"

"اللہ مجھ پر اتنا برا وقت نہ لائے۔ شوبز کی ایک آفت ہی کم نہیں ہوتی تمہیں تو دو دو چمٹی ہوئی ہیں۔"

یکا یک چند فائر ہوئے۔ یہ گولیاں جھنڈ میں سے چلائی گئی تھیں۔ ایک گولی ہمارے عین سامنے دیوار پر لگی۔

"اوہ، یہ فائرنگ کیسی ہے؟" شاہین کی پُرتشویش آواز ابھری۔

"تمہیں میری کسی بات پر یقین ہی نہیں آتا۔ یہ شوٹنگ ہو رہی ہے بھئی۔ مجھ پر اور ریما پر گولیاں چل رہی ہیں اور تمہیں پتا ہی ہے فلموں میں ہیرو، ہیروئن پر گولیاں کیوں چلائی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ کسی بہت ہی تنگ جگہ پر گھس کر بیٹھ جائیں بلکہ لیٹ جائیں۔ ایک دوسرے سے جڑ کر۔ سنسر والے منہ دیکھتے رہ جائیں۔ ہم بھی اس وقت سیوریج کے ایک خالی پائپ میں گھسے ہوئے ہیں۔"

"خالی تو تم یونہی کہہ رہے ہو۔ ورنہ یہ گند سے بھرا ہوا پائپ ہوگا۔ تمہارے دماغ کی طرح۔"

ایک بار پھر دونوں طرف سے تابڑ توڑ گولیاں چلیں۔ شاہین چند سیکنڈ کے لئے خاموش ہوگئی۔ پھر اس کی سنجیدہ آواز آئی۔ "عمران! تم کسی مشکل میں ہو؟"

"اس سے بڑی مشکل اور کیا ہوگی کہ تم سے بات کر رہا ہوں۔" وہ مخصوص انداز میں

بولا۔

"عمران!" شاہین نے احتجاجی لہجے میں کہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "پتا نہیں کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ ہمیں تمہارے دوست اقبال والے واقعے کا پتا چلا ہے۔ بہت زیادہ دکھ ہوا ہے۔"

وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اقبال دیر سے آتے ہیں اور کبھی کبھی جلدی چلے جاتے ہیں۔ اس بارے میں پھر بات کریں گے۔"

"اچھا تابش صاحب کہاں ہیں؟ عاطف اور فرح ان کے لئے بڑے پریشان ہیں۔"

"وہ میرے ساتھ ہی ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ ہو سکا تو میں اس سے ان لوگوں کی بات کراؤں گا۔"

سامنے جھنڈ میں نقل و حرکت نظر آ رہی تھی۔ مشین گن والی جیپ بھی کچھ آگے آ گئی تھی۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ عمران نے کہا۔ "اچھا ڈیئر! اگلا شاٹ تیار ہو گیا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب بلا رہے ہیں، خدا حافظ۔"

اس نے شاہین کا جوابی خدا حافظ سنے بغیر ہی فون بند کر دیا۔

جگت سنگھ کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ "یہ لوگ آگے آ رہے ہیں۔ ان کی ماتا کی......" اس کے ساتھ ہی اس نے گولیوں کی بوچھاڑ کی۔ دوسری طرف سے تند و تیز جواب آیا۔ ایک بار پھر دو طرفہ فائرنگ شروع ہوگئی۔ قریباً پانچ منٹ تک تاریکی میں شعلے لپکے اور دھماکے ہوئے۔ پھر میگافون پر کسی فوجی کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ "بچ نہیں سکتے ہو تم لوگ۔ مفت میں جیون گنوانے سے بہتر ہے کہ گرفتاری دے دو۔ تمہارے ساتھ قانون کے مطابق برتاؤ ہوگا۔"

چند سیکنڈ کے وقفے سے اعلان دہرایا گیا۔ آخر میں کہا گیا۔ "اگر تمہیں سرنڈر کی آفر منظور ہے تو ہوا میں ایک ساتھ تین سنگل شاٹ چلاؤ...... تین سنگل شاٹ۔"

سرنڈر کی آفر کسی کو قبول نہیں تھی۔ درحقیقت ہم مرنے کے لئے آمادہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔

O......❖......O

یہ رات ایک بجے کا وقت تھا۔ بادلوں کے ٹکڑوں نے مدھم چاندنی کو ڈھانپ لیا تھا۔ پروگرام کے مطابق، میں اور جگت سنگھ بڑی خاموشی سے تاریکی میں رینگ گئے۔ دو دستی بم جگت کے پاس اور دو میرے پاس تھے۔

میں نے شام ہی کو جگت سنگھ سے دستی بم اچھالنے کا میکنزم اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ میں

نے مڑ کر اندرونی کمروں کی طرف دیکھا...... وہاں ثروت موجود تھی۔ اگر اسے پتا چلتا کہ میں ایسی خطرناک حرکت کرنے جارہا ہوں تو اس پر بہت برا اثر پڑتا۔ شاید وہ بے ہوش ہی ہو جاتی جس طرح فرید کوٹ میں ریچھوں کی یلغار کے بعد ہوئی تھی۔

ہم ریسٹ ہاؤس سے نکلے۔ کچھ دور تک جھک کر چلتے رہے پھر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھے۔ ہمارے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ زمین ٹھنڈی اور قدرے ریتیلی تھی۔ پیٹ اور کہنیوں کے بل اس طرح رینگنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ خاص طور سے ایسے افراد کے لئے جو اس کا تجربہ نہ رکھتے ہوں۔ کہنیوں اور گھٹنوں سے باقاعدہ خون رِسنے لگتا ہے۔ حسبِ پروگرام جگت آگے تھا، میں دو تین فٹ پیچھے۔ رائفلیں افقی رخ سے ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔

قریباً ساٹھ میٹر کا فاصلہ ہم نے اسی طرح طے کیا۔ درختوں کے قریب پہنچے تو باتوں کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ ہم بے آواز رینگتے چلے گئے۔ آوازیں واضح ہو گئیں۔ یہ بی ایس ایف کے دو جوان تھے۔ ان کی باتوں میں جاوا کا نام آیا...... وہ جاوا کے بارے میں ہی باتوں میں مصروف تھے۔ ایک نے کہا۔ ”اوئے، کون سی ایسی ہیروئن ہے جو جاوا صاحب نے چھوڑی ہوگی۔ اسٹوڈیو کا رستہ جاوا صاحب کے بیڈروم سے ہو کر گزرتا ہے پیارے۔“

”خیر، ایسی بھی بات نہیں۔ ہم لوگ اپنے دل سے ہی قصوں کے طوطے چڑیاں بنا لیتے ہیں۔ کم از کم...... کم از کم پونم کے بارے میں تو میں یہ بات ماننے کو بالکل تیار نہیں۔ تم کو پتا ہی ہے اس کا چاچا پرکاش پاٹل خود اچھا بھلا ڈان ہے۔“

”اوئے تم کو آئیڈیا نہیں۔ ایسے 70 سی سی ڈان جاوا صاحب کی سو ہارس پاور کے سامنے ایک دم ٹھس ہو جاتے ہیں۔ میں نے سنا ہے جن دنوں جاوا نے پونم کو چکھا تھا، ان دنوں وہ پرکاش بھائی دبئی چلا گیا تھا کوئی لوکیشن دیکھنے کے بہانے......“ وہ دبی آواز میں ہنسا۔

ان دونوں افراد نے ایک خستہ دیوار کے اوپر رائفلیں پوزیشن کر رکھی تھیں۔ ہم ان کے پہلو کی طرف سے آگے بڑھ رہے تھے۔ جگت نے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ ہوا۔ درمیانی فاصلہ چند فٹ کے قریب تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے اور جھپٹے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ اپنی وزنی رائفلوں کا رخ تبدیل کر سکتے یا کچھ اور کرتے، میں نے اپنی وزنی رائفل گھما کر ایک شخص کی کنپٹی پر ماری۔ یہ اتنی بھرپور اور ”جچی تلی“ ضرب تھی کہ یہ شخص بغیر آواز نکالے کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ دوسری طرف جگت سنگھ نے بھی اپنے

حریف کو اچھی چوٹ لگائی تھی۔ وہ گر گیا لیکن بے ہوش نہیں ہوا۔ مجھے لگا کہ وہ آواز نکالنے جا رہا ہے۔ میں نے جھپٹ کر اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ دیا۔ اس دوران میں جگت نے اپنی کرپان دستے تک اس کے سینے میں پیوست کر دی۔ وہ چند بار پھڑک کر ساکت ہو گیا۔

ہم اپنی جگہ دبکے رہے اور اردگرد کی سن گن لیتے رہے۔ گاڑیاں اب بھی تقریباً تین میٹر کے فاصلے پر تھیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ ہماری اس کارروائی کی خبر گاڑی سواروں کو نہیں ہوئی۔ اب ہم اگلے مرحلے کے لئے تیار ہوئے۔ ہم نے ایک ایک دستی بم اپنی بیلٹس سے علیحدہ کیا اور مٹھی میں دبا لیا۔ مشین گن والی جیپ کا ہیولا ہمیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”جگت سنگھ! ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔“

”کیا مطلب بادشاہ زادے؟“

”یہ دیکھو، بدلیاں آگے جا رہی ہیں۔ یہ تمہارا چندا ماموں کسی بھی وقت مکھڑا دکھا دے گا۔“

”ہاں، یہ بات تو ہے۔“ جگت بولا۔

ہم ایک بار پھر کرالنگ کے انداز میں گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ دو افراد کو لمبا لٹانے کے بعد ہمارا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ میرے ذہن میں بس ایک ہی ڈر تھا اور یہ ڈر کچھ دیر بعد سامنے بھی آ گیا۔ ہم پہلو کی طرف سے تھوڑا سا کلاوا کاٹ کر بڑھ رہے تھے۔ کوشش تھی کہ ہلکی سے ہلکی آواز بھی پیدا نہ ہو۔ جوں جوں مشین گن سے فاصلہ کم ہو رہا تھا، دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ اب ہم اس دوری پر پہنچنے والے تھے جہاں سے جگت سنگھ کے بقول مشین گن والی گڈی کو پندرہ سولوٹوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا یعنی تباہ کیا جا سکتا تھا۔ جگت سنگھ مجھ سے پانچ چھ فٹ آگے نکل گیا تھا۔ دستی بم جیسے اس کے ہاتھ میں بے طرح مچل رہا تھا۔

یکا یک ایک جھماکا ہوا۔ اتنی تیز روشنی ہوئی کہ ہمیں زمین پر گھاس کے تنکے اور ریت کے ذرے تک نظر آئے۔ یہی وہ اندیشہ تھا جو بار بار میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ ہم سرچ لائٹ کی زد میں تھے۔ اس لائٹ نے ہمارے اردگرد موت کا چمکیلا ہالا سا بنا دیا تھا۔ ہم ایک ساتھ اٹھے...... کسی بھی وقت ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے والی تھی۔ روشنی اتنی تیز تھی، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کا منبع کس طرح ہے۔

پھر گولیاں چلیں لیکن یہ ہمارے سامنے سے نہیں، عقب سے چلی تھیں اور انہوں نے براہ راست سرچ لائٹ کو نشانہ بنایا تھا۔ یکا یک پھر ہمیں تاریکی نے چھپا لیا۔ ہم نے پوری

رفتار سے بھاگتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑی عقب سے عمران کی چلّاتی ہوئی آواز آئی۔ ”واپس آ جاؤ۔“

اب شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ عمران ہی تھا جو ہمارے پیچھے آیا تھا اور جس نے سرچ لائٹ کو اندھا کر کے ہماری مدد کی تھی لیکن اب ہم اتنا آگے آ گئے تھے کہ بغیر کچھ کئے واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔ شاید جا ہی نہیں سکتے تھے۔ جگت نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ مشین گن والی گاڑی پر دستی بم پھینکا۔ زبردست شعلے کے ساتھ سماعت شکن دھماکا ہوا۔ اس روشنی میں مجھے نظر آیا کہ اس گاڑی کے ساتھ ایک اور گاڑی بھی ہے۔ اس پر بھی ہیوی گن نصب تھی۔ میں نے Ring میں انگلی ڈال کر پن کھینچی اور اس دوسری گاڑی کو نشانہ بنایا۔ میرا پھینکا ہوا بم گاڑی کے پچھلے حصے میں گرا۔ گاڑی اگلی طرف سے اچھلی اور ایک سائیڈ پر الٹ گئی۔ اس میں غالباً کچھ دھماکا خیز مواد موجود تھا۔ اس نے زوردار آواز کے ساتھ آگ پکڑ لی اور پوری گاڑی دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ اس دوران میں جگت دوسرا بم بھی پھینک چکا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں گرا لیکن اس نے بھی یقیناً قرار واقعی نقصان پہنچایا۔ ہم پلٹ کر بھاگے۔ ہم نیچے جھکے ہوئے تھے۔ عقب سے گولیوں کی ایک باڑ آئی۔ فائرنگ کے رخ سے اندازہ ہوا کہ یہ اندھی فائرنگ ہے۔ وہ لوگ ہمیں دیکھ نہیں پا رہے۔ عمران سامنے سے ہمیں کور دے رہا تھا۔ اس کی فائرنگ مؤثر تھی کیونکہ وہ گاڑیوں کے ہیولے دیکھ سکتا تھا اور اندازہ ہوا کہ وہ اکیلا نہیں۔ اس کے ساتھ کم از کم دو شوٹرز موجود تھے۔

ہم ان درختوں کے پاس سے گزرے جہاں دو بے حرکت جسم پڑے تھے۔ ان میں سے ایک زندگی سے محروم ہو چکا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے سینے میں جگت نے اپنی کرپان گھونپی تھی۔ ہم انہیں کراس کر گئے اور آگے نکل گئے۔ عمران نے ہماری راہنمائی کی۔ ہم ایک چھوٹے سے ٹیلے کی اوٹ میں چلے گئے۔ اب ہم محفوظ دوری پر تھے۔

***

عمران بھی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے گھورا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو...... نہیں باز آئے نا۔

ہم نے بھرپور جوابی فائرنگ کی۔ دو گاڑیاں جل رہی تھیں۔ یہ وہی تھیں جو میرے اور جگت سنگھ کے نشانے پر آئی تھیں۔ یقیناً مشین گنوں کے ساتھ ساتھ دو چار اہلکار بھی ہٹ ہوئے تھے۔ ایک شخص کو آگ کا لباس پہن کر رقصِ بسمل کرتے تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے اندر سے بھی ہمیں پوری سپورٹ مل رہی تھی۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے ”ری ٹریٹ“ ہونے لگے اور واپس ریسٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔ اچانک مجھے ان دو رائفلوں کا خیال آیا جو ہم میدان میں چھوڑ آئے تھے۔ یہ ان دو اہلکاروں کی رائفلیں تھیں جنہیں ہم نے جھنڈ کے درختوں میں لمبا لٹایا تھا اور جن میں سے ایک کے سینے میں جگت سنگھ نے کرپان گھونپی تھی۔ وہ دو رائفلیں ہمارے لئے مالِ غنیمت کی حیثیت رکھتی تھیں اور ہمیں ان کی ضرورت بھی تھی۔

عمران نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور بولا۔ ”ان رائفلوں کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے؟“

میں نے دیکھا، وہ دونوں رائفلیں عمران کے پاس تھیں۔ یہ پوری طرح لوڈڈ تھیں۔ رائفل مینوں کو فائر کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا ہم نے۔ گولیوں کے تین چار طویل اسٹریپس بھی عمران کے ایک شوٹر کے ہاتھ میں تھے۔ تین چار سو گولیاں تو یقیناً ہوں گی۔ یہ ایمونیشن اس وقت ہمارے لئے انرجی ٹانک کی حیثیت رکھتا تھا۔

”ویل ڈن۔“ میں نے بے ساختہ عمران کی تعریف کی۔

"تم نے بھی اچھا کیا لیکن مشورہ کر لیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔" عمران نے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ تم اجازت نہ دیتے۔" میں نے کہا۔

جگت بولا۔ "بادشاہو! آپ واقعی کمال کے بندے ہو۔ لگتا ہے کہ واہگرو کی خاص کرپا ہے آپ پر۔ شاید آپ خطرے کو سونگھ لیتے ہو۔ آپ ہمارے پیچھے آکر اس سرچ لائٹ کا کونڈا نہ کرتے تو پکی گل ہے ہمارا کونڈا ہو جانا تھا۔ بہت بہت دھنیواد آپ کا۔"

فائرنگ میں ایک بار پھر وقفہ آ گیا تھا۔ دور سے انڈین سپاہیوں کے بولنے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ریت سے گاڑیوں کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک گاڑی بڑی تیزی سے واپس جاتی دکھائی دی۔ یقیناً وہ زخمیوں کو لے کر گئی تھی۔ ہماری یہ کارروائی بڑی کامیاب رہی تھی۔ میرے اور جگت سنگھ سمیت کسی بندے کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ ہم نے دو مشین گنیں ناکارہ کر دی تھیں۔ کم از کم ایک دو بندوں کو تو یقیناً ہلاک کیا تھا۔ ایمونیشن سمیت دو ہیوی رائفلیں بھی ہاتھ آئی تھیں۔

جگت سنگھ کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ باقی دو دستی بم بھی لے کر نکلتا اور گھیرا ڈالنے والوں میں گھس جاتا۔ مجھے وہ گالیاں یاد آئیں جو اس نے دستی بم پھینکتے ہوئے انڈین سپاہیوں درجاوا کے غنڈوں کو دی تھیں۔

کچھ دیر بعد میں اور عمران پھر اپنی پوزیشنوں پر تھے۔ میں نے کہا۔ "یہ کیا جادو ہے تمہارے پاس...... میں جب بھی تمہیں بتائے بغیر کہیں نکلتا ہوں، تمہیں پتا چل جاتا ہے؟"

"اسی کو تو کہتے ہیں خبردار جرنلسٹ۔"

"کچھ آگے کی بھی خبر ہے جرنلسٹ صاحب؟ یہاں سے نکل سکیں گے یا نہیں؟"

"شام تک میں مایوس تھا لیکن اب نہیں ہوں۔ یہاں مجھے ایک ایسی چیز نظر آ گئی ہے جو مجھے یقین دلا رہی ہے کہ ہم یہاں سے نکل سکیں گے۔ نہ صرف نکل سکیں گے بلکہ عنقریب ثروت اور ڈاکٹر مہناز وغیرہ کے ساتھ مل کر بدین کے کسی اچھے سے ریستوران میں مزیدار سا ڈنر بھی کریں گے اور ابرار صدیقی اور ایشوریا رائے کی موت کا دکھ بھلانے کی کامیاب کوشش کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام تک پہنچانے کی پلاننگ بھی ہو گی۔"

"ایشوریا کا مجھے بھی صدمہ ہوا ہے۔ اس نے کافی سزا پا لی تھی۔ اب وہ اپنے گلی کوچوں کے لئے ترس رہی تھی۔ لیکن تم بات کو کسی اور طرف لے گئے ہو۔ کون سی شے تمہیں ایسی نظر آئی ہے جو تمہاری امید بندھا رہی ہے؟"

وہ دور تاریکی میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی مجھے خود کسی نتیجے پر پہنچ لینے دو پھر بتاؤں گا۔"

"کیوں، کوئی خطرہ ہے مجھ سے؟"

"خطرہ تو ہونا چاہئے۔ تم اب من مانیاں کرنے لگے ہو۔"

ہمارے سامنے جھنڈ کے اندر اور ارد گرد نقل و حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ نقصان اٹھانے کے بعد وہ لوگ یقیناً پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ "مجھے لگتا ہے کہ اب یہ لوگ حملہ کریں گے۔" میں نے کہا۔

"اور زوردار کریں گے۔"

"تو پھر تیار ہو جانا چاہئے۔" میں نے کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا اور ساتھیوں کو ہدایات دینے کے لئے سرونٹ کوارٹر سے باہر نکل گیا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آج میں اسے کسی اور نظر سے دیکھ رہا تھا۔ یہ نظر نئی تھی اور وہ خود بھی نیا تھا۔ سینہ تان کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ ان لمحوں میں وہ واقعی ایک فوجی افسر ہی نظر آیا۔ پتا نہیں کتنے روپ تھے اس کے؟ عمو...... موت کے کنوئیں میں زندگی کو داؤ پر لگانے والا بازی گر...... ریوالور کا کھیل کھیلنے والا نڈر طالع آزما، درد دل رکھنے والا ایک سماجی کارکن، جانوروں کا ٹریز...... اور اب ایک سابق فوجی...... پیاز کی طرح اس کی بہت سی پرتیں تھیں۔ ہر پرت کے نیچے ایک اور پرت ظاہر ہوتی تھی۔ ساتھیوں کو ہدایات دینے کے بعد عمران واپس آ گیا۔

سویٹی کی موت کے بعد اس کی ساتھی دونوں لڑکیاں بہت دہشت زدہ تھیں۔ ان میں سے ایک پر تو بار بار غشی سی طاری ہو رہی تھی۔ سویٹی کی طرح یہ دونوں لڑکیاں بھی عمران پر بہت بھروسا کر رہی تھیں۔ جب وہ عمران کی طرف دیکھتیں تو ان کی آنکھوں میں امید اور حوصلے کی چمک پیدا ہو جاتی تھی لیکن جب وہ دور ہو جاتا تو ان کی آنکھوں میں بھی تیرگی پھیل جاتی تھی۔ جگت سنگھ جھک کر چلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بادشاہو! آپ کا بڑا آسرا ہے ان دونوں کڑیوں کو۔ آپ ایک بار ان کو شکل دکھا دیں اور تسلی کے دو چار بول بول دیں۔ نہیں تو رو رو کر مر جائیں گی وہ۔"

عمران نے مجھے پوزیشن پر چوکس بیٹھنے کو کہا اور خود جگت سنگھ کے ساتھ اندرونی کمروں کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے چند سیکنڈ بعد ہی جیلانی میرے پاس آ بیٹھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔ دوسرا پٹیوں میں لپٹا ہوا اس کے گلے سے جھول رہا تھا۔ وہ کچھ دیر

خاموش اور گم صم بیٹھا رہا...... پھر اچانک بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’تابش بھائی! آپ عمران صاحب کے بہت قریب ہیں، آپ ہی کچھ کریں۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں دکھ کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ وہ کوئی بہت گھمبیر بات چھپا رہا تھا۔

’’جیلانی! کیا بات ہے...... تم بتاتے کیوں نہیں؟‘‘

اس نے عقب میں دیکھا، جیسے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ عمران کی واپسی کے آثار تو نہیں۔ پھر بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ’’تابش بھائی! آپ عمران صاحب کو روکیں...... مجھے یقین ہے وہ بہت غلط کام کرنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے......‘‘ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

’’جیلانی! تم پریشان کر رہے ہو۔ جو بات ہے، جلدی کہو۔‘‘

اس نے ایک لمبی آہ بھری اور جیسے حوصلہ جمع کرنے لگا۔ ہمارا گھیرا مزید سخت ہو رہا تھا۔ کچھ اور گاڑیاں موقع پر پہنچ رہی تھیں۔ ان کی متحرک روشنیاں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جیلانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ بولا۔ ’’مجھے لگتا ہے کہ عمران صاحب ایک بہت غلط قدم اٹھانے جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں موبائل پر بات کرتے سنا ہے۔ وہ کسی انڈین کرنل سے بات کر رہے تھے۔‘‘

’’انڈین کرنل سے؟‘‘

’’جی ہاں، مجھے لگتا ہے وہ یہاں موجود ہے۔ وہ کمینہ جاوا بھی شاید اس کے پاس ہی ہے۔ عمران صاحب ان کو اپنی حوالگی کی آفر کر رہے ہیں...... اس شرط پر کہ باقی سب افراد کو حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکل جانے دیا جائے......‘‘ جیلانی کی آواز پھر بھرا گئی۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے عمران کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا اسے ایک خاص طریقہ نظر آ رہا ہے اور اس کی وجہ سے سب کے لئے امید کی کرن پیدا ہو گئی ہے۔ تو کیا یہی وہ طریقہ تھا؟ وہ اپنی جان کو اتنا ارزاں کیوں سمجھتا تھا؟ کیوں ہر جگہ اسے داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا تھا؟ مجھے اس کے دیوانے پن پر تاؤ آنے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، جیلانی دھیمی آواز میں بولا۔ ’’انہوں نے جو ارادہ کر لیا ہے پورا کریں گے۔ ہم انہیں روک نہیں سکیں گے۔ ہماری خاطر اور ان لڑکیوں کی خاطر وہ خود کو بڑی تکلیف دہ موت کے حوالے کر دیں گے۔ میری سمجھ میں تو اس کا ایک ہی طریقہ

ہے......‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

اس نے ایک بار پھر عقب میں دیکھا اور بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ’’ہمارا یہ پکا ارادہ ہونا چاہئے کہ آخری گولی اور آخری بندے تک لڑیں گے۔ اکٹھے جینے مرنے کا یہی تو مطلب ہوتا ہے۔ ہمیں عمران صاحب کو کسی ڈھنگ سے روکنا پڑے گا۔ وہ رک جائیں اور تھوڑا وقت گزر جائے تو پھر ہو سکتا ہے کہ قدرت کی طرف سے کوئی مدد بھی آ جائے۔‘‘

’’ایسی کسی مدد کی توقع ہے تمہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بہت زیادہ تو نہیں لیکن تھوڑی بہت ہے۔ ہمارے کچھ ساتھی سائل پور تک آ چکے ہیں۔ انہوں نے دو سرکاری ٹرک بھی حاصل کر لئے ہیں۔ وہ آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے یہ کوشش کامیاب ہو جائے۔‘‘ جیلانی کہہ تو رہا تھا لیکن اس کی آواز میں کوئی خاص دم خم نہیں تھا۔

میں نے جیلانی سے پوچھا۔ ’’تم نے عمران کو انڈین کرنل سے بات کرتے کب سنا؟‘‘

’’یہ کوئی ایک گھنٹا پہلے کی بات ہے۔ آپ اس وقت اندر کے کمروں میں ٹارچ ڈھونڈ رہے تھے۔‘‘

’’تم نے عمران کو روکنے کے لئے ابھی کسی طریقے کی بات کی تھی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

جیلانی نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھ کر جیب میں سے تین چار گولیاں نکالیں...... یہ ہائی پوٹینسی ٹرنکولائزر تھیں۔ وہ بولا۔ ’’ابھی لڑکیاں چائے بنائیں گی، میں ہی لے کر آؤں گا۔ عمران صاحب کے کپ میں دو گولیاں ڈال دیتے ہیں۔‘‘

اس کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ عمران جیسے شخص کو اس کے کسی ارادے سے روکنا تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے اور جیلانی نے جو کچھ بتایا تھا...... اور یقیناً درست ہی بتایا تھا، وہ ازحد خطرناک تھا۔ مجھے خود بھی بار بار اس قسم کا شبہ ہو رہا تھا...... پچھلے دو تین گھنٹوں میں عمران نے کئی بار کہا تھا کہ اس ساری سچویشن کا ذمے دار وہ خود ہے۔ اس نے یہاں جو دشمن پال رکھے تھے، وہ سب سمٹ کر سامنے آ گئے ہیں اور وہ خود تو پھنسا ہی ہے، ہم سب بھی پھنس گئے ہیں۔

میں نے جیلانی سے پوچھا۔ ’’اس ڈوز کا اثر کب تک رہے گا؟‘‘

’’کم از کم صبح تک تو چلے گا ہی۔ تب تک صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔‘‘

ہم نے اس بارے میں چار پانچ منٹ بات کی اور پھر فیصلہ کیا کہ اب رات کا باقی حصہ عمران کو ’’آرام‘‘ کرنے کا موقع دیا جائے۔

عمران واپس آ گیا تھا۔ ہماری گفتگو کا رخ بدل گیا۔

ڈاکٹر مہناز کے پاس چائے کے لوازمات موجود تھے۔ فاخرہ اور ثروت نے اندرونی کمرے میں عارضی چولہا بنا کر چائے تیار کی۔ اس کے لئے ایک بڑی کیتلی بھی بس کے اندر سے ہی مل گئی۔ پروگرام کے مطابق جیلانی ہی چائے لے کر آیا۔ وہ صرف جیلانی نہیں، کیپٹن جیلانی تھا اور آج وہ اپنے افسر کو ایک نہایت خطرناک ارادے سے باز رکھنے کے لئے ایک قدم اٹھا رہا تھا۔ اس قدم کے لئے اسے میری پوری حمایت حاصل تھی۔

عمران والا کپ عمران کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ٹیلی اسکوپ تھی اور وہ گاہے بگاہے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک گھونٹ لیا اور پھر دوبارہ ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ اس نے کپ کو دیکھا۔ اس کی حسیات بلا کی تھیں۔ وہ کچھ چونکا ہوا نظر آیا۔ اسی دوران میں اس کے موبائل کی بیل ہوئی۔ وہ کال ریسیو کرتا ہوا احاطے کی طرف چلا گیا۔ یہ دوسری بار ہوا تھا کہ اس نے علیحدہ میں جا کر بات کی تھی۔ یہ سب کچھ جیلانی والی اطلاع کی تصدیق کر رہا تھا۔ آدھ منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا۔

''کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ چائے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر ایک چھوٹا سا ''سپ'' لیا اور کپ ایک طرف رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا یا اپنا سوال دہراتا، اس نے میرے ہاتھ سے کپ لے کر ایک گھونٹ لیا اور ہمیں گہری نظروں سے دیکھ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔

''کک......کیا ہوا جی؟'' جیلانی نے پوچھا۔

''وہی جو تم نے کیا ہے۔ بلکہ شاید......تم دونوں نے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''اس میں Bromazepam ہے......کیوں کر رہے ہو تم ایسا؟'' عمران نے پوچھا۔

جیلانی گنگ سا ہو گیا۔ میں بھی سٹپٹا گیا۔ عمران کی غیر معمولی زود فہمی کا تجربہ میں اس سے پہلے بھی دو چار بار کر چکا تھا۔ چند سیکنڈ کی بوجھل خاموشی کے بعد میں نے بھنائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم ایسا اس لئے کر رہے ہیں کہ تمہیں تمہارے دیوانے پن سے روکنا چاہتے تھے۔ تم سمجھتے ہو کہ دنیا جہان کی عقل اکٹھی ہو کر تمہارے دماغ میں گھس گئی ہے۔ تم جو فیصلہ بھی کرو گے، سو فیصد درست ہوگا اور اس فیصلے کے لئے تمہیں کسی اُلو کے پٹھے سے مشورے کی

ضرورت بھی نہیں۔ تمہارے ارد گرد نرے گدھے اور پیدائشی احمق ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہارا موبائل فون اس بات کی گواہی دے گا کہ تم انڈین کرنل سے بات چیت کر رہے ہو۔ خود کو اس کے حوالے کر کے ایک تاریخی احسان کرنا چاہ رہے ہو ہم سب پر۔ ہماری زندگیاں بچانے کے لئے ایک عظیم الشان قربانی دے رہے ہو۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری اس سوچ پر......اور تمہارے اس احسان پر۔ ہم سب تمہاری طرح جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ہمیں بھی اللہ نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں، دماغ دیا ہے۔ تم اکیلے ہی آسمانوں سے ہمدردی اور قربانی کے دیوتا بن کر نازل نہیں ہوئے ہو۔''

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''ہم اکٹھے جائیں گے اور اکٹھے مریں گے۔ قربانی ہوگی تو سب کی ہوگی۔ لاشیں اٹھیں گی تو سب کی اٹھیں گی۔ اپنی عقل پر اتنا ہی گھمنڈ کرو جتنا بنتا ہے۔ تم بھی دھوکا کھا سکتے ہو۔ ابھی ایک دن پہلے کھایا ہے کہ نہیں تم نے، ہم سب......ایک عام لڑکی کو جاوا کی رکھیل سمجھ کر لئے پھرے ہیں اپنے ساتھ۔''

وہ خاموش تھا۔ اچانک کہیں سے مشین پسٹل کے دو فائر ہوئے۔ پھر تابڑ توڑ گولیاں چلنے لگیں۔ دونوں طرف کے رائفل مین تواتر سے ٹریگر دبانے لگے۔ میں نے دیکھا، دو افراد کسی کو کھینچتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی طرف لا رہے ہیں۔ چند سیکنڈ بعد یہ ہمارے سامنے سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ یہ جگت سنگھ اور قربان علی تھے۔ انہوں نے ایک مخالف شوٹر کو دبوچا ہوا تھا اور گھسیٹتے ہوئے اندر لا رہے تھے۔ اس بندے کے کندھے میں گولی لگی تھی اور اس کی دھاری دار شرٹ اور جینز کی پینٹ خوں رنگ ہو رہی تھی۔

''لگتا ہے یہ جاوا کا گرگا ہے۔'' قربان نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیسے پکڑا؟'' عمران نے پوچھا۔

جگت بولا۔ ''آپاں کو شک ہوا تھا جی۔ پہلے آپاں دونوں سمجھے کہ اندھیرے میں کوئی کتا ہل جل کر رہا ہے۔ پھر اندازہ ہوا کہ یہ چار نہیں دو لاتوں والا کتا ہے۔ یہ ڈھڈ کے بل رڑ کر (کرالنگ کر کے) ٹیلے سے آگے نکل آیا تھا۔ پتا نہیں کیا ارادہ تھا اس کا۔ ہم نے آگے جا کر گولی چلائی اور پکڑ لیا۔ یہ دیکھیں، تین دستی بم نکلے ہیں اس کے پاس سے۔''

ابھی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں تھا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم نے بھی پوزیشن سنبھال لی۔ مخالفین کی ''فائرنگ پاور'' زیادہ تھی اور تعداد بھی۔ میں نے اندازہ لگایا

کہ ان کی تقریباً چار گولیوں کے جواب میں ہم ایک گولی چلا رہے ہیں۔ بہر حال ہم انہیں آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب تھے۔ پانچ چھ منٹ بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ اس دوران میں مخالفین نے جھنڈ میں اپنی پوزیشن کچھ اور مضبوط کر لی تھی۔

جگت سنگھ نے پکڑے جانے والے شخص کی مشکیں بڑی اچھی طرح کس دی تھیں.....

38 بور کی گولی اس بندے کے کندھے کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی۔ ڈاکٹر مہناز اپنے طبی سامان کے ساتھ آئی اور اس نے مضروب کا خون بند کرنے کے لئے مضبوطی سے پٹی باندھ دی۔ اس دوران میں وہ آنکھیں بند کئے لیٹا رہا اور لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ یہ تیس بتیس سال کا بندہ تھا۔ سکھ نہیں تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ پنجاب یا ہماچل پردیش وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس نے کراہنے کے لئے منہ کھولا تو جگت سنگھ نے رائفل کی نال اس کے منہ میں گھسا دی اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ "آپاں جو کچھ پوچھیں گے، سچ بتانا پڑے گا۔ نہیں تو گولی وہاں وہاں سے گزرے گی جہاں جہاں سے تیرا بھوجن گزرتا ہے۔"

وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ بے پروائی سے جگت کی طرف دیکھتا رہا۔ چہرے مہرے سے وہ بڑا کرخت بندہ لگتا تھا۔ ظاہر جاوا جیسے ڈان کا قریبی ساتھی تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں یقین ہو گیا کہ وہ آسانی سے زبان کھولنے والا بندہ نہیں۔ وہ الٹا ہمیں ڈرا رہا تھا کہ ہم بہت بری طرح پھنس چکے ہیں اور بہتر ہے کہ ہتھیار پھینک کر اپنی جانیں بچائیں۔

دفعتاً فرانسس نامی یہ بندہ کچھ چونکا ہوا نظر آیا۔ اس نے بغور عمران کو دیکھا اور بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہاری آواز کہیں سنی ہے۔ یہ زیادہ دن پہلے کی بات بھی نہیں ہے۔" اس کی نیم گنجی پیشانی پر الجھن کی لکیریں تھیں۔

تب یکا یک وہ اپنے زخمی کندھے کو تھامتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اس نے عمران کا بازو دیکھا۔ عمران نے کلائی پر سے آستین اڑسی ہوئی تھی۔ ہم نے دیکھا، جاوا کا یہ عیسائی گرگا بڑے دھیان سے عمران کی کلائی دیکھ رہا ہے۔ عمران کی سرخ وسپید کلائی پر گولی لگنے کا ایک پرانا نشان تھا۔ یہ تقریباً پانچ سال پرانی بات تھی جب ایک تاریک رات میں ایک پُرشور نالے کے اوپر سراج کے کارندے شیرے نے عمران پر گولی کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ وہ جیکٹ کی وجہ سے بچا تھا تاہم چند گولیاں اسے لگ گئی تھیں۔ یہ کلائی کا چار پانچ انچ لمبا سیاہی مائل نشان بھی اسی خونی واقعے کی یادگار تھا۔

فرانسس نے اس نشان کو دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مجھے لگا وہ سخت

حیران ہوا ہے اور اس کے ساتھ وہ ساری کرختگی اور عداوت اس کے چہرے سے دور ہو رہی ہے جو کچھ دیر پہلے تک اس کے نقوش کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ اس نے ایک بار پھر عمران کو سر تا پا دیکھا اور بولا۔ "مجھے یاد آ گیا...... آپ کو میں نے گولڈن بلڈنگ میں دیکھا تھا۔ یقیناً وہ آپ ہی تھے۔ آپ کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں ہے...... اور آپ کے ہاتھ کا یہ نشان...... اسی ہاتھ سے آپ نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ آپ دھوئیں کی وجہ سے بری طرح کھانس رہے تھے۔ مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔"

"تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"لیکن مجھے سب کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔ میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ یہ آپ ہی تھے، آپ ہی نے ہمیں بچایا تھا۔ اس وقت آپ کے چہرے پر نقاب تھا لیکن میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ ایک بڑی خواہش پوری ہوئی ہے میری۔" وہ عمران کے سامنے آ گیا۔ اس کا انداز مؤدب اور عقیدت مندی کا تھا۔

"کون ہو تم؟" عمران نے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف کیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ "سر! میں گولڈن بلڈنگ کے ان گارڈز میں سے ہوں جو کمرا نمبر تین میں لاک رہ گئے تھے۔ پوری بلڈنگ میں دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ ہمیں اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔ آپ آگ اور دھوئیں میں سے گزر کر ہم تک پہنچے تھے۔ دروازہ کھول کر ہمیں نکالا۔ میں ان گارڈز کا سیکنڈ انچارج فرانسس جوزف ہوں۔ مجھے وہ سارا واقعہ معلوم ہے۔ آپ ہمیں بلڈنگ میں بھول گئے تھے لیکن پھر ہمارا جیون بچانے کے لئے آپ نے اپنے جیون کو شدید خطرے میں ڈالا...... میں...... بہت بڑا اپرادھی ہوں لیکن یہ ایک ایسا احسان ہے جو مجھ جیسا بندہ بھی بھلا نہیں سکتا۔ آپ...... بتائیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ آپ وہی ہیں نا؟"

عمران خاموش تھا، ہم سب خاموش تھے۔ یہ عجیب ٹوئسٹ آیا تھا۔ اگلے دس پندرہ منٹ کافی اہم اور انکشاف انگیز تھے۔ فرانسس نامی یہ انچارج گارڈ جاوا کے کارندوں میں سے تھا۔ ہم نے کچھ دیر پہلے بی ایس ایف کی گاڑیوں پر جو تین دستی بم پھینکے تھے، ان سے جہاں گنیں برباد ہوئی تھیں، وہیں چار بندے بھی شدید زخمی ہوئے تھے جن میں دو کچھ ہی دیر بعد ہلاک ہو گئے تھے۔ جاوا کا یہ کارندہ ان دستی بموں کا جواب دستی بموں سے دینے کے لئے ہماری طرف آیا تھا لیکن دھر لیا گیا۔ اب وہ صرف دس پندرہ منٹ کے اندر ہی ایک بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا اور اس تبدیلی کی وجہ وہ بڑے جذباتی انداز میں گولڈن بلڈنگ والے واقعے سے جوڑ رہا تھا

جسے ہم تقریباً بھول چکے تھے۔

پتا نہیں کہ جاوا سے فرانسس کا تعلق کتنی دیر سے تھا اور اس میں کتنی گہرائی تھی مگر عمران کے ایک عمل نے اسے اس طرح متاثر کیا تھا کہ اس کی ساری کیمسٹری ہی بدلی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ یوں لگا جیسے پتھر اشک بار ہے...... وہ عمران کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ''میں اس احسان کے بدلے آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟''

عمران نے کہا۔ ''میں تمہاری احسان شناسی کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ اگر تم ہمیں ہماری مطلوبہ معلومات فراہم کر دو تو یہی بہت ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں ان معلومات کے لئے تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔''

عمران کے کہنے پر مہناز نے فرانسس نامی اس بندے کی مرہم پٹی ایک بار پھر زیادہ اچھے طریقے سے کی۔ اسے چائے وغیرہ پلائی گئی۔ اس نے کئی اہم باتیں بتائیں۔ اس نے انکشاف کرنے والے لہجے میں کہا۔ ''شاید آپ لوگوں کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ بی ایس ایف اور ہمارے لوگوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ہم لوگ آپ پر ہلا بول کر ریسٹ ہاؤس میں گھسنا نہیں چاہتے۔''

''اس کی وجہ؟''

''وہی جو آپ نے بتائی ہے اور جو میں نے بھی بتائی ہے۔ علاقے میں یہ جگہ آسیب زدہ مشہور ہے۔ کوئی پاس سے بھی نہیں گزرتا۔ بی ایس ایف کے لوگ بھی یہاں نہیں گھسیں گے اور نہ ہم گھسیں گے۔''

''تو پھر؟''

''دیکھیں جی، یہ لوگ اس چکر میں ہیں کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ فائرنگ میں الجھایا جائے اور آپ پر یہ ظاہر کیا جائے کہ کسی بھی وقت ریسٹ ہاؤس پر چڑھائی ہو سکتی ہے۔ یوں آپ کا ایمونیشن بالکل ختم کر دیا جائے۔''

''ایمونیشن ختم ہو جائے گا تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر بھی یہ لوگ اندر نہیں گھسیں گے۔ یہ آپ ہی کو باہر آنے اور گرفتاری دینے کا کہیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم یہاں جم کر بیٹھے رہیں تو کوئی ہمیں یہاں پکڑنے نہیں

آئے گا۔''

''نہیں، خیر ایسا تو نہیں ہوگا...... اگر آپ خود نہ نکلے تو پھر آپ کو کسی اور طریقے سے باہر نکالا جائے گا۔ خاص طور پر میجر صاحب کو تو یہ لوگ ہر صورت پکڑنا چاہتے ہیں۔''

''مثلاً کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟''

''شاید آپ کو یہ بات عجیب لگے لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ آپ کو باہر نکالنے کے لئے آپ کو ایک دم ڈرا دیا جائے گا۔ دراصل علاقے کے لوگ بھی اس بات کو بالکل پسند نہیں کر رہے کہ آپ لوگوں کو پکڑنے کے لئے بی ایس ایف، پولیس یا ہم اندر گھسیں۔ انہوں نے مل جل کر کچھ عجیب سا ماحول بنا دیا ہے۔ مقامی بی ایس ایف تو پہلے ہی اس جگہ کو آسیب زدہ سمجھتی تھی، اب باقی لوگ بھی ڈرے ہوئے ہیں جن میں ہم بھی شامل ہیں۔ بھیا جاوا صاحب کے ساتھیوں میں واحد میں ہوں جو ان باتوں کو بکواس سمجھ رہا ہے۔''

''اور شاید اسی لئے تمہیں تین دستی بم دے کر یہاں بھیجا بھی گیا۔'' عمران نے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جی۔''

''تم نے ابھی کہا ہے کہ شاید ہمیں ڈرا کر یہاں سے نکالا جائے گا...... اس کا کیا مطلب ہے؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''دراصل شام سے ہی مختلف طریقوں پر غور ہو رہا ہے۔ جاوا صاحب نے کرنل صاحب کو یہ مشورہ دیا تھا کہ گھیرا برقرار رکھا جائے۔ جب کھانا پانی اندر نہیں جا سکے گا تو آپ لوگ خود ہی ہمت ہار کر باہر آ جائیں گے۔ پر کرنل صاحب کا کہنا تھا کہ اس میں کافی وقت لگے گا۔ ہو سکتا ہے چار پانچ دن۔ اوپر سے سخت آرڈر ہیں کہ جلد سے جلد گرفتاری ہو۔ اوپر بیٹھے ہوئے افسر اس آسیب واسیب کی بات سے بے خبر ہیں اور انہیں خبر ہو بھی تو شاید وہ اس کو اتنی اہمیت نہ دیں۔''

''تو پھر ہمیں نکالنے کے لئے کیا پلاننگ ہے ان کی؟''

فرانسس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''شاید آپ کو پتا ہی ہو بھیا جی (جاوا) کے پاس بہت سے پالتو ریچھ ہیں۔ وہ جگہ جگہ سے ہر طرح کے ریچھ اکٹھے کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ممبئی میں رکھے گئے ہیں، کچھ بھڑوچ اور کھمبات وغیرہ میں۔ یہ سارے بڑے خوں خوار جانور ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک بڑا کنٹینر پہنچا ہے۔ وہ دیکھیں...... وہ دیکھیں...... جھنڈ کے پاس، گاڑیوں کے پیچھے۔ وہ اونچی چھت والا سفید کنٹینر۔''

میں نے ٹیلی اسکوپ کی مدد لی اور مجھے وہ کنٹینر صاف نظر آیا۔ وہ شاید ابھی کچھ دیر پہلے

ہی یہاں پہنچا تھا۔عمران اور جیلانی نے بھی ٹیلی اسکوپ سے کنٹینر کو دیکھا۔خالی آنکھ سے بھی اس کی سفیدی مائل چھت دکھائی دیتی تھی۔

''اس میں کیا ہے؟'' کیپٹن جیلانی نے پوچھا۔

''اس میں پالتو ریچھ ہیں جی۔سات کے قریب۔''

''ان کا کیا کیا جائے گا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ایمونیشن ختم ہونے کے بعد بھی اگر آپ لوگ ریسٹ ہاؤس میں ڈٹے رہے اور باہر نہیں آئے تو ان ریچھوں کو ریسٹ ہاؤس کی طرف ہانک دیا جائے گا۔اس کام کے لئے شکاری کتے بھی استعمال ہو سکتے تھے اور بی ایس ایف والوں نے وہ منگوا بھی لئے تھے لیکن مقامی لوگوں نے سختی سے منع کر دیا۔ان کا کہنا تھا کہ پالتو کتے بلیاں اور گھوڑے یہاں داخل نہیں کئے جا سکتے۔اس سلسلے میں پنڈتوں نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔بہر حال، بھیا جی کو امید ہے کہ شاید ریچھ چھوڑنے کی نوبت نہ آئے۔آپ کو کسی اور طریقے سے باہر نکال لیا جائے۔''

میرے جسم میں پھریری دوڑ گئی۔جاوا کے وہ خوں خوار ریچھ نگاہوں کے سامنے آئے جنہوں نے اپنے ٹریز کو مارا تھا اور کوٹھی میں زبردست توڑ پھوڑ مچائی تھی۔اس کے ساتھ ہی مجھے ثروت کا خیال آیا۔وہ بدترین حالات سے گزر رہی تھی لیکن اگر وہ جاوا کے ریچھ بھی یہاں دیکھ لیتی تو شاید اس کا دل ہی کام کرنا بند کر دیتا۔

عمران نے بی ایس ایف کی ٹوٹل نفری اور اسلحے وغیرہ کے بارے میں بھی فرانسس سے معلومات حاصل کیں۔گاڑیوں کی کل تعداد کا پتا چلایا اور ان کی لوکیشنز معلوم کیں۔فرانسس نے یہ بھی بتایا کہ جاوا گروپ کی پانچ گاڑیاں اور قریباً 30 شوٹرز یہاں موجود ہیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران کی نگاہیں گاہے بگاہے اس سمت میں اٹھ جاتی تھیں جہاں فرانسس نے سفید کنٹینر کی نشاندہی کی تھی۔وہ مسلسل کچھ سوچ رہا تھا...... فرانسس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ ہماری آپس کی تلخ کلامی اور لڑائی پس منظر میں چلی گئی تھی۔

قربان وغیرہ فرانسس کو باہر لے گئے۔ایک طرح سے اب وہ ہماری حفاظتی تحویل میں تھا۔

فرانسس جو کچھ بتا رہا تھا، بڑا حیران کن تھا۔ہمیں پہلے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ لوگ صرف گھیرا ڈالے ہوئے ہیں ورنہ جتنی ان کی نفرت تھی اور فائر پاور تھی، وہ دو تین گھنٹے پہلے اس قابل ہو گئے تھے کہ ہم پر ہلا بول کر ریسٹ ہاؤس میں گھسنے کی کوشش کرتے۔توہمات کہاں نہیں ہوتے، یہاں بھی موجود تھے اور ایک طرح سے یہ ہمارے حق میں بھی تھے۔

علاقے کے لوگ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ بی ایس ایف یا پولیس وغیرہ ریسٹ ہاؤس میں گھسے اور یوں عاملوں اور دو تین بڑے پنڈتوں کے مطابق بد آتمائیں اس چار دیواری سے باہر نکل آئیں۔

ریچھوں کی یہاں آمد کا سن کر میرا دھیان بار بار ثروت کی طرف جا رہا تھا۔وہ قریب سے کسی ریچھ کی آواز بھی سن لیتی تو شاید ہوش کھو دیتی۔وہ کسی ایسی صورتِ حال کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔پرانے واقعے کے اثرات اس کے ذہن پر بڑے گہرے تھے۔

اس دوران میں جگت سنگھ نے آ کر مجھے بتایا۔''بادشاہ زادے! چھوٹی تمہیں بلا رہی ہے۔''

میں خود بھی ثروت کے پاس جانا چاہ رہا تھا۔اپنی پوزیشن جگت سنگھ کو سونپ کر میں اندرونی کمروں کی طرف گیا۔راستے میں مجھے ڈاکٹر مہناز ملی۔اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔قربان علی بھی ایک دم غمزدہ کھڑا تھا۔میں چونک گیا۔میرا دھیان سیدھا نصیر احمد کی طرف گیا۔وہ شدید زخمی تھا۔

''نصیر احمد تو ٹھیک ہے؟'' میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کی خوب صورت آنکھیں نم ہو گئیں۔

قربان علی بولا۔''نصیر احمد ہمیں چھوڑ گیا ہے تابش صاحب۔''

میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ڈاکٹر مہناز ہولے سے بولی۔''لیکن آپ لڑکیوں کو کچھ نہ بتائیں۔خاص طور سے ثروت کو۔وہ پہلے ہی ڈپریشن میں ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خود کو سنبھالتا ہوا ثروت کی طرف بڑھا۔ثروت ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے ثروت؟''

''بیٹھ جائیں۔'' وہ عجیب انداز میں بولی۔

میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔وہ انہی کپڑوں میں تھی جن میں ممبئی سے چلی تھی۔سرخ پھولوں والی شلوار قمیص تھی جس پر اس نے شال اوڑھ رکھی تھی۔شال کندھوں پر تھی اور ریشمی بال بکھرے بکھرے نظر آتے تھے۔ایک چھوٹے جھمکے کا سایہ اس کے رخسار پر حرکت کر رہا تھا۔میں سوچ رہا تھا کہ وہ بولے گی لیکن کچھ نہیں بولی۔بس پلکیں جھکائے بیٹھی رہی۔پھر ایک دم اس نے جذباتی انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور انہیں میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔آنکھیں نم ہو گئیں۔قریباً ایک منٹ ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔میں نے کہا۔''کچھ بولو نا

ثروت!"

اس کی روشن پیشانی پر ایک رگ ابھری ہوئی تھی مگر اس نے اپنے ہونٹوں کو حرکت نہیں دی۔ ہونٹ جو خشک اور بے رنگ ہونے کے باوجود میرے لئے بہت دلنشین تھے۔

"کچھ بولنا نہیں؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ دلربا انداز تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ بدستور میرے ہاتھوں پر رکھے ہوئے تھے۔

اس دوران میں ڈاکٹر مہناز نے کمرے میں جھانکا۔ ثروت نے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لئے۔ دو آنسو اس کے شفاف رخساروں پر متحرک ہوئے۔ اس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ "اسے پڑھ لیجئے گا۔"

ڈاکٹر مہناز اب اندر آ گئی تھی۔ میں اٹھ کر واپس اپنی پوزیشن پر پہنچ گیا۔ عمران ٹیلی اسکوپ میں اردگرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

میں نے کاغذ کھولا اور ٹارچ کی روشنی میں پڑھنا شروع کیا۔ "تابش! میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں اور آپ نے بڑے حوصلے سے برداشت کئے ہیں۔ میرے لئے شدید رنج کی بات یہی ہے کہ آپ کی ان اذیتوں کا میرے پاس کوئی صلہ نہیں ہے۔ میں کیا کروں؟ میں اپنی سوچوں کا شکار ہوں تابش! میں وہی بات کہوں گی۔ میں اس خیال کو اپنے دل سے نکال ہی نہیں سکتی کہ آپ کا اور میرا ملاپ نصرت کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث ہوگا۔ پتا نہیں کیوں اب بھی میرا دل بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ نصرت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ضرور کسی بڑی مصیبت کا شکار ہے اور اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ میں اس وقت اپنے شوہر سے دور ہوں اور آپ کے قریب......

"ہم جس طرح کے حالات میں ہیں، ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے تابش! ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کے دوست نصیر کو دیکھا ہے۔ مجھے نہیں لگتا، ڈاکٹر مہناز اسے بچا پائے گی۔ شاید اگلی باری میری ہو یا خود ڈاکٹر مہناز کی ہو۔ تابش! اگر مجھے کچھ ہو گیا...... تو آپ نصرت کا بہت خیال رکھئے گا۔ وہ بن ماں باپ کے ہے۔ بالکل بے آسرا ہے۔ اس نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ اسے میری کمی محسوس نہ ہونے دیجئے گا۔ اور ایک آخری بات آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔ اسے ہمیشہ یاد رکھئے گا...... میں آج بھی آپ سے پیار کرتی ہوں اور اس

پیار کی شدت اتنی زیادہ ہے کہ میرے پاس اس کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ میں اس اظہار کے لئے خود کو بالکل بے بس محسوس کرتی ہوں۔ میری دوسری خطاؤں کی طرح میری اس بے بسی کو بھی معاف کر دیجئے گا۔ اگر ہم زندہ رہے تو آج کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گے۔ خدا حافظ۔"

میں نے کاغذ اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ عمران نے آخری بار ٹیلی اسکوپ کو نیم دائرے کی شکل میں گھمایا اور بولا۔ "بھانڈیل اسٹیٹ کی قلعے والی لڑائی یاد ہے تابی! آج پھر ویسی ہی پوزیشن نظر آ رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس وقت تو نل پانی سے چھوٹے سرکار کی کمک آ گئی تھی لیکن یہاں ایسی کوئی امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ جو کچھ کرنا ہے، شاید ہمیں خود ہی کرنا ہے۔ کوئی خاص بات آتی ہے تمہارے ذہن میں؟"

وہ ٹیلی اسکوپ کو ایک طرف رکھ کر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "بھانڈیل میں کمک کا اصل فائدہ یہی ہوا کہ گھیرا ڈالنے والوں میں کھلبلی مچی تھی۔ اس کھلبلی کا فائدہ اٹھا کر ہم قلعے سے نکل کر حکم کی فوج پر ٹوٹ پڑے تھے۔ نوجوان طلال، بھرت کمار، [illegible] وغیرہ نے بھی ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر بے مثال جرأت دکھائی تھی اور حکم اور اینڈرسن وغیرہ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ اگر یہاں بھی کوئی اس طرح کی کھلبلی مچ سکے تو ہم باہر نکل کر بھرپور حملہ کر سکتے ہیں، اندھیرے میں گھیرا توڑ کر نکل سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ابھی ان کے پاس سرچ لائٹس نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی لائٹ تھی جو ہم نے توڑ دی ہے۔"

"لیکن کھلبلی ہو کس طرح؟"

"یہی مسئلہ ہے۔ اب تو جھکڑ بھی تھم گئے ہیں۔ اگر شدید جھکڑ ہی آ جائیں تو ایسی سچویشن میں ہیلپ مل سکتی ہے۔ پچھلے سال اسی علاقے میں اسی طرح کی صورتِ حال میں تیز آندھی نے شہزاد، اقبال اور جیلانی کی مدد کی تھی۔"

جیلانی بھی ٹیلی اسکوپ سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہماری باتیں بھی سن رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔

عمران نے پوچھا۔ "کوئی تجویز ہے تمہارے ذہن میں؟"

وہ بولا۔ "تجویز تو نہیں لیکن آپ کی یہ بات درست لگتی ہے کہ کوئی ہلچل ہمیں ان کا گھیرا توڑنے کا موقع دے سکتی ہے اور وہ بھی صبح ہونے سے پہلے پہلے۔"

عمران نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں تھا وہ جیسے کسی نتیجے

پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر ٹیلی اسکوپ سے کسی خاص منظر کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ جیسے تذبذب میں تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ ایم جی فور گن کس کے پاس ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے شوتر صدیق کے پاس ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''سیڑھیوں کے پاس۔'' میں نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بولا۔

ہم جھک کر احتیاط سے چلتے ہوئے اس شوتر کے پاس پہنچے۔ اس نے سیڑھیوں کے قریب پوزیشن لے رکھی تھی۔ اس کے چاروں طرف گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی صورتِ حال کی سنگینی کو دیکھ رہا تھا اور غالباً نصیر کی موت سے بھی باخبر ہو چکا تھا پھر بھی اس کا سینہ تنا ہوا تھا اور مورال ہائی تھا۔ عمران نے اس سے ایم جی فور آٹومیٹک لے لی اور اپنی ٹرپل ٹو اسے تھما دی۔ ایک میگزین گن کے ساتھ اٹیچ تھا۔ ایک اور فل لوڈڈ میگزین بھی عمران نے لے لی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر احتیاط سے سیڑھیاں چڑھا اور بالائی منزل پر آ گیا۔ یہاں کھڑکیوں اور دیواروں میں گولیوں کے بے شمار سوراخ تھے۔ قربان کے ایک ساتھی کی لاش فرش پر پڑی تھی۔ اس پر ایک پوتھین پھیلا دیا گیا تھا۔ ہم ایک چھوٹا زینہ طے کر کے بالائی منزل کی چھت پر آ گئے۔ یہاں سیڑھیوں کی ایک ڈھلوان چھت کے سوا کوئی آڑ نہیں تھی۔ اس چھوٹی سی آڑ میں ایک گن مین چوکس بیٹھا تھا۔ عمران نے اس کا کندھا تھپکا اور گن سمیت نیچے جانے کی ہدایت کی۔ ساتھ ہی اس سے کہا کہ وہ قربان علی اور دیگر ساتھیوں کو بالکل چوکس کر دے، ہر کوئی اپنی پوزیشن پر موجود رہے۔

''ایم جی فور گن'' خاصی طاقتور ہوتی ہے۔ کل دوپہر شوتر صدیق نے بتایا تھا کہ اس ایک میٹر لمبی گن کا وزن قریباً نو کلوگرام کے لگ بھگ ہے۔ یہ لمبی رینج تک مار کرتی ہے اور ایک منٹ کے اندر 800 سے لے کر 885 راؤنڈ تک فائر کر دیتی ہے۔ یعنی ایک سیکنڈ میں تقریباً 15 راؤنڈ۔

عمران نے گن کے دستے کو مضبوطی کے ساتھ کندھے سے لگایا اور کسی شے کا نشانہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کچھ بتاؤ گے بھی؟'' میں نے بھنا کر کہا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے ٹیلی اسکوپ میں جھانکتے ہوئے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ شاید کوئی اہم فرد اس کے نشانے پر ہے۔ مثلاً جاوا یا اٹیرین کرنل...... یا پھر کوئی اور اہم بندہ۔ کچھ دیر بعد اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''میں سفید کنٹینر کو ہٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''فاصلہ تو کافی ہے اور زاویہ بھی خاصا مشکل ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ کامیابی ہو جائے۔''

وہ اب رسک لے کر کھڑا ہو گیا تھا اور بڑی یکسوئی سے اپنا نشانہ لے رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شاید کنٹینر کی فیول ٹینکی کو نشانہ بنانا چاہ رہا ہے۔

''یار کھڑے ہونے کا رسک نہ لو۔'' میں نے اسے تنبیہ کی۔

''کس کس رسک سے روکو گے جگر! یہاں تو رسک کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔''

وہ بلا کا نشانے باز تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کرنے جا رہا ہے اس کے لئے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ وہ سرتاپا ساکت ہو گیا جیسے سنگی مجسمہ ہو۔ اور پھر اس نے ٹریگر دبایا۔ گن کو زوردار جھٹکے لگے۔ ''ریٹ ٹیٹ'' کی مخصوص تہلکہ خیز آواز سے ایک برسٹ چلا...... پھر دوسرا۔ تیسرے برسٹ سے پہلے دوسری طرف سے برسٹ آیا۔ عمران اس کے لئے پہلے سے تیار تھا اس لئے جھک گیا تھا۔ ڈھلوان چھت اور چمنی کے اردگرد چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی...... ہم دبکے ہوئے تھے۔ عمران کو ابھی تک اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک اور برسٹ چلانا چاہ رہا تھا اور یہ ازحد خطرناک تھا۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ وہ رکے گا نہیں۔ اور پھر فائرنگ میں چند سیکنڈ کے وقفے کے دوران میں وہ کھڑا ہوا اور پوری یکسوئی سے ایک اور برسٹ چلایا۔ بے شک وہ نشانے باز تھا لیکن قسمت کی دیوی بھی اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اس بار عمران کے چلائے ہوئے برسٹ کا نتیجہ اس کی مراد کے مطابق تھا۔ ایک شعلہ نکلا اور دھماکے کے ساتھ ہی کنٹینر کے اگلے حصے نے آگ پکڑ لی۔ میں طاقتور دوربین کی مدد سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

کنٹینر شعلوں میں گھرا تو اردگرد افراتفری نظر آئی۔ کئی ہیولے دوڑتے بھاگتے دکھائی دیئے۔ شاید یہی وہ افراتفری تھی جو عمران دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن نہیں...... وہ اس کے سوا بھی کچھ چاہتا تھا۔ اور جو وہ چاہتا تھا پھر ہمارے سامنے بھی آیا۔ کچھ افراد نے گھبراہٹ کے عالم میں کنٹینر کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر موجود ریچھوں کو بچانا چاہتے تھے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا اور لرز گیا۔ بڑے بڑے ریچھ جست لگاتے ہوئے کنٹینر کے دھوئیں میں

سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے دیکھا، دروازہ کھولنے والے افراتفری میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ مدھم چاندنی میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ریچھ بی ایس ایف کے کسی اہلکار کی گولی سے زخمی ہوا۔ وہ ایک بار لوٹ پوٹ ہو کر گاڑیوں کی طرف لپکا۔ دو تین گاڑیاں اس کے سامنے ریورس ہوتی چلی گئیں۔ دائیں طرف بھی کچھ ایسی ہی سچویشن نظر آئی۔ اوپر تلے کئی فائر بھی ہوئے۔ دوسری طرف کنٹینرز کو لگنے والی آگ ایک ٹرک نما گاڑی تک چلی گئی اور وہ بھی ایک دھماکے سے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔

عمران اور میں سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے۔ عمران ساتھ ساتھ اپنے شوٹرز کو پکار رہا تھا۔ وہ بھی جیسے پہلے ہی سے تیار تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ عمران نے ان کو پہلے سے بریف کیا ہوا ہے۔ میں نے قربان علی، صدیق اور جیلانی وغیرہ کے ہاتھ میں دستی بم دیکھے لیکن جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ دستی بم نہیں تھے۔ یہ گیس بم تھے جو تیزی سے دھواں پھیلاتے تھے۔ ہم تیزی سے فائرنگ کرتے ہوئے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلے۔ میں نے دیکھا، بھاگتے بھاگتے عمران نے جگت سنگھ سے اس کی کرپان بھی لے لی ہے۔ یہی وقت تھا جب میں ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ ایک براؤن کوڈیاک ریچھ پر پڑی۔ یہ خون خوار ریچھ پھنکارتا ہوا ریسٹ ہاؤس کا جنوبی دروازہ توڑ کر اندر آ رہا تھا اور اندر عورتیں تھیں۔ فقط میڈم صفورا کے پاس ایک چھوٹا پسٹل موجود تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں واپس پلٹا۔ میں نے ریچھ پر دو سنگل شاٹ فائر کیے۔ اس دوران میں وہ چنگھاڑتا اور پھنکارتا ہوا اندرونی کمروں میں گھس گیا۔ اندر سے لڑکیوں کے چلانے کی دردناک آوازیں آئیں۔ یقیناً ان میں ثروت کی آواز بھی شامل تھی۔ میں اندر جھپٹا۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی۔ میں نیچے گر گیا۔ ایک گولی میری کلائی کو زخمی کرتی ہوئی گئی...... دیگر ایک دو گولیاں رائفل پر لگیں اور وہ میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ میں نے اس کا میگزین چکنا چُور دیکھا۔ میں نے قمیص کے نیچے سے دندانے دار شکاری چاقو نکالا اور اندرونی کمروں کی طرف گیا۔ ایشوریا اور نصیر احمد کی چادر پوش لاشوں کو پھلانگتا ہوا میں کمرے میں پہنچا تو منظر لرزہ خیز تھا۔ لڑکیاں ساتھ والے کمرے کے ایک کونے میں دبکی ہوئی تھیں۔ میڈم صفورا قریباً آٹھ فٹ اونچے ریچھ کے سامنے تھی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک فائر وہ ریچھ پر پہلے کر چکی تھی۔ دوسرا اس نے میرے سامنے کیا۔ لیکن اس سے پہلے میڈم کو شدید نقصان پہنچ چکا تھا۔ میں نے دیکھا میڈم کی گردن کے نیچے والے حصے اور کندھے کے اوپری حصے کا سارا گوشت غائب تھا۔ خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ یقیناً یہاں ریچھ کے بھاری پنجے نے کاری ضرب لگائی تھی۔ دو گولیاں کھا کر بھی ریچھ پر زیادہ اثر نہیں

ہوا۔ اس نے میڈم پر جھپٹا مارا۔ کئی کلو وزنی تھپڑ میڈم کے چہرے پر پڑا۔ میڈم ایک جسیم اور دبنگ خاتون تھی لیکن کسی ہلکی پھلکی شے کی طرح اڑتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی، اس [illegible] سے پستول نکل کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

میں نے پہلو کی طرف سے جسیم ریچھ کی پسلیوں پر وار کیا...... وہ تڑپ کر میری طرف متوجہ ہوا۔ حیوان اور انسان رُوبرو تھے۔ اس کے بالوں بھرے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں قاتل چمک تھی۔ وہ کسی بپھرے ہوئے پہلوان کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں۔ شاید یہ میری غیر معمولی قوت برداشت ہی تھی جس نے مجھے اس موقع پر زندہ رکھا۔ ریچھ کی تھوتھنی چھوٹی لیکن سر بہت بڑا ہوتا ہے۔ یہ بالوں بھرا متعفن سر مجھ سے فقط چند انچ کی دوری پر تھا۔ وہ شاید میری گردن نوچنا چاہ رہا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی قاتل تھوتھنی کو خود سے دور رکھا اور دائیں ہاتھ سے شکاری چاقو کا ایک اور وار اس کے پیٹ پر کیا۔ اس مرتبہ چاقو دستے تک اس کے اندر گیا۔ میں نے اسے واپس کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ نکلا نہیں۔ ریچھ نے ایک پھنکار کے ساتھ مجھے گھمایا۔ میں اڑتا ہوا ایک دیوار سے ٹکرایا۔ میڈم صفورا میرے قریب ہی گری ہوئی تھی۔ وہ بری طرح زخمی تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے دکھایا کہ اس کا پسٹل کہاں ہے۔ میں نے پسٹل پر جست لگائی اور گھوم کر اوپر تلے تین فائر موذی جانور پر کیے۔ ایک عین اس کی آنکھوں کے درمیان لگا اور وہ ایک دیوار گیر کھڑکی توڑتا ہوا اوندھے منہ گرا۔ مجھے باہر سے شدید ترین فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ہر رائفل اور ہر آتشیں ہتھیار کا دہانہ کھل گیا ہے۔ ثروت سمیت دونوں لڑکیاں دوڑتی ہوئی کسی اور کمرے میں گھس گئیں۔ مجھے وہاں ایک رائفل پڑی نظر آ گئی...... میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ابھی تک حرکت کرتے ہوئے ریچھ پر ایک برسٹ مار کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔

اب میں باہر کی طرف لپکا۔ مجھے ریسٹ ہاؤس سے آگے اور جھنڈ کی طرف ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آیا۔ یقیناً یہ وہی اسموک بم تھے جو عمران کے ساتھیوں نے پھینکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھ سے فقط آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر قربان علی کھڑا تھا۔ پھر اس نے جھک کر اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کی۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور قربان علی کو چھلنی کر گئی۔ اس کی رائفل دور لڑھک گئی تھیں وہ ایک اچھی آٹھ ایم ایم رائفل تھی لیکن میں اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو شاید خود بھی قربان علی کے پاس پہنچ جاتا۔ میں نے دیکھا، صدیق اس بس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہے جس پر ہم یہاں پہنچے تھے۔ اس بس میں تین چار فالتو

ٹائر مو[redacted] تھے جو ناکارہ ٹائروں کی جگہ لے چکے تھے۔ صدیق فائرنگ کی زد سے بچنے کے لئے [redacted] جھک کر بیٹھا تھا۔ اس نے بس کو ٹرن کیا اور اندرونی کمروں کی طرف لایا۔ غالباً عمران کی ہدایت تھی کہ اندر موجود لڑکیوں کو ڈاکٹر مہناز سمیت سوار کرایا جائے اور آس پاس موجود شوٹرز کو بھی بٹھا لیا جائے۔ شاید وہ گھیرا توڑ کر نکلنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ابھی بس احاطے کے آخری سرے تک ہی پہنچی تھی کہ اس کی باڈی میں کئی برسٹ لگے۔ غالباً اس کی فیول لائن کو نقصان پہنچا۔ اگلے پہیوں کے قریب سے شعلے نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے دروازے والا حصہ جلنا شروع ہو گیا۔

''صدیق...... چھلانگ لگاؤ؟'' میں نے پکار کر کہا۔

صدیق نے چھلانگ لگائی مگر یہ موت کی چھلانگ ثابت ہوئی۔ دو گولیاں اس کے سینے سے پار ہو گئیں۔ گولیاں ریسٹ ہاؤس پر مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔

جیلانی دھوئیں میں سے برآمد ہوا۔ اس نے جلتی ہوئی بس کو دیکھا اور تاسف سے بولا۔

''بہت برا ہوا...... بہت برا۔ اب نکلنا مشکل ہوگا۔'' اس دوران میں دھماکے سے پوری بس نے آگ پکڑ لی اور رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔

ہم نے پلٹ کر پھاٹک کے پاس پوزیشنیں لے لیں اور فائرنگ شروع کر دی۔ قربان کا بے جان جسم میرے سامنے ہی پڑا تھا۔ لاش گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ اس کی رائفل اب بھی ہماری دسترس سے دور تھی۔

''ایمونیشن دو۔'' جیلانی نے چلا کر کہا۔

ایک شوٹر تین چار بھرے ہوئے میگزین لے کر آیا۔ وہ جھک کر دوڑتا ہوا ہم سے دس بارہ فٹ دور پہنچا تھا کہ اوندھے منہ گر گیا۔ کوئی گولی اسے چاٹ گئی تھی۔ بہرحال دو میگزین لڑھکتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ دھوئیں میں سے ایک ریچھ برآمد ہوا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس کی ٹانگ خون آلود تھی۔ شاید زخمی ہو کر وہ مزید مشتعل ہو گیا تھا۔ اس کا وزن آٹھ دس من سے کم نہیں ہوگا۔ وہ ہمیں روند کر ہی گزر جاتا تو شاید ہم اٹھ نہ سکتے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اس پر فائرنگ کی اور اسے ختم کر دیا۔

یہی وقت تھا جب ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح دھوئیں کی چادر کو چیر کر ہماری طرف آئی۔ یہ وہی گرے جیپ تھی جو جاوا کے خاص استعمال میں ہوتی تھی۔ یہ خاصے بڑے سائز کی تھی اور اس کی نادر خصوصیات ہم دیکھ ہی چکے تھے۔ میں نے گن اس کی طرف سیدھی کی مگر اس پر فائر اثر نہیں کرتا تھا۔ فائر تو رہی دور کی بات، اس پر جگت کے ساتھیوں نے

میرے سامنے کئی دستی بم پھینکے تھے۔ یہ واقعہ فرید کوٹ کے راستے میں رُونما ہوا[redacted]ور دار دھماکوں کے باوجود جیپ کو ذرا سا نقصان بھی نہیں پہنچا تھا۔

یکا یک مجھے اور جیلانی کو اندازہ ہوا کہ ہمیں جیپ پر فائر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر جاوا یا اس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ خود عمران تھا۔ اس نے بریک لگائے اور آٹومیٹک دروازے کھول دیئے۔ وہ ہمیں اندر بیٹھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ نشستوں پر خون کے دھبے تھے۔ عمران اندرونی کمروں کی طرف بھاگا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ اور جگت سنگھ لڑکیوں کو لئے ہوئے نمودار ہوئے۔ عمران نے گرے جیپ اس طرح کھڑی کی تھی کہ لڑکیوں کو زیادہ فاصلہ نہ طے کرنا پڑے۔ پھر بھی رسک تو موجود تھا۔ عمران کے علاوہ دو شوٹرز نے بھی لڑکیوں کو کور دیا ہوا تھا۔ وہ کبھی جھک کر چلتی اور کبھی گھٹنوں کے بل رینگتی گرے جیپ تک پہنچ گئیں۔ ثروت اور مہناز بھی شامل تھیں لیکن میڈم صفورا نظر نہیں آ رہی تھی۔

''میڈم صفورا؟'' جیلانی نے پوچھا۔

عمران نے نفی میں سر ہلا کر اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ ہم نے میڈم کو لڑکیوں کا نگہبان مقرر کیا تھا اور اس نے نگہبانی کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ آخری وقت تک شیرنی کی طرح حالات کے سامنے اور خوں خوار بھورے ریچھ کے سامنے ڈٹی رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے آخری بار دیکھوں لیکن اس کا موقع کہاں تھا۔ نصیر اور قربان علی کے چہرے دیکھنے کا بھی موقع نہیں تھا۔ ہمارے اردگرد لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ عمران نے گرے جیپ اسٹارٹ کی تو وہ ہوئی نہیں۔ اندازہ ہوا کہ اس کے اندر کوئی آٹومیٹک سوئچ تھا جو آف ہو گیا ہے۔ قربان علی کا ایک ساتھی غالباً ایسے کام کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ بونٹ اٹھا کر کوشش کرنے لگا۔

جیلانی نے پھاٹک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھئے جی...... وہ لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔''

ہم نے جیپ کی کھڑکیوں میں سے دیکھا۔ جیلانی درست کہہ رہا تھا۔ پھاٹک سے قریباً پچاس میٹر آگے ہمارے چار شوٹرز گھیرے میں تھے۔ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں وہاں کی مدھم جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ وہی چھوٹا سا ٹیلا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ہم نے بھی پوزیشن لی تھی۔ ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ دو شوٹرز زخمی ہیں اور دو انہیں سہارا دے کر واپس ریسٹ ہاؤس کی طرف آنا چاہتے ہیں لیکن تابڑ توڑ گولیوں میں یہ ممکن نہیں تھا۔ ان چاروں کی جان کسی بھی وقت جا سکتی تھی۔ انہیں مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے اور عمران نے ایک

دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ ہوا۔ ایسے دیوانے فیصلے ہم پہلے بھی کر[illegible]ہے تھے۔ جب ہم دونوں کے کندھے آپس میں چھوتے تھے اور نگاہیں اپنے ہدف پر جمی ہیں...... اور سانسوں کی لے تیز ہوتی تھی...... اور سینے میں دھڑکن کا نقارہ بجتا تھا تو وہ لازوال فقرہ ایک بازگشت کی طرح ہمارے کانوں میں گونجنے لگتا تھا...... جب ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور جب مرنا ہے تو ڈرنا کیا......

...... ہاں، موت تو ایک ہی بار آتی ہوتی ہے۔ جان نے تو ایک ہی بار نکلنا ہوتا ہے اور ہم اس فلسفے کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ عمران نے جیلانی سے کہا۔ ''یا شیخ! تم ادھر کا دھیان رکھو۔ ہم انہیں نکال کر لاتے ہیں۔''

جیلانی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن ہمارے سامنے بولنے کی ہمت اسے نہیں ہوئی۔ ثروت کا چہرہ بھی خوف سے زرد تھا۔ یہ بڑی خطرناک کوشش تھی لیکن یہ بھی طے تھا کہ ہم اپنے ان چار شوٹرز کو یہاں موت کے منہ میں چھوڑ کر فرار نہیں ہوں گے۔

رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ ہم ایک ساتھ جھک کر بھاگے اور گولیوں کی بارش میں ٹیلے کی طرف لپکے۔ موت کی طرف لپکنے کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ جان کو ہتھیلی پر رکھنے کی اپنی ایک ترنگ ہوتی ہے۔ ایک گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ایک عمران کے بازو میں لگی۔ میں نے گولی کے گوشت میں گھسنے کی آواز صاف سنی۔ وہ ایسے زخموں کی پروا کرنے والا نہیں تھا۔ ہم ٹیلے کے عقب میں اپنے ساتھیوں کے پاس اوندھے منہ گر گئے۔

ہماری کمک نے ان کے حوصلے جوان کر دیئے۔ ایک شخص عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔

''سر! یہ دونوں زخمی ہیں۔ آپ ان کو پیچھے لے جانے کی کوشش کریں، ہم انہیں روکتے ہیں۔''

''نہیں...... تم انہیں پیچھے لے جاؤ۔ ہم روکتے ہیں۔'' عمران نے حکم دیا۔

شوٹر کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ عمران کی بات مانتا۔ تب ہم نے دیکھا کہ زخمی ہونے والے دونوں ''شوٹرز'' نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک ماسٹر جواہر تھا۔ اس کی ٹانگ میں ران کے اوپری حصے پر گولی لگی تھی۔ زخم کاری تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کراہ رہا تھا۔ دوسرا شخص بے ہوش تھا۔ عمران کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دونوں شوٹرز نے دونوں زخمی ساتھیوں کو دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ حتی الامکان خود کو زمین سے قریب رکھ رہے تھے تاکہ گولیوں کی زد سے بچ سکیں۔ میں اور عمران ڈٹ کر فائرنگ کا جواب دینے لگے۔ انڈین سپاہی تین اطراف سے اس چھوٹے سے ٹیلے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی ایک طرف کی کوشش تو اس فائرنگ کی وجہ سے ناکام ہو رہی تھی جو جیلانی

اور جگت سنگھ وغیرہ بلٹ پروف گرے جیپ کے اندر سے کر رہے تھے۔ مگر باقی دو طرف سے انہیں سخت مزاحمت دیئے جانے کی ضرورت تھی۔

یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ ہم اپنی پوری فائر پاور استعمال کرنے لگے تاکہ دونوں زخمی اور دونوں شوٹرز ''ری ٹریٹ'' کرتے ہوئے ریسٹ ہاؤس تک پہنچ جائیں اور جیپ میں سوار ہو جائیں۔ بعد میں ہم بھی یہ مورچا چھوڑ کر جیپ کی طرف دوڑ لگا سکتے تھے۔ لیکن انڈین سپاہی قریب آتے جا رہے تھے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ قریباً بیس میٹر پیچھے سے ایک شوٹر کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ''سر! عباس کو گولی لگ گئی ہے۔''

عمران نے دانت پیس کر منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔ وہ رشین AEK999 چلا رہا تھا۔ وہ اس مورچے میں پہلے سے ہی موجود تھی۔ اس میں میگزین کی جگہ گولیوں کے طویل اسٹریپس استعمال ہو رہے تھے۔ بھرپور حملہ روکنے کے لئے ایسی گنز مفید ثابت ہوتی ہیں۔ عمران نے کہا۔ ''تابی! تم جاؤ، ان کی مدد کرو۔ میں یہاں روکتا ہوں انہیں۔''

''نہیں عمران! تم ہر جگہ حکم چلاتے ہو۔ تم جاؤ، میں روکتا ہوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''یار! میرا بازو زخمی ہے۔ میں کھینچ نہیں سکوں گا۔ انہیں۔'' اس کا اشارہ زخمیوں کی طرف تھا۔

اس کی دلیل میں وزن تھا۔ ایسی وزنی دلیلیں ہر وقت اس کے پاس موجود رہتی تھیں۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ وہ یہ جگہ چھوڑنے پر تیار ہو جائے لیکن ناکامی ہوئی۔

میں پیٹ کے بل رینگتا ہوا واپس آیا۔ شوٹر عباس کے سر کا ایک حصہ اڑ چکا تھا۔ مغز بکھرا پڑا تھا۔ میں نے دوسرے شوٹر کی مدد کی اور دونوں زخمیوں کو دھیرے دھیرے پھاٹک کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ ماسٹر جواہر تو خود بھی تھوڑا بہت آسرا کر رہا تھا مگر دوسرا ساتھی مکمل بے ہوش تھا۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ ہم ٹیلے کے بالکل آڑ میں تھے اور ٹیلے پر عمران نے مورچا سنبھالا ہوا تھا۔ وہ ہمیں پورا کور دے رہا تھا۔ ہم دونوں زخمیوں کو ریتیلی زمین پر کھینچتے ہوئے پھاٹک تک لے گئے۔ گرے جیپ کی عقبی لائٹس روشن تھیں لیکن وہ ابھی تک اسٹارٹ نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور عمران کی طرف دیکھا۔ پچاس ساٹھ میٹر دور وہ کسی چٹان کی طرح ڈٹا ہوا تھا۔ انڈین سپاہی ٹیلے پر چڑھنے اور اسے پکڑنے میں ناکام تھے۔ پھر میں نے دیکھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا...... ہر خطرے کو بالائے طاق رکھ کر...... جیسے جنگلی

کتوں میں گھرا ہوا شیر ہو۔ اس کی للکار دل ہلا دینے والی تھی۔ پچاس ساٹھ میٹر کی دوری سے بھ[illegible] کی گونج میرے کانوں میں محسوس ہوئی۔ اس نے گن کو اس کے اسٹینڈ سے اٹھا لیا تھا اور تین اطراف میں حرکت دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے مثال جارحیت تھی۔ چاروں طرف دھماکے اور شعلے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں واپس اس کی طرف لپکتا، میں نے دیکھا کہ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا ہے۔ وہ اپنی نہایت مؤثر فائرنگ سے انڈین سپاہیوں کو تتر بتر...... بلکہ شاید دہشت زدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اور میرا ساتھی شوٹر بھی ریسٹ ہاؤس کے پھاٹک سے تھوڑا آگے چلے گئے۔ ہم نے عمران کو بھرپور کور دیا لیکن ہمارے کور سے زیادہ عمران کی اپنی فائرنگ کارگر تھی۔ قریباً ایک منٹ کے اندر وہ پھاٹک کی آڑ میں ہمارے ساتھ تھا۔ یہی وقت تھا جب گرے جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی فرحت بخش آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ قربان کا ساتھی اس کے انجن کو پھر سے حرکت میں لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''تابی! تم جیپ ڈرائیو کرو۔'' عمران نے پکار کر کہا۔

ہم فائرنگ کرتے ہوئے الٹے قدموں جیپ کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے دونوں زخمی جیپ میں گئے۔ پھر جیلانی...... پھر میں...... عمران اب بھی باہر تھا اور وزنی گن کو اسٹینڈ سمیت اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک آخری برسٹ چلایا اور جیپ میں آ گیا۔ دروازے بند ہو گئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

یہ آٹومیٹک اور جدید ترین گاڑی تھی۔ کلچ دبانے اور گیئر لگانے کی ضرورت سے بے نیاز۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کی عقبی جانب سے نکلنا تھا۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ چھ فٹ اونچی ایک خستہ حال دیوار تھی جس کے بالائی کنارے سے تعویذوں کی پوٹلیاں سی لٹک رہی تھیں۔ گاڑیاں دیواروں میں سے نہیں گزر سکتیں مگر یہ مختلف گاڑی تھی۔ انڈیا کا نامی گرامی ڈان اس کا مالک تھا۔ اس نے اسے اپنے لئے محفوظ ترین بنا رکھا تھا۔ یہ بلٹ پروف تھی اور بارودی دھماکے بھی اس پر اثر نہیں کرتے تھے اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں تھی میری ہدایت پر سب نے خود کو زوردار شاک کے لئے تیار کر لیا۔ قریباً چالیس کلو میٹر کی رفتار سے جیپ اور چاردیواری کا تصادم ہوا۔ ہم راستہ بناتے ہوئے آگے نکلتے چلے گئے۔ ہیوی جیپ نے دیوار توڑ ڈالی تھی۔

یہ سڑک نہیں تھیں کھلا میدان تھا اور جھاڑ جھنکاڑ بھی تھا۔ ہمارا رخ مغرب کی طرف تھا۔ مغرب جہاں سرحد تھی۔ جہاں پاکستان کی مٹی تھی۔ اور ہمارے جسموں پر خون کے چھینٹے

تھے۔ ہم نے اپنے دشمنوں کو ایک نہایت کاری ضرب لگا کر ان کا گھیرا توڑا تھا اور اب اپنی مٹی کی طرف جا رہے تھے۔

یہ ہمارے دشمنوں کے لئے بہت بڑی شکست تھی اور وہ اسے ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے پاس موقع تھا کہ وہ بارڈر تک پہنچنے سے پہلے پہلے ہمیں روک لیں۔ ہمیں اور ہماری عورتوں کو اپنے انتقام کے شکنجے میں جکڑیں اور ان جسموں سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑیں جنہوں نے ممبئی سے بھڑوچ تک اور سائل پور سے ریسٹ ہاؤس تک ان کی اَن گنت لاشیں بچھائی تھیں۔ وہ خاص طور سے عمران کو اپنی گرفت میں لانا چاہتے تھے۔ اسے اس کے ''جرائم'' کی پاداش میں مثالِ عبرت بنانا چاہتے تھے۔

وہ آندھی اور طوفان کی طرح ہمارے پیچھے آئے۔ درجنوں ہیڈ لائٹس تھیں جو اچھلتی کودتی ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ دائیں بائیں بھی بہت سی متحرک روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ لوگ ہم پر فائر بھی کر رہے تھے لیکن اب ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ ہم ایک محفوظ گاڑی پر سوار تھے۔ قدرت نے دشمن کا سارا انتظام اسی پر الٹ دیا تھا۔ انڈرورلڈ کے سپر اسٹار جاوا نے نہ جانے کتنے ملین بلین خرچ کر کے اپنے لئے یہ نادر روزگار گاڑی بنوائی تھی اور یہ اب ہمارے استعمال میں تھی۔ یہ عمران کے پاس کیسے اور کیونکر پہنچی، یہ ابھی مجھے معلوم نہیں تھا مگر لگتا تھا کہ جب ریچھوں کی وجہ سے گھیرا ڈالنے والوں میں افراتفری پھیلی اور گاڑیوں کو لگنے والی آگ نے اس افراتفری کو بڑھایا تو عمران اور اس کے ساتھیوں نے اپنے مورچے چھوڑ کر حملہ کیا تھا۔ انہوں نے دھوئیں والے گیس بم پھینکے تھے۔ یقیناً انہی لمحوں میں عمران نے اس گاڑی کو ٹارگٹ بنایا تھا یا ممکن تھا کہ وہ خود ہی اس کے نشانے پر آ گئی ہو۔ اس لگژری گاڑی کی نشستوں پر خون کے دھبے موجود تھے۔ پتا نہیں یہ کس کا خون تھا؟

میں نے مڑ کر دیکھا۔ عمران اس دیوہیکل جیپ کی درمیانی نشستوں پر موجود تھا...... اس کے بازو میں گولی لگی تھی ڈاکٹر مہناز لرزتے ہاتھوں سے پٹی باندھ کر اس کا خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں پاکستانی لڑکیاں ذہنی طور پر عمران کو اور مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھتی تھیں۔ خاص طور سے عمران پر تو وہ دونوں والہانہ یقین کرنے لگی تھیں۔ وہ دونوں اب بھی عمران کے دائیں بائیں موجود تھیں۔ آنکھیں بند کر کے سسک رہی تھیں۔ عمران نے انہیں اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا اور تسلی بخش انداز میں تھپک رہا تھا۔ ان لمحوں میں وہ اپنی عمر اور اپنے چلبلے پن سے کہیں آگے اور جدا نظر آ رہا تھا۔ جیسے وہ خود ''پاکستان'' تھا اور ان لڑکیوں کو پناہ دے رہا تھا۔

''گولی اندر ہی ہے؟'' میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

''ہاں...... لیکن تقریباً آر پار ہے۔ تھوڑا سا چیرا دے کر نکالی جا سکے گی۔''

ظاہر ہے کہ یہ کام گاڑی رکنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ فی الحال ہمارے پیچھے بلا کی رفتار سے موت لپک رہی تھی۔ گاہے بگاہے گولیاں جیپ کی باڈی اور کھڑکیوں سے ٹکراتیں اور چنگاریاں چھوڑتی تھیں۔ جگت سنگھ کی آنکھوں میں شعلے تھے۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ وہ سن روف سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ غالباً چاہتا تھا کہ چھت کے چور کو خلا میں سے باہر نکل کر جوابی فائرنگ کرے۔ میں نے کہا۔ ''جگت سنگھ! بیٹھے رہو۔ کوئی ضرورت نہیں، ان کی فائرنگ سے کچھ نہیں بگڑ رہا ہمارا۔''

''پر بادشاہ زادے! یہ ٹائر پھاڑ دیں گے۔''

''نہیں پھٹیں گے ٹائر بھی۔'' عمران نے کہا۔

چند منٹ کی زبردست اچھل کود کے بعد ہم پختہ سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی لیکن ہموار تھی۔ میں تیس ہارس پاور کی طاقتور جیپ کا ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔ وہ کمان سے نکلا ہوا تیر بن گئی۔ عقب میں آنے والی اَن گنت گاڑیاں بدستور ہمارے پیچھے تھیں لیکن اب ہمیں ایک فائدہ تھا۔ اب ہم سڑک پر تھے۔ وہ ہمارے دائیں بائیں سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں۔ صرف پیچھے آ سکتی تھیں۔ گولیوں کی بوچھاڑ گاہے بگاہے گاڑی کے عقبی حصے سے ٹکراتی تھی۔ یہ سارا بارڈر ایریا تھا۔

''شاید چیک پوسٹ ہے آگے۔'' میں نے کہا۔

''راستہ بھی بلاک ہے۔'' جیلانی نے کہا۔

ایک فوجی جیپ سڑک پر آڑی کھڑی تھی۔ میں نے رفتار کم کرنے کے بجائے کچھ بڑھا دی۔ جیپ نے پہلے چیک پوسٹ کا بانس توڑا۔ پھر فوجی جیپ کے بونٹ کو ٹکر مار کر اسے ایک طرف لڑھکایا پھر ایک موٹر سائیکل کو روندتی ہوئی نکل گئی۔ ہم پر فائر بھی ہوئے لیکن یہ بے اثر تھے۔

اب صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ درختوں کے ہیولے اور زمین کے نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ ہوا چل رہی تھیں وہ بند گاڑی میں ہم سے ٹکرا نہیں رہی تھی لیکن یہ سوچنا بھی خوش گوار تھا کہ یہ پاکستان سے آنے والی ہوا ہے۔

میں نے ایک بار پھر عقب نما آئینے میں عمران کو دیکھا۔ اس نے آخر میں ناقابلِ بیان معرکہ لڑا تھا۔ ٹیلے کے عقب میں تقریباً پانچ منٹ تک اس نے تن تنہا انڈین فوجیوں اور جاوا

کے خطرناک گرگوں کو روکا تھا۔ میں نے وہ ہر ہر منظر دیکھا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب لگا تھا کہ وہ لوگ ٹیلے پر آ جائیں گے اور عمران کو پکڑ لیں گے۔ مگر اسی وقت عمران کی شدید مزاحمت نے ان کے قدم روک دیئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہم بھی صحیح سلامت جیپ تک پہنچ پائے۔

عمران نے فاخرہ نامی لڑکی کو اب بھی اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ اس کی چھاتی پر سر رکھے بند آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ ذرا مختلف لگا۔ عمران نے اس طرح اسے اپنے ساتھ کیوں لگا رکھا تھا؟ صرف وہی تو خوف زدہ نہیں تھی۔ سب ڈری ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر مہناز کے ہونٹ بھی بالکل خشک ہو رہے تھے۔ ہم نے ایک چیک پوسٹ تو پار کر لی تھی۔ آگے کیا کیا ہونا ہے، اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

یکا یک میں نے ڈاکٹر مہناز کو چونکتے دیکھا۔ عمران کے بازو کی پٹی کرنے کے بعد وہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں ''یہ بلڈ کہاں سے آ رہا ہے؟'' مہناز نے تیزی سے پوچھا۔

تب وہ آگے جھک کر دیکھنے لگی۔ اس نے فاخرہ نامی لڑکی کو پیچھے ہٹایا۔ ''اوہ گاڈ!'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

جیلانی اور جگت سنگھ بھی عمران کی طرف جھک گئے۔ میں نے گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے عقب نما آئینے میں دیکھا اور لرز گیا۔ عمران کے سینے پر گولی کا ایک بڑا زخم تھا۔ خون سے اس کی قمیص سرخ ہو رہی تھی۔ غالباً اسی زخم کو چھپانے کے لئے اس نے فاخرہ کو مسلسل اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔

مہناز نے قینچی سے عمران کی قمیص کاٹی اور اس پر جھک گئی۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ بڑے ''کیلیبر'' کی گولی تھی۔ تھوڑا دائیں جانب لگی تھی مگر پتا نہیں اس نے اندر سے کیا کیا زخمی کیا تھا۔

عمران نے مجھے عقب نما میں گھورتے ہوئے پایا تو زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''گھبراؤ نہیں جگر! میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں اور وہ بھی صرف ایک گولی سے۔ بس ذرا فٹافٹ پاکستان پہنچا دو۔''

میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ اب روشنی پوری طرح پھیل گئی تھی۔ میں ڈاکٹر مہناز سے مسلسل عمران کے زخم کی نوعیت پوچھ رہا تھا۔ وہ بس ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی اور پورے انہماک سے عمران پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے عمران کے چہرے پر کرب کے ہلکے سے آثار دیکھے۔

جیلانی مسلسل پچھلی اسکرین سے عقب میں آنے والی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ٹیلی اسکوپ اس کی آنکھوں سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایک بڑی فوجی گاڑی سب سے آگے ہے۔ اس پر لانچنگ سسٹم ہے۔ میرے خیال میں دو بڑے راکٹ ہیں......نہیں تین بڑے راکٹ ہیں۔''

''اوہ، یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' عمران کے لہجے میں تشویش تھی۔

''لیکن یہ جیپ بم پروف ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ہے مگر اتنی رفتار سے چلتی ہوئی گاڑی راکٹ لگنے سے الٹ جائے گی اور شاید وہ یہی چاہتے ہیں۔''

''بارڈر کتنی دور رہ گیا ہے اندازاً؟'' جیلانی نے پوچھا۔

''قریباً تین کلومیٹر۔'' عمران نے جواب دیا۔ آواز میں تکلیف کا عنصر تھا۔

جیلانی نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے رکھی۔ وہ بولا۔ ''مجھے لانچرز کے آس پاس حرکت نظر آ رہی ہے جی۔ لگتا ہے وہ لوگ کچھ کرنے والے ہیں۔''

عمران نے ڈاکٹر مہناز کو پیچھے ہٹایا اور گھوم کر عقب میں دیکھا۔ میں اندر تک کانپ گیا۔ عقب نما آئینے میں مجھے جو کچھ نظر آیا، وہ میرا دل خون کرنے کے لئے کافی تھا۔ سینے پر لگنے والی گولی شاید عمران کی کمر کی طرف سے نکل گئی تھی۔ دونوں کندھوں کے قریباً درمیان زخم دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ لوہے کا انسان تھا۔ جب کچھ کرنے پر آتا تھا تو کر گزرتا تھا۔ اپنے زخم کی پروا کئے بغیر وہ پورا گھوما۔ اس نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور سپاٹ آواز میں بولا۔ ''وہ جان بوجھ کر فاصلہ رکھے ہوئے ہیں تاکہ ہم عام ہتھیاروں سے انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں۔''

''ظاہر ہے، ان کے راکٹ کی Reach تو ہم تک ہے۔'' جیلانی نے کہا۔

عمران کچھ دیر چپ رہنے کے بعد جیلانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شیخ! مجھے اسنیپر گن دو۔''

''کیا کریں گے اس سے؟''

''یار گن دو۔'' وہ اٹل انداز میں بولا۔

جیلانی نے ایک نشست کے نیچے سے گن نکال کر عمران کے حوالے کر دی۔

''کیا کرو گے اس سے؟'' میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''گن کا کیا کرتے ہیں؟'' وہ اس کا سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے بولا۔

''لیکن اس کے راؤنڈ نہیں ہیں۔''

عمران نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے جیلانی کو اشارہ کیا۔ جیلانی نے ایک کھٹکا دبا کر ایک لیور کھینچا اور سن روف کھل گیا۔ یہ قریباً دو فٹ مربع کا خلا تھا۔ تیز ہوا اندر آنے لگی۔ ہمارے لباس پھڑ پھڑانے لگے۔ میں نے دیکھا، ثروت کے بال اُڑ اُڑ کر اس کے زرد چہرے کو ڈھانپ رہے ہیں۔

عمران نے گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے خالی اسنیپر کندھے سے لگائی اور اس کی طاقتور ٹیلی اسکوپ میں سے پیچھے کا منظر دیکھا۔ گاڑی کم و بیش سو کلومیٹر کی رفتار سے جا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ پیچھے والی گاڑیوں کی رفتار بھی یہی تھی۔

''میں اس لانچر والی گاڑی پر ایک فائر کرنا چاہ رہا ہوں۔'' عمران نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

میں نے جھلا کر کہا۔ ''گولی کے بغیر فائر کرنے کا کون سا طریقہ ایجاد کیا ہے تم نے؟''

''ایک گولی ہے میرے پاس۔'' اس نے انکشاف کیا اور اپنی کاٹرائے کی پتلون کا پائنچا اٹھا کر جراب کے اندر سے اسنیپر گن کی گولی نکال لی۔

میں حیران رہ گیا۔ ایک دم ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ جب احمد آباد سے آگے چلتی بس میں جاوا کے لوگ پی ایس ایف کے ساتھ مل کر ہمارا تعاقب کر رہے تھے تو اسی طاقتور اسنیپر کی مدد سے ہم نے انہیں بس سے دور رکھا ہوا تھا۔ آخری مرحلے میں گن مین کو اسنیپر کی ایک گولی نہیں ملی تھی۔ خیال تھا کہ وہ فائر ہو گئی ہے یا شاید نشستوں کے نیچے کہیں لڑھک گئی ہے۔ اب وہی چمکتی ہوئی گولی عمران کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اکثر اس طرح کی حرکات کرتا تھا اور کبھی کبھی ایسی حرکات حیرت انگیز طور پر سودمند ثابت ہوتی تھیں۔

''میں نے اس وقت یہ ایک گولی سنبھال لی تھی ورنہ اس نے بھی چل ہی جانا تھا۔ اب ہو سکتا ہے کام آ جائے۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا اور قریباً چار انچ لمبی گولی کو گن میں ایڈجسٹ کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ سن روف کے خلا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس میں کھڑا ہو کر فائر کرنا چاہتا تھا شاید۔

ڈاکٹر مہناز کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس نے عمران کے زخم کی نوعیت دیکھ لی تھی۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جگت سنگھ، جیلانی، قربان کے ساتھی شوٹرز سب پریشان تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''پلیز عمران صاحب! آپ کچھ نہ کریں، آپ کا خون تیزی سے نکلنے لگا ہے۔''

ساتھ ہی ڈاکٹر مہناز نے جگت سنگھ اور جیلانی وغیرہ کو اشارہ کیا کہ وہ عمران کو کوئی بھی حرکت کرنے سے روکیں۔ جگت اور جیلانی نے کوشش کی لیکن عمران نے انہیں بری طرح جھڑک کر روک دیا۔ میں نے پہلی بار اسے اس طرح اپنا تحمل کھوتے ہوئے دیکھا تھا۔ خون بہنے کی رفتار واقعی تیز ہوگئی تھی۔ وہ پوری نشست کو بھگو رہا تھا۔

''شیخ! مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ'' عمران نے کہا۔

جیلانی نے سوالیہ نظروں سے مہناز کی طرف دیکھا۔

''یہ میرا حکم ہے شیخ! مجھے اٹھاؤ۔ میں فائر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے سہارا دو۔ جلدی کرو۔'' وہ تحکم سے بولا۔

اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ اس کا دیرینہ ساتھی جانتا تھا کہ اسے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ جیلانی اور جگت نے مل کر عمران کو سہارا دیا۔ اس نے اپنا ایک گھٹنا نشست کے ہتھے پر ٹکایا اور اپنا بالائی دھڑ سن روف کے چوکور خلا میں سے باہر نکال دیا۔ میں ایک سائیڈ مرر سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس آٹومیٹک سائیڈ مرر کو ایڈجسٹ کیا۔ اب جیپ کی چھت نظر آرہی تھی۔ عمران کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس نے طاقتور اسنیپر گن کو چھت پر رکھ کر اس کا دستہ اپنے کندھے سے لگا رکھا تھا۔ وہ ٹیلی اسکوپ میں دیکھ کر نشانہ لے رہا تھا۔ وہ بلا کا نشانے باز تھا۔ میں نے اسے سرکس میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر درست نشانہ لگاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ لیکن یہاں معاملہ اور تھا۔ وہ ایک تیز رفتار گاڑی پر سوار تھا اور وہ جس ہدف کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا، وہ بھی متحرک تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پاس صرف ایک موقع تھا۔ اس دور مار رائفل کا صرف ایک راؤنڈ۔ اگلے آٹھ دس سیکنڈ میں اگر یہ راؤنڈ درست فائر ہو جاتا تو ہم ایک بھیانک خطرے سے بچ سکتے تھے۔

دفعتاً میں نے دیکھا کہ ہماری تیز رفتار، جیپ کے سامنے ذرا دائیں جانب دس پندرہ فٹ کی دوری پر چمک کے ساتھ زوردار دھماکا ہوا۔ ایک اونچے قد کی خودرو جھاڑی اپنی جڑوں سے اکھڑ کر فضا میں بلند ہوئی۔ اس جھاڑی کے ساتھ شاید کئی من مٹی بھی اچھلی ہوگی۔ جیپ جیسے لہرا کر رہ گئی۔ میں نے اسے بمشکل سڑک پر رکھا۔ جیپ کے اندر لڑکیاں بری طرح چلائیں۔ جیپ کے اچانک لہراؤ کے سبب جیلانی نشستوں کے درمیان گرا۔

یہ راکٹ فائر ہوا تھا۔ شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اگلا نشانہ سیدھا جیپ پر لگ سکتا تھا۔ یہ اب منٹوں کا نہیں، سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ میں نے سائیڈ مرر میں دیکھا۔ عمران بدستور نشانہ لے رہا تھا۔ ان لمحوں میں اس کا جسم بالکل ساکت ہوگیا تھا جیسے وہ پتھر کا مجسمہ ہو۔ یہ نشانہ

درست لگتا تو اس کی زندگی کا یادگار نشانہ ہوتا اور اگر خطا ہو جاتا تو پھر شاید زندگی ہی نہ رہتی، اس کی نہ ہماری۔ میرے اندازے کے مطابق وہ گاڑی کے ڈرائیور کو نشانہ بنا رہا تھا۔

......صرف ایک موقع تھا، صرف چند سیکنڈ تھے...... ایک بہترین نشانے باز تھا اور ایک مشکل ترین ہدف تھا...... کسی بھی وقت دوسرا راکٹ ہماری اس بلٹ پروف جیپ سے ٹکرا سکتا تھا اور اسے درجنوں قلابازیاں دے سکتا تھا۔ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اب چند سو میٹر کے فاصلے پر مجھے بارڈر کے آثار نظر آرہے تھے۔ دو جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ان میں سے ایک جھنڈا یقیناً میرا سبز ہلالی پرچم تھا۔ مجھے اس جھنڈے تک پہنچنا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اگر ہم مریں تو اس جھنڈے کے سائے میں مریں۔ ہمارا خون ہماری مٹی میں جذب ہو۔ اور ان لمحوں میں مجھے لگا کہ اس بارڈر کے پار ایک ماں کی آغوش ہے۔ مادرِ وطن کی آغوش۔ ہم اس تک پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہمیں چھپا لے...... ہمارے زخمی جسموں کو ڈھانپ لے اور ہماری سرخروئی پر فخر سے ہماری پیشانیاں چوم لے۔

اور زخمی عمران نشانہ لے رہا تھا۔ ہوا عقب سے آرہی تھی اور اس کے بال آگے کی طرف اُڑ رہے تھے...... پھر اس نے ٹریگر دبایا۔ وہ بلا کا نشانے باز تھا...... لیکن...... وہ قسمت کا دھنی بھی تھا۔ بخت کا فرشتہ بھی تو اس کے سر پر سایہ فگن رہتا تھا۔ اس کی بانٹی ہوئی محبتیں اور چاہتیں مشکل میں اس کے لئے ایک نورانی توانائی بن جاتی تھیں۔ میں دیکھ نہیں سکا لیکن جیلانی اور جگت سنگھ نے ٹیلی اسکوپس آنکھوں سے لگا رکھی تھیں۔ ''ویل ڈن...... ویل ڈن۔'' جیلانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

عقب میں کسی خوفناک دھماکے کی آواز آئی اور بہت فاصلے پر کچھ شعلے سے چمکتے دکھائی دیئے۔

''کیا ہوا جیلانی؟'' میں نے پکار کر پوچھا۔

جیلانی سے پہلے ہی جگت بولا۔ ''الٹ گیا جی لانچر...... آگ لگ گئی۔ پچھلی ایک گڈی بھی وجی (ٹکرائی) ہے اس میں۔ وہ بھی درختوں میں وڑ گئی۔ آگ لگ گئی ہے اسے بھی۔ دوسری گڈیاں کچے میں اتر کر آگے آرہی ہیں...... پر اب وہ دور ہیں......'' وہ رواں تبصرے کے انداز میں بول رہا تھا۔ آواز جوش سے کانپ رہی تھی۔

عمران نڈھال سا ہو کر واپس اپنی نشست پر ڈھے گیا۔ کرب کے ساتھ اس کے چہرے پر ایک اطمینان سا بھی تھا۔ خون سے اس کی شرٹ اور کاٹرائے کی براؤن پینٹ سرخ تھی۔ جیلانی نے سن روف کا خلا بند کر دیا۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر عمران کے پاس پہنچوں اور اسے اپنے بازوؤں میں لے لوں۔ میں نے اسٹیئرنگ تھام رکھا تھا اور میری نظریں سڑک پر مرکوز تھیں۔ مجھے آخری تین چار سو گز کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اور یہ کوئی عام فاصلہ نہیں تھا۔ یہ بھی موت کا گھیرا تھا۔ بارڈر پر موجود بی ایس ایف اہلکار جان چکے تھے کہ جو گرے جیپ تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی ہے، اسے روکنا ہے۔ ہر قیمت پر روکنا ہے لیکن اس جیپ کو روکنے کے لئے ان کے پاس پوری تیاری نہیں تھی۔ ان کے پاس چھوٹی بڑی گنیں تھیں اور وہ انہیں مسلسل چلا رہے تھے۔ گرے جیپ کی باڈی اور اسکرینز پر مسلسل چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں اور شدید تھرتھراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ جب کوئی بڑا برسٹ لگتا تھا تو دیوہیکل جیپ جیسے لہرا سی جاتی تھی۔

میں رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ سامنے چیک پوسٹ کا ترنگا نظر آ رہا تھا۔ انڈین فوجی بھاگ بھاگ کر ریت کی بوریوں کے پیچھے پوزیشنیں لے رہے تھے۔ انہوں نے لوہے کے بڑے بڑے، دو پھاٹک بند کر دیئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ جیپ ان مضبوط پھاٹکوں کو توڑ سکے گی یا نہیں اور ٹکرانے کے بعد میں اسے سنبھال پاؤں گا یا نہیں...... مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اگر ان آخری دو تین سو میٹرز میں کوئی راکٹ یا آرٹلری کا گولہ گاڑی سے آ ٹکرایا تو وہ ہمارا تحفظ کر سکے گی یا نہیں...... یا اپنے پہیوں پر رہ سکے گی یا نہیں۔ میں بس اسے بھگاتا جا رہا تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔

لوہے کے گیٹ پچاس ساٹھ میٹر دور رہ گئے تھے تو میں نے اچانک فیصلہ بدلا اور جیپ کو سڑک سے اتار دیا۔ اتنی رفتار سے دوڑتی جیپ کو ناہموار جگہ پر سنبھال کر رکھنا آسان نہیں تھا۔ میں نے اپنی پوری صلاحیت صرف کر دی۔ جیپ کے اندر فاخرہ، مہناز اور ثروت وغیرہ کی آوازوں نے کہرام سا مچا دیا۔ ہر آن یہی لگا کہ جیپ الٹ جائے گی۔ کئی مواقع پر وہ کئی کئی فٹ زمین سے اچھلی اب سامنے پھاٹک نہیں تھے۔ خاردار باڑ تھی، تارکول کے ڈرم وغیرہ تھے اور مسلح سنتری تھے۔ عقب میں بی ایس ایف اور جاوا کی گاڑیاں تھیں اور بے رحم فائرنگ تھی...... پھر فیصلے کا لمحہ آیا۔ جیپ گولی کی رفتار سے خاردار باڑ اور دیگر رکاوٹوں سے ٹکرائی۔ ان کے پرخچے اُڑاتی ہوئی وہ پار ہوئی اور قریباً چالیس پچاس میٹر کے ''نو مین لینڈ'' کو پار کر کے پاکستانی علاقے میں داخل ہوگئی۔

ہمارے پاکستانی علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی پاکستانی پوسٹ کی طرف سے کراس فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ یہ فائرنگ ہم پر نہیں بلکہ انڈین فوجیوں پر ہو رہی تھی۔ ظاہر

ہے کہ بھارتیوں کی طرف سے جو فائر آ رہا تھا، وہ پاکستانی علاقے کی طرف آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، پاکستانی فوجیوں کو خاص ذرائع سے یہ اطلاع بھی ہو چکی تھی کہ گرے جیپ میں اپنے لوگ آ رہے ہیں۔

دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھی۔ ہم پاکستانی علاقے میں یوں داخل ہوئے جیسے کبڈی کا کوئی ماسٹر کھلاڑی، مخالف کھلاڑیوں سے لڑنے بھڑنے اور انہیں پچھاڑنے کے بعد فاتحانہ ہاتھ اٹھاتا ہوا اپنی حدود میں پہنچ جاتا ہے...... میں جیپ کو قریباً نصف کلومیٹر تک اسی طرح بھگاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پاکستانی فوجیوں اور رینجرز نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم رک گئے۔

کیپٹن رینک کے ایک آفیسر نے اندر جھانکا۔ جیلانی نے باہر نکل کر سرگوشیوں میں آفیسر سے بات کی۔ آفیسر نے فوراً ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت دی اور اس کے ساتھ ہی وائرلیس پر آگے والی پوسٹوں کو ہمارے لئے ہدایات دینے لگا۔

گرے جیپ پھر روانہ ہوئی۔ اردگرد کے پاکستان فوجی اور رینجرز اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ہم آگے بڑھتے گئے۔ یہ اپنی زمین تھی، یہ اپنی ہوا تھی، اپنے کھیت، اپنے درخت اور ہم زخموں سے چُور...... اور ہم سب سے زیادہ چُور ہمارا ہیرو...... ہمارا عمران۔ ڈاکٹر مہناز مسلسل اس کا خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''گھبراؤ نہ یارو...... اتنی جلدی نہیں مروں گا۔ لیکن اگر تم نے ایسے چہرے بنائے رکھے تو پھر ضرور کچھ سوچنا پڑے گا۔''

مہناز نے اس کی بات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تابش صاحب! نزدیک ترین اسپتال کون سا ہے؟''

جیلانی نے کہا۔ ''ہم اسپتال کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ وہ دیکھیں سامنے ایمبولینس کھڑی ہے۔ وہ ہمیں گائیڈ کرے گی۔''

یہ ایک فوجی ایمبولینس تھی۔ ہماری جیپ قریب پہنچی تو ایمبولینس نے ہماری راہنمائی شروع کر دی۔ اس کا سائرن پوری آواز سے بج رہا تھا۔

کچھ آگے جا کر ڈاکٹر مہناز میری طرف آئی اور میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''تابش! عمران صاحب کی حالت زیادہ اچھی نہیں۔ انہیں ایمبولینس میں شفٹ کرنا چاہئے وہاں آکسیجن وغیرہ بھی ہوگی۔''

ہم نے ایمبولینس کے قریب پہنچ کر اسے روکا۔ یہ ایک بڑی گاڑی تھی۔ ہم نے عمران

کے علاوہ زخمی شوٹر کو بھی اس ایمبولینس میں منتقل کر دیا۔ میں عمران کے ساتھ تھا۔ عمران کا چہرہ خون کے بہاؤ کے سبب زرد ہو گیا تھا لیکن اس کا حوصلہ اسی طرح جوان تھا۔ اسے ایمبولینس کے اسٹریچر پر لٹایا گیا تو کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ لیٹ گیا۔ میں نے اس کا زخمی بازو والا ہاتھ تھام لیا۔ میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ وہ بولا۔ ''زیادہ بیوی بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔ بابا جلالی دیکھو کہاں پہنچ کر واپس آ گیا ہے۔ مجھے تو پھر ایک گولی لگی ہے۔''

میں نے اس کا ہاتھ بھینچ لیا۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ہوا تو پہلے مجھے ہوگا۔''

وہ مسکرایا۔ ''ساری بیویاں ایسے ہی کہتی ہیں۔ بعد میں رنگ برنگے کپڑے پہنتی ہیں اور برسی کا دن بھی بھول جاتی ہیں۔ بہرحال، میں تمہیں ایسے کمینے پن کا موقع دینے والا نہیں ہوں۔ خاطر جمع رکھو۔''

''جاوا بچ گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں...... لیکن تمہارے لئے ایک چیز رکھی ہوئی ہے میں نے۔ جاوا کی جیپ میں ہی پڑی ہے۔ آخری سیٹ کے نیچے، بائیں طرف۔ ابھی اسے نکال لینا۔ مجھے تو اب شاید دو چار دن اسپتال کی دال روٹی کھانی پڑے گی۔''

''آٹھ دس دن کھا لینا مگر ٹھیک ہو جانا۔'' میں نے اس کے گہرے زخم سے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔

ایک فوجی مسلسل عمران کو آکسیجن ماسک لگانا چاہ رہا تھا لیکن عمران نے یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ دوسری طرف ڈاکٹر مہناز، زخمی شوٹر رفیع کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا اور اس کی سانس بھی اکھڑ رہی تھی۔ آکسیجن اسے لگا دی گئی۔

ہم ایک عارضی فوجی اسپتال میں پہنچے۔ ایک سرجن نے ہنگامی طور پر جیپ کے اندر ہی عمران کا معائنہ کیا۔ اسے کچھ طبی امداد دی گئی۔ اسے خون کی فوری ضرورت تھی۔ یہ خون مہیا ہو گیا اور ایمبولینس کے اندر ہی عمران کو لگا بھی دیا گیا۔

اس دوران میں عمران نے ایک فون کال بھی موصول کی۔ پتا نہیں وہ کس سے بات کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''جی جناب! ٹارگٹس تقریباً اچیو ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز کو واپس لے آئے ہیں۔ تابش اور اس کی کزن ثروت بھی بخیریت آ گئے ہیں۔ ثروت کا شوہر یوسف پہلے ہی ایک ڈیل کے ذریعے پاکستان آ چکا ہے...... یس سر...... یس سر۔ دو لڑکیاں بھی ہیں۔ فاخرہ اور اس کی سہیلی۔ ممبئی کے فلمی مافیا کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھیں۔ ایک تیسری بھی تھی

سویٹی...... ایشوریا کے نام سے جانی جاتی تھی۔ وہ نہیں آ سکی۔ اسے ریسٹ ہاؤس میں گولی لگ گئی تھی......''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ غالباً عمران اور اس کی ٹیم کی کارکردگی کو سراہا جا رہا تھا۔ عمران نے جواب میں دو بار تھینکس کہا اور کال ختم ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر نے اصرار کر کے عمران کو آکسیجن ماسک چڑھا دیا۔

گرے جیپ ہمارے ساتھ ہی یہاں پہنچی تھی۔ اس میں سے بھی زخمیوں کو نکال کر اس عارضی اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ باقی مرد و زن کو آرمی والوں نے اپنی حفاظتی تحویل میں لے لیا۔ ان میں جگت سنگھ بھی شامل تھا۔ اس دوران میں مجھے عمران کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ جیپ میں میرے لئے ایک چیز ہے۔

میں نے جیلانی کو اس بارے میں بتایا۔ وہ بولا۔ ''مجھے بھی کہہ رہے تھے کہ جاوا تو انڈیا میں رہ گیا ہے لیکن میں اس کی ایک خاص چیز لے آیا ہوں۔ اس کے بغیر وہ بیکار ہی ہے۔''

ہم دونوں جیپ میں پہنچے۔ جیپ کی باڈی پر ان گنت گولیوں کے نشان تھے۔ لیکن یہ گولیاں جیپ کے اندر ''پینی ٹریٹ'' نہیں کر سکی تھیں۔ ڈان نے اپنے لئے جو سخت ترین حفاظتی انتظام کر رکھا تھا، وہ آج ہماری زندگیاں بچنے کا سبب بنا تھا۔ اس یونیک جیپ کو آرمی والوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جیپ کے اندر زخمیوں کے خون کے دھبے تھے۔ سب سے زیادہ خون اس نشست پر تھا جہاں عمران بیٹھا تھا۔ میں اس خون سے نگاہ چراتا ہوا، پچھلی نشستوں تک پہنچا۔ ہم دونوں نے نیچے جھانکا۔ شروع میں تو کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر ایک فٹ بال سا نظر آیا۔ جیلانی نے اسے باہر نکالا۔ ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ یہ جاوا کا سر تھا۔ اسے ٹھوڑی کے بالکل نیچے سے کاٹا گیا تھا۔ سیاہی مائل رگیں لٹک رہی تھیں۔

''او گاڈ!'' جیلانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میرے جسم میں بھی سرد لہر دوڑ گئی۔ تاہم اس لہر میں خوشی اور اطمینان کا ایک بے مثل احساس بھی تھا۔ جاوا کی منحوس آنکھیں کھلی تھیں۔ چربی دار جبڑا ذرا لٹکا ہوا تھا۔ سانولے سفاک چہرے پر کئی گہری خراشیں تھیں۔ لگتا تھا کہ آخری وقت میں اس نے کافی مزاحمت کی۔ پاکستانی ہیرو اور بھارتی ولن کا یہ مقابلہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا مگر نتیجہ ہمارے سامنے تھا۔ لگتا تھا کہ جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا اور انڈیا کے اس نامی گرامی ڈان کو چند سیکنڈ کے اندر موت سے ہمکنار کر دیا گیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا، یہ واقعی کسی خون خوار ریچھ کا سر ہے جو ان گنت دوشیزاؤں کی رگِ عصمت سے خون پی چکا ہے اور گوبند سنگھ جیسے بے شمار کڑیل جوان اس کی بربریت

کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اب اس کا سر خاک وخون میں لتھڑا ہمارے سامنے پڑا تھا۔ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں اقبال، ابرار صدیقی، پورب کمار، قربان علی اور میڈم صفورا وغیرہ کے چہرے نگاہوں میں گھوم گئے۔ ہم نے ان کے خون کا بدلہ لے لیا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ دھوئیں والے بموں سے حملہ کرنے سے تھوڑی دیر پہلے عمران نے جگت سے اس کی نہایت تیز دھار کرپان بھی مانگی تھی۔ یہی لگتا تھا کہ یہ اُس وزنی کرپان کی کارروائی ہے۔

پاس ہی ریگزین کا ایک بیگ تھا جس میں آٹومیٹک رائفلوں کا بچا کھچا ایمونیشن تھا۔ جیلانی نے یہ ایمونیشن جیپ کے فرش پر الٹا اور انڈیا کے خطرناک ڈان کا خون آلود سر اس بیگ میں ڈال کر زپ کھینچ دی۔

''ویل ڈن میرے یار!'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''کلیجا ٹھنڈا کیا تو نے۔ اب زندگی کی طرف بھی واپس آ جانا۔ ہر مصیبت کو شکست دیتا ہے تُو، اب اسے بھی دے دینا۔ ہمیں مایوس نہ کرنا۔ ہمیں بڑا مان ہے تجھ پر۔''

باہر کھڑے فوجی آفیسر دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ریگزین کے بیگ میں کیا رکھا ہے۔ جیلانی نے ایک طرف جا کر ان سے چند سرگوشیاں کیں اور بیگ ان کے حوالے کر دیا۔ دیکھنے میں بالکل یہی لگتا تھا کہ بیگ میں کوئی فٹ بال یا پھر تربوز قسم کی شے ہے جو ہم تحفے کے طور پر سرحد پار سے لائے ہیں۔

سنگین ترین صورتِ حال کے باوجود میں عمران کے فقرے سے محظوظ ہوا۔ اس نے کیپٹن جیلانی سے کہا تھا۔ ''جاوا، انڈیا میں ہی رہ گیا ہے لیکن اس کی ایک شے میں لے آیا ہوں۔ اس کے بغیر وہ تقریباً بیکار ہی ہے۔''

''ویل ڈن میرے یار!'' میں نے ایک بار پھر دل ہی دل میں کہا۔

ایک خوش شکل پاکستانی فوجی آفیسر میرے پاس آیا۔ وہ مکمل یونیفارم میں تھا۔ اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''کیپٹن ڈاکٹر شرجیل احمد۔''

''جی میں تابش ہوں۔ عمران صاحب کا ساتھی۔''

''مجھے معلوم ہے بلکہ ہم نے سب کچھ دیکھا ہے۔ گرے جیپ آپ ہی ڈرائیو کر رہے تھے نا؟''

''جی ہاں۔''

''آپ نے کمال کیا مسٹر تابش! ویری ویل ڈن۔ ہماری نظریں ٹیلی اسکوپ کے ذریعے آپ پر ہی جمی تھیں۔ آپ نے بڑے مشکل حالات میں جیپ کو سنبھالے رکھا۔ خاص طور پر کچے پر اترنے کے بعد۔ وہ بہت رفتار تھی۔''

''شکریہ۔''

''اور کچے پر اترنے کا آپ کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ وہ دو پھاٹک تھے اور آپ انہیں توڑ نہیں سکتے تھے۔ فرض کیا ایک ٹوٹ بھی جاتا تو آپ کی رفتار اتنی کم ہو جاتی کہ دوسرا آپ کا راستہ روک لیتا۔''

''عمران صاحب کا کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''عمران صاحب ایمبولینس میں ہیں۔ لیکن اب ان کے بارے میں صورتِ حال کچھ تبدیل ہوئی ہے۔ ہم ہیلی کاپٹر منگوا رہے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''ان کی حالت اتنی اچھی نہیں۔ انہیں جلد از جلد کراچی پہنچنا چاہئے۔ باقی دونوں زخمیوں کو بھی ارجنٹ ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔''

ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ عمران کے لئے میری تشویش بڑھ رہی تھی اور کچھ یہی کیفیت باقی ساتھیوں کی بھی تھی۔

○......❖......○

ہم گیارہ بجے کے لگ بھگ کراچی پہنچ گئے۔ ہیلی کاپٹر سے عمران اور دیگر دونوں زخمیوں کو جدید ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور سر آغا خان اسپتال پہنچایا گیا۔ میں اس تمام عرصہ عمران کے ساتھ رہا۔ وہ ہوش میں تھا اور ہمیشہ کی طرح حوصلہ مند بھی۔ بہرحال اس کے منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا تھا اور بلڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ اب بھی باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑنا چاہ رہا ہے مگر فی الحال حالت اجازت نہیں دے رہی تھی۔

جب وہ لوگ اسے اسٹریچر پر بھگاتے ہوئے آپریشن تھیٹر کی طرف لے جا رہے تھے، میں بھی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر مجھے روک دیا گیا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا گیا۔ وہ اسٹریچر کو دوڑاتے ہوئے بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ میں وہیں ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ''عمران! مجھے چھوڑنا مت...... مجھے چھوڑنا مت۔ نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' میں نے دکھ کے عالم میں زیر لب کہا اور میری آنکھوں سے گرم پانی کے سوتے پھوٹ نکلے۔

شام چار بجے کے قریب ہمارے باقی ساتھی بھی بذریعہ سڑک کراچی پہنچ گئے۔ فوجی حکام کی ہدایت پر انہیں کلفٹن میں ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور وہاں ان کی سیکیورٹی رینجرز کو سونپ دی گئی۔ میں ہوٹل پہنچا تو مین گیٹ پر میڈیا کے لوگوں کا ہجوم نظر آیا لیکن انہیں اندر نہیں جانے دیا جا رہا تھا۔

ہوٹل کی لابی میں ہی میری ملاقات جگت سنگھ سے ہوگئی۔ اس کے ایک ہاتھ اور چہرے پر معمولی زخم تھے۔ ان کی بینڈیج ہو چکی تھی۔ اس نے سب سے پہلے مجھ سے عمران کے بارے میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا۔ ''اس کا دوسرا آپریشن ہو رہا ہے۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کے لئے دعا کرو۔''

''آپاں کا تو رواں رواں اس کے لئے دعا کرتا ہے بادشاہ زادے۔ وہ شیر مرد ہے۔ گیدڑوں کے کاٹنے سے اسے کچھ نہیں ہوگا۔ واہگرو کی کرپا ہوگی۔''

''ثروت کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''چھوٹی وہ سامنے اٹھارہ نمبر کے کمرے میں ہے۔ بہت رو رہی ہے اس نے ابھی کہیں فون کیتا ہے۔ اس کو پتا لگیا ہے کہ اس کی نکی بہن کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور اسے کسی باہر کے ملک لے جایا گیا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ ثروت کو نصرت کی حالت کا پتا چل گیا ہے۔ یقیناً یہ اس کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ یعنی ایک بہت بڑی مصیبت سے نکلنے کے فوراً بعد وہ ایک اور بڑے صدمے کا شکار ہوگئی تھی۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ ڈاکٹر مہناز نے دروازہ کھولا۔ مہناز کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ اس کے ہاتھ میں خالی سرنج تھی۔ غالباً اس نے ابھی ثروت کو کوئی انجکشن دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر مہناز باہر نکل گئی تاکہ میں اکیلے میں ثروت سے بات کر سکوں۔

ثروت صوفے پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنا ماتھا صوفے کے ہتھے پر ٹیک رکھا تھا۔ وہ ہولے ہولے رو رہی تھی۔

میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر ایک دم اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ جیسے میں نے اسے چھوا نہ ہو، اس کے کندھے پر انگارہ رکھ دیا ہو۔

''کیا بات ہے ثروت؟''

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں...... پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔ جو کچھ ہو رہا ہے میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے...... آپ کی نیت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ اسپتال میں ہے۔ وہ مر رہی ہے۔ اس کا کچھ نہیں ہو سکے گا۔ کچھ نہیں۔'' وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

''ثروت! خود کو سنبھالو۔ یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ ہوٹل ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ اسے پھر آسٹریا لے گئے ہیں۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے...... ابھی جانا ہے۔''

''سب کچھ ہو جائے گا ثروت! تم حوصلہ رکھو۔''

''بس آپ یہاں سے چلے جائیں۔ پلیز، میرے کمرے سے چلے جائیں۔''

پھر میرے اٹھنے سے پہلے ہی وہ خود اٹھی اور بھاگ کر اٹیچ کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔

میں سکتہ زدہ بیٹھا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لی اور اٹھ کر مردہ قدموں سے باہر آ گیا۔ سامنے جیلانی آتا نظر آیا۔ اس کا زخمی بازو اب اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اس نے بھی سب سے پہلے عمران کے بارے میں پوچھا۔ میں نے وہی بتایا جو ابھی جگت کو بتایا تھا۔ جیلانی بھی میرے ساتھ ہی اسپتال میں جانا چاہتا تھا مگر یہاں مقامی حکام کی ایک ہنگامی میٹنگ ہو رہی تھی۔ دو تین فوجی افسران بھی اس میں شریک تھے۔ جیلانی کو یہاں سارے واقعے کی رپورٹ دینا تھی۔ جیلانی نے مجھے ایک اخبار بھی دکھایا۔ شام کے اس اخبار میں دو خبریں اہم تھیں۔ پہلی، انڈین ڈان جاوا کے قتل کی خبر تھی۔ لکھا گیا تھا کہ جاوا کے قتل پر ممبئی میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ وہاں کی انڈر ورلڈ ہل کر رہ گئی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ جاوا کو بہیمانہ طریقے سے قتل کرنے والا وہی میجر کا گروپ ہے جو اس سے پہلے بھی انڈیا میں کئی اہم لوگوں اور خاص طور سے حساس ادارے کے افراد کو قتل کر چکا ہے۔ اس قتل کے بعد انڈیا کے نیوز چینلز پر بہت ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔

دوسری خبر کھوکھرا پار بارڈر پر دو طرفہ فائرنگ کی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ یہ فائرنگ قریباً دس منٹ جاری رہی۔ اشتعال انگیزی انڈین فورسز کی طرف سے ہی ہوئی۔ پاکستانی فوجیوں نے اس کا جواب دیا۔ کسی Casualty کی اطلاع نہیں تھی۔ ہاں، خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس فائرنگ کے دوران میں ایک گاڑی انڈین فائرنگ سے بچتی بچاتی پاکستانی علاقے میں داخل ہوگئی۔ اس مکمل بلٹ پروف گاڑی کو قبضے میں لے لیا گیا ہے۔ گاڑی یا گاڑی سواروں کے

بارے میں کوئی تفصیل نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ''جیلانی! میں دوبارہ اسپتال جا رہا ہوں۔ تم ذرا ثروت کا خیال رکھو۔ وہ بہت تناؤ میں ہے۔''

''ہاں، مجھے بھی لگ رہا ہے لیکن ابھی ان کے شوہر بھی تو پہنچ رہے ہیں۔'' جیلانی نے اطلاع دی۔

''کیا مطلب؟''

''ڈاکٹر مہناز بتا رہی تھیں کہ ان کے شوہر یوسف صاحب سے رابطہ ہو گیا ہے۔ وہ لاہور سے آنے والی فلائٹ پر آ رہے ہیں۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

جیلانی میٹنگ میں چلا گیا۔ میں اسپتال روانہ ہوا تو جگت سنگھ بھی ساتھ ہولیا۔ ہم سب کے دل عمران کی حالت کے لئے دھڑک رہے تھے۔ اسپتال میں کافی لوگ آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھے۔ یہ سب عمران سے تعلق رکھتے تھے۔ آرمی کے کچھ لوگ بھی دکھائی دیئے۔ پتا چلا کہ عمران کا دوسرا آپریشن مکمل ہو گیا ہے اور اسے ''آئی سی یو'' میں منتقل کیا جانے والا ہے۔ کیپٹن شرجیل بھی یہاں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ ایک نہیں دو گولیاں تھیں جو بالکل پاس پاس لگی تھیں۔ ایک گولی زیادہ آگے نہیں جا سکی اور ایک ٹوٹی ہوئی پسلی کے قریب سے نکال لی گئی۔ دوسری گولی نے زیادہ نقصان کیا۔ اس نے ایک پھیپھڑے کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی کو بھی متاثر کیا ہے۔ اگلے پندرہ بیس گھنٹے عمران کی صحت یابی کے لئے بہت اہم ہیں۔

''وہ ہوش میں ہے کیپٹن؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، انہیں ٹرنکولائزرز کے زیر اثر رکھا گیا ہے۔ یہی ان کے لئے بہتر ہے۔''

جیلانی بھی میٹنگ سے فارغ ہو کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ہم سب عمران کے لئے بے چین تھے۔

رات دس بجے کے قریب کیپٹن شرجیل ہمیں زبردستی ہوٹل واپس لے آیا تا کہ ہم کچھ کھا پی سکیں اور ذرا آرام کر لیں۔ ہوٹل کے برآمدے میں ہی میری ملاقات اس شخص سے ہو گئی جس کا سامنا کرنا میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ یہ یوسف تھا۔

انڈیا سے رفو چکر ہونے کے بعد وہ پہلی بار اپنی صورت دکھا رہا تھا۔ بہرحال، اس کے چہرے پر کسی طرح کی ندامت یا جھجک نہیں تھی۔ اس کی اونچی لمبی ناک لشکارے مار رہی تھی اور وہ بہترین تراش کے لباس میں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ ''کیا حال ہے آپ

کے دوست عمران صاحب کا؟'' وہ مصنوعی تفکر سے بولا۔

''آپریشن ہو چکا ہے، حالت بہتر ہو رہی ہے۔'' میں نے رسمی جواب دیا۔

''آپ کے ساتھیوں اور میڈم صفورا وغیرہ کا سن کر بہت بہت افسوس ہوا۔ شکر ہے کہ اللہ نے آپ کی جان بچالی اور آپ پھر سے ہمارے درمیان ہیں۔''

''ہم تو پہلے بھی سب کے درمیان ہی تھے۔ آپ کی خاطر نکلنا پڑا۔''

''بس اللہ حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔''

''بے شک...... مگر اپنے بچاؤ کے لئے آپ نے خود بھی زبردست کوشش کی۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''میں مسلسل پاکستانی سفارت خانے سے اِن ٹچ رہا ہوں۔ پرسوں میں خود انڈیا جانے والا تھا۔ بہرحال تھینکس گاڈ! آپ نوک سلامتی سے واپس آ گئے۔ میں اور ثروت خاص طور سے آپ کے بہت زیادہ ممنون ہیں۔ کاش وہاں وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ مجھے زندگی بھر اس کا افسوس رہے گا۔''

وہ بہروپیا اس واقعے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جب اس نے باقاعدہ مجھ پر گولی چلائی تھی۔

مجھے اندیشہ تھا کہ میں کہیں طیش میں اس سے کچھ کہہ نہ بیٹھوں۔ میری مشکل ایک خوش پوش لڑکی نے آسان کی۔ وہ تیزی سے میری طرف آئی۔ وہ عمران کی ساتھی شاہین تھی۔ وہ آتے ساتھ ہی میرے بازو سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ رونے والی کوئی بات نہیں۔ بس دعا کرو وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

''میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں تابش بھائی! پلیز مجھے وہاں چلیں۔''

''ابھی تو میں بھی اس سے نہیں مل سکا۔ لیکن امید ہے کہ کل صبح تک ہم اسے دیکھ سکیں گے اور شاید بات بھی کر سکیں گے۔ کیپٹن شرجیل بتا رہا تھا کہ اس کے دونوں آپریشن کامیاب رہے ہیں۔''

اسی دوران میں مجھے سرکس کے مالک جان محمد صاحب اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگ کر بھینچا اور تھپکی دی۔ میرے شانے تھام کر بولے۔ ''تم لوگوں نے انڈین ایجنسیوں کو یادگار سبق سکھایا ہے۔ وہاں کے ٹی وی چینلز پر کہرام مچا ہوا ہے۔ جاوا کی موت کی خبر بھی بار بار نشر ہو رہی ہے۔ انڈین فوج کے ذرائع اپنے اصل نقصان کو چھپا رہے ہیں پھر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ درجنوں مرے ہیں۔ کئی گاڑیاں تباہ ہوئی ہیں۔''

تب انہوں نے عمران کی حالت کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ آپریشنز کے بعد وہ بہتر ہے۔ میں نے شاہین سے فرح اور عاطف کے بارے میں پوچھا۔ شاہین ایک دم چپ ہو کر جان محمد صاحب کی طرف دیکھنے لگی۔ میرے ذہن میں اَن گنت اندیشے کلبلائے اور جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ”کیا ہوا؟ کہاں ہیں وہ؟“

”پریشانی کی بات نہیں۔ وہ خیریت سے ہیں۔“ جان صاحب نے کہا۔ ”لیکن...... پاکستان میں نہیں ہیں۔“

”نہیں ہیں؟“

”میں نے پانچ دن پہلے ان دونوں کو تمہارے بچے سمیت دبئی بھجوا دیا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا ہے ان کے حق میں۔ اقبال کے قتل کے بعد یہاں جاوا کے بندوں کے حوصلے بڑے بڑھ گئے تھے۔ وہ ہر جگہ دندنا رہے تھے۔ سلطان چٹا نے ایک روز عاطف کو مال روڈ کے ایک جم سے نکلتے دیکھ لیا اور اسے للکارا۔ عاطف بڑی مشکل سے بچ کر نکلا۔ میں سمجھ گیا کہ اب تمہارے بھائی بہن کا یہاں رہنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ میں نے بالو سمیت انہیں دبئی بھجوا دیا ہے۔ بالو کی آیا صفیہ اور زری بھی ساتھ ہی گئی ہیں۔ ہو گے تو کل تمہاری ان سے بات بھی کروا دوں گا۔“

اس دوران میں جان محمد صاحب کے فون پر بیل ہوئی۔ انہوں نے اسکرین دیکھی اور ہولے سے بولے۔ ”لو بھئی، بڑی لمبی عمر ہے ان دونوں کی۔ انہی کی کال ہے۔“

پہلے جان صاحب نے خود تھوڑی سی بات کی۔ اس کے بعد فون میری طرف بڑھا دیا۔

”ہیلو۔“ مجھے عاطف کی آواز سنائی دی۔

”میں تابش ہوں عاطف...... کیسے ہو تم؟“

”تابش بھائی جان! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ ہم تو بہت پریشان تھے۔ ٹی وی پر بڑی بری خبریں آ رہی تھیں۔ عمران بھائی کے بارے میں انڈیا کے ٹی وی چینلز پر کہا جا رہا ہے کہ ان کا تعلق فوج سے رہا ہے اور وہ ایک گروہ بنا کر انڈیا میں لوگوں کو ٹارگٹ کرتے رہے ہیں۔ طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ فرح کا تو رو رو کر برا حال ہے۔ لیں اس کو اپنی آواز سنائیں۔“

دو سیکنڈ بعد فرح کی سسکتی ہوئی صدا اُبھری۔ ”بھائی جان! آپ سچ بتائیں آپ پاکستان میں ہیں نا؟ آپ ٹھیک ہیں نا؟ زخمی تو نہیں ہیں آپ؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کوئی درجن بھر سوال کر دیئے۔

میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ میں خیریت سے پاکستان پہنچ گیا ہوں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر میرے پاس پہنچ جائے اور مجھ سے لپٹ کر اپنے دل کی بھڑاس آنکھوں کے راستے نکال دے۔ میں اسے کسی بچی کی طرح پچکارتا رہا، سمجھاتا رہا۔ اس نے مجھے چھوٹے بالو کی آواز سنائی۔ اس کی توتلی زبان...... اس کی پیاری سی کلکاری۔ وہ سلطانہ کا جگر گوشہ تھا۔ اس کے جسم کا حصہ تھا۔ میں جب بھی اس کی آواز سنتا تھا، میرے سارے بھولے بسرے زخم لَو دینے لگتے تھے۔

عاطف اور فرح نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں دبئی میں خود کو بالکل محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔ جان محمد صاحب نے ان کے لئے اچھی سیکیورٹی بھی مہیا کر رکھی ہے۔ ان دونوں کو عمران کے زخمی ہونے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اس کے لئے بے حد فکرمند تھے۔ عمران بھائی...... عمران بھائی کہتے ان کی زبان نہیں سوکھتی تھی۔ میں نے ان کو عمران کے بارے میں حتی الامکان تسلی دی اور یہ بھی کہا کہ یہاں کے معاملات سے فارغ ہو کر میں بہت جلد ان سے ملنے کے لئے آ رہا ہوں۔

شاہین تو فوراً اسپتال جانا چاہ رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ابھی کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے اور جیلانی نے متعلقہ ڈاکٹرز سے فون پر رابطہ رکھا ہوا ہے۔ وہ صورتِ حال سے آگاہ رکھے ہوئے ہیں۔

وہ جو ہمہ وقت عمران سے دست و گریباں رہتی تھی اس وقت یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ جیسے اُڑ کر اس تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ہم نے جیسے تیسے رات گزاری۔ اس دوران میں بھی ڈاکٹر شرجیل سے میری بات ہوتی رہی۔ آخری دو گھنٹوں میں ڈاکٹر بھی شاید کچھ دیر کے لئے سو گیا تھا۔ ہم چھ بجے ہی ہوٹل سے نکل کر اسپتال روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں میرے ساتھ جگت، جان محمد صاحب اور شاہین بھی تھے۔ شاہین کی خوب صورت آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ وہ غمزدہ حسن کا نمونہ نظر آتی تھی۔ پچھلے تین چار ماہ میں اس کے نقوش میں کچھ اور بھی نکھار آیا تھا۔ شبنم سے دھلے دھلائے پھول جیسا چہرہ اور نہایت متناسب جسم...... ترشے ہوئے نفیس بال اس کے چہرے پر بہت جچتے تھے۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ Arcobat والا جاب مکمل طور پر چھوڑ چکی تھی۔ یوں اس کی شخصیت میں سنجیدگی اور وقار کا تناسب کچھ بڑھا تھا۔

ہم اسپتال پہنچے تو سب سے پہلے جیلانی ہی نظر آیا۔ اس کا اڑا اڑا سا رنگ دیکھ کر میرا کلیجا جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ ”خیریت ہے جیلانی؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے جی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہم سے بہت کچھ چھپایا گیا

ہے۔ عمران صاحب کی حالت کل شام سے ہی اچھی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے راتوں رات انتظام کیا ہے اور انہیں پاکستان سے لے گئے ہیں۔''

''پاکستان سے لے گئے ہیں؟'' میں بھونچکا رہ گیا۔

''جی ہاں، انہیں اسپیشل انتظام کے ذریعے میونخ روانہ کر دیا گیا ہے۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ رات نو بجے ہی سرجنز نے کہہ دیا تھا کہ ان کی زندگی بچانے کے لئے انہیں فوراً بیرونِ ملک بھیجنا پڑے گا۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے وہ کراچی ایئرپورٹ سے امارات کی پرواز کے ذریعے روانہ ہو گئے ہیں۔ دو ڈاکٹروں کی ٹیم بھی یہاں سے ان کے ساتھ گئی ہے۔''

میں بے دم سا ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اردگرد کی ہر شے گھومتی محسوس ہوئی۔ ایک دم شور سا اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ شاہین ایک تپائی سے ٹکرانے کے بعد فرش پر گری تھی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

''شاہین......شاہین!'' میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بند اور چہرہ ہلدی تھا۔

دو نرسیں بھاگی ہوئی آئیں۔ ایک ملازم اسٹریچر لایا۔ شاہین کو اسٹریچر پر لٹا کر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔

میرا اپنا سر گھوم رہا تھا۔ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ شام کے بعد تو ہمیں کچھ اور صورتِ حال بتائی گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ آپریشنز کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی دوران میں پژمردہ ڈاکٹر شرجیل بھی نظر آ گیا۔ میں نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ ''یہ ہم کیا سن رہے ہیں ڈاکٹر......عمران کہاں ہے؟''

''آپ ٹھیک سن رہے ہیں تابش صاحب! انہیں ایمرجنسی میں باہر بھیجا گیا ہے اور یہ شکر کا مقام ہے کہ راتوں رات اس کا انتظام ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے بہت بروقت فیصلہ کیا ہے۔ یہاں علاج بہت مشکل تھا۔ بیس تیس گھنٹوں کے اندر زندگی داؤ پر لگ سکتی تھی۔ ان کے اسپائنل میرو میں سوزش پیدا ہو رہی تھی۔''

''لیکن آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ انہیں لے جایا جا رہا ہے؟ ہم انہیں مل لیتے، ایک بار دیکھ لیتے۔''

''یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ وہ بے ہوش تھے۔ ویسے بھی سب کچھ آناً فاناً ہوا، یہ ایک عام فلائٹ تھی۔ اس میں ہنگامی طور پر خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ آپ کو پتا ہی ہو گا، دو سینئر

ڈاکٹرز بھی ساتھ گئے ہیں۔ اب امید ہے کہ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں تابش صاحب! ہی از اے لکی مین۔ ورنہ اتنی جلدی یہ سب کچھ ہونا ممکن نہیں تھا۔''

اسی اثنا میں مزید ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔ سب اس ڈرامائی تبدیلی پر ششدر تھے۔

پندرہ بیس منٹ بعد شاہین کو ہوش آ گیا۔ وہ ایمرجنسی وارڈ کے بستر پر تھی۔ اس کی پیشانی پر ایک نیلگوں گومڑ نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھ تھام کر سسکنے لگی۔ ''وہ بچ جائے گا نا تابش بھائی؟''

''اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔ ''وہ ایک فائٹر ہے۔ لڑنا جانتا ہے۔ وہ اپنی تکلیف سے بھی لڑے گا اور شکست دے گا۔''

''یہاں اس کا علاج کیوں نہیں ہو سکا؟ اس کا مطلب ہے، اس کی حالت سیریس ہے؟''

''میری بات کیپٹن ڈاکٹر شرجیل سے ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فی الحال حالت سیریس نہیں تھی۔ لیکن ڈر تھا کہ اگلے ایک دو دن میں ہو سکتی ہے۔ کیپٹن کا کہنا ہے کہ عمران کا باہر جانا اس کے لئے بہت اچھا ثابت ہو گا۔ علاج کے بعد اس کی بحالی میں بھی زبردست مدد ملے گی۔''

''میں تو اسے دیکھ بھی نہ سکی۔ سوری بھی نہ کہہ سکی۔ کتنی بری ہوں میں۔ آخری بار کتنا لڑی ہوں اس سے۔ یہ جانے بغیر کہ وہ زخمی ہے، انڈینز کے گھیرے میں ہے، لڑ رہا ہے۔''

میں زبردستی مسکرایا۔ ''تمہیں سوری کہنے اور پھر سے لڑنے کا پورا موقع ملے گا۔ اب خود کو سنبھالو۔ ورنہ ہم دوہری مشکل کا شکار ہو جائیں گے۔''

اس نے اپنے ہونٹ بھینچ کر سسکیاں روکنے کی کوشش کی۔ پھر اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر کچھ مڑے تڑے نیلے نوٹ نکالے۔ یہ سات آٹھ ہزار روپے تھے۔ شاید اس نے اپنے روزمرہ رچ سے بچائے ہوئے تھے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے یہ میرے حوالے کئے اور بولی۔ ''پلیز آپ اس کے لئے کوئی صدقہ وغیرہ دے دیں۔ ابھی اسی وقت۔ خود جائیں یا کسی کے ذمے لگا دیں......پلیز۔''

میں نے روپے اس سے لے کر جیب میں رکھ لئے۔ دل کے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ پیار کی اصل حقیقت کا پتا، مشکل اور تکلیف کے وقت چلتا ہے۔ جذبوں کی پرکھ آزمائش کی کسوٹی پر ہی ہوا کرتی ہے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اُڑ کر عمران کے پاس پہنچ جاؤں لیکن یہ سب کچھ اتنا

آسان نہیں تھا۔سفری کاغذات کی تیاری میں ہی کئی دن لگ سکتے تھے۔اب کراچی میں رکنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ہمیں لاہور جانا تھا۔اسپتال چھوڑنے سے پہلے ہم نے ان دوافراد کی تیمارداری کی جوعمران کے ساتھ ہی زخمی ہوئے تھے اور اب اسی اسپتال میں زیرِعلاج تھے۔وہ دونوں اب رُوبہ صحت تھے۔ان میں سے ایک تو وہی ماسٹر جواہر تھا۔ممبئی چھوڑنے کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا،اس کا اصل ذمے دار تو یہی شخص تھا۔اس نے اپنی محبوب بیوی سریتا کو بتانے کے لئے ہمیں ایک ایسا دھوکا دیا جس نے ہم سب کو جاوا اور بی ایس ایف کے خونی چنگل میں پھنسا دیا۔ابرار صدیقی،قربان علی،سویٹی اور میڈم صفورا سمیت کئی ساتھیوں کی جان گئی اور عمران بھی شدید زخمی ہوا اس سب کے باوجود مجھے یا عمران کو اس شخص سے کوئی گلہ نہیں تھا۔اس نے اپنے نقطۂ نظر سے شاید ٹھیک ہی کیا تھا۔اس نے سریتا کو اس ساری خونی کشمکش سے بچانے کی کوشش کی......اور یہ ثابت بھی ہو گیا کہ اس نے جو کیا درست کیا۔سریتا کی جگہ جولڑکی اس خونی کشمکش میں شامل ہوئی،وہ ریسٹ ہاؤس میں ماری گئی تھی۔

ماسٹر جواہر بستر پر لیٹا تھا اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو رِس رہے تھے۔اس کی ایک ٹانگ اور بازو پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

"مجھے شما کر دیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

میں نے اس کا شانہ تھپکا اور کہا۔"جواہر!جب تم انڈیا جاؤ گے تو تمہیں بہت کچھ بدلا ہوا ملے گا......اور ہوسکتا ہے کہ تمہاری قسمت زور مارے اور تمہیں تمہاری بیوی اور بچی بھی واپس مل جائیں۔"

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔میں نے تہ کیا ہوا تازہ اخبار کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔اس میں جاوا کی موت کی خبر جلی حروف میں موجود تھی۔جاوا کی ایک مدھم سی تصویر بھی چھاپی گئی تھی۔خبر کی تفصیل میں کافی کچھ لکھا تھا جس میں یہ بات بھی موجود تھی کہ جاوا،پریم چوپڑا اور ان کے کئی قریبی ساتھیوں کی موت کے بعد اس گروہ کے خلاف پورے "مہاراشٹر" میں کریک ڈاؤن ہوا ہے۔بہت سی گرفتاریاں ہوئی ہیں اور کئی لوگ زیرِزمین چلے گئے ہیں۔بہت سی لڑکیوں کو حبس بے جا سے نکالے جانے کی اطلاع بھی ہے۔جاوا کے ایک ٹھکانے سے فاسٹنگ بدھا کی وہ نادر مورتی بھی سرکاری تحویل میں لے لی گئی ہے جس کی قیمت کروڑوں ڈالرز میں ہے اور جس کی تلاش میں کئی گروپ انڈیا میں سرگرمِ عمل تھے۔

ماسٹر جواہر خبر پڑھ رہا تھا اور اس کی بھیگی آنکھوں میں آس کی ایک مدھم سی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔میں اسے اخبار اور اس مدھم روشنی کے ساتھ چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا۔

میں،شاہین اور جگت سنگھ بارہ بجے واپس ہوٹل پہنچے تو وہاں ایک نئی اطلاع میری منتظر تھی۔میں نے ثروت اور یوسف والے کمرے کی طرف نگاہ اٹھائی۔دروازہ کھلا تھا اور باوردی ملازم صفائی کر رہا تھا۔جیلانی نے کہا۔"ثروت صاحبہ اور ان کے شوہر چلے گئے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو لاہور گئے ہیں۔وہاں سے انہیں آج رات آسٹریا کے لیے فلائٹ پکڑنی ہے۔یوسف صاحب ہی بتا رہے تھے۔"

پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے لگا کہ آج میں نے ثروت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا ہے۔آس کی ہر روشنی آج بجھ گئی ہے۔میرا دل چاہا کہ آج آخری بار ثروت کے پیچھے جاؤں۔اس کو شانوں سے تھام کر اس سے پوچھوں......ثروت!تمہاری اور یوسف کی خاطر میں تمہارے ساتھ دربدر ہوا۔عمران انڈیا پہنچا،اس کے ساتھی پہنچے،اب ہم سب زخموں سے چور مختلف اسپتالوں میں پڑے ہیں۔تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ جاتے ہوئے رسمی شکریہ ہی ادا کر دیتیں......بتا ہی دیتیں کہ میں جا رہی ہوں۔کیا تم بھی یوسف کی طرح ہی بالکل بے حس ہو چکی ہو؟

لیکن اس میں کوئی فائدہ نہیں تھا......نہ ثروت کے پیچھے جانے میں کچھ حاصل تھا۔لگتا تھا وہ بے مروتی اور لاتعلقی کی ہر حد پار کر چکی ہے اور جو لوگ اس طرح آگے چلے جاتے ہیں،انہیں روکنا یا آواز دینا بیکار ہوتا ہے۔وہ نہیں رکتے۔انہیں چھوڑ دینا چاہئے،آزاد کر دینا چاہئے۔ان کے تصور کی پیشانی پر ایک الوداعی بوسہ دے کر ان کے خیال کی پلکوں کو آخری بار چوم کر انہیں رخصت کر دینا چاہئے۔یہی محبت کا چلن ہے،یہی عشق کا وطیرہ ہے۔پیار میں جبر نہیں ہے۔یہ تو شیشے سے پتھر کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔کسی کرشمے کے سبب کامیاب ہو جائے تو سربسجود ہوتا ہے،ناکام ہو جائے تو گلہ نہیں کرتا۔وہ جانتا ہے کہ کچھ بھی نہ ملا تو "درد کی دولت" تو اسی کی ہے۔محبوب کے شیریں ہونٹ نہ پائے لیکن زہر کا پیالا تو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔کسی کا ریشمی پیکر گلے سے نہ لگا لیکن تختۂ دار کا پھندا تو اسی کا ہے۔کانٹے،زخم،کرب کے کوڑے،انگارے،زہر میں بجھے تیر......انتظار کی زہریلی برچھیاں،سب......ہاں سب کے سب اس کی ملکیت ہیں......اس کی جاگیر ہیں۔

میں ثروت کے خالی کمرے کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

○......❖......○

ہم لاہور پہنچے۔لاہور کیا تھا میرے لئے ایک ویرانہ تھا۔گلیوں میں جیسے خاک اڑ رہی

تھی۔ یہاں ثروت نہیں تھی۔ فرح اور عاطف نہیں تھے...... یہاں عمران نہیں تھا۔ وہ ہزاروں میل دور میونخ کے ایک اسپتال میں آنکھیں بند کئے ایک سفید بستر پر پڑا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ مجھے ہر پل اس کی خبر ملتی رہے۔ ساتھ ساتھ میں اپنے سفری کاغذ بھی تیار کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پھر سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے خوب صورت گڑھے کو اپنی انگلی سے چھو کر کہنا چاہتا تھا، میں آ گیا ہوں عمران۔ اب اپنے سارے دکھ اور تکلیف مجھے سونپ دو۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مسکرائے گا اور کہے گا۔ ''دیکھ لے، اب پھر بول رہا ہے نا کسی بیوی کی طرح۔''

لاہور پہنچنے کے اگلے روز میں نے اپنی اور شاہین کی طرف سے اس کا صدقہ وغیرہ دیا۔ پھر میں میانی صاحب قبرستان گیا۔ وہاں ہمارا پیارا دوست اقبال ایک قبر میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا آنکھیں بھگوتا رہا۔ جیلانی اور امتیاز بھی میرے ساتھ تھے۔ جیلانی کے تین چار مسلح ساتھی ہمارے قریب ہی اندرونی سڑک پر ایک گاڑی میں بیٹھے تھے۔ امتیاز نے ہمیں بتا دیا تھا کہ لاہور میں باہر نکلتے ہوئے ہمیں بہت احتیاط کرنا پڑے گی۔

عمران کے اندرونِ شہر والے گھر کی چابی امتیاز کے پاس ہی تھی۔ ہم اسی گھر میں شفٹ ہوئے۔ شاہین کو جان محمد صاحب اپنے ساتھ لے گئے۔ عمران کی طرح وہ شاہین سے بھی بہت شفقت رکھتے تھے۔ وہ اسے لاہور ہی میں کسی محفوظ جگہ پر ٹھہرانا چاہتے تھے۔ میں نے شاہین سے کہا کہ میں جان صاحب کو اور اسے ہر وقت صورتِ حال سے باخبر رکھوں گا۔

ہم اندرونِ شہر والے گھر پہنچے تو ساتھ ہی لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہیں عمران کے زخمی ہونے کا علم ہو چکا تھا اور وہ اس کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ یہ سب عام لوگ تھے۔ کوئی خوانچہ فروش تھا، کوئی کریانہ فروش...... دودھ دہی والا بالا پہلوان، پان سگریٹ والا توفیق...... پڑوسی زاہد حسین، چاچا رفیق، پھل فروش عبدالکریم اور کئی دوسرے۔ وہ رسمی طور پر نہیں آئے تھے۔ ان کے چہروں پر وہی پریشانی تھی جو اپنے کسی قریبی عزیز کی تکلیف پر ہوتی ہے۔

ہیرو بھائی کس شہر میں ہیں؟ کس اسپتال میں ہیں؟ ہیرو پتر کب تک ٹھیک ہوگا؟ وہ کب واپس آئے گا؟ اس قسم کے بہت سے سوال ہم سے پوچھے جا رہے تھے۔

اس دوران میں بہرا چاچا نذیر آیا۔ وہ گھر کے صحن میں داخل ہوا تو رو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''کہاں چھوڑ آئے ہو ہمارے ہیرو پتر کو...... کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟''

میں نے اسے دلاسا دیا۔ اس کے کان کے پاس بلند آواز سے کہا۔ ''آپ کا ہیرو پتر

بالکل ٹھیک ہے چاچا! آپ کی دعائیں اسے بالکل بھلا چنگا کر دیں گی۔ وہ پھر سے ہمارے درمیان ہوگا۔''

''کب آئے گا؟ تمہیں اسے ساتھ لے کر آنا تھا۔ اسے کہنا تھا، میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ وہاں سب تیری راہ دیکھ رہے ہیں۔ تیری دید کو ترسے ہوئے ہیں۔'' چاچے کی ادھیڑ عمر لیکن نوبیاہتا بیوی بھی ساتھ تھی اور غم کی تصویر نظر آتی تھی۔

لوگوں میں سے کچھ رو رہے تھے، کچھ مشتعل تھے۔ ''ہم ماردیں گے اسے جس نے ہیرو بھائی پر گولی چلائی ہے۔'' ایک مزدور ٹائپ شخص نے بلند آواز میں کہا۔ اس کے جذباتی انداز سے دو چار اور افراد بھی اشک بار ہو گئے۔

قاری حبیب اللہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں عمران بھائی کے لئے دعا کرنی چاہئے۔ ان کے لئے پڑھنا چاہئے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے آسانیاں پیدا کرے۔''

اسی دوران میں جیلانی کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بات کرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے واپس آ کر کہا۔ ''ایس پی حمزہ صاحب کا فون تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ کچھ لوگ وہاں میو اسپتال کے باہر جمع ہو گئے ہیں۔ کسی نے جھوٹی خبر اڑائی ہے کہ عمران صاحب یہاں اس اسپتال میں لائے گئے ہیں۔ یہ لوگ اندر جانا چاہ رہے ہیں اور ڈاکٹروں سے بدتمیزی کر رہے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''حمزہ صاحب نے ہم دونوں کو بلایا ہے تاکہ لوگوں کو حقیقت بتائیں اور سنبھالیں۔ وہ اپنی گاڑی بھی بھیج رہے ہیں۔''

قریباً بیس منٹ بعد پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دیئے۔ یہ دو گاڑیاں تھیں۔ میں اور جیلانی پولیس جیپ میں اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ جیلانی کے اپنے مسلح ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ ہم اسپتال پہنچے تو دنگ رہ گئے۔ وہاں عجیب نقشہ نظر آیا۔ کم و بیش تین سو افراد یہاں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سارا ہجوم لاہور کے گلی کوچوں کا سرمایہ تھا...... یہ عام شخص تھا جو فٹ پاتھوں پر سوتا ہے، چمکتی دھوپ میں پسینا بہاتا ہے، رکشا یا تانگا چلاتا ہے۔ مختلف ضرورتوں کے لئے لمبی قطاروں میں لگتا ہے اور رات کو اکثر صبر کے نوالے کھا کر امید کا پانی پی لیتا ہے۔

یہ سب عمران کے پرستار تھے۔ اس کی تکلیف کا سن کر اس اسپتال کے گرد امڈ آئے تھے۔ وہ اپنے زخمی ہیرو کو دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ جذباتی افراد نے زبردستی ایمرجنسی میں جانے کی

کوشش کی تھی، عملے نے انہیں زدوکوب کیا۔ اس کے بعد اور لوگ یہاں جمع ہو گئے اور اچھا خاصا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اب بھی ہجوم میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

حمزہ صاحب خود وہاں موجود تھے۔ صلاح مشورے کے بعد انہوں نے میگا فون پر لوگوں کو پُرسکون رہنے کے لئے کہا اور بتایا کہ عمران کے دو قریبی دوست یہاں موجود ہیں۔ وہ اصل حقیقت آپ لوگوں کو بتائیں گے۔

حمزہ صاحب کے کہنے پر میں ایک ایمبولینس کی چھت پر کھڑا ہو گیا اور میگا فون کے ذریعے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں عمران کا ساتھی تابش آپ کے سامنے ہوں۔ آپ میں سے کئی لوگ مجھے جانتے ہوں گے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عمران بالکل خیریت سے ہے اور اس کا بہترین علاج ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اس اسپتال میں موجود نہیں ہے۔ میں آپ کو پوری ذمے داری کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ وہ اس اسپتال میں نہیں ہے۔ وہ پاکستان میں ہی نہیں ہے۔ اسے کل رات کراچی سے جرمنی پہنچایا گیا ہے۔ وہاں کے بہترین اسپتال میں اس کی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے اس کے ڈاکٹروں سے میں نے خود بات کی ہے۔ آپ لوگ اس کے لئے دعائے خیر کریں۔ اللہ کرے وہ چند دن میں پھر سے ہم سب کے درمیان موجود ہو۔“

کچھ احتجاجی آوازیں ابھریں جن سے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ اب بھی یقین نہیں کر رہے۔ میرے ساتھ کیپٹن جیلانی بھی چھت پر چڑھ آیا۔ اس نے بھی میری تائید کی۔ آخر میں، مَیں نے ایک دو فقرے کہے۔ لوگ جاننا چاہتے تھے کہ عمران ہیرو کے ساتھ اصل میں کیا ہوا ہے۔ انڈیا میں کن لوگوں نے اسے زخمی کیا اور وہ کیونکر یہاں پہنچ سکا، وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی عمران کی اس حیثیت سے آگاہ نہیں تھا جو مجھے بھی بس چند دن پہلے ہی معلوم ہوئی تھی۔ وہ خفیہ طور پر ایک ایسی مسلح آرگنائزیشن چلا رہا تھا جس نے انڈین ایجنسیوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے اور ان کے ملک میں گھس کر ان کے پنجوں سے بے گناہ پاکستانیوں کو رہائی دلائی تھی۔ مجھے رہ رہ کر یاد آتا تھا کہ جب میں بھانڈیل اسٹیٹ میں پھنسا تھا تو مجھے ہرگز ہرگز امید نہیں تھی کہ کوئی انڈیا آئے گا اور اس دور دراز گمنام جگہ پر مجھ تک پہنچے گا۔ عمران پہنچا تھا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس کا ایک سیٹ اَپ تھا اور وہ ایک عرصے سے اسی طرح کی کارروائیاں کر رہا تھا۔

ہم سارے ہجوم کو تو عمران کی صحت کے حوالے سے تفصیل نہیں بتا سکتے تھے۔ ہم نے چند لوگوں کو منتخب کیا اور انہیں ایک علیحدہ کمرے میں لے جا کر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ کچھ

دیر بعد ہجوم منتشر ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن اگر ہم یہ سمجھتے تھے کہ لوگ مکمل طور پر تتر بتر ہو جائیں گے تو یہ غلط تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ ٹولیوں کی شکل میں اندرونِ شہر کی طرف چل پڑے۔ اندازہ ہوا کہ وہ عمران کی رہائش گاہ کے بارے میں جانتے ہیں اور وہاں جا رہے ہیں۔

رات تک عمران کی رہائش گاہ کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ کئی سو کا مجمع تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جن پر وہ اپنی محبتیں اور چاہتیں نچھاور کرتا تھا۔ راتوں کے اندھیرے میں اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر نکلتا تھا اور چپکے سے ان کی مدد کرتا تھا، مصیبت میں ان کے کام آتا تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے اپنے اہم ترین کام پسِ پشت ڈال دیتا تھا۔ یہ بے لوث تعلق تھا اور اس تعلق کی بدولت آج سیکڑوں آنسو اس کی صحت یابی کے لئے گر رہے تھے۔ اَن گنت ہاتھ اس کو دعا دینے کے لئے اٹھائے گئے تھے۔ بوڑھے، نادار، معذور، مفلس سب طرح کے لوگ اس ہجوم میں شامل تھے۔ اس کی کھٹارا موٹر سائیکل گھر کے برآمدے میں کھڑی تھی۔ میں نے ایک ملنگ نما بوڑھے کو دیکھا، اس نے موٹر سائیکل کو باقاعدہ چوما اور پھر اپنی گدڑی سے اسے صاف کرنے لگا۔

قاری حبیب اللہ نے قریبی مسجد میں سورۃ یٰسین کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہاں مدرسے کے بچے اور بہت سے دیگر افراد جمع تھے۔ کوئی شخص چاول کی تین چار دیگیں پکوا کر لے آیا تھا جو لوگوں میں تقسیم کی جا رہی تھیں۔

رات نو بجے کے قریب پھر شاہین نے فون کال کی۔ ”تابش بھائی! کوئی فون آیا میونخ سے؟“

”ہاں، ابھی پندرہ منٹ پہلے آیا ہے۔ اس کی حالت اب بہتر ہے۔“

”وہ تو کہہ رہے تھے کہ خطرے سے باہر نہیں۔“

”نہیں، اب ایسی بات نہیں۔“

اسی دوران میں جگت سنگھ اندر آیا۔ اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ جیلانی صاحب باہر گاڑی میں بلا رہے ہیں۔

میں شاہین سے بات ختم کر کے باہر نکلا۔ گھر کے دروازے سے باہر پہنچا تو ہجوم میری طرف اُمڈ آیا۔ وہ مجھ سے عمران کی حالت کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آس و امید کے دیئے ٹمٹما رہے تھے۔ میں نے بمشکل ان کے درمیان سے راستہ بنایا اور بتایا کہ ابھی کچھ دیر میں فون آنے والا ہے پھر آپ کو تازہ صورتِ حال بتائیں گے۔

میں جگت سنگھ کے ساتھ باہر سڑک پر پہنچا۔ یہاں ٹی وی چینلز کی چند گاڑیاں بھی کھڑی

نظر آئیں۔ ان سے پہلو بچاتے ہوئے میں اور جگت ملحقہ سڑک پر گئے۔ یہاں جیلانی اسٹیشن وین میں موجود تھا۔ جگت باہر رہا، میں اندر گیا۔ جیلانی بالکل گم صم بیٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔

"کیا اطلاع ہے جیلانی؟"

"عمران صاحب کی حالت ٹھیک نہیں...... ابھی فون آیا ہے...... ان کی ریڑھ کی چوٹ انہیں سنبھلنے نہیں دے رہی۔ وہ...... بہت...... نازک حالت میں ہیں۔" جیلانی کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ اردگرد کی ہر شے گردش کرتی محسوس ہوئی۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"جیلانی...... کہاں ہے عمران؟ سچ بتاؤ...... جھوٹ نہ بولنا۔"

جیلانی نے یکا یک مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ کرب کی انتہا کو چھُو کر بلند آواز میں بولا۔ "وہ چلا گیا...... وہ چلا گیا تابش صاحب...... چھوڑ گیا ہم سب کو۔ وہ مر گیا تابش صاحب...... وہ مر گیا......"

جیلانی کی دردناک پکار اسٹیشن وین کے خلا میں گونجنے لگی۔ میرا ذہن جیسے ماؤف ہو گیا۔ مجھے لگا میرے کان بند ہو گئے ہیں۔ حسیات دم توڑ گئی ہیں۔ جیلانی چلّا رہا تھا، رو رہا تھا، بول رہا تھا لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پوری شدت سے اس کے بازوؤں کا حلقہ توڑا اور اتنے زور سے اسے دھکا دیا کہ وہ وین کی درمیانی نشست پر جا گرا اور کھڑکی ٹوٹ گئی۔ "بکواس بند کرو۔" میں سینے کی پوری قوت سے دہاڑا۔ "تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے، وہ نہیں مر سکتا...... وہ نہیں مر سکتا۔"

جیلانی ایک بار پھر میری طرف آیا اور مجھے سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے بند کر دیا۔ "خبردار، اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا تو...... تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔ کس نے بتایا ہے؟ کس نے بتایا ہے؟"

کوئی چیز لگنے سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ ہماری آوازیں باہر جا رہی تھیں۔ لوگ اسٹیشن وین کی طرف لپکے۔ میڈیا والے بھی دوڑے آئے۔ کیمرے حرکت کرنے لگے۔ لائٹیں چمکنے لگیں۔

یہی وقت تھا جب میں نے جان محمد صاحب کو دیکھا۔ وہ بھی روتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ان کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ جو بھیانک ترین خبر ہم تک پہنچی ہے، وہ

درست ہے۔ جس قیامت کا ڈر تھا، وہ ہم پر ٹوٹ چکی ہے۔

میں نے قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ لیکن مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ مجھے اس پستول کو کیا کرنا ہے۔ خود کو گولی مارنی ہے، خبر سنانے والے کو مارنی ہے یا پھر کسی ایسے دشمن کو جو اس خبر کا ذمے دار ہے۔ دل کے کسی گوشے میں یہ آس بھی سر اٹھا رہی تھی کہ کاش یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب ہو۔ ابھی میں اٹھ بیٹھوں اور یہ سب کچھ بکھر جائے۔ اردگرد کی ہر چیز دھندلا رہی تھی۔ چہرے، آوازیں، روشنیاں، سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھاما اور زمین کی طرف جھکتا چلا گیا۔ میرے اردگرد آہ و بکا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

○......❖......○

عمران مر گیا۔ ایک روشن ستارہ بجھ گیا۔ ایک مسکراتا چہرہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا۔ دعائیں، التجائیں، تمنائیں، سسکیاں، کچھ بھی اسے جانے سے نہ روک سکا۔ یہی قدرت کا اصول ہے۔ وہ اوپر والا جب کسی کو لے جانے کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر دنیا کے بہترین دماغ، جدید ترین طبی سہولتیں اور تمام مادی توتیں مل کر بھی اسے روک نہیں سکتیں۔ وہ لے جاتا ہے اور کہتا ہے، یقین کرو میری قدرت پر۔

بے شک موت اٹل ہے اور سب کے لئے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی کس طرح مرتا ہے۔ بقول شاعر...... جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے۔

جس بانکپن سے کوئی اجل کو گلے سے لگاتا ہے، وہ بانکپن زندہ لوگوں کے لئے امر ہو جاتا ہے اور ان کو جینے مرنے کی راہیں دکھاتا ہے۔

وہ خطروں کا کھلاڑی تھا۔ ہر روز موت سے اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ بارڈر ایریا کے ریسٹ ہاؤس کے سامنے اس ٹیلے پر جہاں اس نے قریباً پانچ منٹ تک تن تنہا درجنوں بھارتی فوجیوں کا راستہ روکا تھا۔ وہ ایک چٹان کی طرح ڈٹ گیا تھا۔ گرے جیپ اور گولیوں کی بوچھاڑوں کے درمیان ایک دیوار بن گیا تھا۔ یوں لڑا تھا کہ چشم فلک نے بھی مرحبا کہا ہوگا۔ وہ منظر ایسا نہیں تھا کہ کبھی اسے فراموش کیا جا سکتا۔

سب کچھ ہو چکا تھا۔ مصدقہ خبریں آ چکی تھیں۔ پھر بھی نہ جانے دیوانہ دل مانتا کیوں نہیں تھا۔ یہی لگتا تھا کہ ابھی میرے فون کی بیل ہوگی۔ اس کی مسکراتی آواز سنائی دے گی۔ "جگر! چکر دے دیا نا سب کو۔ یہاں میونخ میں ریما اور نرگس کے ساتھ شوٹنگ فرما رہا ہوں...... سوئمنگ کر رہا ہوں اور فائیو اسٹار بوفے کھا رہا ہوں۔ بس جلدی سے آ جاؤ تم بھی۔ بڑی لمبی چوڑی پلاننگ کرنی ہے...... ایک دو کڑاکے دار پروگرام بنانے ہیں۔"

لیکن فون خاموش تھا۔ اب اس پر ایسی کوئی کال نہیں آنا تھی، نہ ہی اس کی اسکرین پر کبھی عمران کا نام چمکنا تھا۔ رو رو کر میرے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر سینے کے الاؤ مدھم نہیں ہو رہے تھے اور نہ ہی یقین آ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے...... یہاں تک کہ دو دن بعد اس کا تابوت لاہور پہنچ گیا۔ میں نے اس کی شکل دیکھ لی۔ تابوت کے شیشے میں اس کی ٹھوڑی کا گڑھا کسی نگینے کی طرح چمکتا تھا۔ بند آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے شرارت کر رہا ہو۔ بے شمار سوگوار اس کے اردگرد موجود تھے۔ اس کے تابوت سے لپٹ رہے تھے، دھاڑیں مار رہے تھے۔ وہ ان کا غم خوار اور مسیحا تھا...... اور شاید محافظ بھی۔ وہ ان کے لئے دشمن کے قلب میں گھستا تھا۔ دشمن کی پناہ گاہوں میں گھس کر ان کو مارتا تھا۔ وہ برسوں اپنی بچھڑی ماں کو ڈھونڈتا رہا پر وہ انڈین جیلوں کے اندھیروں میں گم ہو گئی۔ وہ تو اسے نہ مل سکی لیکن اس نے اور بہت سی ماؤں، بہنوں اور بھائیوں، بیٹوں کو ڈھونڈ نکالا۔ اس نے انہیں انڈین ایجنسیوں کے بے رحم چنگل سے نکالا، ان کی جیلیں توڑیں اور انہیں پاکستان کی آزاد فضاؤں میں پہنچایا۔ وہ وطن کا بیٹا تھا۔ اس کی ساری دشمنیاں اپنے وطن کے حوالے سے تھیں۔ وہ کسی اور روپ میں جیتا تھا۔ لوگ اسے سرکس کے نڈر شو مین کے طور پر جانتے تھے۔ وہ ریوالور کے نہایت خطرناک کھیل کھیلتا تھا۔ ایسے شوز کے لئے وہ انڈیا بھی جاتا تھا مگر اس کا اصل روپ تو یہی تھا۔ دشمن کے ملک میں گھس کر اس کو مات دینا اور اس کے سینے پر اپنی برتری کا جھنڈا گاڑنا۔ اس نے اَن گنت جھنڈے گاڑے اور جب ایک رات وہ گھیر لیا گیا، اس خونی ٹیلے کے گرد اس کے سارے دشمن یکجا ہو کر اس پر پل پڑے تو اس نے وہی کیا جو شیر کرتا ہے اور شیر دل کرتے ہیں۔ اس نے انہیں للکارا اور فقط ''پانچ چھ منٹ'' کے اندر ان کو عذاب اور ہلاکت کی پانچ چھ صدیوں میں سے گزار دیا۔ چاروں طرف ان کی لاشیں بکھیر دیں۔ بتا دیا ان کو کہ کس طمطراق سے جیا جاتا ہے اور جب وقت آن پڑے تو کس شان سے مرا جاتا ہے۔

میری حسیات جیسے کند ہو چکی تھیں۔ میرے اردگرد سب کچھ دھندلا دھندلا سا تھا۔ آوازیں کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ میرے یار کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا تھا۔ چاہنے والوں نے اسے پھولوں سے لاد دیا تھا، دولہا بنا دیا تھا۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ میں ایک حقیر تنکے کی طرح اس سمندر میں بہا جا رہا تھا...... تم بہت آگے نکل گئے عمران! میں بہت پیچھے رہ گیا۔ تم ہر جگہ جیت جاتے تھے، تم آج بھی جیت گئے...... یار! ایک بار تو مجھے جیتنے کا موقع دے دیتے۔ از راہِ مروت ہی سہی...... اخلاقاً ہی سہی، اس وقت کہہ دیتے...... اس ٹیلے پر اس وقت کہہ دیتے، تم فائرنگ کرو۔ میں زخمیوں کو پیچھے لے کر جاتا ہوں۔ تم اس

وقت بھی خطروں کے ٹھیکیدار بنے...... تم نے اس وقت بھی سب کچھ اپنے سینے پر جھیلا...... بڑی ناانصافی کی تم نے میرے ساتھ۔ بہت برا کیا...... اب کیا کروں گا میں؟ کہاں ڈھونڈوں گا تمہیں؟ اس شہر کی گلیاں مجھے کھانے کو آئیں گی۔ اس کے ریستوران، اس کے باغ، اس کے بازار...... اور تیری وہ کھٹارا موٹر سائیکل...... کیا یہ سارے منظر جینے دیں گے مجھے؟ یہ نہیں جینے دیں گے۔ اب مجھے بھی مر جانا چاہئے۔ اب یہاں کچھ نہیں میرے لئے۔

میں نے روتے روتے سوچا...... ہاں ٹھیک ہے۔ میں اپنے اس دولہے کو دفن کر لوں۔ پھر میں بھی نکلوں گا، میں بھی مر جاؤں گا۔ مجھ سے اب نہیں جیا جائے گا۔

عمران میانی صاحب میں سپرد خاک ہو گیا۔ اپنی ساری مسکراہٹوں، چہکاروں اور قہقہوں سمیت نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اپنے دیرینہ دوست اقبال کے پہلو میں اس کی قبر بنی۔ راوی روڈ بازار کے ایک لڑکے نے اس کی گل پوش قبر کے نزدیک ایک کتبہ لگا دیا۔ شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے۔

میری سماعت میں وہی بول گونجنے لگے جو ہر شہیدِ وطن کی رحلت پر فضاؤں میں سرایت کرتے ہیں۔ اے راہِ حق کے شہیدو...... وفا کی تصویرو، وطن کی ہوائیں تمہیں سلام کہتی ہیں۔

میرا دولہا دوست پہلے مٹی اور پھر پھولوں میں چھپ گیا۔ میں اب یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر جیلانی سائے کی طرح ساتھ لگا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم سب کی سیکیورٹی کے مسائل ہیں۔ وہ مجھے پھر سے عمران کے گھر لے آیا۔ دس مرلے کا وہ گھر جس میں اس نے اپنی زندگی کے اہم سال گزارے تھے۔ میں ان در و دیوار کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی میرے ساتھ لپٹ گیا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ یہ شاہین تھی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اپنی آنکھوں کا پانی نچوڑتی رہی۔ میرے پاس کہنے کو کیا تھا جو اس سے کہتا۔ میرے پاس تو شاید آنسو بھی نہیں بچے تھے۔ میں بس خاموشی کی زبان میں اسے دلاسا دیتا رہا۔ ایک فوجی آگے آیا۔ یہ کیپٹن ڈاکٹر شرجیل تھا۔ اس نے ایک لفافہ شاہین کے حوالے کیا۔ اس میں عمران کی ذاتی اشیاء تھیں۔ یہ اشیاء کراچی میں آپریشن تھیٹر میں لے جاتے ہوئے عمران سے علیحدہ کی گئی تھیں۔ اس کا چرمی پرس، اس کی رسٹ واچ، سگریٹ کا پیکٹ، لائٹر، ایک رنگ اور اس طرح کی کچھ چیزیں۔ کیپٹن ڈاکٹر شرجیل نے کہا۔ ''میڈم! عمران صاحب نے کہا تھا، یہ آپ کو دی جائیں۔''

شاہین نے یہ سب کچھ دیکھا۔ اپنی اوڑھنی کے پلو میں باندھ کر اسے گرہ لگائی اور اس گرہ کو سینے سے لگا کر ہجوم میں گم ہو گئی۔

نہ جانے کیوں اس وقت عمران کے وہ آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے جو اس نے فون پر شاہین سے کہے تھے۔ ہم اس وقت ریسٹ ہاؤس کے سامنے بی ایس ایف والوں سے برسرِ پیکار تھے۔ فائرنگ ہو رہی تھی۔ عمران نے حسبِ معمول مذاق کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ شوٹنگ کی فائرنگ ہے۔ آخر میں وہ بولا تھا...... اچھا ڈیئر! اگلا شاٹ تیار ہو گیا ہے......ڈائریکٹر صاحب بلا رہے ہیں...... خدا حافظ۔ اگلا شاٹ اس کی موت کا شاٹ تھا۔

جیلانی اور امتیاز کو بھی عمران کے غم نے نڈھال کر رکھا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہم تینوں میں سے کس کا غم زیادہ ہے۔ رات کو میں نیم جان سا چٹائی پر لیٹ گیا۔ جگت سنگھ میرے قریب ہی صوفے پر سویا ہوا تھا۔ جیلانی اور امتیاز کچھ فاصلے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شاید انہوں نے سمجھا کہ میں سو گیا ہوں۔ جیلانی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''اس کا بچنا محال تھا۔ منگل کے روز ہی اس کی حالت بڑی نازک تھی، بالکل بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کی نالیاں اور دوسرے ہیلپنگ انسٹرومنٹس اتار دیئے تھے۔ بے چاری کی بدقسمتی یہ رہی کہ عمران صاحب خود زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئے، ورنہ لگتا تھا کہ وہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ کریں گے۔ وہ ڈونیشن کے لئے بھاری رقم کا انتظام بھی کر چکے تھے۔ بس سارے قدرت کے کھیل ہیں۔''

میں جان گیا کہ یہ گفتگو ثروت کی بہن نصرت کے بارے میں ہو رہی ہے۔ اسے نہایت نازک حالت میں ویانا پہنچایا گیا تھا۔ ثروت اور یوسف بھی اس کے پیچھے گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہم انسان کو کھا جاتے ہیں۔ کیا نصرت کو بھی واہمو نے ہی کھایا تھا؟ بہرحال پتا نہیں کیوں اب مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہاں تک کہ ثروت کا خیال بھی اب ذہن سے کہیں بہت دور جا چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اور یوسف کے حالات سے مجھے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ باروندا جیکی نے کبھی کہا تھا...... ہر کہانی کا انجام مرضی کے مطابق نہیں ہوتا۔ مگر ہر انجام میں زندگی موجود ہوتی ہے اور اگر اسے موقع دیا جائے تو وہ اپنا رستہ خود ڈھونڈتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ زندگی دکھ ہے اور خود ہی اس کا مداوا بھی ہے۔

رات پچھلے پہر ہم چاروں جاگ گئے۔ دیر تک بیٹھے رہے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔ میں بہت کم سگریٹ پیتا تھا لیکن اب پی رہا تھا...... بالکل کسی ''چین اسموکر'' کی طرح۔ اور یہ سگریٹ بھی عمران ہی کے تھے۔ ہمارے سینوں میں ایک آگ روشن تھی۔ غیظ و غضب کی ایک لہر تھی جو جسم کے ہر حصے میں پھیلتی تھی اور سر ٹکراتی تھی۔ صبح تین بجے کے قریب ہمیں وہ فون کال آئی جس کا انتظار تھا۔ جیلانی کے ایک ساتھی نے ایک خاص اطلاع دی۔ یہ اطلاع سلطان چیٹا،

سیکرٹری ندیم اور ان کے دو خاص ساتھیوں کے بارے میں تھی۔ عمران کی موت کے فوراً بعد سے یہ لوگ اپنے ٹھکانوں سے غائب تھے۔ آج تیسرے روز ہمیں یہ کامیابی ملی تھی۔ ہم پہلے ہی پوری طرح تیار تھے۔ ایک تاریک شیشوں والی کرولا میں بیٹھ کر نکل گئے۔ ہمیں لاہور سے باہر جانا پڑا۔ قلعہ ستار شاہ کے قریب چاولوں کا ایک بہت بڑا گودام تھا اور ساتھ میں شیلر بھی تھا۔ یہ جگہ ایک سیاسی پارٹی کے اہم رکن کی ملکیت تھی۔ ہماری اطلاع کے مطابق سلطان چیٹا یہیں موجود تھا۔ ہم نے تیزی سے کارروائی کر کے دو چوکیداروں کو رسیوں سے باندھ دیا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے۔ اس کے بعد ہم اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ عمران کا سائیلنسر لگا پستول اس وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ پستول میرے ہاتھ میں جیسے اس کی نمائندگی کر رہا تھا۔ گودام کے ساتھ ہی ایک انیکسی نما عمارت تھی۔ اس عمارت میں بڑی بڑی خوفناک مونچھوں والا ایک مسلح شخص ہمارے سامنے آیا۔ وہ بہت خطرناک نظر آتا تھا مگر اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ جو بندے اس کے سامنے آئے ہیں وہ اس وقت کس آگ میں جل رہے ہیں اور کتنے جان لیوا ثابت ہوں گے۔ میرے سائیلنسر لگے پستول سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں نکلیں اور وہ رائفل سیدھی کرنے کی حسرت دل میں ہی لے کر فرش بوس ہو گیا۔

ہم ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ یہاں سیکرٹری ندیم سے ملاقات ہو گئی۔ بظاہر نفیس نظر آنے والا یہ شخص پرلے درجے کا رنگ باز تھا۔ شروع شروع میں سویٹی عرف ایشوریا رائے کے حسن سے اسی نے شب و روز خراج وصول کیا تھا۔ اب بھی اس کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے کسی بنت حوا کے قرب سے حظ اٹھاتا رہا ہے۔ ایک بڑی ٹرے میں چکن کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور شراب کی تقریباً خالی بوتل پڑی تھی۔ گلاس فرش پر لڑھکا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی لڑکی موجود نہیں تھی لیکن نسوانی پرفیوم کی خوشبو موجود تھی۔ سیکرٹری ندیم بستر پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ عریاں تھا۔ فقط اس کے جسم کے درمیانی حصے پر ایک تولیا نما کپڑا پڑا تھا۔ جیلانی نے آگے بڑھ کر پستول کے بیرل سے یہ کپڑا ہٹا دیا۔ وہ سر تا پا عریاں ہو گیا۔ لیکن اسی طرح مدہوش پڑا رہا۔ اس نے سمجھا، شاید یہ اس کی ساتھی لڑکی ہے۔ مدہوشی میں ہی بولا۔ ''اوئے کیا کرتی ہے بدبختے! اب ذرا دو گھنٹے ٹھونکا لگانے دے (آرام کرنے دے)۔''

میں نے اس کی پشت پر زوردار لات رسید کی۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا۔ ''تجھے ٹھونکا لگوانے کے لئے ہی آئے ہیں۔ بڑا لمبا ٹھونکا ہو گا اس دفعہ۔'' میں نے کہا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چندھیائی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ پھر وہ تولیا ڈھونڈا جس نے اس کا ستر چھپا رکھا تھا۔ تولیا جیلانی کے پستول کے بیرل سے جھول رہا تھا۔ عینک کے بغیر

بھی اس نے کم از کم تولیا تو دیکھ ہی لیا۔ تب اس نے مڑ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ یہاں ایسا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف گیا۔ اس کی ٹانگ کچھ عرصہ پہلے راجا نے توڑی تھی۔ پہلی گولی اسے میں نے ماری اور یہ اسی جگہ تھی جہاں اس نے کچھ دیر پہلے تولیا رکھا ہوا تھا۔ دوسری گولی جیلانی نے چلائی۔ یہ بھی سائیلنسر لگا پستول تھا اور صرف ''ٹھک'' کی آواز پیدا کرتا تھا۔ یہ گولی ندیم کی گردن کے پچھلے حصے میں لگی اور دانت توڑ کر منہ کی طرف سے نکل آئی۔ مزید تسلی کے لئے میں نے تیسری گولی اس کے سینے میں اتار دی۔

لڑکی کمرے میں ہی موجود تھی۔ وہ واش روم میں تھی۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا پھر دروازہ بند کیا اور مدد کے لئے چلاّنے لگی۔ بند واش روم سے اس کی آواز بھلا کس کے کانوں تک پہنچنی تھی۔ اس نے اندر سے کنڈی لگائی تھی۔ ہم نے باہر سے بھی لگا دی اور اس دوسرے کمرے کی طرف بڑھے جہاں سلطان چٹا کی موجودگی کا امکان تھا۔ سلطان چٹا بھی جہازی سائز کے بیڈ پر مدہوش پڑا تھا۔ یہاں کسی عورت کے آثار نہیں تھے، تاہم سلطان چٹا کا بالائی جسم عریاں تھا۔ اس کے بازوؤں کی توانا مچھلیوں پر بے ہودہ ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔ وہ گونج دار خراٹے لے رہا تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں سائیڈ ٹیبل پر دو پاسپورٹ پڑے نظر آئے۔ جیلانی نے پاسپورٹ اٹھائے۔ ایک سلطان چٹا کا تھا، دوسرا ایک معروف پاکستانی ایکٹریس کا۔ پاسپورٹس پر ترکی کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں او کے ٹکٹ بھی تھے، ان پر روانگی کی تاریخ کل دوپہر کی تھی۔ ہم نے دیکھا، کمرے میں دو تین تیار اٹیچی کیس بھی پڑے ہیں۔

جیلانی نے ہولے سے کہا۔ ''لگتا ہے جناب چٹا صاحب فرار ہو رہے ہیں...... استنبول میں موجیں کرنے کے لئے۔''

''اور نقلی نہیں اصلی ایکٹریس کے ساتھ۔'' امتیاز نے کہا۔

جگت سنگھ نے اپنی مونچھ کو مروڑا دیا۔ ''دوجوں کے لئے نقلی مال اپنے لئے اصلی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی کرپان چبھو کر سلطان چٹا کو جگایا۔ وہ چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر یہی لگا جیسے اس نے موت کے فرشتوں کو رُوبرو دیکھا ہے۔ اس کا رنگ لیموں سے زیادہ زرد ہو گیا۔ اس کے کان میں گولی کا سوراخ عمران کے باکمال نشانے کی یادگار تھا۔

''کک...... کیا بات ہے؟'' وہ ہکلایا۔

''تمہیں جہاز پر بٹھانے کے لئے آئے ہیں۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

جگت بولا۔ ''پر یہ جہاز جب اُڈے گا تو اوپر ہی اوپر جائے گا...... سیدھا رب سوہنے

کے سامنے جا کر اتارے گا تجھے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کرپان کا ایک وار سلطان کے پہلو میں کیا۔ سلطان تڑپا۔ میں نے امتیاز کے ہاتھ سے آٹو میٹک رائفل لی اور سلطان کو بھون کر رکھ دیا۔ سلطان اور اس کے بستر میں درجنوں سوراخ ہو گئے ہوں گے۔ جیلانی نے اس کے منہ پر تھوکا اور ایک گولی عین اس کی پیشانی میں اتاری۔ وہ اپنے جہازی سائز کے بستر کو لہو رنگ کرنے لگا۔ یہ اقبال کی موت کا بدلہ بھی تھا۔

یہی وقت تھا جب بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ جگت نے لات مار کر دروازہ کھولا اور امتیاز نے رائفل سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کئی افراد زخمی ہو کر گرے۔ جگت سنگھ کے پاس اب تک دو کالے انار (دستی بم) موجود تھے۔ پتا نہیں اس نے کیسے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ اسے عشق تھا ان ''اناروں'' سے۔ یہاں بھی وہ یہ بم استعمال کرنے سے نہیں چوکا اور اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ ورنہ جتنے لوگ یکا یک گودام کی طرف سے آئے تھے، ان سے نمٹنا مشکل ہو جاتا۔ دھماکوں اور شعلوں سے قرب و جوار لرز اُٹھے۔ گودام کے ایک حصے میں آگ لگ گئی۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے واپس اپنی گاڑی کی طرف بھاگے...... اور نکلنے میں کامیاب رہے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ یہ دو تین گاڑیاں تھیں۔ ہم نے تیز رفتاری سے شیخوپورہ کی طرف سفر جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ ان گاڑیوں کے ساتھ پولیس کی گاڑیاں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ ان کی نیلی بتیاں، دکھائی دے رہی تھیں اور ہوٹرز بھی سنائی دیتے تھے۔ یقیناً وائرلیس پر پیغام چل گئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ یہ پولیس والے اس سیاسی لیڈر کے زیر اثر ہوں جس کے ڈیرے پر سلطان چٹا نے پناہ لے رکھی تھی۔ میں نے چلتی گاڑی سے حمزہ صاحب کو فون کرنا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ فون بند کر کے سو رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ جاگتے بھی ہوتے تو خاطر خواہ مدد نہ کر سکتے۔ مخالف پارٹی کا اثر و رسوخ تو ظاہر ہونا ہی تھا، خاص طور سے جب اتنی بڑی واردات ہو چکی تھی۔

گاڑی جیلانی ڈرائیو کر رہا تھا۔ آٹھ دس میل آگے جا کر اچانک گاڑی کو جھٹکے لگنے لگے۔ ''اوگاڈ!'' جیلانی نے کہا۔ ''پیٹرول ختم۔''

ہم نے گاڑی کو درختوں میں گھسا دیا اور روشنیاں بجھا دیں۔ وہ کافی آگے تک چلی گئی۔ جونہی وہ رکی، ہم چھلانگیں لگا کر نکلے۔ جیلانی نے کہا۔ ''ہمیں دو ٹولیوں میں نکلنا چاہئے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اور جگت شمال کی طرف گئے جبکہ جیلانی اور امتیاز جنوب مشرق کی طرف نکلے۔ درختوں میں بہت سی ہیڈ لائٹس چمکنا شروع ہو گئی تھیں۔ ٹارچیں بھی تھیں۔

وہ لوگ ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ جگت سنگھ پاؤں دبا کر چل رہا ہے۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگ چکی تھی اور یہ گولی گودام والی جھڑپ میں ہی لگی تھی۔

O......❖......O

رات کے پچھلے پہر کی خنکی میں یہ ایک طویل تعاقب ثابت ہوا۔ ہم کیچڑ میں لت پت تھے، گاہے بگاہے میں جگت کو سہارا بھی دے رہا تھا۔ اچانک ایک سُوئے (چھوٹی نہر) کے کنارے مجھے ایک لوڈر اور ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ میں اور جگت جیپ کی طرف بڑھے۔ یہ دو تین شکاری تھے جو سحری کے وقت یہاں مچھلیوں کی تاک میں بیٹھے تھے۔ میرا ارادہ ان پر پستول تاننے اور گاڑی حاصل کرنے کا تھا لیکن پھر ایک شخص کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا یہ سہراب جلالی صاحب تھے...... جنہیں عمران بابا جلالی کہتا تھا۔ بابے جلالی نے بھی مجھے پہچان لیا اور اپنی بیکال شکاری رائفل نیچے رکھ دی۔ ''اوہ تابش باورچی تم؟'' وہ حسبِ عادت بولا۔

''جلالی صاحب! ہمارے پیچھے لوگ ہیں۔ ہم یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں فوراً۔''

ضعیف ہونے کے باوجود جلالی کمال کا باہمت شخص تھا۔ ''اسٹینڈ'' لینا جانتا تھا۔

اس نے چھوٹے لوڈر پر فوراً ہمیں اپنے دو کارندوں کے ساتھ روانہ کر دیا اور خود پیچھے آنے والوں کے سوال جواب کے لئے تیار ہو گیا۔ بوڑھے جلالی سے یہ ملاقات کسی کرشمے سے کم نہیں تھیں ورنہ زخمی جگت کی وجہ سے مجھے لگ رہا تھا کہ شاید ریسٹ ہاؤس کی طرح ہم آج یہاں بھی نرغے میں آ جائیں گے۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہم بھاگ دوڑ میں جلالی فارم ہاؤس کے قریب آ چکے ہیں۔ صرف بیس منٹ کے سفر کے بعد ہمیں فارم ہاؤس کے آثار نظر آ گئے...... کچھ ہی دیر بعد جلالی کے نجی چڑیا گھر کے جانوروں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ دس منٹ بعد ہم فارم ہاؤس کے اندر رہائشی حصے میں موجود تھے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ڈاکٹر مہناز کی شکل بھی نظر آ گئی۔ اسے بابے طفیل نے نیند سے جگایا تھا۔ ڈاکٹر مہناز بھی ہمیں یہاں دیکھ کر ششدر ہوئی۔ اس نے فوری طور پر جگت سنگھ کا معائنہ کیا۔ گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چیر کر نکلی تھی۔ چربیلے جسم کی وجہ سے بہت خون بھی نہیں بہا تھا۔ مہناز نے اچھی طرح اس کی مرہم پٹی کر دی اور درد کش گولیاں بھی دے دیں۔ دیگر افراد کے سامنے اس نے ہم سے زیادہ سوال جواب نہیں کئے۔ بابے جلالی کی آمد صبح سات بجے کے قریب ہوئی۔ انہوں نے حسبِ عادت نیکر پہن رکھی تھی جس میں ان کی سوکھی سڑی ٹانگیں دو بیساکھیوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ سر پر سرخ پی کیپ تھی۔ جلالی صاحب نے ہمیں تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے۔ خوش قسمتی سے، ہمارا

تعاقب کرنے والے اس جگہ پہنچے ہی نہیں تھے جہاں بابا جلالی موجود تھے۔

بابے جلالی کے دبلے پتلے جسم کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ یہ بندہ اپنی ظاہری حالت سے کہیں زیادہ مضبوط تھا اور اس سے زیادہ اس کا ارادہ مضبوط تھا۔ وہ جس بات پر اڑ جاتا تھا، بس لوہے پتھر کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر مہناز سے کہا کہ وہ کمرے میں رکھا ہوا ٹی وی آن کرے۔ مہناز نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے کچھ دیر پہلے کوئی خبر دیکھی ہے جواب ہمیں بھی دکھانا چاہتا ہے۔ یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ ایک نیوز چینل پر رات آخری پہر والے واقعے کی دھواں دھار نیوز چل رہی تھی۔ سابق ایم این اے مشتاق گورایا کے شیلر پر خوفناک واردات ہوئی تھی۔ اس واردات میں سلطان چٹا اور سیکرٹری ندیم کے علاوہ گورایا کے جواں سال بیٹے کی موت کی خبر بھی تھی۔ بتایا جا رہا تھا کہ حملہ کرنے والوں نے خودکار رائفلیں اور دستی بم استعمال کئے اور تباہی مچا دی۔ اس واردات کے ڈانڈے بڑے وثوق سے عمران دانش کی موت سے جوڑے جا رہے تھے۔ واضح طور پر میرا، جیلانی اور امتیاز وغیرہ کا نام لیا جا رہا تھا۔

آخر میں جلتے ہوئے گودام اور سر پیٹتے گورایا کی ویڈیو بھی دکھائی گئی اور بتایا گیا کہ پورے شہر کی پولیس حرکت میں ہے اور ملزمان کی تلاش میں چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ رات کی واردات کے بعد میرے سینے میں فروزاں شعلوں پر چند چھینٹے پڑے تھے۔ ایم این اے کا نام سن کر کچھ چھینٹے اور پڑے۔ یہ مجھے ایک بونس کی طرح لگا۔ یہ مشتاق گورایا وہی تھا...... جس نے پانچ سال قبل ثروت کی گمشدگی کے موقع پر سیٹھ سراج وغیرہ کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور ہماری کوئی پیش نہیں چلنے دی تھی۔

ٹی وی بند کرنے کے بعد جلالی نے بڑے جوش سے میری پیٹھ تھپکی۔ ''بہت خوب...... سینہ ٹھنڈا کیا تم نے۔ میرے بس میں ہو تو اس چٹے کی لاش کو شیخوپورہ کی سڑکوں پر گھسیٹوں۔'' جلالی صاحب غصے سے ہانپنے لگے۔ مہناز نے جھٹ ایک چھوٹی سی گولی نکال کر میز پر رکھ دی تا کہ اگر کام زیادہ بگڑے تو وہ گولی نگل سکیں۔

میں جلالی صاحب کے اس جوش کی وجہ سمجھتا تھا۔ قریباً پانچ ماہ پہلے یہ سلطان چٹا ہی تھا جس نے نادر ٹی ٹی کو فارم ہاؤس پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

جلالی صاحب نے اپنی نیکر کے گیلوز سیدھے کئے۔ پھر اپنے استخوانی ہاتھوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ میرے دونوں شانے جکڑے اور بولے۔ ''پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے تم دونوں کو پناہ دی ہے...... اور جب پناہ دی ہے تو بس دی ہے۔ اب جان

بھی چلی جائے گی تو تمہاری حفاظت کروں گا۔ دیکھوں گا کون مائی کا لال یہاں پہنچتا ہے اور تمہیں گرفتار کرتا ہے یہاں سے۔" عمر رسیدہ سہراب جلالی کا وجود جوش اور غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ گلے کی رگیں دھڑ ادھڑ بج رہی تھیں اور نظر آ رہی تھیں۔

ڈاکٹر مہناز نے جلدی سے گولی اور پانی کا گلاس جلالی کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے گولی نگل لی اور اپنی غصیلی گفتگو جاری رکھی۔ ہم نے جو کچھ جاوا اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا تھا، اس کی تفصیل انہیں ڈاکٹر مہناز سے معلوم ہو ہی چکی تھی۔ وہ بار بار میرے شانے تھپکتے تھے اور تعریفی کلمات ادا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے مجھے اشارے سے کہا کہ فی الحال میں ان کی کسی بات پر اختلاف نہ کروں اور خاموش رہوں۔

کچھ دیر بعد جلالی صاحب ہمیں پوری حفاظت کا یقین دلا کر چلے گئے تو جگت سنگھ نے حیران ہو کر کہا۔ "بادشاہ زادے! یہ بابا جی سچ مچ کے ہیں یا بجلی وغیرہ سے چلتے ہیں؟"

میں بابے جلالی کے مزاج کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ جس طرح کچھ عرصے پہلے جلالی صاحب کو آرا کوئے مورتی ملی تھی اور انہوں نے اس کے تحفظ کی قسم کھالی تھی، اسی طرح آج انہوں نے ہمیں پناہ دی تھی اور اس پناہ کی خاطر ہر خطرہ مول لینے کا برملا اظہار کر دیا تھا لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس بوڑھے کمزور لیکن نہایت باہمت شخص کو کسی اور آزمائش میں نہیں ڈالوں گا...... ہرگز نہیں۔

جلالی صاحب کے پاس ایک بہترین کمپنی کے سیکیورٹی گارڈز موجود تھے۔ انہوں نے شام تک کچھ مزید گارڈز منگوا لئے۔ انہوں نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ ہمیں لمبے عرصے تک یہاں چھپانے اور ٹھہرانے کا پکا ارادہ کر چکے تھے لیکن میری دلی کیفیت کچھ اور تھی۔ میں ہر اس چیز اور منظر سے دور چلا جانا چاہتا تھا جس کا تعلق کسی بھی صورت عمران سے ہو۔ وہ مجھے ہر شے میں اپنی جھلک دکھاتا تھا، مسکراتا تھا اور میرا دل خون کرتا تھا۔ یہاں اس فارم ہاؤس میں بھی ہر طرف اس کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔

رات کو جب سب سو گئے تو میں نے ڈاکٹر مہناز کے نام ایک مختصر خط لکھا۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر! میں آپ کی محبتوں کا متحمل نہیں ہوں۔ میں ان در و دیوار میں گھٹ کر مر جاؤں گا۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کیجئے گا اور جلالی صاحب کو بھی اس سے باز رکھیے گا۔ میرا ساتھی جگت سنگھ ابھی زخمی ہے۔ یہ بھی یہاں سے ننکانہ صاحب جانا چاہتا ہے لیکن امید ہے کہ آپ چار پانچ دن اس کی میزبانی کر لیں گے تاکہ یہ ٹھیک سے چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے۔ آپ کو زندگی کا نیا سفر مبارک۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں

(یہ مہناز اور جلالی صاحب کی شادی کی طرف اشارہ تھا) خدا حافظ۔"

یہ خط میں نے مہناز کے میڈیکل باکس میں ایسی جگہ رکھ دیا جہاں اس کی نظر کا پڑنا لازمی تھا۔ جگت سنگھ وہسکی کا کواٹر پی کر چت لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں اس کے خراٹوں کی گونج تھی۔ وہ ایک دلیر اور بے لوث ساتھی تھا۔ لڑنا مرنا جانتا تھا اور مرنے والوں کا بدلہ لینا بھی۔ اس نے آشا کور اور گوبندر کی موت کا قرار واقعی بدلہ لیا تھا۔ "خدا حافظ جگت سنگھ!" میں نے دل ہی دل میں کہا اور جلتی ہوئی نم آنکھوں کے ساتھ نکل آیا۔ فارم ہاؤس کے گارڈز کو علم تھا کہ میری نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنی۔ موسم سرد تھا۔ میرے پاس ایک پستول اور شکاری چاقو تھا۔ میں نے چادر کی بکل مار رکھی تھی اور شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ میں درختوں کے نیچے پھیلی ہوئی تیرگی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہر خطرے سے بے نیاز۔

O......❖......O

میرے لئے زندگی میں اب کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا کہ میں دماغی طور پر مر چکا ہوں۔ اردگرد کے ہر منظر میں اجنبیت اور ویرانی تھی۔ پتا نہیں میں کن کن راستوں پر چلتا، کن کن سواریوں پر سفر کرتا اور کہاں کہاں رکتا، لاہور اور شیخوپورہ سے بہت دور نکل آیا۔ میں بس چلتا ہی جا رہا تھا۔ کوئی مقصد تھا اور نہ کوئی منزل۔ پیٹ کا دوزخ، ایندھن مانگتا تھا تو جو ملتا تھا کھا لیتا تھا۔ ایک روز میں نے خود کو اس جگہ پایا جو دنیا میں جنت کا نمونہ تھی۔ یہ دریائے کنہار کی گزرگاہ تھی۔ کاغان سے آگے ناران کے بلند و بالا سرسبز پہاڑ تھے۔ یہ جنت ارضی تھی لیکن مجھے اس میں بھی ذرہ بھر کشش محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن میرے موبائل فون پر بیل ہوئی۔ یہ جیلانی کی کال تھی میں نے کال ریسیو کی لیکن پھر بات کرنے کا ارادہ بدل دیا اور موبائل توڑ کر دریائے کنہار کے پُرشور پانی میں پھینک دیا۔ میں جب تک زندہ تھا، اپنے ماضی سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

ناران کے مضافات میں ایک کھٹارا بس کے سفر کے دوران میں ایک مشفق بزرگ سے میری جان پہچان ہو گئی۔ پتا نہیں ان کے دل میں کیا آئی کہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔

انہوں نے ناران کی آبادی سے ذرا ہٹ کر ایک شاندار باغ لگا رکھا تھا۔ وہیں پر مکان بھی تعمیر کیا ہوا تھا۔ ہر طرح کے پھل یہاں موجود تھے۔ انہوں نے دو گائے اور کچھ بکریاں پال رکھی تھیں۔ گھر میں ان کی بیوی اور چوبیس پچیس سال کے ایک معذور بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ نوجوان ذہنی طور پر پسماندہ تھا اور اُسے چلنے پھرنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔

میں عبدالغفور نامی ان بزرگ کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ میری موجودگی سے انہیں ایک عجیب سے تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں اور کان ماضی کی طرف سے بالکل بند کر لئے تھے۔ فرح اور عاطف کی آوازیں، بالو کی کلکاریاں، ثروت کی مسکراہٹ اور سب سے بڑھ کر عمران کا چہرہ...... میں کچھ یاد رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں یہ سب کچھ کھو چکا تھا اور جو میرا نہیں تھا، وہ میرے دل و دماغ کو کیوں اتنی بے رحمی سے زخمی کرتا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میرے جسم کو محنت مشقت اور اذیت سہنے کی عادت ہو چکی تھی۔ سردی گرمی مجھ پر بہت کم اثر کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے یخ بستہ سردیوں نے ناران کی فضاؤں کو ڈھانپ لیا۔ میں اس موسم میں بھی اکثر بغیر کسی گرم لباس کے گھومتا تھا۔ عبدالغفور صاحب اور ان کی بیوی کے بہت منع کرنے کے باوجود میں باغبانی میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ گھنٹوں اور پہروں کی جان توڑ مشقت مجھے پسینے میں شرابور کر دیتی۔ میں اپنی جان لیوا سوچوں سے دور رہنے کے لئے اپنے جسم کو بالکل نڈھال کر لیتا۔ وہ بوڑھے میاں بیوی مجھے روکتے ہی رہ جاتے۔

دن گزرتے رہے...... اندھیرے اور اجالے کے پنچھی ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے رہے۔ سورج پہاڑوں کی چوٹیوں پر ابھرتا اور ڈوبتا رہا۔ یخ بستہ ہوائیں وادیوں کو تہ و بالا کرتی رہیں۔ میں ان ویرانوں میں گھومتا رہا۔ عمران کی یادوں سے پیچھا چھڑاتا رہا اور اپنے لئے قبر کی کوئی اچھی سی جگہ تلاش کرتا رہا۔ مجھے اب موت کے سوا کسی کا انتظار نہیں تھا۔ میں کبھی کبھی شام کے وقت ڈائری میں کچھ لکھنے بھی بیٹھ جاتا۔ چند دن پہلے کا لکھا ہوا ایک صفحہ میرے سامنے تھا۔

”مجھے یہاں آئے ہوئے اب آٹھ مہینے سے اوپر ہو چکے ہیں۔ مجھے پیچھے کی کچھ خبر نہیں اور نہ ہی میں رکھنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ یہیں کہیں میری سانس پوری ہو جائے اور میں چیڑ اور دیودار کے بلند درختوں کے نیچے کسی قبر میں سو جاؤں۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو سکا تو شاید میں یہاں سے واپس نہ جا سکوں۔ کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زندگی کا نظام چلتا ہی رہتا ہے۔ بالو بھی پروان چڑھ جائے گا۔ عاطف اور فرح کی زندگیاں بھی اپنی ڈگر پر چلنے لگیں گی۔ میں ان کے لئے زندگی گزارنے کے لئے بہت کچھ چھوڑ آیا ہوں۔ لیکن میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میرا عمران نہیں ہے...... اس کا چوڑا سینہ اور روشن آنکھیں نہیں ہیں۔ میرے پاس ثروت نہیں ہے، اس بے وفا کی آس نہیں ہے۔ مجھے اب یہیں پر مرنا زیادہ اچھا لگتا ہے......

”جیکی نے کہا تھا، سب کہانیوں کا انجام مرضی کے مطابق نہیں ہوتا لیکن ہر انجام میں زندگی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسے موقع دیا جائے تو اپنے رستے خود ڈھونڈ لیتی ہے لیکن کبھی کبھی زندگی کو موقع دینا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“

”آہ سلطانہ! تم نے مجھ سے زندگی کا وعدہ لیا تھا لیکن اب یہ وعدہ نبھانا میرے لئے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔ میں تمہارے بچے کے لئے بھی شرمندہ ہوں۔ بے شک بالو محفوظ ہاتھوں میں ہے لیکن میں اسے وہ محبت اور وہ زندگی نہیں دے سکا جو تم چاہتی تھیں۔ یہ سب کچھ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔ اے بھانڈیل اسٹیٹ کے اس دور دراز قبرستان میں ابدی نیند سونے والی...... مجھے معاف کر دینا۔“

میں نے ڈائری بند کی اور کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا۔ ایک آواز نے مجھے متوجہ کیا۔ یہ عبدالغفور صاحب کی بیوی کی آواز تھی۔ میں انہیں خالہ کہتا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ”بیٹے! ایک موٹر آئی ہے۔ مہمان ہیں، تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

میں بے طرح چونک گیا۔ میں نے قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول ٹٹولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ گھوما تو میری نگاہ ساکت رہ گئی۔ میں نے ایک خوش پوش لڑکی کو دیکھا...... یہ نصرت تھی۔ ہاں نصرت تھی، اور زندہ تھی۔ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ وہ پھولوں کے تختوں کے درمیان نیم پختہ سیڑھیاں اترتی ہوئی میری طرف چلی آئی۔ اس کی ساڑھی اور شال دھیرے دھیرے ہوا میں لہرا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ آگے آئی اور تابش بھائی کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے شانوں سے ٹٹولا اور خود کو یقین دلایا کہ یہ جاگتی آنکھوں کا خواب نہیں۔ تب میری نگاہ اوپر گئی اور میں کیپٹن جیلانی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ بھی سیڑھیاں اتر کر میرے پاس آ گیا اور بغلگیر ہو گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ خود کو جیلانی سے چھڑاؤں، اسے دھکا دوں اور بھاگتا ہوا باغ کے ملگجے اندھیرے میں گم ہو جاؤں۔ یہ دونوں میرا ماضی تھے اور میں ماضی کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔

”بڑی مشکل سے ڈھونڈا ہے آپ کو۔ بہت گھمایا ہے آپ نے ان پہاڑوں میں۔“ جیلانی کی آواز شکوہ کناں تھی۔

میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے نصرت کو دیکھا۔ ”میں نے تو سنا تھا کہ...... کہ......“

اپنی موت سے چار پانچ گھنٹے پہلے اس نے پھر پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ اس کا جگر ضرور نصرت کے ساتھ میچ کرے گا۔ بصورتِ دیگر اس نے اپنا یہ باڈی پارٹ کسی بھی ضرورت مند کو لگانے کی اجازت دی تھی۔ چار پانچ گھنٹے بعد وہ چلا گیا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ شاید دنیا کے چند خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ایک تھا جو پانسا پھینکتا تھا، سیدھا پڑتا تھا۔ اس نے جو آخری پانسا پھینکا، وہ بھی سیدھا پڑا۔ ڈاکٹر اور سرجن ششدر رہ گئے۔ سب کچھ تقریباً ویسا ہی ہوا جیسا اس نے چاہا تھا۔ آوٹ آف فیملی ہونے کے باوجود ساری کراس میچنگ پازیٹو رہیں۔ عمران کا جگر، نصرت کے لئے بہترین ثابت ہو رہا تھا۔ اسے تمام ٹرٹیسٹوں سے گزارا گیا اور پھر دم توڑتی نصرت کے جسم کا حصہ بنا دیا گیا۔ وہ لکی مین کا جگر تھا اور ''لک'' کہاں اپنی جگہ نہیں بناتی۔ اس نے نصرت کے جسم کے اندر بھی جگہ بنائی۔ اس کے اعضا نے اس ٹرانسپلانٹیشن کو کمال خوبی سے قبول کیا اور دو تین ماہ کے اندر ہی وہ تیزی سے رُو بہ صحت ہونے لگی اور آج وہ یہاں تھی، میرے سامنے...... میرے عمران کے جگر کے ساتھ۔

رات کو باقی لوگ تو سو گئے، میں بالو کو گود میں لے کر بیٹھا رہا اور انگیٹھی کے سامنے جیلانی سے باتیں کرتا رہا۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ جیلانی کو میرا سراغ اس ایک فون کال سے ملا تھا جس کو سنے بغیر میں نے فون توڑ ڈالا تھا۔ جیلانی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی کال فلاں علاقے سے ریسیو ہوئی تھی۔ اس نے بہت سے دیہات اور قصبوں کی خاک چھانی اور آخر مجھ تک آن پہنچا۔ اس سے پہلے وہ لوگ دبئی بھی گئے تھے۔ اس خیال سے کہ شاید میں وہاں فرح اور عاطف کے پاس موجود ہوں۔ لیکن ناکامی ہوئی۔ وہاں فرح اور ثروت کے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان باتوں کے دوران میں فرح نے اپنی صاف گو فطرت کے عین مطابق ثروت سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ یہاں تک کہ سلطانہ اور بالو کے بارے میں بھی سب کچھ ثروت کے گوش گزار کر دیا۔ اس نے ثروت کو بتایا کہ بھانڈیل اسٹیٹ کی سلطانہ سے میری شادی کیسے اور کن حالات میں ہوئی تھی اور سلطانہ کی موت کے بعد بالو کس طرح پاکستان پہنچا......

میں نے جیلانی سے کہا۔ ''یوسف کہاں ہے؟''

''کون یوسف؟''

''ثروت کا شوہر۔''

''وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے...... اور نہ ہی اب پاکستان میں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ثروت اس سے خلع حاصل کر چکی ہے اور یہ کام کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یوسف پیش ہی نہیں ہوا۔ یوسف کی جرمن بیوی نے بھی اس سے طلاق حاصل کر لی ہے۔ نہ صرف جرمنی میں اس کی ساری پراپرٹی وہ لڑکی کورٹ کے ذریعے ہڑپ کر گئی ہے بلکہ اب وہ وہاں جیل کی ہوا کھا رہا ہے۔''

''او گاڈ......'' میں نے سر تھام لیا۔

یہ زندگی مجھے مار کر پھر کیوں زندہ کر رہی تھی۔ میں اب لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ میں نے کہا۔ ''جیلانی! مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ ثروت نے یوسف سے خلع حاصل کر لیا ہے؟''

اس نے انگیٹھی کے انگاروں کو گھورا اور کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ ''ہاں تابش صاحب! آپ نے خود ہی بتایا تھا کہ ثروت صاحبہ واہموں میں جکڑی ہوئی ہیں...... واہموں کو توڑنے کے لئے پیغمبر اور ولی آئے ہیں یا پھر ہم جیسے عام انسانوں میں کبھی کبھی عمران اور دانش جیسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی محبت اور خداداد صلاحیتوں سے فرسودہ عقیدوں کے بتوں کو پاش پاش کرتے ہیں۔ یہ بس انہی باکمال لوگوں کے بس کا کام ہوتا ہے ورنہ ان عقیدوں اور واہموں سے ڈھیٹ اور سخت شے دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتی۔''

میں نے جیلانی کو پہلی بار اس طرح بولتے دیکھا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''آپ کی خوش قسمتی تھی کہ ''ثروت کے وہم کو توڑنے کی جنگ'' میں آپ کو عمران کا ساتھ ملا۔ اس نے اپنے آخری وقت میں یہ کر دکھایا۔ ثروت کو اس خوف نے جکڑا ہوا تھا کہ آپ سے ملاپ اس کی بہن کو زندگی سے دور لے جائے گا مگر جب وہ واقعی مر رہی تھی تو آپ...... یعنی آپ اور عمران کی وجہ سے اسے زندگی مل گئی۔ اور یہی وہ موڑ تھا جہاں اس وہم کا بت چکنا چُور ہوا اور ملیا میٹ ہوا۔''

رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں کمرے میں جا کر اوندھے منہ چٹائی پر گر گیا اور عمران کے لئے ٹوٹ کر روتا رہا۔ وہ میرے اندر یوں رچ بس گیا تھا کہ نکل نہیں سکتا تھا۔ وہ عجب شخص تھا۔ وہ آخر تک دوسروں کے لئے جیتا رہا اور مر کر بھی ایثار اور قربانی کا ٹھیکیدار خود ہی بنا۔ وہ مجھے جگر کہتا تھا اور میرے لئے ہی جگر دے گیا۔ مجھے پتا نہیں کہ کب تک ویسے ہی پڑا سسکتا رہا۔ آج کے انکشاف نے میرے کندھوں پر عمران کے احسانوں کا بوجھ کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ میرا چہرہ تکیے پر تھا۔ آنکھوں میں جلن اور سینے میں شعلوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ باہر برف باری ہو رہی تھی۔ سردی عروج پر تھی لیکن میں ننگی چٹائی پر بغیر کسی لحاف کے پڑا تھا۔ آگ

تو میرے اندر تھی جو بجھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

اچانک مجھے اپنی کمر پر کسی کے لمس کا احساس ہوا۔ کسی نے ایک نرم کمبل میری پشت پر ڈال دیا اور پھر خود بھی اس کمبل کے ساتھ لگ گیا۔ یہ ثروت تھی۔ میں دیکھے بغیر ہی جان سکتا تھا کہ وہ ثروت ہے۔ اس کے جسم کا گداز کمبل میں اور پھر میرے جسم میں منتقل ہو رہا تھا۔ وہ عقب سے میرے ساتھ لگ گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ خاموشی کی زبان سب سے طاقتور ہوتی ہے۔ وہ بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ اپنے سابقہ رویے پر شرمندگی ظاہر کر سکتی تھی۔ اپنے کہنہ واہے پر پشیمانیوں کا اظہار کر سکتی تھی، مجھ سے معافی مانگ سکتی تھی۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس میرے ساتھ لگ کر میرے اوپر ڈھے کر ہولے ہولے سسکتی رہی۔ یہ خاموشی اس کے ہر اظہار پر حاوی تھی۔ ہر فقرے سے زیادہ متاثر کن۔ پتا نہیں کتنی ہی دیر اسی طرح گزری۔ پھر اس نے میرا رخ اپنی طرف پلٹا۔ میں نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ وہ سرتاپا محبت تھی۔

محبت میں ہارے ہوئے لوگوں کی باتوں میں بہت گہرائی ہوتی ہے۔ بارونداجیکی کے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ہر کہانی کا انجام بندے کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا لیکن ہر کہانی کے برے سے برے انجام میں بھی زندگی موجود ہوتی ہے۔ اس زندگی کو موقع دیا جائے تو وہ اپنے رستے خود ڈھونڈتی ہے۔ شاید میری زندگی نے بھی رستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

ان لمحوں میں مجھے لگا کہ ٹھوڑی کے گڑھے والا وہ خوب صورت عمران کہیں میرے آس پاس ہے۔ مجھے دیکھ رہا ہے...... اور مسکرا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے... کوئی بات نہیں تابی! اداس مت ہونا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میں تمہارے اندر رچ بس چکا ہوں۔ میں تم سب کے اندر رچ بس چکا ہوں۔ تم لوگ جب جب محبت کرو گے، جب جب سکھ بانٹو گے، ایثار کرو گے اور قربانی دو گے، مجھے اپنے بالکل قریب پاؤ گے اور جب بہار کی سہانی شاموں میں اور سرما کی نرم گرم راتوں میں تم زندگی کے گہرے دکھ سینے میں چھپا کر مسکراؤ گے، ہنسو گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہنسوں گا۔ تمہارے بالکل پاس آ جاؤں گا۔ ہاں میرے دوست، اداس مت ہونا۔